13

رابطۂ ادب اسلامی (عالمی) کا سہ ماہی اردو ترجمان

کاروانِ ادب اسلامی

بانی

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

مدیر مسئول

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

ناشر

مرکزی دفتر رابطۂ ادب اسلامی (عالمی)

پوسٹ بکس ۹۲ ندوۃ العلماء لکھنؤ

سہ ماہی کاروانِ ادب اسلامی

بانی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ
سابق صدر رابطہ ادب اسلامی (عالمی)

مجلس مشاورت

پروفیسر عبداللہ عباس ندوی، مکہ مکرمہ
پروفیسر عبدالحلیم ندوی، دہلی
مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، لکھنؤ
مولانا سید محمد واضح رشید ندوی لکھنؤ
پروفیسر محمد راشد ندوی، علی گڑھ
پروفیسر سید محمد اجتباء ندوی، دہلی
پروفیسر تحسین فراقی
پروفیسر ظہور احمد اظہر
پروفیسر وقار احمد رضوی
مولانا محمد سلطان ذوق ندوی

مدیر مسئول

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (ناظم شعبۂ برصغیر)

مجلس ادارت

پروفیسر محسن عثمانی ندوی، C.I.E.F.L. حیدرآباد
پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ندوی، اے، ایم، یو، علی گڑھ
مولانا نذر الحفیظ ندوی، لکھنؤ

معاون انتظامی

اقبال احمد ندوی

معاون طباعت

محمد غفران ندوی

طباعت: - پاریکھ آفسٹ لکھنؤ

کمپیوٹر کتابت: - حامد۔ کمپیوٹر سیکشن مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ

زرتعاون

اس شمارہ کی قیمت	ایک سو ساٹھ روپے
سالانہ برائے ہندوستان	ایک سو پچاس روپے
پاکستان و بنگلہ دیش	تین سو روپے یا دس امریکی ڈالر
ان کے علاوہ دیگر ممالک	چار سو روپے یا بارہ امریکی ڈالر

چیک یا ڈرافٹ اس نام سے بنائیں RABITAT-AL-ADAB-AL-ISLAMI (INDIA)

صدر دفتر رابطہ ادب اسلامی (عالمی) پوسٹ بکس ۹۳ ندوۃ العلماء لکھنؤ

فہرست مضامین

جلد نمبر ۸	اپریل ۲۰۰۱ء مارچ ۲۰۰۲ء	شمارہ نمبر ۱-۴

نمبر شمار			صفحہ نمبر
۱	منزل بہ منزل	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۶

سیرت و شخصیت

۱	حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی اوصاف وخصوصیات	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۹
۲	حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی کی شخصیت سازی میں والدہ کے خطوط کا حصہ	مولانا سید محمد واضح رشید ندوی	۱۹
۳	حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت: تعلیم ومطالعہ اور تصنیفات کے آئینہ میں	مولانا نذر الحفیظ ندوی ازہری	۲۵
۴	حضرت مولانا علی میاں ندوی کی ادبی خدمات اور تصانیف	مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی	۴۸
۵	حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی ایک مایہ ناز ادیب، ایک قابلِ فخر داعی	ڈاکٹر منجد مصطفیٰ بہجت	۸۱
۶	مفکر اسلام، نابغۂ روزگار حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی	پروفیسر سید رضوان علی ندوی	۹۰
۷	اسلام کی نشأۃ ثانیہ میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کا قائدانہ کردار	ڈاکٹر محمد عارف جنید	۱۰۰
۸	حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی علمی خدمات	مولانا شمس الدین آفریدی	۱۱۰
۹	رابطہ ادب اسلامی: مولانا علی میاں کی فکری قیادت اور تحریک ادب اسلامی کا ثمرہ	حسین امین	۱۱۵
۱۰	حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی اور فکر ولی اللہی	مولانا راشد ندوی	۱۲۵
۱۱	مفکر اسلام اپنی فکر ونظر کے آئینہ میں	عارف عزیز	۱۳۳
۱۲	تحریکِ پیام انسانیت	احسن علی خان	۱۴۰

صاحبِ طرز ادیب

۱۳	حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب اسلوب ادیب اور نقاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	۱۴۹
۱۴	حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی کا اسلوب اور اس کے مضمرات	پروفیسر عتیق اللہ	۱۸۰
۱۵	حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی تعمیری ادب کا اعلیٰ نمونہ	مولانا علاء الدین ندوی	۱۸۶
۱۶	حضرت مولانا علی میاں ندوی بحیثیت ایک اردو ادیب	پروفیسر وصی احمد صدیقی	۲۰۲

ادب اطفال

۱۷	بچوں کے ادب میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کا اسلوب	مولانا سعید الرحمٰن ندوی اعظمی	۲۲۰
۱۸	حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کی سیرت نگاری ادب اطفال کے تناظر میں	پروفیسر محمد یاسین مظہر صدیقی ندوی	۲۵۲
۱۹	حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی اور ادب اطفال	ڈاکٹر محمد اقبال حسین ندوی	۲۶۷
۲۰	حضرت ابوالحسن علی ندوی قصصی ادب کے تناظر میں	مولانا سراج الدین ندوی	۲۷۸
۲۱	بچوں کا ادب اور حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی	مولانا عقیل احمد قاسمی	۲۸۶

شعر و سخن

۲۲	حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کا مذاق شعر و سخن	مولانا عبداللہ عباس ندوی	۲۹۳
۲۳	حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کا ذوق شاعری	مولانا فیصل احمد بھٹکلی ندوی	۳۰۰

تصانیف پر ایک نظر

۲۴	نقوشِ اقبال.....ایک مطالعہ	پروفیسر ابوالکلام قاسمی	۳۲۲
۲۵	حضرت ابوالحسن علی ندوی.....نقوشِ اقبال کی روشنی میں	ڈاکٹر محمد نعمان خاں	۳۳۵
۲۶	کاروانِ مدینہ ایک.....مطالعہ	ڈاکٹر نعیم الحسن اثری	۳۴۳
۲۷	پرانے چراغ.....ایک مطالعہ	ڈاکٹر محمد نفیس حسن	۳۶۱
۲۸	القراءۃ الراشدہ کا ایک تجزیہ	ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی	۳۷۶
۲۹	ادبی و تنقیدی بصیرت اور گلِ رعنا پر تبصرہ.....	پروفیسر شریف حسین قاسمی	۳۸۷

۳۰	تاریخ دعوت وعزیمت..... ایک مطالعہ	مولانا شمس الدین ندوی	۳۹۷
۳۱	شرق اوسط کی ڈائری	پروفیسر وصی احمد صدیقی	۴۱۱
۳۲	اپنے گھر سے بیت اللہ تک	پروفیسر انیس احمد چشتی	۴۲۵
۳۳	حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کی سیرت نگاری میں قرآنی استناد	پروفیسر یاسین مظہر صدیقی	۴۳۶

منظوم خراجِ عقیدت

۳۴	علی ٹھنڈک ہو آنکھوں کی.....	محترمہ خیر النساء بہتر	۴۶۸
۳۵	تری ہستی کو چراغِ رہ گذر پاتا ہوں میں	شفیق جونپوری	۴۶۹
۳۶	کشورِ ہندوستاں سے بوالحسن رخصت ہوا	عبدالقیوم ایڈوکیٹ	۴۷۲
۳۷	غمِ دل فگار	واصف الرحمٰن واصف	۴۷۴
۳۸	منقبت مفکر اسلام	محمد حسین فطرت بھٹکلی	۴۷۵
۳۹	کلید کعبہ کی شرف یابی پر	محمد حسین فطرت بھٹکلی	۴۷۷

متفرقات

۴۰	آخری سفر	محمد یاسین ذکی	۴۷۸
۴۱	حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی - ایک نظر میں	مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی	۴۹۰
۴۲	حضرت ابوالحسن حسنی ندوی کی اردو تصانیف	محمد طارق زبیر ندوی	۵۰۷

ادب اسلامی کی خبریں

۴۳	خطبۂ استقبالیہ	مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی	۵۱۵
۴۴	بھٹکل میں دفتر رابطہ ادب اسلامی کا قیام	مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی	۵۲۴
۴۵	محی الدین منیری صاحب حیات وخدمات	ذاکر الحق سورپ	۵۳۱
۴۶	رابطہ ادب اسلامی کی قاہرہ میں سالانہ نشست	ادارہ	۵۳۹

دو فیصلے

"ہم مسلمانوں نے پورے عزم کے ساتھ سوچ سمجھ کر ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہمارے اس فیصلہ کو ارادۂ الٰہی کے سوا کوئی طاقت بدل نہیں سکتی ہمارا دوسرا فیصلہ یہ ہے کہ ہم اس ملک میں اپنے پورے عقائد، دینی شعائر اور اپنی پوری مذہبی اور تہذیبی خصوصیات کے ساتھ رہیں گے..... ہندوستان کے دستور نے ہمیں اس ملک میں نہ صرف رہنے کی آزادی دی ہے بلکہ اس نے ہمارے رہنے کا خیر مقدم کیا ہے وہ ہم کو ہماری خصوصیات کے ساتھ رہنے کی اجازت دیتا اور اس کا انتظام کرتا ہے"۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

منزل بہ منزل

گذشتہ شمارہ میں اس تازہ شمارہ کے لیے مؤسس صدر رابطہ ادب اسلامی رحمۃ اللہ علیہ کے نمبر ہونے کا اعلان تھا، اور یہ کہ یہ شمارہ چار شماروں کی جگہ ہوگا، چنانچہ اس کو اسی حیثیت سے تیار کئے جانے کی طرف توجہ دی گئی، اس کو اب سے خاصا پہلے تیار ہو جانا چاہئے تھا، لیکن کچھ تو ملک کے خاص حالات اور کچھ دیگر اسباب کے باعث تاخیر ہوتی گئی، چنانچہ اسے اب پیش کرنا ممکن ہو سکا، ہم معذرت خواہ ہیں کہ ہمارے قارئین کو اس کے سلسلہ میں خاصا انتظار کرنا پڑا۔

اس درمیان برصغیر کا ایک سالانہ مذاکرۂ علمی ''ادب اسلامی کی نمائندہ شخصیات'' کے موضوع پر لکھنؤ میں منعقد ہوا، اور ایک سیمینار مع رابطہ ادب اسلامی کی سہ سالہ کانفرنس کے قاہرہ مصر میں منعقد ہوا، پھر ہندوستان میں رابطہ کی مختلف شاخوں کی طرف سے بھی مقامی اور علاقائی ایک روزہ کئی سیمینار منعقد ہوئے، اس طریقہ سے رابطہ ادب اسلامی کی کارکردگی الحمدللہ بخوبی جاری ہے۔

رابطہ ادب اسلامی کے تأسیسی صدر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم شخصیت کے پہلو کئی تھے، جن کو ان کی وفات کے بعد اہل علم نے ان کی شخصیت پر کتابیں اور رسالوں کے نمبر شائع کر کے نمایاں کئے، ان پہلوؤں میں ادب کا پہلو ہمارے رابطہ ادب اسلامی کے خاص موضوع کا ہے، رابطہ ادب اسلامی کے اس

ترجمان نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے اسی پہلو کو اصلاً ترجیح دی ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی نوعمری کا زمانہ ایسے ماحول میں گذرا جس میں ادب سے خصوصی دلچسپی لی جاتی تھی، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد بڑے مصنف تھے، تاریخ ان کا خصوصی موضوع تھا، لیکن ادب میں بھی ان کو دستگاہ حاصل تھی، انہوں نے علوم وفنون اور شخصیات پر کتابیں تصنیف کرنے کے ساتھ "گل رعنا" کے نام سے شعراء کے تذکرہ و تبصرہ پر بھی کتاب تصنیف کی تھی، اپنے والد ماجد سے ان کے علمی وادبی ذوق کا ورثہ پانے کے ساتھ ساتھ خود مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے قریبی اہل قرابت اردو ادب وشاعری سے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے، ان کی معاصرت وصحبت میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ادبی مذاق کو ابتدائے عمر سے جلاء ملا، ان کو آغاز طالب علمی میں ہی منتخب نثری ادب کے مطالعہ کا موقع مل گیا، اور اساتذۂ شعر کے کلام سے متعارف ہوئے، اور اس کے ناقدانہ ذوق سے واقف ہونے کا بھی موقع ملا، عربی زبان وادب کی تعلیم نے ان کے ادبی ذوق کو اردو سے عربی تک وسیع کردیا، پھر مولانا کی ادبی صلاحیت صرف نظری واقفیت وذوق تک محدود نہیں رہی بلکہ وہ ان کے تحریری وتقریری عمل میں بھی ظاہر ہوئی۔

اردو کے تعلق سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ان تصنیفات وتحریروں میں جو تذکروں اور تبصروں پر مشتمل ہیں، اور سفرناموں اور دعوتی مضامین کی صورت میں سامنے آئیں یہ صلاحیت ظاہر ہوئی، اور اس نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات میں ایک ایسی حلاوت اور ایسی چاشنی پیدا کردی جس نے ان کے رشحات قلم کو قارئین کے لئے خاص طور پر پسندیدہ بنادیا، اور عربی میں تو مذکورہ اصناف کے علاوہ مولانا کے تعلیمی موضوع کے مقالات وتصنیفات میں بھی یہ صلاحیت نمایاں ہوئی، اور عربی ادب کے منتخبات اور بچوں کے لئے تیار کردہ کتابوں میں جلوہ گر ہوئی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے عربی ادب کے جو منتخبات تیار کئے ان کو اسلامی عہد ہی

سے شروع کیا، اور بچوں کے لئے بھی جو کتابیں تیار کیں ان کو بھی اسلامی روح ومزاج کے ساتھ مربوط رکھا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑے عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ روحانی شخصیت کے بھی مالک تھے، غالباً یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ادب وزبان کی اپنی صلاحیت کا خصوصی حصہ بطور خاص ادب کے اسلامی پہلو کو عطاء کیا، پھر اپنے اس تجربہ کو ایک نظریہ کی صورت میں عربی زبان وادب کی موقر عالمی انجمن مجمع علمی عربی دمشق شام میں پیش کیا، جس کو ادب عربی کے ماہرین نے سراہا، بالآخر اس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کی، جو رابطہ ادب اسلامی کی تشکیل کی صورت میں ظاہر ہوئی، لہذا رابطہ ادب اسلامی کے ترجمان کی طرف سے ان پر شائع کئے جانے والے خصوصی شمارہ کے لئے یہی موزوں تھا کہ وہ اسی پہلو کو اولیت دے۔ امید ہے کہ قارئین اس طریقہ سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ادبی امتیاز واختصاص سے خصوصی واقفیت حاصل کرسکیں گے۔

اس خاص نمبر میں جو مضامین پیش کئے جارہے ہیں ان میں سرفہرست وہ مضامین ومقالات ہیں جو اکتوبر ۲۰۰۰ء میں جامعہ اسلامیہ بھٹکل کی ضیافت میں رابطہ کی بھٹکل شاخ کی دعوت پر اور اس کے تعاون سے بچوں کے ادب پر منعقد ہونے والے سیمینار میں پڑھے گئے تھے، اس سہ روزہ سیمینار کا ایک روز حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ادبی کارناموں کے لئے مخصوص کردیا گیا تھا جس میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور ادبی خدمات کے سلسلہ میں متعدد وقیع مضامین پیش کئے گئے، پھر وہ مضامین ومقالات ہیں جو رابطہ کے دوسرے سیمیناروں میں حضرت مولاناؒ کے اوپر پڑھے گئے، نیز دیگر رسالوں اور کتابوں سے بھی کچھ اچھے مضامین لئے گئے ہیں، اس طرح اس خصوصی شمارہ کو اپنی حد تک معیاری اور بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی گئی ہے، ہم اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ ہم اپنے قارئین پر چھوڑتے ہیں۔

قابلِ فخر کارنامہ

''اگر کوئی ہندوستانی مسلمان عرفات کے بھرے میدان میں جہاں ساری دنیا کا عطر جمع ہو جاتا ہے' کھڑا ہو کر ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا کارنامہ بتائے' ان قربانیوں کا ذکر کرے جو ایک صدی پہلے دی جا چکی تھیں تو کوئی ایسا آدمی نہ ملے گا جو اس کی تردید کر سکے''۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

اوصاف وخصوصیات

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ برصغیر کی ایک ممتاز اور غیر معمولی شخصیت کی حیثیت سے زندگی گزار کر ۱۹۹۹ء کے اختتام پر اس دُنیا سے رخصت ہوئے، ان کی وفات پر صدی اختتام کے قریب پہنچی، اس صدی کو برصغیر کی تاریخ میں گزشتہ صدیوں پر یہ امتیاز حاصل رہا ہے کہ اس میں یورپ کے جدید ترقی یافتہ تمدن سے برصغیر کو سابقہ پڑا جس کا اس کی تمدنی واخلاقی قدروں پر خاصہ اثر پڑا۔ نیز غیر ملکی اقتدار کی چیرہ دستیوں اور حق تلفیوں کے ردّعمل کے طور پر جذبۂ حریت کو فروغ ہوا، اس سے یہاں انقلاب کی راہ ہموار ہوئی اور اس کے نتیجہ میں پورا برصغیر اپنے پُرانے دور سے نکل کر نئے دَور میں داخل ہوا۔

مولاناؒ ان شخصیتوں میں تھے جنھوں نے سادہ دل مشرق اور شاطر وہوشیار مغرب کی کشاکش کو دیکھا اور سمجھا اور غیر ملکی اقتدار کے دور کے ختم کرنے کی کوششوں کا بھی مشاہدہ کیا، اور ان سے دلچسپی لی، پھر آزادی کا دور شروع ہونے پر انقلاب کے بعد کے مراحل کو بھی دیکھا اور اس کی پیچیدگیوں اور زندگی کی قدروں پر ان کے اثرات دیکھے،

پھر ایک عالمِ دین اور ایک حساس دل رکھنے والے دانشور، اور ایک محبِ وطن اور ملتِ اسلامیہ کے وفادار فرزند کی حیثیت سے وقت کے تقاضوں کو سمجھنے اور اعلیٰ قدروں کی حامل زندگی کو استوار کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے میدانِ عمل میں داخل ہوئے اور اپنے علم وعمل سے ۶۵ سال کی کارکردگی کے ساتھ ایک عظیم مفکر، معلم اور مصلح کی ذمہ داری انجام دی، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی یہ ممتاز سنجیدہ شخصیت کیسے بنی، اس کا جواب خود ان کی شخصیت کی تشکیل میں کارفرما عوامل واسباب میں ملتا ہے۔

مولاناؒ کے والد ماجد حکیم سید عبدالحیٔ حسنی رحمۃ الہ علیہ ہندوستان کے ممتاز مؤرخ اور علم وثقافت سے گہری واقفیت رکھنے والے عالمِ دین اور مصنف تھے، اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے ایک بڑے دینی وعلمی ادارے (ندوۃ العلماء) کے سربراہ بھی تھے، ان کا انتقال ہوا تو ان کے صاحبزادے کی عمر صرف ۹ سال کی تھی، لہذا ان کو اپنے نوعمر صاحبزادے کی تعلیم وتربیت کا باقاعدہ موقع نہیں ملا، لیکن ان کے چھوڑے ہوئے اثرات سے ان کے سمجھدار وذمہ دار پسماندگان سے اس کا مداوا ہوا، ان کے بڑے بیٹے ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی جو دینی تعلیم مکمل کر کے عصری تعلیم کے مراحل بھی پورے کر رہے تھے، اور ان کی عالی ہمت اور دیندار اہلیہ، پھر وہ قیمتی سرمایۂ کتب جو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے جو گھر کے اندر موجود تھا، اور جس میں خود ان کی غیر معمولی خصوصیت کی حامل تصنیفات تھیں، ان کے نوخیز صاحبزادہ کی تربیت کا ایک چھا ذریعہ بنیں، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد سے ملے ہوئے ذوق مطالعہ کے اثر سے اپنے گھر کے اندر موجود علمی سرمایۂ علمی سے آغاز عمر ہی میں اور خاص طور پر اُردو ادب اور اخلاق وسیرت کے دائرہ میں خوب استفادہ کیا، پھر فکری ودعوتی مزاج کی تشکیل کے سلسلہ میں ان کے بڑے بھائی نے پوری توجہ کی، وہ قدیم وجدید دونوں علمی راہوں سے گزرے تھے، وہ دینی وعلمی درسگاہ سے فضیلت کر کے جدید علوم کی طرف متوجہ ہوئے تھے اور سائنس میں B.Sc. کی امتیازی

کامیابی حاصل کر کے (M.B.B.S.) کے کورس کی تکمیل کی تھی، اور اس کے اور میڈیکل پریکٹس کے ذریعہ سماجی زندگی کے معاملات اور اسلامی تقاضوں سے بخوبی واقف ہوئے تھے، وہ اسلامی سربلندی کے داعی اور اسلامی قدروں پر پورا اعتماد رکھتے تھے، چنانچہ اپنے نوخیز بھائی کی بہتر تعلیم نیز اخلاقی و دینی تربیت پر انھوں نے اور والدہ صاحبہ نے پوری توجہ صرف کی۔ والدہ صاحبہ اپنے موقر شوہر کے جلد انتقال کر جانے کی وجہ سے اپنی اولاد کو سنوارنے اور بنانے پر ساری توجہ مرکوز رکھنا ضروری سمجھتی تھیں، مولاناؒ اپنے گھریلو سرمایۂ علم وادب کے مطالعہ اور اپنی والدہ اور بھائی کی رہنمائی و تربیت سے آگے بڑھے تو ان کو علم وادب کے دیگر پہلوؤں میں کمال پیدا کرنے کے لئے وقت کے مشہور اساتذہ ملے، خاص طور پر حدیث شریف، تفسیر قرآن اور ادبِ عربی میں ان کو امتیازی شان پیدا کرنے کے ذرائع حاصل ہوئے، تاریخ کے موضوع میں نمایاں صلاحیت خود اپنے گھر کے سرمایۂ علمی کے ذریعہ اور علمی رجحان اپنے خصوصی ماحول سے حاصل ہو چکا تھا، اس کے ساتھ ساتھ گھر کے دینی ذوق کے اثر سے باطنی اصلاح و تزکیۂ نفس کی طرف میلان ہوا جس کے حصول اور اس میں ترقی کی راہ وقت کے مشہور و مستند بزرگوں کی صحبت و استفادہ کے ذریعہ آسان ہوئی۔

ان تمام اسباب نے مولاناؒ کو متعدد و متنوع کمالات و خصوصیات کا حامل انسان بنا دیا، وہ ایک طرف ممتاز مفکر و مصلح، دوسری طرف کامیاب معلم و مربی، اور تیسری طرف بااثر صاحب قلم و صاحب اسلوب ادیب بنے۔

تاریخ کے مطالعہ سے مولاناؒ نے قوموں اور ملکوں کے عروج و زوال کے اسباب کو سمجھا، ہندوستان کے غلامانہ دور کی پریشانیوں و پسماندگی کا مشاہدہ کرنے کے ساتھ نئی حاصل ہونے والی آزادی کے بعد کی پیچیدگیوں نیز فرقہ وارانہ و طبقاتی کشمکش کے دل سوز مناظر دیکھ کر ملک و قوم کو بربادی سے بچانے کے جذبہ کے حامل بنے، علوم

دینیہ میں دستگاہ پیدا ہونے سے مسلمانوں کی فلاح وصلاح کی مفید صورتوں سے آگاہ ہوئے اوراس کے لئے قدیم وجدید وسائل کا مفید اور صالح طریقۂ کار اخذ کیا۔

تصنیف وذوق ادبی کے ذریعہ ذہنوں کو بیدار کرنے اور ترقی وکامرانی کی صحیح راہ دکھانے کی صلاحیت سے کام لینے کی کوشش کی اور اپنی زندگی کو مفید اور تربیتی کاموں میں وقف کردیا۔

اس سلسلہ میں مولاناؒ نے دو خاص صفتوں کو حرزِ جاں بنایا:

ایک تو قوم وملت کی خیر خواہی وخیر طلبی اور دوسرے زہد وقناعت کے ساتھ حصولِ مقصد کے لئے لگن اور قربانی، اس کے ساتھ ساتھ طبیعت کی نرمی، کریمانہ اخلاق، والہانہ جذبۂ عمل، فہم وفراست اور مقصد کی بلندی جیسی ممتاز صفات مولاناؒ کی خصوصیات بنیں، اپنی انہی صلاحیتوں سے انھوں نے متعدد اہم ترین مسائل حل کئے، اور قوم کے دانشوروں اور رہبروں کو متأثر کیا اور اپنوں اور غیروں کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی۔

مولانا کی شخصیت میں دو نمایاں صفتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:

ایک تو ممکنہ حد تک وسعتِ قلبی، دوسری صفت دوسروں کی دل آزاری سے پرہیز۔

وسعت قلبی کا تو یہ حال تھا کہ دین وملت کی تعمیر میں حصہ لینے والے تمام لوگوں کے لئے اپنے دل میں جگہ رکھتے تھے، اوران کی خوبیوں کا اعتراف کرتے، ان سے ملتے اور اظہار قدر کرتے تھے، بشرطیکہ وہ دین وملت کی بنیادی قدروں اور مسلمہ اصولوں کے خلاف کام نہ کررہے ہوں، چنانچہ فقہی مسلک کا اختلاف، مکتبِ فکر کا فرق یا طریقۂ کار کا تنوع مولاناؒ کی نظر میں دوری اور ٹکراؤ کا سبب نہ تھا، بشرطیکہ اس کا کام اصل دین، اور ملت کی تقویت کو نقصان پہنچانے والا نہ ہو، اسی قاعدے کے بموجب مولاناؒ نے دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور جامعہ سلفیہ بنارس، اسی طرح جمعیت علماء ہند، جماعت اسلامی وغیرہ سب کو ان کی تعمیری اور ملی کوششوں اور دینِ حق کی

ضرورت کے زاویہ سے دیکھا، اور ان کے لئے اظہار قدر کیا، ان کے ذمہ داروں سے اخوت و ہمدردی کا معاملہ رکھا اور حسب ضرورت تعاون کیا۔

مولاناؒ کی دوسری صفت دوسروں کی دل آزاری سے پرہیز رہی ہے، مولاناؒ کی یہ صفت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ کوئی شخص مولاناؒ کی تحقیر و تنقیص کرتا تو بھی مولاناؒ اس کا جواب نہ دیتے، اور اپنے معاونین و محبین کو بھی ہدایت کرتے کہ وہ کوئی انتقامی رویہ اختیار نہ کریں، اور ان سے ایسا آدمی ملتا تو وہ اس سے اس بات کی شکایت بھی نہ کرتے بلکہ شرافتِ نفس کے ساتھ معاملہ کرتے، اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ مولانا کو تنقیص و تحقیر کے رویہ سے تکلیف نہیں ہوتی تھی، وہ حساس طبیعت تھے، ان کو ایسی بات سے تکلیف ضرور ہوتی تھی لیکن انھوں نے اپنا وطیرہ برداشت اور رواداری کا رکھا، وہ یہ شعر پڑھتے تھے:

آسائشِ دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف، با دشمناں مدارا

دوسروں کا بُرا چاہنا یا انتقام لینا مولاناؒ کے یہاں بالکل نہ تھا، وہ دوسروں کی عیب جوئی سے بھی دور رہتے تھے، جن کو بُرا سمجھتے تھے بلا ضرورت ان کی برائی کا بھی تذکرہ نہیں کرتے تھے، حتی کہ ان کے خدام کو بعض وقت یہ دھوکا ہو جاتا تھا کہ مولاناؒ اپنے فلاں مخالف کے بارے میں بالکل ناواقف ہیں اور اس سے اس ناواقفیت میں دھوکہ کھا جاسکتے ہیں، لیکن کسی نے توجہ دلائی تو اندازہ ہوا کہ مولاناؒ بے خبر نہیں ہیں لیکن ظاہر نہیں کرتے، مولاناؒ کے اس رویہ کے نتیجہ میں ان سے متعدد دوری رکھنے والے ان کا محبت ہی کا رویہ دیکھ کر بالآخر ان سے قریب ہوئے۔

مولاناؒ کی ایک اہم خصوصیت دین وملت کی خدمت و دفاع کا جذبہ تھا، وہ کسی کو بھی دین وملت کو نقصان پہنچاتے دیکھتے یا دین کے مسلمہ حقائق یا دین کی بنیادی حقوق پر حملہ آور ہوتا دیکھتے تو اس کا سخت نوٹس لیتے تھے، اور اس میں کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے،

اس کی مثالیں ان کے مختلف مضامین میں اور تصنیفات میں بآسانی دیکھی جاسکتی ہیں، انھوں نے عربوں کے ساتھ عقیدت ومحبت کے باوجود عرب قومیت کی مخالفت بلکہ سخت تردید کی اور ترک قوم کے کارناموں کی وجہ سے ان کی قدر ومحبت رکھنے کے باوجود موجودہ ترک حکمرانوں کے الحادی رویہ کی سخت مذمت کی اور اپنی اسی غیرتِ دینی کے تقاضہ سے حسب ضرورت اپنی زبان وقلم کو مؤثر ڈھنگ سے استعمال کیا، انھوں نے ہندوستان میں اسلامی ثقافت کو غیر اسلامی ثقافت میں مدغم کرنے کی کوششوں کی کھل کر مخالفت کی اور اس سلسلہ میں تقریریں کیں اور مضامین لکھے اور اس میں مسلمانوں کی کثیر آبادی کے بسے ہونے کے ناطے اس بات کی تحریک چلائی کہ تمام مذاہب کو اپنے اپنے طریقہ سے کام کرنے کا موقع ملے اور اکثریت اپنی اکثریت کی بنیاد پر اقلیت پر اپنے مذہب وتہذیب کو عائد نہ کرے اور سب شریف پڑوسی کی طرح زندگی گزاریں۔

مولاناؒ ملتِ اسلامیہ کی سماجی، تعلیمی اور سیاسی ضرورتوں اور تقاضوں پر ان کی اہمیت کے مطابق نظر رکھتے تھے اور کام کرنے والوں کے مابین طریقۂ کار اور نقطہ ہائے نظر کا جو فرق ہوتا اس کو اختلاف اور کشمکش کا موضوع نہ بناتے ہوئے اپنا ضروری تعاون دیتے تھے، تعلیمی تحریکات میں، دینی تعلیم کی درسگاہوں کے علاوہ جن سے ان کا گہرا ربط تھا، ملت کی عصری درسگاہوں، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ دہلی وغیرہ کی بھی اہمیت وضرورت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کی مشکلات کے حل کے لئے جو ادبی واخلاقی تعاون دے سکتے تھے وہ دیتے تھے، ان کی نظر میں ملت کی بقاء وحفاظت وترقی کی ضروری فکر کرنا مشترک فریضہ تھا، اس کے لئے اپنے جماعتی ونظریاتی اختلافات سے بلند ہوکر کام کرنے کی ضرورت سمجھتے اور اس پر عمل کرتے تھے، اور اس کے لئے ان کے اختیار میں جو تعاون ہوسکتا تھا وہ دیتے تھے، ان کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی تمام جماعتیں ان پر متفق ہوجایا کرتی تھیں اور اپنے آپس کے اختلاف وفرق کے باوجود ان کو اپنا مشترک ہمدرد اور

مشیر سمجھتی تھیں۔

مولاناؒ کے مختلف النوع ومتعدد الفکر گروہوں کے ساتھ تعاون وتائید کا یہ مطلب نہیں ہوتا تھا کہ ان کی خود کوئی الگ رائے نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ محض ملت کی بقاء اور ترقی کی مصلحت کی خاطر چھوٹی اور انفرادی مصلحتوں کو نظر انداز کر کے بڑی مصلحت کے لئے ہمدردی وتعاون کرتے تھے، ورنہ وہ ہر مسئلہ میں اپنی متعین رائے رکھتے تھے اور غلط اور منحرف رجحانات کے ساتھ کوئی لوچ نہیں رکھتے تھے۔

بلکہ ان کے خلاف مثبت جدوجہد کرتے تھے اور یہ بات ان کی تقریروں اور تصنیفات میں پوری طرح عیاں ملتی ہے، پھر مولاناؒ کا خدمتِ دین وملت کا دائرہ صرف ہندوستان اور برصغیر تک محدود نہیں تھا، بلکہ پورے عالم اسلامی تک پھیل گیا تھا، وہ مشرق میں ملیشیا وانڈونیشیا تک اور مغرب میں افغانستان، ایران، ترکی اور ممالک عربیہ تک یورپ وامریکہ میں مقیم مسلمانوں کی سوسائٹیاں تک مولاناؒ کے فکر وعمل کے دائرے میں تھیں، وہ جہاں جس تعاون کا تقاضا سمجھتے اس کے کرنے کی کوشش کرتے اور جہاں کمزوری اور انحراف محسوس کرتے وہاں اصلاح وتنقید کی اپنی آواز پہنچاتے اور صحیح اسلام اور ملت کی صحیح مصلحت کی پاسداری کی طرف توجہ دلانے کا جرأت مندانہ کام انجام دیتے تھے، اس کے لئے عوام میں عمومی خطاب کا، اور حکومت کے ذمہ داروں کے لئے ملاقات وافہام وتفہیم کا طریہ اختیار کرتے، مولاناؒ نے دینی وملی خدمت کے لئے اپنا جو مزاج بنایا تھا اس میں مخاطب کے لئے اس کے مقام وحیثیت کے لحاظ سے جو اسلوبِ کلام مناسب ہوتا اور اس کا جو اچھا کام ہوتا اس کے لحاظ اور اس کے اعتراف کے ساتھ بات کرتے لیکن اس سے کہنے والی بات زوردار طریقہ سے کہہ دیتے۔ تنقید ہوتی لیکن انداز محبانہ ومشفقانہ ہوتا، چنانچہ ان کی تلخ بات بھی برداشت کر لی جاتی۔ اس سلسلہ میں انکو اپنے ملک کے چوٹی کے لیڈروں اور غیر ممالک کے سربراہانِ مملکت سے بات کرنے کے جو مواقع

حاصل ہوئے انھوں نے ان مواقع سے فائدہ اٹھایا، اور استغناء کے ساتھ اور یہ محسوس کراتے ہوئے بات کی کہ ان کی کوئی مادی غرض نہیں ہے اور یہ محض خیر خواہی میں ہے، اس کی تھوڑی بہت تفصیل ان کی خودنوشت سوانح میں دیکھی جاسکتی ہے۔

مولانا کا یہ عمل غیر معمولی انداز کا ہوتا تھا، میں نے خود کئی ایسے موقعے دیکھے کہ جہاں رواداری اور تنقید کو جمع کرنا خاصا دشوار تھا لیکن مولاناؒ ان سے حکمت اور جرأت کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے۔

مولاناؒ عرب اور مسلم حاکموں اور بادشاہوں سے ملے، ان میں ہر ایک کو نصیحت کی اور ان کے ملک کی خرابیوں کی طرف متوجہ کیا، خاص طور پر وہ سعودی بادشاہوں سے ملے اور اردن کے بادشاہوں اور مراکو کے بادشاہ اور مختلف حاکموں سے ملے، سب کو اصلاحِ حال اور ملک کی خدمت کی اور اعلاء کلمۃ اللہ کی تلقین کی، ان ملاقاتوں اور باثر لوگوں سے اپنی ملاقاتوں میں اپنے نجی معاملہ میں پورے استغناء سے کام لیا۔ کبھی اپنی ذات یا خاندان کے کسی فرد کے لئے سفارش نہیں کی اور نہ ہدیہ قبول کیا اور اگر کسی طرح ہدیہ یا انعام ملا تو اس کو ملی و دینی مقاصد کے اداروں کو دے دیا، اسی طرح فیصل اوارڈ کے معاملہ میں کیا اور ملّی اداروں کو دے دیا، دبئی سے ملنے والی ایک کروڑ ۱۲ لاکھ روپئے کی رقم سیکڑوں مدارس میں تقسیم کردی، ان کا یہ استغناء اس لئے نہیں تھا کہ ان کو رقم کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، ان کو بعض وقت خاصی تنگی پیش آتی تھی، تب بھی یہی کرتے تھے، کہتے تھے کہ اگر ہم کسی حاکم سے کچھ لیں گے تو ممنون ہوں گے، جرأت کے ساتھ نصیحت یا تنقید نہ کرسکیں گے، چنانچہ ان کو جرأت سے بات کہنے میں ڈر نہیں لگتا تھا، لیکن حکمتِ دعوت کے تقاضہ سے خوش اخلاقی جتنی ضروری تھی کرتے تھے۔

مولانا اپنی سماجی اور ملی کاموں میں طریقۂ نبوت پر عامل ہونے کی کوشش کرتے تھے کہ مخاطب سے اس کی زبان اور فہم کے مطابق بات کی جائے اور مخلصانہ و ہمدردانہ انداز

میں اور اصل مرض کو سامنے رکھتے ہوئے معالجانہ جذبہ سے بات کی جائے۔

قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے پیغام حق پہنچانے کا جو تذکرہ آیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ میں جو تفصیل ملتی ہے انھوں نے اس کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنایا، نیز تاریخ میں اہل ایمان وعزیمت مصلحین امت کے جو تذکرے ملتے ہیں ان سے اخذِ فیض کیا اور طریقہ کار کے اس تنوع کو بھی سمجھا جو مختلف زمانوں اور مختلف ماحولوں اور مختلف حالات میں مصلحین امت نے اختیار کئے، اس میں مولاناؒ کے سامنے امام احمد بن حنبلؒ کا طریقۂ حق پر جمنا اور سخت آزمائش اور اذیت کے باوجود حق پر قائم رہنا، امام غزالیؒ کا علم میں کمال پیدا کرنے کی فکر کرنا اور اس کی اہمیت کی تلقین کرنا، امام ابن تیمیہؒ کا دین کی بنیادی قدروں کی وضاحت کے ساتھ سماجی خرابیوں اور بددینی کا اپنی تصنیفات کے ذریعہ مقابلہ کرنا اور دین کی صحیح فکر کی ترجمانی کرنا، مولانا جلال الدین رومیؒ کا حکیمانہ ومصلحانہ انداز کا ناصحانہ ومربیانہ کلام، حضرت مجدد الف ثانیؒ کا توحید پر زور اور حاکمانِ وقت کی بالواسطہ ناصحانہ انداز میں اصلاحِ حال کی کوشش، خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور شیخ شرف الدین یحیٰ منیریؒ کی روحانی ومصلحانہ زندگی اور حکیمانہ اندازِ تربیت واصلاح، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی سماجی وتہذیبی بگاڑ اور سیاسی بدحالی کے دور میں حکیمانہ طریقہ سے اصلاح حال کی کوشش اور تعلیم وتربیت کے نظام کی درستگی اور رہنمائی کا کام، پھر حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء کی اصلاحِ عقیدہ وعمل کیساتھ ہجرت وجہاد کے عمل کو قائم کرنے کی کوشش شامل ہے۔

حضرت مولاناؒ نے ان سب سے استفادہ کیا اور موجودہ زندگی کے ان گوشوں میں جو مذکورہ بالا ائمہ امت کے یہاں ملتے ہیں، اپنے طریقۂ کار کے لئے رہنمائی حاصل کی، اس سلسلہ میں ان کی مثال شہد کی مکھی کی طرح رہی جو ہر طرح کے پھولوں سے اپنی ضرورت کا رس لیتی اور شہد بناتی ہے، جو دوسروں کے کام آتا ہے، اس کے جسم میں ڈنک

بھی ہوتا ہے جو کہ وہ اس وقت استعمال کرتی ہے جب اس کو تنگ کیا جائے اور رُکاوٹ ڈالی جائے، لیکن اس بات میں مولاناؒ قدرے مختلف تھے، وہ حتی الوسع انتقام نہیں لیتے تھے، اس کے بار بار موقعے آئے کہ مولاناؒ کو جواب دینا چاہئے تھا لیکن مولاناؒ نے صبر اور خاموشی کو ترجیح دی۔

مولاناؒ اپنی فکر کی بلندی، معاملہ فہمی اور حق شناسی سے اور اسی کے ساتھ انحراف وگمراہی کے خطرات کو محسوس کرتے ہوئے اپنی علمی صلاحیت اور داعیانہ طریقۂ کار کو مؤثر زبان وقلم کے ذریعہ بروئے کار لاتے، وہ ان کے ذریعہ اصلاحِ حال اور تلقین وتربیت کا کام لیتے تھے۔

مولاناؒ کے سامنے امت اسلامیہ کی مجموعی وبنیادی مصلحت اور امت اسلامیہ کی وحدت واتفاق کی اہمیت برابر رہتی تھی، خواہ وہ فکر صحیح کی ترویج ہو، انحراف وگمراہی کا مقابلہ ہو، امت کے اتحاد وسربلندی کا معاملہ ہو، یا دشمنان ملت کی گمراہ کن ریشہ دوانی کا مقابلہ ہو یا امت مسلمہ کو اس کے ماضی کے بلند مقام پر واپس لانے کا معاملہ ہو۔ مولاناؒ ان سب کاموں کے لئے کوشاں رہتے تھے اور ان میں اپنی عقلی وعملی توانائیاں صرف کرتے تھے۔

وہ آج اپنے ملک وقوم، اپنی ملت اور اپنے قدردانوں سے جُدا ہو گئے ہیں لیکن اپنے پیچھے اپنے کاموں اور اپنی خصوصیات وصفات کے روشن نقوش چھوڑ گئے ہیں، جن کو قائم رکھنا اور بڑھانا ان کے قدردانوں کی ذمہ داری ہے اور اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں ہماری اجتماعی وانفرادی بھلائی مضمر ہے۔

مولانا سید محمد واضح رشید ندوی

حضرت مولانا کی شخصیت سازی میں

والدہ کے خطوط کا حصہ

دل کی گہرائیوں سے نکلے سچے جذبات واحساسات کا جیسا اظہار خطوط میں ہوتا ہے، وہ دوسری تحریروں میں کم ہوتا ہے، خطوط میں بے تکلفی اور بے ساختگی اور تعبیر کی سچائی کامل طور پر پائی جاتی ہے، اس میں بھی ماں باپ کے خطوط امتیازی حیثیت رکھتے ہیں جو وہ اپنی اولاد کو لکھتے ہیں، جس میں بچہ کے ذہن کی پوری رعایت رکھی جاتی ہے اور بچہ کی ذہنی وفکری ترقی کے ساتھ یہ اسلوب بھی اس کے مطابق بلند ہوتا چلا جاتا ہے، علوم ومعارف، حکایتوں قصوں میں زندگی کے متعلق ہدایات، مسرت اور رنج کا بیان، انعام ومحرومی کا ذکر، حوادث وواقعات کا تذکرہ اور جو کچھ گھر میں بھلا برا، مفید اور غیر مفید پیش آتا ہے، اور زندگی کے جو مسائل ہوتے ہیں ان کا بے تکلف بیان ہوتا ہے، پھر یہ خطوط قاری پر دو قسم کے خاص اثر ڈالتے ہیں، ایک تو یہ کہ قاری کے اندر خوشی کے جذبات موجزن ہوتے ہیں دوسرا اس کے برعکس تاثر غم کا ہوتا ہے۔

چنانچہ علماؤ مشائخ، قائدین وعمائدین کے تذکرے ان ماؤں کے ذکر کے بغیر ادھورے رہتے ہیں جن کا ان کی تربیت اور نشو نما میں اہم کردار رہا ہے، اور ان کی شخصیت

سازی میں اہم عنصر رہا۔ ماں کی مامتا اور شفقت، اس میں اہم کام آتی ہے، جب باپ اپنی تمام تر کوششوں کو بے اثر دیکھ رہا ہوتا ہے، اس وقت ان کی محبت اور تڑپ اپنا کام دکھاتی ہے اس لئے بڑی شخصیات کی شخصیت سازی کا اہم اور بنیادی سبب تلاش کرنے پر وہی عنصر نمایاں نظر آتا ہے جو ماں کے نصائح اور توجیہات سے متعلق ہے، حالانکہ یہ نصائح اور توجیہات استاد، مرشد و مربی کی نصائح وارشادات سے مختلف اور الگ ہیں لیکن دل کی تپش اور آنسوؤں کی تاثیر کو زخمی کر کے قاری کو بے خود بنا دیتی ہے۔ اسی چیز نے خطوط کی اس قسم کو ادبی حلاوت اور فنی جمال کا رنگ دے کر ادب کی اہم قسم بنا دیا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تربیت اور ان کی شخصیت سازی کے بنیادی عناصر وعوامل میں جہاں ان کے ماہرین فن اساتذہ اور بلند پایہ مشفق مربیوں اور مشائخ کرام پر نظر جاتی ہے جن کی زمانہ اور اس کے حالات اور تقاضوں پر نظر تھی اور جو مزاج شناس اور نباض تھے، وہیں ان کی والدۂ ماجدہ کی دعائیں اور تربیت وارشاد کا اہم عنصر ہے، جنھوں نے ابتدائے طفولیت سے لے کر زمانۂ طالب علمی اور جوانی تک پوری نگہداشت رکھی اور فکر کی اور دعاؤں کو اپنا لازمی اور بڑا وظیفہ بنایا، وہ خطوط کے ذریعہ وقتاً فوقتاً جھنجھوڑتی اور زندگی میں انقلاب برپا کر دینے والے جملوں کا استعمال کرتیں، چونکہ وہ شاعرہ بھی تھیں اور قادر الکلام تھیں، مناجات کہتیں اس لئے وہ ان سے ہدایات و رہنمائی کا وہ کام لیتیں جو ایک واعظ اور مصلح اپنے وعظ وبیان سے کم لے پاتا ہے، والدہ ماجدہ کی آہ سحر گاہی اور نالۂ نیم شبی ہی ہے کہ جس نے ان کو ان بلند اوصاف وکردار کا حامل بنایا جس کے حامل کم ہی ہوتے ہیں۔

یہ شب بیدار اور برگزیدہ خاتون مخدومہ سیدہ خیر النساء بہتر صاحبہ بنت مصلح کبیر حضرت شاہ ضیاء النبی حسنیؒ رائے، بریلوی ہیں، دائرہ حضرت شاہ علم اللہؒ میں ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئیں اور ایک خاص علمی، دینی، روحانی ماحول میں پروان چڑھیں، یہ اس خاندان کی

بی بی تھیں جو ایک چھوٹا خاندان ہونے کے باوجود شعراء، ادباء، مصلحین اور علماء ومشائخ کی جماعت ہر زمانہ کو دیتا رہا ہے، اس نامور خاندان کے بزرگوں کی میراث، آپ میں مجموعی طور پر منتقل ہوئی جس نے آپ کی مناجات اور شعر ونثر کی کتابوں میں وہ بلا کی تاثیر اور کشش پیدا کی جس سے آپ کی مناجاتوں اور کتابوں کو بڑی قبولیت حاصل ہوئی، آپ کو قرآن کریم سے والہانہ تعلق تھا، اور اپنے ذوق وشوق سے قرآن مجید پورا یاد کرلیا تھا، تلاوت کا خاص معمول تھا، بہنیں اور سہیلیاں بھی حفظ قرآن کریم کی دولت سے بہرہ ور تھیں۔

دعائیں خوب آپ کو یاد تھیں اور بزرگوں کے واقعات اور حکایتیں ذہن نشین تھیں، جن سے وہ ارشاد وتربیت میں کام لیتی تھیں اور معاشرے پر گہری نظر رکھتیں مشورے دیتیں، اور خود بھی شرکت فرماتیں، چنانچہ سلائی پکائی، صفائی، تمام امور، مہارت اور سلیقہ کے ساتھ انجام دیتیں، اور یہ مصروفیات کبھی بھی ذکر وتلاوت اور دعا ومناجات میں مانع اور حارج نہ بنتیں، ادبی ذوق اور تربیتی مزاج، جو کہ ایک خاندانی خصوصیات اور امتیازات رہا ہے، ان میں منتقل ہوا تھا، جس کو انھوں نے اپنی خوبیوں سے اور جلا بخشا، نظم ونثر دونوں میں اچھی قدرت رکھتی تھیں، قلبی کیفیات اور دینی جذبات کو نظم میں ڈھالتیں اور ان توقعات وآرزوؤں کو بھی نظم کرتیں، جو انھوں نے اپنے فرزند گرامی سے باندھ رکھی تھیں، چونکہ وہ ایک دردمند اور فکرمند خاتون تھیں، اس لئے وہ ایک لڑکی کو مثالی عورت دیکھنا چاہتیں تھیں، جو شوہر کے لئے باعث راحت وسکون بنے اور بیٹے کے لئے محبت نچھاور کرنے والی اور اس کے ساتھ اس کی تربیت سے غفلت نہ برتنے والی ماں بنے اور اپنی حد تک گھریلوں معاشرہ کو صحیح اسلامی معاشرہ میں ڈھال دینے والی خاتون بنے، اس کے لئے کتابیں بھی لکھیں ''حسن معاشرت'' اور ''ذائقہ'' کو نثر میں اور نظم میں ''کلید باب رحمت'' کو بڑی مقبولیت ملی۔

ادب وتربیت دونوں اعتبار سے آپ کے خطوط میں وہ دینی جذبہ اور حکیمانہ

اسلوب ملتا ہے جو اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتا، اس میں زندگی ہے، تحریک ہے، حساسیت ہے اور درد و سوز ہے، دنیا کا وصف بھی اور اس کے کھوٹ کا اظہار بھی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ کی خرابیوں اور فتنوں سے کس باریک بینی سے واقف تھیں اور ایک نوخیز کے جذبات کو سمجھنے میں کس درجہ حساس تھیں، ان کے خطوط میں جو انھوں نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے لکھنؤ میں تعلیم کے دوران لکھے تھے، جہاں نرمی، گرمی، صراحت اور کنایہ نظر آئے گا وہیں کبھی لچکدار اور کبھی طاقتور اسلوب میں واقعات اور مثالوں کے ذکر کے ساتھ مخاطب ہوتی ملیں گی، یہ خطوط ان سخت حالات میں تحریر کئے گئے ہیں جب ان کے عظیم المرتبت شوہر مولانا حکیم سید عبدالحیٔ صاحب حسنیؒ کا حادثۂ ارتحال پیش آیا تھا اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی عمر صرف نو سال کی تھی، ایسے حالات میں ایک ہوشمند اور غیور و باحمیت خاتون کو جو کرنا چاہئے تھا اس سے زیادہ وہ کرتی نظر آتی ہیں، انھوں نے اپنی جو ذمہ داری محسوس کی اس کا کچھ اندازہ ان کے خطوط سے کیا جا سکتا ہے جو محفوظ رہ گئے، ایک خط میں جب انھوں نے مولانا کا انگریزی کی طرف رجحان کو زور پکڑتے دیکھا تو تحریر کیا:

مجھے تو انگریزی سے بالکل انسیت نہیں، بلکہ نفرت ہے، مگر تمہاری خوشی منظور ہے، علی! دنیا کی حالت نہایت خطرناک ہے، اس وقت عربی حاصل کرنے والوں کا عقیدہ ٹھیک نہیں تو انگریزی والوں سے کیا امید؟

دینی علم اور دنیوی علم کے سلسلے میں ان کی غیرت و حمیت کا کچھ اندازہ ان کے خط کے ایک اقتباس سے بڑی حد تک ہو سکتا ہے، وہ ملاحظہ ہو:

''علی! اگر لوگوں کا عقیدہ ہے کہ انگریزی والے مرتبے حاصل کر رہے ہیں کہ کوئی ڈپٹی اور کوئی جج، کم از کم وکیل اور بیرسٹر ہونا تو ضروری ہے، مگر میں بالکل اس کے خلاف ہوں، میں انگریزی والوں کو جاہل اور اس کے علم کو بے سود اور بالکل بے کار سمجھتی ہوں''۔

ساری نصیحتوں کے بعد اس عمل پر انعام کا ذکر کرتے ہوئے خط کو یوں ختم کرتی ہیں:

''بہت جلد خیریت کی اطلاع دو، اور اگر دیر کرو گے تو میں سمجھوں گی کہ میری نصیحت تمہیں ناگوار ہوئی، انشاء اللہ تعالیٰ رمضان شریف میں تم سے وعظ کہلاؤں گی، اللہ تعالیٰ میری خواہش سے زیادہ تمہیں توفیق دے کہنے کی، اور تمہارا کلام پر اثر اور خدا کی خوشی ورضا مندی کے قابل ہو آمین۔

ایک مکتوب میں انہماک، جفاکشی اور قدیم طالبعلمانہ صفات کی تلقین کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''تمام باتوں کا شوق بے کار سمجھو، شوقین مزاج والوں سے دلچسپی نہ رکھو، طالب علموں کو صرف پڑھنا چاہئے، کپڑے پھٹے ہوں یا جوتا، کچھ شرم کی بات نہیں، بلکہ فخر کرنا چاہئے، یہ حالت فلاح و بہبودی کا باعث ہوتی ہے، انھیں تکلیفوں میں علم کی قدر ہوتی ہے، عقلمند اور خوش نصیب وہ ہے جو نایاب چیز حاصل کرے، وہ کیا ہے؟ شریعت کی پابندی۔

اس وقت کا علم عام ہے اور ہر کسی کو میسر ہے، دو چار کتابیں لے لیں بس قابل ہو گئے، ہزاروں خطرے پیش نظر رہتے ہیں، یہ خط اگر دل چاہے غور سے دیکھنا اور اکثر اس پر نظر ڈالتے رہنا''۔

ایک مکتوب میں بزرگوں کے طریقہ کی طرف متوجہ کرتی ہوئی لکھتی ہیں:

''.....اور جہاں تک ممکن ہو، اگلے علماء کی سی لیاقت پیدا کرو، وہی معلومات حاصل کرو کہ کوئی بات شریعت کے خلاف نہ ہو، اور تمام مسئلوں سے بخوبی واقف ہو جاؤ، اس وقت اسی علم کی ضرورت ہے، اس وقت کے علماء کچھ نہیں جانتے، اور فتنے پیدا کرتے ہیں، میری دلی تمنا ہے کہ تم علم میں وہ مرتبہ حاصل کرلو جو بڑے بڑے علماء نے حاصل کیا، جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہیں، کان مشتاق ہیں، دل شوق میں مٹا جاتا ہے، علی! اس سے زیادہ کوئی خواہش نہیں، اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ تمہیں تمام خوبیاں عطا کرے کہ جو اس کی رضا کا باعث ہوں، وہی وقت آجائے، آمین''۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ خود اپنی والدہ صاحبہ کی تربیت اور نگرانی کا حال بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"گھر میں کسی بڑے مرد کے نہ ہونے کی وجہ سے والدہ صاحبہ ہی میری نگرانی، اخلاقی و دینی تربیت کی ذمہ دار تھیں، مجھے قرآن مجید کی بڑی بڑی سورتیں انھوں نے اسی زمانہ میں یاد کرائیں، باوجود اس کے کہ ان کی شفقت خاندان میں ضرب المثل تھی، اور والد صاحب کے انتقال کی وجہ سے وہ میری دلداری اور اور ایک حد تک ناز برداری قدرتاً دوسری ماؤں سے زیادہ کرتی تھیں لیکن دو باتوں میں بہت سخت تھیں، ایک تو نماز کے بارے میں مطلقاً تساہلی نہیں برتتی تھیں، میں عشاء کی نماز پڑھے بغیر سو گیا خواہ کیسی ہی گہری نیند ہو اٹھا کر نماز پڑھواتیں اور نماز پڑھے بغیر ہرگز نہ سونے دیتیں، اسی طرح فجر کی نماز کے وقت جگا دیتیں، اور مسجد بھیجتیں اور پھر قرآن مجید کی تلاوت کے لئے بٹھا دیتیں، دوسری بات جس میں وہ قطعاً رعایت نہ کرتیں اور اس میں ان کی غیر معمولی محبت وشفقت حارج نہ ہوتی یہ تھی کہ اگر میں خادم کے لڑکے یا کام کاج کرنے والے غریب بچوں کے ساتھ کوئی زیادتی یا ناانصافی کرتا یا حقارت اور غرور کے ساتھ پیش آتا تو وہ نہ صرف مجھ سے معافی منگواتیں بلکہ ہاتھ تک جوڑواتیں اس میں مجھے کتنی ہی اپنی ذلت اور خفت محسوس ہوتی مگر وہ اس کے بغیر نہ مانتیں، اس کا مجھے اپنی زندگی میں بہت فائدہ پہنچا اور ظلم وتکبر وغرور سے ڈر معلوم ہونے لگا اور دل آزاری اور دوسروں کی تذلیل کو کبیرہ گناہ سمجھنے لگا، اس کی وجہ سے مجھے اپنی غلطی کا اقرار کر لینا ہمیشہ آسان معلوم ہوا۔

مولانا نذر الحفیظ ندوی ازہری

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی شخصیت

تعلیم ومطالعہ اور تصنیفات کے آئینے میں

جس طرح اشعار اور کتابوں کے انتخاب سے پسند کرنے والے کی سیرت وکردار، ذوق ونفسیات اور عقلی سطح کا اندازہ ہوتا ہے اسی طرح کسی مصنف کی علمی وفکری اور تحقیقی کاوشوں کے علمی ودعوتی فوائد کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ اس کی علمی وادبی ترقی واستعداد میں کن کتابوں اور شخصیتوں نے بنیادی کردار ادا کیا ہے اس لئے کہ زیر مطالعہ کتابوں کی نوعیت، معیار، مطالعہ کی کیفیت، استفادہ کی صلاحیت، نیز ان موضوعات سے ذوق ومناسبت کا عکس تصنیفات پر لازمی طور سے پڑتا ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی سیرت کی تشکیل وتعمیر، کردار کی پختگی، علمی وادبی استعداد کی نشوونما اور بنیادی علوم میں ملکہ ورسوخ میں جہاں خاندانی خصوصیات اور گھریلو ماحول نے فیصلہ کن رول ادا کیا وہیں مشفق مربیوں نے حکیمانہ تربیت اور مناسب وقت پر مناسب کتابوں کے مطالعہ کی رہنمائی نے آگے کی طرف قدم بڑھانے میں مدد دی، اس طرح خوب سے خوب تر اور زیبا سے زیباتر کی طرف مولانا کا سفر آخر تک جاری رہا۔ یہ تربیت ہی کا اثر تھا کہ بجز قرآن مجید کے کسی ایک کتاب سے (خواہ وہ کتنے ہی

شاندار اور پر جلال علمی اصطلاحات میں ہو) ان کی سیری نہیں ہوئی۔ مولانا کی جہد مسلسل کا اندازہ ان کے اس پسندیدہ شعر سے کیا جاسکتا ہے جو وہ اکثر گنگنایا کرتے تھے۔

نشانِ منزلِ جاناں ملے ملے نہ ملے
مزے کی چیز ہے یہ ذوقِ جستجو میرا

یا یہ شعر!

جز ذوق طلب، جز شوق سفر کچھ اور ہمیں منظور نہیں
اے عشق بتا اب کیا ہوگا کہتے ہیں کہ منزل دور نہیں

یہ ذوق جستجو اور جہد مسلسل ان کی زندگی کا رفیق رہا۔ اِدھر والذین جاھدوا فینا پر عمل اُدھر لنھدینھم سبلنا کی بشارت، یہی اندازہ ان کی روحانی ترقی کے بارے میں کیا جاسکتا ہے۔(۱)

مولانا نے جس کتاب کو پڑھا (اور عام طور پر وہ اپنے موضوع پر منتخب ہوا کرتی تھی) اس کو پوری طرح ہضم کرلیا۔ مثالی کتابوں کی تقلید اور نقل میں سیکڑوں صفحات لکھ ڈالے، پھر جب تصنیف وتالیف کی طرف متوجہ ہوئے تو اس ذوق جستجو اور طلب کی بدولت ایک مقالہ یا چند صفحات کا مضمون یا ایک خیال پوری کتاب کی صورت اختیار کرجاتا۔ لیکن بحث وتحقیق کا معیار، زبان کی شیرینی اور شگفتگی، الفاظ کے انتخاب میں ٹمپریچر کی سطح کسی طرح بھی متاثر نہ ہوتی اس میں جہاں نزہۃ الخواطر کے بار بار مطالعہ کو دخل تھا وہیں مایہ ناز استاذ شیخ خلیل عرب اور ہلالی جیسے نادرۂ روزگار اساتذہ کے ہاتھوں ادبی ذوق کے پروان چڑھنے کا بھی حصہ ہے۔ مولانا حیدر حسن خاں جیسے محدث جلیل کے طرز تحقیق سے مولانا نے اپنے تصنیفی کاموں میں فائدہ اٹھایا، فرماتے تھے کہ جس کو داعی اور مصنف بننا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ کچھ عرصہ تک تدریس کا مشغلہ اختیار کرے، اس سے علمی استعداد میں پختگی، مطالعہ میں وسعت اور محنت کی عادت ہوتی ہے

اور کلموا الناس علی قدر عقولھم کا تجربہ ہوتا ہے جو دعوتی کام کے لئے ضروری ہے۔

مولانا نے اپنے جلیل القدر استاذ مولانا حیدر حسن خاں کے طرز تدریس وتحقیق کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک بڑی بنیادی بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ''بعض اوقات مسائل کی تحقیق کے سلسلہ میں قرآن وحدیث کے ایسے الفاظ آجاتے تھے جن کا مفہوم متعین کرنے میں اہل زبان مختلف الخیال ہیں۔ ایسے مواقع پر علمائے معانی وبیان اور آئمہ لغت کی اہم تصانیف کھلتیں، کلام عرب سے استشہاد ہوتا، الفاظ کی حیثیت اور مختلف زمانوں میں ان کے استعمال کی تاریخ پر نظر ڈالی جاتی ہے اور بڑی کدوکاوش کے بعد رائے قائم کی جاتی۔ (۲)

مولانا کی فکر کی تشکیل میں سیرت نبوی، تاریخ وتذکرے، سوانح حیات اور ادبی کتابوں نے بنیادی کردار ادا کیا ہے فتوح الشام کے منظوم ترجمہ صمصام الاسلام اور مسدس حالی نے دینی ثقافت کے پودے کو علمی وجذباتی طور پر بالیدگی عطا کی اور عام معلومات واستعداد میں اضافہ ہوا، منفی طور پر مولانا کے دل میں عیسائیوں کے خلاف ایک ایسا حریفانہ جذبہ اور عناد پیدا ہوا جس پر کسی ملک کے مقامی حالات ومسائل کبھی غالب نہ آسکے۔ قاضی سلیمان منصور پوریؒ کی وجد آفریں کتاب رحمۃ اللعالمین نے اس محبت (محبت رسول) سے آشنا کیا جس کے بغیر یہ زندگی خاک اور سارا عالم خس وخاشاک ہے۔ آگے چل کر مولانا سید سلیمان ندویؒ کی کتاب خطبات مدراس نے مولانا کو سب سے زیادہ متاثر کیا اور حدیث وسیرت کے نئے نئے پہلو سامنے آئے اور اس عہد انقلاب میں اہل علم اور تعلیم یافتہ غیر مسلموں کے سامنے حدیث وسیرت پیش کرنے کی راہ معلوم ہوئی۔ (۳)

عربی کی عبارت صحیح پڑھنے اور صرف ونحو کے ضروری مسائل کے جزو دماغ بن جانے میں مولانا سید طلحہ حسنی کا خاص درجہ تھا۔ ان سے جہاں اور بہت سے علمی فوائد حاصل ہوئے وہیں ذہنی تربیت ہوئی اور تاریخی شعور بیدار ہوا۔ ثقافت میں تنوع اور وسعت

پیدا ہوئی۔(۴)

دوسرا بنیادی فائدہ ان کی صحبت سے یہ ہوا کہ سلف کی عظمت، متقدمین کے مراتب سے واقفیت اور آئمہ اہل سنت ومحدثین کی محبت وعقیدت پیدا ہوئی، تفاسیر واحادیث اور سیر وتراجم کی کتابوں کی اہمیت ان کی علمی وفنی خصوصیات اور فرق مراتب معلوم ہوئے۔(۵)

مولانا نے سب سے پہلے عربی زبان سیکھی اس کے بعد ان ادباء کی کتابوں کو ہضم اور ان کے رنگ میں لکھنے کی کوشش کی جو صاحبِ طرز ادیب اور مستقل مکتب فکر رکھتے تھے۔ابن المقفع، جاحظ، عبدالقاہر جرجانی، بحتری، متنبّی کے علاوہ حماسہ، نہج البلاغہ، (حصہ مکاتیب) کو مثالی سمجھ کر ان سے بھرپور استفادہ کیا۔

ہلالی صاحب کے ذریعہ عربی زبان وادب کے بہت سے مبادی و بدیہیات اور زبان کی تعلیم کے بہت سے حقائق واصول سے براہ راست واقفیت ہوئی۔ان سے سلف جیسی احتیاط، علمی تورّع، اہل لغت جیسا اتقان، علماء نحو جیسی پختگی اور اہل زبان جیسی شیریں نوائی وخوش گفتاری سیکھی، ان کی صحبت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ادب خیالات کے اظہار کا بلند اور فنی اور ترقی یافتہ ذریعہ ہے جو تمدن وتخیّل کی ترقی سے پیدا ہوتا ہے اور اس کی قبل از وقت تعلیم ضیاع وقت ہے۔دوسری حقیقت یہ معلوم ہوئی کہ زبان کو بغیر ترجمہ کی مدد کے پڑھانا چاہئے۔حریری متنبّی اور حماسۂ عربی ادب کی اعلیٰ کتابیں ہیں جنہیں زبان کی تعلیم کے بعد عربی ادب کی تکمیل کرنے والے فضلا کو پڑھنا چاہئے۔(۶)

دینی عناصر کی تخم ریزی بچپن میں ہو چکی تھی، گھر کے دینی ماحول نے ان کو پروان چڑھایا۔آغاز شباب میں اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی، پھوپھا سید طلحہ حسنی اور اپنے استاذ شیخ خلیل عرب کی رہنمائی ونگرانی میں جن کتابوں کا مطالعہ اور ان کے اثرات قبول کئے ان میں سورۂ زمر کے ذریعہ توحید کا درس تھا جس کو شیخ خلیل

عرب نے بڑے ذوق وشوق سے پڑھا یا اور دل ودماغ میں توحید خالص کا نقش، نقش دوام بن گیا، کتاب الجہاد کا باب بھی انھوں نے بڑے جوش وجذبہ سے پڑھا ابوالنصر مروزی کی موثر اور طاقتور کتاب قیام اللیل، ابن القیم کی زاد المعاد، الجواب الکافی، ابن تیمیہ کی تفسیر سورۃ النور جیسی کتابوں نے نوجوانی میں بہترین نگراں واتالیق اور اخلاقی محتسب وناصح کا کام کیا۔

خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات فوائد الفواد، شاہ غلام علی کی درالمعارف، مجدد الف ثانی اور شیخ شرف الدین یحیٰ منیری کے مکتوبات کے مطالعہ سے مولانا کے قلب نے گرمی اور نرمی محسوس کی۔ دردومحبت، سوز وگداز سے بھرے ہوئے واقعات اور دردومحبت میں ڈوبے ہوئے اشعار اور فقرے دل پر نقش ہوئے۔ امام غزالی کی احیاء العلوم کے مطالعہ نے دل پر بجلی کا سا اثر کیا۔ مگر یہ مطالعہ جاری نہ رہ سکا۔ اس میں ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کی بصیرت کو دخل تھا۔ جن کے نزدیک اس کے مطالعہ کے شغف سے بعض غیر معتدل رجحانات کے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس حکیمانہ تربیت کا اثر تھا کہ فلسفہ، تصوف واخلاق کے نکات ومباحث نے جو متاخرین صوفیا کی کتابوں میں بکثرت ملتے ہیں، مولانا کو کبھی متاثر نہیں کیا۔ وہ افراط وتفریط سے الگ اعتدال کی راہ پر ہمیشہ گامزن رہے۔ (۷)

مجدد الف ثانی اور شیخ شرف الدین یحیٰ منیری کے مکتوبات کے مطالعہ سے علم کلام کا ایک نیا عالم سامنے آیا، مکتوبات مجددی کے آخر میں سنت وبدعت کے بارے میں مجددانہ کلمات وتحقیقات سے مولانا کو بڑا شرح صدر اور ان کے ایمان ویقین میں اضافہ ہوا۔ نیز دور اکبری وجہاں گیری میں دین کی نصرت وحمایت کے سلسلہ میں مکتوبات نے دینی حمیت وغیرت کو بیدار کیا۔ اور دین کی حرارت پیدا کی (۸) اسی طرح شاہ ولی اللہ دہلوی کی بے نظیر کتاب حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفا کے بالاستیعاب مطالعہ سے شاہ

صاحب کی باریک بینی کا اثر قائم ہوا۔ علمی واصولی مباحث اور متکلمانہ وفلسفہ آمیز کتابوں کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہوئی، الفوز الکبیر کے مطالعہ نے ذہن کی بہت سی گرہیں کھولدیں ۔شاہ صاحب کی شخصیت اور تحقیقات سے مولانا جتنے متفق اور متاثر ہوئے اس کی بنا پر انہوں نے اپنی فکری اور علمی نسبت شاہ صاحب ہی کی طرف کی ہے، اس لئے کہ انہیں پر پورے تعلیمی وفکری نسب اور شجرہ کو مولانا ختم سمجھتے تھے۔

مولانا نے درسی اور متداول اور بعض غیر متداول ضخیم تفسیریں لفظ بلفظ دیکھیں ،لیکن ان کو اصل فائدہ متن قرآن کے سادہ اور بار بار پڑھنے سے ہوا۔ نیز قرآن مجید سے بہرہ ور ہونے کے لئے مولانا کی نگاہ میں دو چیزیں سب سے زیادہ مفید ثابت ہوتی ہیں۔

ایک علوم نبوت اور مزاج نبوت سے مناسبت رکھنے والے ایسے اشخاص کی صحبت ومعاشرت جن کی زندگی کان خلقہ القرآن کا پرتو ہو۔

دوسری چیز یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جن راستوں پر چلے ان پر چلنے سے قرآن مجید کھلتا ہے (۹) مولانا کے نزدیک ہر وہ چیز جو علوم نبوت کے چشمہ سے نہ آئی ہو، مشتبہ اور الفاظ کا طلسم معلوم ہوتا ہے، تسکین صرف وحی ونبوت کے راستہ سے آئے ہوئے علم سے ہوتی ہے۔ جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا تک پہنچایا اور جو وحی کی زبان میں قرآن مجید اور عربی زبان میں حدیث میں محفوظ ہے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کے ملفوظات کے مجموعہ صراط مستقیم کے مطالعہ کا یہ فیض ہوا کہ علوم نبوت سے وحشت اور اجنبیت جو وضعی وصناعی علوم وتصنیفات سے پیدا ہوتی ہے۔ دور ہوئی اور اس کی تمیز ہوئی کہ علمی اصطلاحات اور زمانہ کی زبان کے بغیر بھی علوم وحقائق ادا کیے جاسکتے ہیں اور کتابوں کے راستہ کے علاوہ اور بھی راستے ہیں جن سے وہ علوم آتے ہیں جو کتابوں کے صفحات میں مقید نہیں کئے جاسکتے ہیں ایسا بھی ممکن ہے کہ مغز ہو چھلکے نہ ہوں، معانی ہوں زیادہ الفاظ نہ ہوں، متن ہو حواشی نہ ہوں۔

نصاب ونظام تعلیم وتربیت کے متعلق اصلاحی وتجدیدی خیالات کا تخم مولانا کے دماغ پر شیخ خلیل عرب اور شیخ ہلالی کی مجالس میں پڑا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ماحول اور لٹریچر نے اس کا نشو ونما کیا۔ ندوۃ العلماء کا تخیل اور دین و دنیا کی بہم آمیزی اور علماء اور اہل دین کی قیادت کی ضرورت واہمیت کا احساس مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے اس خطبۂ صدارت سے وضاحت وقوت کے ساتھ مولانا کو ہوا جو ندوۃ العلماء کے اجلاس ۱۹۲۴ء میں پڑھا گیا۔ پھر مزید مطالعہ سے مولانا کا یقین اور اطمینان بڑھتا گیا۔ یہ دونوں چیزیں ان کے علمی عقائد اور نظریات کا جزو بن گئیں۔ (۱۰)

مغربی تہذیب ونظام سے مولانا کی نفرت اصل میں ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی اور پھوپھا سید طلحہ حسنی کی صحبتوں اور مجلسوں سے پیدا ہوئی۔ اس نفرت کو جو زیادہ تر قلبی تھا مولانا دریابادی کے رسالہ سچ اور صدق کے پرچوں نے مستحکم اور دماغی بنادیا۔ لیکن مغربی تہذیب کی تاریخ کو سمجھنے اور لادینیت ومادیت کے ارتقاء کی اس منزل کی توجیہہ میں ڈریپر کی کتاب معرکۂ مذہب وسائنس اور لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ نے بڑی مدد دی۔ ان دونوں کتابوں سے بڑا مواد ملا، جن سے اپنے مضامین اور استدلال میں مولانا نے بڑا کام لیا۔ اسی طرح مغربی تہذیب کے مزاج اور اس کے حقیقی نقائص، اسلامی تہذیب سے اس کے بنیادی اور اصولی تضاد اور دونوں کے اتحاد کے عدم امکان کے متعلق سب سے زیادہ واضح اور پرمغز چیز محمد اسد کی کتاب اسلام ایٹ دی کراس روڈ کے مطالعہ سے معلوم ہوئی۔ (۱۱)

درس وتدریس کا دور

طالب علمی کے مرحلے کے بعد ہی تدریس وتعلیم سے وابستگی ہوگئی۔ اس دور میں علمی ترقی کے ساتھ روحانی تزکیہ کے مراحل سے گزرے۔ (۱۲) جو مضامین زیر تدریس تھے ان میں تفسیر وحدیث اور ادب وتاریخ کے مضامین تھے۔ مولانا نے اپنے فطری مزاج

اور طبعی خصوصیات کی بنا پر لگے بندھے طریقہ پر تعلیم دینے کے بجائے ایسا طریقہ اختیار کیا جس میں قدم قدم پر سخت محنت و جانفشانی اور پتہ ماری کرنی پڑتی تھی۔ قرآنی مضامین کی تیاری میں گزشتہ اقوام کی تاریخ، عقائد، تہذیب، ان کے اخلاقی امراض، انسانی سوسائٹی پر ان کے اثرات اور قرآن کی روشنی میں قوموں کے عروج و زوال کا گہرا مطالعہ کیا، اس میں گبن کی تاریخ زوال روما اور دوسرے مغربی مورخین کی کتابوں کا براہ راست مطالعہ کیا، سورہ کہف سے شغف اور عشق نے مغربی مادیت اور اس کے پورے نظام فکر کو سمجھنے میں نہ صرف شاہ کلید عطا کیا، بلکہ اس سورہ کی روح اور اسپرٹ نے مغربی کوکھ سے جنم لینے والے فتنوں، لادینی تحریکات اور اس کے علمبرداروں کی فکری سازشوں کو بے نقاب کرنے اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے مولانا کو تیار بھی کیا۔

۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۹ء تک کا یہ دور مولانا کی زندگی میں سخت ترین علمی تیاری اور شدید ترین محنت و یک سوئی کا ہے۔ اس مدت میں مولانا نے طلبہ پر غیر معمولی محنت کی اور ان کے سامنے کلیجہ نکال کر رکھ دیا، لیکن اپنے مخصوص مزاج (خوب سے خوب تر کی تلاش اور ذوق جستجو) کی بنا پر یہ فضا بھی شاہین صفت مولانا علی میاں کو تنگ دکھائی دینے لگی۔ انھیں محسوس ہوا کہ طلبہ پر جتنی محنت کی جاتی ہے اس کے تناسب سے نتائج سامنے نہیں آرہے ہیں۔ اس لیے کہ تعمیر سے زیادہ تخریبی عناصر طلبہ کی آنکھوں اور کانوں کے راستے دل و دماغ میں بہت تیزی سے جگہ بنا لیتے ہیں، دوسرا احساس یہ بھی تھا کہ صالح تحریک و دعوت اور طلبہ کی صحیح خارجی مشغولیت کے بغیر پند و موعظت اور تعلیمی و تربیتی کوششیں نقش پر آب ثابت ہوتی ہیں۔ ان دو احساسات کے علاوہ جو اندرونی عملی تجربوں پر مبنی تھے۔ ہندوستان کی فضا سیاسی تحریکوں (مسلم لیگ خاکسار، اور کانگرس) کی بنا پر پورے برصغیر میں ایک نئے ہمہ گیر انقلاب کے آثار کھلی آنکھوں نظر آنے لگے تھے، جو تہذیب و اخلاقیات، عقائد، مذہبی تصورات و اقدار اور تمدن و معاشرت سب پر اثر انداز

ہونے والا تھا۔ بلکہ ان سب کا نیا سانچہ تیار کرنے والا تھا۔

وسیع مطالعہ اور فکر و عمل کے میدان میں

۱۹۳۷ء سے مولانا کا مطالعہ بھی تفسیر وحدیث اور تاریخ وادب کے دائرے سے باہر نکل آیا تھا۔ انہوں نے اس عرصہ میں ڈاکٹر احمد امین، امیر شکیب ارسلان، عبدالرحمٰن کواکبی کی تصنیفات کے علاوہ عالم عربی کے رسائل خصوصاً الفتح کے ولولہ انگیز مضامین پڑھے جنہوں نے فکر ونظر میں وسعت پیدا کی اور ہندستان سے نکل کر عالم اسلام اور اس کے مسائل وتحریکات سے دلچسپی لینے کا سامان پیدا کیا۔ اسی کے ساتھ مولانا نے ہندوستان کی جنگ آزادی اور سیاسی تحریکات کا مطالعہ شروع کر دیا اس سلسلہ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے رسالہ ترجمان القرآن، مولانا آزاد کے الہلال کے ولولہ انگیز مضامین، علامہ اقبال کی حیات بخش شاعری اور مولانا محمد علی جوہر کی پر جوش تقریروں کو پڑھا۔ تحریک خلافت اور سب سے بڑھ کر مغرب کی اسلام دشمنی اور اسلام کے خلاف مغربی طاقتوں کی صف آرائی نے مسلمانوں میں اپنی ذات وملت کا شعور پیدا کر دیا تھا جس کو اقبال خودی سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ ملی واجتماعی سطح پر ابھر رہی تھی، ان تحریروں اور حالات نے مولانا کے ذہن کی ساکن فضا پر ایک تموج پیدا کر دیا اور ان کی فطرت کی بعض خوابیدہ صلاحیتوں کے بیدار ہونے میں مدد دی۔

ہندوستانی مسلمان اس وقت ''دعوت واقدام'' اور ''قوت وشوکت'' کا پیغام سننے کے لیے بیتاب تھے ان میں ہر ایسی تحریر سے متاثر ہونے کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی جو بلند سطح سے ان کو خطاب کرے، ان کے ملی وجود کو غذا پہنچائے، مغربی تہذیب اور ہندوستان کی قومیت متحدہ میں تحلیل ہو جانے کی دعوت پر ضرب لگائے۔ مسلمانوں کو ان کے قائدانہ مقام سے آگاہ کرے۔ اور ثابت کرے کہ اسلام میں بھی زندگی کے مسائل کا حل اور انسانیت کے تمام مصائب کا علاج ہے۔

ان حالات میں اردو میں سیرت سید احمد شہید شائع ہوئی جس نے برصغیر کے ایک بڑے خلا کو پر کیا تھا۔ کتاب نے بہت سے غیرت مند احساس انسانوں کو بے چین و مضطرب کردیا۔ اس سلسلہ میں مولانا کے پاس جو تاثراتی خطوط آئے۔ انہوں نے ان کو محدود وتدریسی ماحول سے نکال کر وسیع دعوتی میدان میں لا کھڑا کیا۔ اپنے ہم خیال دوستوں کے ساتھ مولانا نے دینی دعوتی مراکز کا دورہ کیا۔ ان شخصیات سے بھی ملے جو دعوتی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ مولانا محمد الیاس کے نفس گرم نے ایمان واحتساب کی ایسی روح پھونک دی جو مولانا کی زندگی میں نئے موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا عبدالقادر رائے پوری کی حقیقت پسندی، فنائیت، روشن ضمیری، سیاسی فہم وفراست، روشن دماغی، دینی و دنیوی جامعیت، کریمانہ اخلاق اور بزرگانہ شفقت نے خاص طور سے متاثر کیا۔ انہوں نے مولانا کی علمی وادبی صلاحیتوں اور اصل جوہر کو پہنچانا۔ ان کی قدر وحوصلہ افزائی کی اور ترغیب دی کہ وہ ان خداداد صلاحیتوں کو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا اسلام کی قیادت پر از سرنو اعتماد بحال کرنے کے لیے استعمال کریں۔ اس وقت کا یہی تجدیدی کام ہے۔ اور یہی روحانی ترقی کا زینہ ہے۔

پہلا دعوتی رسالہ

۱۹۴۳ء میں ہندوستان چھوڑو تحریک کی قیادت کانگرس کررہی تھی، یہاں کے برادران وطن اس سلسلہ میں قربانیاں دے رہے تھے، مسلمان محض تماشائی بنے ہوئے تھے، حالانکہ ہندوستان کی سلطنت انگریزوں نے مسلمانوں سے چھینی تھی، وہی انگریزوں کی آمد سے پہلے اس ملک میں قائدانہ مقام رکھتے تھے۔ انھیں کو برطانوی اقتدار اور غلبہ سے اس وقت سب سے بڑا خطرہ لاحق تھا۔ انھیں مغربی طاقتوں نے خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کیا تھا۔ اور تمام عرب سلطنتوں کو اپنا غلام دوست نگر بنالیا تھا۔ اس لیے ان کے اصل حریف ورقیب مسلمان تھے اور انھیں کو اصل میدان میں آنا تھا، اور قائدانہ کردار

ادا کرنا چاہئے تھا۔ کہ قومیں اور ملتیں دلیری وجاں بازی ،قربانی وخطر پسندی اور قائدانہ کردار ادا کرنے ہی سے عزت وسرفرازی حاصل کرتی ہیں۔

اس صورت حال کو سامنے رکھ مولانا نے دعوتان متافسان (دوحریف اور نبرد آزما دعوتیں) کے نام سے عربی میں ایک مضمون نئے انداز اور اچھوتے اسلوب میں لکھا اس میں مولانا نے ادبی دائرہ سے نکل کر حالات حاضرہ اور مسلمانوں کے تعلق سے لکھا اور جس میں پہلی مرتبہ دعوتی روح اور اسلامی فکر نمایاں ہوا تھا ۔اس مقالہ میں مولانا نے جاہلیت اور اسلام کے فرق کو واضح کرنے کے بعد ثابت کیا کہ اس دور میں یورپ مشرق میں جاہلیت کا علمبردار ہے۔اس کے مقابلہ میں مسلمان اسلام کے حامل وامین اور داعی ونقیب ہیں اس لئے چاہئے تو یہ تھا کہ مغربی طاقتوں اور خاص طور پر برطانیہ کے مقابلہ میں مسلمان بھی میدان میں آئیں کہ مغربی وبرطانوی اقتدار سے سب سے زیادہ انھیں کو نقصان پہونچا ہے اور ایک معین ومثبت دین رکھنے کی وجہ سے آئندہ بھی انھیں کو سب سے بڑا خطرہ لاحق ہے لیکن افسوس ہے کہ صورتحال اس کے برعکس ہے اور وہ اس جنگ آزادی میں خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔

اس رسالہ کے بعد مولانا کے قلم کا رخ عربی میں دعوتی مضامین ورسائل لکھنے اور عربوں کو مخاطب بنانے کی طرف ہوگیا۔

ہم طرزِ جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

مولانا کی تعلیم وتربیت جس انداز میں ہوئی تھی ان کی سیرت سازی اور ذہنی تشکیل جس طرز پر ہوئی تھی اس کو ہم توفیق الٰہی سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں۔ (جیسا کہ خود مولانا بھی اکثر فرماتے تھے) ظاہری طور پر اس میں نصاب کی جدت اور ہر فن کو الگ الگ اس کے ماہرین سے حاصل کرنے اور مناسب وقت پر صحیح علمی ادبی اور دینی رہنمائی، مطالعہ کی کتابوں کے انتخاب اور ان سے استفادہ کی صلاحیت اور دوسروں تک دین

پہنچانے کی حرص اور اپنی دعوت کو پیش کرنے میں حسن ترتیب اور حسن بیان کی رعایت کو دخل ہے۔ چنانچہ مولانا نے جتنے رسائل ومضامین اور کتابیں لکھیں ان سب میں دعوت کی طاقت اور دینی جذبے کا اظہار اور زور قلم، زبان کی حلاوت وسلاست پائی جاتی ہے۔ عربی اور اردو کی تحریروں میں انہوں نے خود اپنی روش نکالی، کسی کی تقلید اور پیروی انہوں نے نہیں کی۔[۱۳] ان کے تمام مضامین اور کتابوں میں خود اعتمادی، جوش دروں اور حرارت ایمانی کے ساتھ استدلال کی قوت، قلم کی متانت اور زبان کی حلاوت بھی ہے۔ داعی کی بلند سطح کا خیال ہمیشہ اور ہر جگہ انہوں نے رکھا ہے۔

تصنیفات کے اسباب ومحرکات

مولانا کی تحریروں، تقریروں اور گفتگو سے جو بنیادی تاثر ہوتا ہے وہ یہ کہ ان سب تصنیفات اور تقریروں کا سرچشمہ کثرت عبادت وانابت ودعا، قرآن مجید میں عمیق تدبر، سیرت نبوی کا عاشقانہ مطالعہ اور مخلصانہ تتبع اور اجتباء اور ہدایت ربانی ہے، نہ کہ محض ذہانت، مطالعہ، وسعت علم اور کسی خاص فلسفہ اور تحریک یا صورت حال کے ردعمل میں یہ کتابیں وجود میں آئی ہیں۔

مولانا کی تصنیفات کے پس منظر اور محرکات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام کتابوں، رسائل اور تقریروں کا محرک اندورنی داعیہ اور جذبہ تھا، یعنی وقت کے دینی تقاضوں کی تکمیل اس میں رضائے الٰہی کے حصول کا جذبہ، اسی لئے وہ سب سے پہلے نیت کا استحضار وتجدید کرتے۔ استخارے کی نمازوں اور دعاؤں کا خاص اہتمام فرماتے۔ پھر جب شرح صدر ہو جاتا تو اپنا سارا وقت اور اپنی تمام تر صلاحیتیں اسی کے لئے وقف کر دیتے، سوتے، جاگتے اٹھتے بیٹھتے اسی موضوع میں سانس لیتے، اسی مضمون کا خیال دل ودماغ اور تمام اعصاب پر چھا جاتا۔ اس کے علاوہ کسی اور موضوع پر سوچنا مشکل ہو جاتا۔

مطالعہ اور تصنیف کی کیفیت

مولانا شروع ہی سے مطالعہ کے حریص تھے، فرماتے تھے کہ خاندانی کتب خانہ کے بار بار الٹنے پلٹنے سے مطالعہ کا ذوق بڑھا، والد صاحب کی کتاب یادایام، گل رعنا اتنی بار پڑھی کہ حفظ ہوگئی، رحمۃ للعالمین جب ہاتھ آئی تو بڑے استغراق اور پورے انہماک کے ساتھ کتاب پڑھی، اور اس میں ایسا ڈوب گیا کہ کسی اور چیز کا ہوش نہیں رہا، والدہ صاحبہ کھانا کھلانے بیٹھتیں تو لالٹین کی روشنی میں کھانا کھاتے ہوئے کتاب بھی پڑھتا جاتا تھا۔ بس، ٹرین اور ہوائی جہاز میں بھی یہ مطالعہ جاری رہتا، بعض کتابوں مثلاً فجر الاسلام کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رائے بریلی کے ڈاک خانے میں رجسٹری کے انتظار میں ختم کی۔ مطالعہ کا یہ انہماک اردو عربی اور انگریزی کتابوں سے فائدہ اٹھانے میں بڑا معاون ہوا، السیرۃ النبویہ کی تالیف کے وقت اپنے ایک خادم کو قاہرہ خط لکھا ہے کہ ہم نے ۱۹۴۷ء میں مکہ معظمہ کے دوران قیام اسرائیل ولفنسون کی کتاب تاریخ الیھود فی بلاد العرب کا مطالعہ کیا تھا، دارالکتب المصریہ سے یہ کتاب نکال کر فلاں صفحہ سے فلاں صفحہ تک نقل کر کے بھیجدو۔ (۱۴)

یہی کیفیت تصنیف کے وقت دل ودماغ پر طاری ہوجایا کرتی تھی جیسا کہ اپنی مایہ ناز کتاب ارکان اربعہ کی تالیف کے اسباب ومحرکات بیان کرنے کے بعد کاروانِ زندگی میں تحریر فرماتے ہیں۔

سیتاپور کے زمانہ قیام ۱۹۶۵ء (۱۵) کے دن ایک طرح موت وحیات کی کشمکش کے دن تھے، تصنیف وتالیف کا مشغلہ تو الگ میں اپنے عزیز رفیقوں سے پوچھتا تھا کہ وہ دن پھر آئیں گے کہ میں معمول کے مطابق دن گزاروں گا، آزادی سے چلوں پھروں گا، اور دوستوں، عزیزوں کی مجلس میں شرکت کروں گا۔ لیکن اس امید وبیم کی حالت میں بھی شدت سے اس کا تقاضہ پیدا ہوا کہ یہاں سے چھٹی پاتے ہی اسلام کے ارکان اربعہ پر

مکمل کتاب تصنیف کرنے کی کوشش کروں۔ یہ خیال قلب وذہن پر ایسا غالب ہوا کہ اس کو ہسپتال کا بیمار وسوگوار ماحول اور آنکھ کی بار بار کی تکلیف بھی ہٹا نہ سکی۔ ۱۶ کتاب کی تالیف کے محرکات کا ذکر کر کے تحریر فرماتے ہیں۔ ۱۹/۲۰/فروری ۱۹۶۶ء کو اسپتال سے واپسی ہوئی تھی۔ کچھ دن ضروری آرام اور ایک دوسفر کے بعد ۸/اپریل ۱۹۶۶ء ۱۶/ذی الحجہ ۱۳۸۵ھ سے اللہ کا نام لے کر اس کا آغاز کر دیا گیا۔ گرمیاں شروع ہو چکی تھیں اور آنکھ کی کیفیت کے لحاظ سے گرمی میں زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ ۱۷ میں نے حضرت شاہ علم اللہ اور سید احمد شہیدؒ کی بابرکت مسجد میں جانب مغرب عقبی حصہ میں بیٹھ کر لکھوانے کا کام شروع کیا۔ عزیزی مولوی نثار الحق ندوی لکھتے تھے۔ میں بولتا تھا، کتاب کو اصلاً عربی میں لکھنا تھا۔

طرز تصنیف وتحقیق

اپنے طرز تصنیف کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> ''پہلے میں نے مواد جمع کیا۔ مثلاً نماز کے لئے پہلے ایک بار پورے قرآن مجید پر نظر ڈالی۔ (۱۸) متعین آیات نوٹ کرائیں۔ حدیث کے لئے جمع الفوائد ومجمع الزوائد کے ان ابواب پر نظر ڈالی جو ان ارکان کے فضائل، ومقاصد وفوائد کے متعلق تھیں۔ اور ان کو نوٹ کیا، پھر خصوصیت کے ساتھ امام غزالی، حافظ ابن قیم، اور شاہ ولی اللہ نے اپنی تالیفات احیاء العلوم، زاد المعاد، اور حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ میں اس پر جو کچھ لکھا ہے اور جو خاص نکتے ان کی تحریروں میں آئے ہیں ان کو قلم بند کیا۔ پھر ان کو سامنے رکھ کر لکھوانا شروع کیا۔ گرمی کی شدت شروع ہونے تک ۱۹ یہ سلسلہ جاری رہتا، ذہن ودماغ پر کتاب کا موضوع اس طرح طاری ہو گیا کہ

دوسرے اوقات میں بھی وہ ساتھ نہیں چھوڑتا تھا۔ یہ عرصہ سے میری زندگی کی ہر اہم تصنیف کا خاصہ بن گیا ہے اس کے خلاف کرنا عام حالات میں اب ممکن نہیں رہا ہے۔ یہ ایک طرح کا تصنیفی اعتکاف ہوتا ہے جس سے نکلنا اس وقت ہوتا ہے جب کتاب کی تاے تمت ہلال عید بن کر نمودار ہوتی ہے۔"

(کاروان زندگی ج دوم ص ۱۸)

بینائی کی اس کمزوری کے باوجود نزہۃ الخواطر جلد ہشتم اور الہند فی العہد الاسلامی کی تکمیل فرمائی۔ جو بڑا پتہ ماری اور بقول مولانا کے ہفت خواں سر کرنے کے برابر تھا۔ صورت یہ تھی کہ نزہۃ الخواطر جلد ہشتم کی تالیف کے درمیان ہی والد ماجد کا انتقال ہوگیا۔ جگہ جگہ خلا تھے۔ بہت سی شخصیتیں زندہ تھیں۔ جو بعد میں مشہور ہوئیں۔ مصنف نے ان کے ابتدائی حالات لکھ کر چھوڑ دیئے تھے۔ اس سے زیادہ دشوار مولانا یہ محسوس کر رہے تھے کہ "والد مرحوم کے قلم سے قلم ملانا سخت دشوار معلوم ہوتا تھا کہ ان کی تحریر میں ایسا ایجاز، سلاست اور حلاوت اور ایک دقیق النظر مصنف وناقد کا احساس ذمہ داری اور موَرخانہ فرض شناسی پائی جاتی ہے کہ میں ان کے طرز پر دو سطریں لکھنا بھی مشکل سمجھتا تھا۔ میں ان تراجم وسوانح کی تکمیل کے سلسلہ میں چند سطریں لکھنے کے مقابلہ میں کسی کے متعلق پورا مضمون لکھ دینا آسان سمجھتا تھا کہ اس میں قلم آزاد ہوتا ہے۔ پھر ان ناقص معلومات کو جمع کرنا اور سنین وفات معلوم کرنا خود ایک ہفت خواں سر کرنا تھا۔ ادھر اپنی حالت یہ تھی کہ براہ راست مطالعہ کرنے سے قاصر تھا۔ (ج۔۲ ص ۲۳)

اس سے زیادہ دشواری والد ماجد کی دوسری کتاب الہند فی العہد الاسلامی کی تکمیل میں پیش آئی۔ اس لئے کہ اس پر کئی بار دیمک نے حملہ کر کے کتاب کو زبردست نقصان پہنچا دیا تھا۔ لیکن یہ ہفت خواں بھی گیس جلا کر راتوں کو اور سفروں کے

درمیان طے کیا گیا۔

اس کتاب الہند فی العہد الاسلامی کے مقدمہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:
مضمون گرفت میں نہیں آرہا تھا اور یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کہانی کو کہاں سے شروع کیا جائے کہ اچانک مضمون ذہن میں آگیا۔ ابھی چند سطریں لکھوائی تھیں، عزیزم مولوی نذر الحفیظ ندوی لکھ رہے تھے کہ زخمی آنکھ میں ٹینشن ہوا۔ ایسا درد ہوا کہ میں دواڈالوا کر لیٹنے پر مجبور ہوا، میں نے لکھنوانا بند کر دیا۔ مگر دماغ نے کام کرنا بند نہیں کیا۔ ذہن میں مقدمہ کا مضمون مچل رہا تھا اور ضد کر رہا تھا کہ اس کو اسی وقت حوالہ قرطاس کیا جائے لیکن لکھوانے کا وقت گذر گیا تھا دوسرے دن کا انتظار کرنا ضروری تھا۔ مجھے وہ تکلیف ابھی تک یاد ہے کہ ذہن کی چکی چل گئی تھی مگر اس سے کام لینے کا موقع نہ تھا۔ اس کی قیمت اعصاب کو ادا کرنی پڑی۔ میں نے کھیتوں میں ٹہل کر دماغ کو سکون پہنچانے کی کوشش کی۔ جوں توں کر کے دن کٹا۔ رات گزری اگلے دن اس مضمون کو مکمل کیا۔ (۲۰)

جب صحت اچھی تھی تو خود ہی لکھتے تھے۔ اس وقت بھی لکھنے میں یہی کیفیت ہوتی تھی، مثلاً قصص النبیین کے بعض حصے، اردو اور عربی کے بعض مضامین ورسالے ٹرینوں پر تھرڈ کلاس ڈبے میں کبھی ٹرین کے دروازے کے پاس کبھی بس اسٹینڈ پر بس کے انتظار میں، ہوائی جہاز پر لکھے اور اس انہماک سے لکھا جیسے مطالعہ وتصنیف میں انہماک ہوتا تھا۔

جوانی کے دور میں جو مطالعہ کیا تھا اس نے بنیاد کا کام دیا۔ نئی تصنیفات وتحقیقات اہم علمی وتحقیقی رسائل برابر دیکھتے رہتے۔ عالم عربی اور یورپ کے سفروں میں نئی کتابوں اور وہاں کے علمی مراکز اور لائبریریوں سے استفادہ فرماتے تھے، انگریزی کے اہم انسائیکلوپیڈیا کا بالاستیعاب مطالعہ کر چکے تھے۔ اپنی کتابوں میں علمی حوالوں کا اہتمام کرتے، صفحات، جلد، اڈیشن اور سن طباعت حتی کہ اگر کسی سے کوئی نکتہ یا خیال لیتے تو اس کا بھی حوالہ دیتے۔ ترمیم واضافہ برابر کرتے رہتے۔ تبصروں اور تنقید کا خیر مقدم کرتے،

علمی مشوروں کو کشادہ قلبی سے قبول کرتے۔ ترمیم کو بنوا کر پھر دیکھتے۔ انڈکس (اشاریہ) مرتب کرنے کا اہتمام تھا۔ الفاظ کے صحیح املا کا غیر معمولی خیال فرماتے، ہمیشہ اول درجہ کے مآخذ اور جدید ترین ایڈیشن کا حوالہ دیتے، تحریر میں وقف، کاما، سوالیہ نشان اور قوسین کا اہتمام کرتے۔

معنوی محاسن

مولانا اپنے کو قرآن کا طالب علم کہتے تھے۔ چنانچہ ان کی تمام تحریریں اس کے اسلوب میں لکھی گئی ہیں۔ یعنی اثبات مفصل اور نفی مجمل، علمی اور اصولی انداز میں۔ (۲۱)

مثلاً اس بات کو غلط ثابت کرنا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں اصلاح وتجدید اور انقلاب حال کی کوشش مسلسل اور غیر منقطع طور نہیں پائی جاتی بلکہ اس میں بڑے طویل طویل خلاء ہیں جو صدیوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ کئی کئی سو برسوں کے بعد کچھ شخصیتیں ابھرتی رہی ہیں۔ جنہوں نے حالات سے کشمکش کی اور جو فکری وعملی لحاظ سے کوئی ممتاز مقام رکھتی ہیں ورنہ عام طور پر متوسط درجہ کے لوگ نظر آتے ہیں، فکری اور عملی حیثیت سے عہد انحطاط کی عام سطح سے بلند نہیں تھے اور جن کے علمی اور عملی کارناموں میں کوئی جدت اور ندرت نہیں پائی جاتی۔ صرف گنی چنی شخصیتیں (جن کی تعداد ۷/۸ سے زیادہ نہیں) اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔

مولانا نے اس خیال کو سرسری نظر سے نہیں دیکھا بلکہ اس کے سنگین نتائج پر نظر کی کہ اگر یہ خیال جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے دل ودماغ میں بیٹھ جاتا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسلام کے اندر ہر دور میں انسانوں کی قیادت کی صلاحیت نہیں اور وہ ایک ایسا درخت ہے جس نے زیادہ پھل نہیں دیئے۔ مولانا نے اس منفی خیال کی تردید کے لئے نہ تو کسی کی ذات کو نشانہ بنایا اور نہ ہی تحقیر وتنقیص کا اسلوب اختیار کیا، بلکہ اس خیال کو غلط ثابت کرنے کے لئے انہوں نے اسلام کی تیرہ سو برس کی تاریخ میں

اصلاح وانقلاب حال کی کوششوں کے تسلسل کو مستند تاریخ کے حوالوں سے ثابت کیا اوران ممتاز شخصیتوں اور تحریکوں کی نشاندہی کی جنہوں نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق دین کے احیا اور تجدید اور اسلام اور مسلمانوں کے کام میں حصہ لیا۔ مولانا نے اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھا ہے۔

ا۔ کسی دعوت یا شخصیت کے حالات ومقاصد معلوم کرنے کے لئے عموماً خود اس کی تصنیفات، تحریروں اور اقوال سے مدد لی، اگر اس میں خلارہ گیا تو اس کے رفقاء وتلامذہ اور معاصرین کی تصنیفات وبیانات کو ترجیح دی، آخر صورت میں مستند مآخذ پر اعتماد کیا۔

۲۔ شخصیتوں کی سیرت اور تذکرہ میں ان کے گردوپیش اس زمانے کی علمی وفکری سطح اور کام کے میدان کی وسعتوں کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے تاکہ ان شخصیتوں کی صحیح عظمت اوران کی کامیابی کی مقدار کا تعین ہوسکے اوراس دور اور ماحول کی کامیابی کے امکانات کا صحیح اندازہ کرکے ان کو تاریخ میں صحیح مقام دیا جاسکے۔ کسی شخصیت کو اس کے ماحول سے نکال کر اپنے ماحول میں لاکر اپنے زمانہ کے پیمانوں اور تقاضوں اور اپنے ذاتی تقاضوں اور خواہشات کے معیار سے جانچنا پھر اس معیار کے لحاظ سے اس کی کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کو نمایاں کرنا ظاہری نگاہ میں ایک بڑا تنقیدی کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ ہر عظیم شخص دوسرے زمانے اور ماحول کے لحاظ سے اور مورخ کے رجحانات اور خیالات کے پیمانے سے سخت ناکام ثابت کی جاسکتی ہے۔، اور نہ صرف اسلامی تاریخ بلکہ انسانی تاریخ کی بھی کوئی شخصیت کامل اور معیاری قرار نہیں دی جاسکتی۔

۳۔ کسی صاحب دعوت یا مصنف اور مفکر کی کتابوں کے زیادہ سے زیادہ مختلف اقتباسات دیئے ہیں تاکہ قارئین مختلف شخصیتوں کے بارے میں محسوس کرسکیں کہ ان کو اطمینان کے ساتھ دید وشنید کا موقع ملا ہے اور کچھ دیر ان کی صحبتوں میں گذرا ہے۔

۴۔ تاریخی شخصیتوں کے صرف علمی کمالات، تحقیقات اور تصنیفات کے

اقتباسات پر اکتفانہ کر کے ان کی زندگی کے باطنی پہلو، تعلق مع اللہ اور اخلاقی خصوصیات کو بھی نمایاں کیا ہے کہ یہ متقدمین اہل دعوت اور اہل فکر کی مشترک خصوصیت ہے کہ وہ اپنے علمی کمالات اور علمی انہماک کے ساتھ عبادت وانابت الی اللہ کا ذوق خاص رکھتے تھے اور ان کی کامیابی ومقبولیت میں اس کو خاص دخل ہے۔

۵۔ کسی شخصیت کے تعارف کے سلسلہ میں صرف اس کے فضائل وکمالات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اگر اس کے منصف محتاط معاصرین یا صاحب نظر متاخرین نے اس پر یا اس کی تصنیفات وافکار پر تنقید کی ہے تو اسکا بھی تذکرہ کر دیا ہے اور اگر اس کا جواب دیا گیا ہے اور اس کی طرف سے دفاع کیا گیا ہے تو اس کو بھی پیش کر دیا ہے۔ لیکن تاریخ کو ناقدانہ تالیف ثابت کرنے کے لئے بے ضرورت تنقید نقل کرنے کا اہتمام نہیں کیا۔

اس طرح مولانا نے اس کثرت سے مثالیں دی ہیں کہ آدمی کہاں تک اس کی تردید کرے گا۔ اس طرح اس کام کی تکمیل سے نہ صرف اصلاح ودعوت کی تاریخ مرتب ہوگئی بلکہ ضمناً مسلمانوں کی فکری وعلمی ارتقاء اور انحطاط اور ارتقاء کی تاریخ بھی وجود میں آگئی۔

عالم اسلام پر مغرب کے تسلط سے انسانی دنیا کا جو عمومی خسارہ ہوا خاص طور سے مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ جس طرح اس شک آفریں تہذیب سے متاثر ہوکر، ذہنی تہذیبی اور اعتقادی ارتداد میں مبتلا ہوا اس کی وسعت وجہاں گیری اتنی بڑھی کہ خود دین اسلام کے بنیادی عقائد پر دبیز پردہ ڈالا جانے لگا۔ اور اسلامی تاریخ سے لے کر قرآن وحدیث، سیرت نبوی، عقائد وعبادات کی تفہیم وتشریح میں بڑی بے باکی وبے تکلفی سے عصر حاضر کے فلسفوں، اقتصادی وسیاسی مکاتب خیال اور ان کی محدود اصطلاحات وتعبیرات کا سہارا لیا جانے لگا۔ اس کی وجہ سے اس کا قوی اندیشہ پیدا ہوگیا

کہ اس مخصوص طرز فکر سے متاثر ہونے والے کہیں خدانخواستہ دین کے ان بنیادی ارکان کی اصل حقیقت واصل طاقت سے ہی محروم نہ ہو جائیں اور ان مقاصد ہی سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں جن کے لئے ان ارکان کی تشریع عمل میں آئی ہے۔ جدید مادی اور عصری تفسیر کے دائرہ اثر میں آکر ایمان اور احتساب کا مفہوم بھی ہمارے ذہنوں اور دلوں سے نکل جائے اور مادی طرز فکر، عبادت اور اخلاق کی روح پر غالب آجائے۔ یہی اندازِ فکر سیرت نبوی کی پیش کرنے میں اختیار کیا جانے لگا۔ بعض لوگوں نے سماجی وسیاسی مصلحین کے طرز پر آنحضرت کی سیرت پیش کرنے کی کوشش کی۔ کسی نے حضور کی تصویر پیش کرنے کے بجائے شعوری یالاشعوری طور پر خود اپنی تصویر کھینچ دی۔ بعض نے سیرت نبوی کو صرف عربوں کی محدود جاہلیت کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی اور یہ دکھایا کہ چودہ سو سال پہلے اسلام نے اچھا کام کیا تھا۔ اس نے لڑکیوں کو زندہ درگور ہونے سے بچالیا۔ بت پرستی ختم کردی۔ لیکن آج جدید سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے، آج کے تقاضے دوسرے ہیں، بعض سیرت نگاروں نے انسائیکلوپیڈیائی انداز میں سیرت لکھی۔ مولانا نے اسلامی عبادات جیسے اہم موضوع پر قلم اٹھایا تو فکر اسلام کی تجدید کا کارنامہ انجام دیا۔ پہلی بار تقابلی مطالعہ، دوسرے مذاہب کے نظام عبادت سے کیا۔ ایسے معروضی انداز میں کہ پڑھنے والا بغیر کسی تلقین اور زور وزبردستی کے کتاب کی مرکزی روح سے ہم آہنگ ہوتا چلا جاتا ہے۔ انہوں نے اچھوتے اسلوب میں سیرت نبوی کو جب پیش کیا تو اس طرح کہ پوری دنیا پر نبوت محمدی کی عظمت اور تاثیر اور تمام انسانوں پر اس کے اثرات واحسانات کی جھلک آجائے۔ سیرت نبوی کے واقعات واقدامات کو کثرت سے پیش کرکے ان سے وہ تعلیمی وتربیتی نتائج نکالے ہیں جن کی روشنی میں انسانی معاشرہ کے بگاڑ کو دور کیا جاسکتا ہے۔ اور بلاتکلف ارکان اربعہ اور نبی رحمت کو غیر مسلموں کو دیا جاسکتا ہے۔ مولانا نے ادب، تاریخ، تذکرے، علم کلام، عبادات، معاملات، سیرت وسوانح پر جتنی تحریر اور تقریریں

کی ہیں ان کے بنیادی مقاصد مندرجہ ذیل ہیں۔

جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا اعتماد اسلام کی قیادت اوراس کی تعلیمات کی ابدی صداقتوں پر از سرنو بحال ہو۔

غیر مسلم اسلام سے مانوس اور مسلمانوں سے قریب ہوں۔

مسلمانوں کے اندر جو معاشرتی فساد اور عقائد واخلاق کی خرابیاں ہیں وہ دور ہوں اور مادہ پرستی اور مغربی تہذیب وتمدن پر فریفتگی کم بلکہ ختم ہوکر اسلامی معاشرہ کی خوبیاں پیدا ہوں۔

قرآن سے ذاتی تعلق پیدا ہو، سیرت نبوی سے شغف ہو، سنت سے محبت وتعلق ہو۔ توحید خالص کا عقیدہ راسخ ہوجائے۔ اسلامی عبادات سے زندہ تعلق ہو، اوران کے اثرات انفرادی واجتماعی زندگی پر نمایاں اسلاف کرام، آئمہ مجتہدین، مجددین اور حقانی وربانی علماء کی داعیانہ کوششوں کی قدر اور شکر کا احساس ہو۔

مسلمان جہاں بھی رہیں شانِ امتیازی سے رہیں، اپنے تشخص کی حفاظت کریں اور غیر اسلامی اثرات سے اپنے کو محفوظ کرلیں۔

حواشی:

(۱) جیسا کہ خود ان کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے جو انہوں نے اپنی مایہ ناز کتاب ارکان اربعہ میں لکھی ہے۔ ''نماز کوئی ایسا ذہنی سانچہ یا چوب خشک کی طرح کوئی جامد اور محدود چیز نہیں جس میں سب یکساں ہوں اور ہر نمازی ایک سطح پر رہنے کے لئے مجبور اوراس سے آگے بڑھنے سے قاصر ہو، وہ دراصل ایک بہت بڑا اور وسیع وعریض میدان ہے جہاں نمازی ایک حال سے دوسرے حال تک اور عروج سے کمال تک اور کمال سے ان منزلوں تک پہنچتا ہے جو اسکے تصور وخیال سے بھی ماوراہیں۔ اس میں لوگوں کا مرتبہ ومقام ایک دوسرے سے بہت مختلف اور جدا ہے۔ اور سب کی سطح الگ ہے۔ غفلت اور جہالت والی نماز استحضار، وتفقہ الی نماز کا مقابلہ کیسے کرسکتی ہے پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ آج کی نماز کل والی نماز سے یا چند ماہ اور چند سال پیشتر والی نماز سے مشابہ ہو اور نمازی ہمیشہ ایک ہی معیار کی نماز پڑھتا رہے۔ (۱۸۸)

(۲) لیکن بہت سے مصنفین (جو لکھے زیادہ پڑھے کم ہوتے ہیں) اپنی تصنیفات کو شاندار الفاظ اور پرجلال علمی اصطلاحات کا پلندہ بنا دیتے ہیں۔ اور ذاتی پسند و ترجیح کو پوری امت بلکہ اجماع کے خلاف مسلط کرنا چاہتے ہیں اس کے لئے دور از کار تاویلات کا سہارا اور بسا اوقات صدیوں کی اسلامی تاریخ پر (جس کا انہوں نے گہرائی سے مطالعہ نہیں کیا) پانی پھیر دیتے ہیں۔

(۳) مثالوں کے لئے ملاحظہ ہو۔ کاروان مدینہ، نبی رحمت، دور الحدیث فی تکوین المناخ الاسلامی، سیرت نبوی دعاؤں کے آئینے میں۔

(۴) عالم عربی کے چوٹی کے ادیب و ناقد، شیخ علی الطنطاوی، ممتاز عالم ڈاکٹر قرضاوی نے مولانا کے محاسن وکمالات میں ان کی تاریخی حس اور شعور کی پختگی اور ثقافت کے تنوع اور وسعت کی خاص طور سے داد دی ہے۔

(۵) مثالوں کے لئے ملاحظہ ہو۔ تاریخ دعوت وعزیمت۔

(۶) مولانا کی تمام تصنیفات میں سلف جیسی احتیاط، علمی تورع۔ اہل لغت جیسا اتقان، علمائے نحو جیسی پختگی اور اہل زبان جیسی شیرینی موجودہ ہے۔

(۷) فرماتے تھے کہ اعتدال کی راہ پر چلنا سب سے مشکل کام ہے اس لئے کہ اس میں جلد شہرت اور مقبولیت حاصل نہیں ہوتی۔ نفس کو بھی تسکین نہیں ہوتی۔ گرم اور تیز گفتگو، خون کا بحر احمر جاری کرنے اور سروں کا قطب مینار قائم کرنے جیسی تعبیرات کی لوگ خوب داد دیتے ہیں۔ لیکن کثرت استعمال سے ان کی گرمی بہت جلد ختم ہو جاتی ہے۔ اور انکے منفی اثرات ناقابل تلافی ہوتے ہیں۔

(۸) حضرت مجدد الف ثانی کی عبقریت اور ان کے اسلوب دعوت کے مولانا بڑے قائل تھے۔
فرماتے تھے کہ آج کل کے عہد میں یہی اسلوب دعوت مناسب اور نتائج کے اعتبار سے مضمون ہے چنانچہ مسلم وغیر مسلم سربراہان حکومت اور امراء وزراء کو خطوط لکھے اور ان سے ملاقاتوں میں جو باتیں کیں ان سب میں اسی مجددی کردار اور اسلوب کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔

(۹) اس کے لئے ملاحظہ ہو، مطالعہ قرآن کے اصول ومبادی، قرآنی افادات، ارکان اربعہ، معرکہ ایمان ومادیت، دعوت وتبلیغ کے معجزانہ اسلوب، کے فکر انگیز مباحث ومضامین وغیرہ۔

(۱۰) نحو التربیۃ الاسلامیہ الحرۃ میں مولانا نے تمام مسلم حکومتوں کو دعوت دی ہے کہ وہ عقائد کے تزلزل، ذہنی انتشار، اخلاقی انارکی، نہ ختم ہونے والی ذہنی کش مکش، حکومتوں اور عوام کے درمیان مسلسل نبرد آزمائی سے اگر نکلنا چاہتی ہیں تو انھیں مغربی ملکوں سے درآمد کئے ہوئے نظام تعلیم وتربیت کے بجائے آزاد اسلامی نظام تعلیم وتربیت کو اختیار کرنا ہوگا۔

(۱۱) ان کے علاوہ گبن کی کتاب زوال روما ہوفڈنگ کی تاریخ فلسفہ جدید اور سی ایم جوڈ کی کتاب پڑھی۔

(۱۲) مولانا احمد علی لاہوری سے بیعت کی اور ان　　کی نگرانی

میں روحانی مدارج طے کئے۔ مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ نے چاروں سلسلوں میں اجازت دی۔ مولانا کا ذہنی سانچہ چونکہ پہلے سے بنا ہوا تھا اس لئے ان کو کسی ذہنی ہجرت کی ضرورت نہیں پیش آئی۔

(۱۳) اخوان کی تحریک کے متعلق لٹریچر ۱۹۴۷ء کے بعد آئے۔

(۱۴) جو کتاب ۱۹۴۷ء میں پڑھی تھی اس کی تمام تفصیلات ان کو یاد تھیں، اور ۱۹۷۸ء میں اس سے فائدہ اٹھایا۔ انگریزی زبان کی تحصیل میں زبردست انہماک پر والدہ ماجدہ نے متنبہ بھی فرمایا۔ لیکن اس کا بنیادی فائدہ یہ ہوا کہ انگریزی کتابوں کے بنیاد پر مآخذ پر نظر پڑ گئی۔ مجموعی طور پر انگریزی کے جن مآخذ کا مولانا نے اپنی کتابوں میں حوالہ دیا ہے ان کی تعداد دو سو کے قریب ہے۔

(۱۵) آنکھ کے علاج کے سلسلہ میں کئی ماہ ہسپتال میں قیام رہا تھا۔

(۱۶) دائیں آنکھ میں آپریشن کی خرابی سے تکلیف رہا کرتی تھی۔ اکثر ایسا ٹینشن ہو جایا کرتا تھا کہ ساری رات جاگ کر گزارتے، اس حال میں بھی تیمارداروں سے تراویح میں قرآن شریف سنا کرتے۔ دن میں اردو عربی کتابیں سنا کرتے، چند ماہ کے قیام میں آٹھ ہزار سے زائد صفحات کو پڑھوا کر سنا۔

(۱۷) ۲۲ر جون ۱۹۶۶ء میں دینی تعلیمی کونسل کے زیر اہتمام میرٹھ میں ایک جلسہ تھا، بسوں کے ذریعہ کئی جگہ سخت لو اور گرمی میں سفر ہوا۔ کئی کئی گھنٹے بس کے انتظار میں شدید گرمی میں وقت گزارنا پڑا۔ ۲۲ر جون کی شب میں ایک جلسہ عام سے خطاب کر کے آرام کیا۔ صبح اٹھے تو معلوم ہوا کہ آنکھ کی روشنی جاتی رہی۔ انا للہ (کاروان زندگی حصہ اول، ص ۵۱۴)

(۱۸) اکیس پارہ تک ترتیب سے یاد کر کے کئی بار تراویح سنا چکے تھے۔ ۲۶ تا ۳۰ بھی یاد تھے جب تک صحت نے ساتھ دیا حفظ کیے ہوئے پارے روزانہ کسی کو سناتے تھے۔

(۱۹) اس زمانے میں تکیہ پر بجلی نہیں آئی تھی۔

(۲۰) یہ واقعہ تکیہ پر پیش آیا۔ ان دنوں کھیتوں میں گندم کی فصل لگی ہوئی تھی۔ یہ مقدمہ ۲۳ر صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

(۲۱) امام ابن تیمیہ کے حوالے سے یہ بات فرماتے تھے۔ چند سال قبل ایک صاحب نے زر کثیر صرف کر کے اپنے ایک شاگرد سے عربی میں ایک ضخیم کتاب حضرت مولانا کے خلاف لکھوائی۔ پھر بڑے اہتمام سے ایک قاصد کے ذریعہ وہ کتاب بھیجی۔ جب وہ کتاب مولانا کو دی گئی تو کتاب دیکھ کر فرمایا کہ اگر آپ ہمارے خلاف دس مزید جلدیں اس طرح کی لکھ دیں گے جب بھی آپ کو اس کا جواب نہیں ملے گا۔ پھر امام ابن تیمیہ کا حوالہ دیا کہ اصل چیز مثبت اور تعمیری کام ہے۔ حضرت مولانا کا اپنے بارے میں ہمیشہ یہی معاملہ رہا اپنے خلاف کسی تنقید کا تذکرہ تک نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی ناقد کا نام لیتا تو اس کو بھی روک دیتے اگر کوئی جواب دینے کا ارادہ کرتا تو اس کو بھی منع فرما دیتے۔

ایسی قوم کا زندہ رہنا محض معجزہ ہے

''جو شخص اپنے دین کی بقاء کے لئے موہوم خطرہ بھی برداشت نہیں کرسکتا اس کو زندہ رہنے کا کیا حق ہے۔ جس جماعت میں باقی رہنے کا احساس نہیں اس کو حکومت کی سرپرستی بھی محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ اگر حکومت ہمارے دین کو باقی رکھنا بھی چاہے اور وہ ساری توقعات پوری کردے جو کسی اسلامی حکومت سے قائم کی جاسکتی ہیں تو بھی ایسی بے عمل قوم کے لئے زندہ رہنا مشکل ہے۔ کچھ نہ کرنے کا علاج آج تک دریافت نہیں ہوا اور اس وقت ہندوستان کا مسلمان اسی مرض میں مبتلا ہے۔ اس میں مالی ایثار کی صلاحیت نہیں وہ خطرہ مول لینے کو تیار نہیں محض مستقبل کے موہوم خطرہ کے پیش نظر اُردو کا فارم تک بھرنے کے لئے آمادہ نہیں پھر ایسی قوم کا زندہ رہنا محض معجزہ ہے۔''

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی

حضرت مولانا علی میاںؒ
کی
ادبی خدمات اور تصانیف

اس حقیقت کے اظہار میں کسی قسم کے تردد اور مبالغہ کی گنجائش نہیں ہے کہ حضرت مولانا علی میاںؒ بیسویں صدی میں عربی کے سب سے زیادہ نامور کامیاب غیر عرب ادیب تھے، ان کے یہاں جو قوت، جوش، حرارت، تاثیر و وجدان، معانی والفاظ کا سیل رواں اور ڈھلی ڈھلائی عبارت پیش کرنے کا سلیقہ ملتا ہے وہ ان کی کاوش، جہد وعزم، وسعت مطالعہ ورسوخ فی العلم اور ماہر فن اساتذہ کی رہنمائی کا رہین منت ہے۔

تعلیم وتدریس

مولانا کی عربی تعلیم کا آغاز ۱۹۲۴ء کے اواخر میں شیخ محمد بن خلیل عرب استاذ ادب لکھنؤ یونیورسٹی کے درس سے ہوا، یہ تعلیم ان کے اس خانگی مدرسہ میں ہوئی جو یونیورسٹی جانے سے قبل اور آنے کے بعد جاری رہتا تھا، مولانا کے ساتھ عرب صاحب کے برادر خورد حسین بن محمد بھی شریک تھے، یہی دو نفری جماعت تھی جس پر عرب صاحب کی

ساری توجہ مرکوز رہا کرتی تھی، ابتدائی شُد بُد کے بعد عربی زبان کی پہلی کتاب "المطالعة العربية" شروع ہوئی، عرب صاحب کا خود ساختہ نصاب تھا جس میں مصری نصاب کی جدید کتابیں "الطريقة المتكرة، مدارج القراءة، كليلة ودمنة، مجموعة من النظم والنثر للحفظ والتسميع" وغیرہ شامل تھیں، عرب صاحب کا انداز درس بڑا شگفتہ ہوا کرتا تھا، عملی مشق اتنی زیادہ کرائی جاتی تھی کہ اجنبی زبان کی ساری وحشت وثقالت دور معلوم ہوتی تھی، ابن المقفع کی "کلیلہ ودمنہ" عرب صاحب کے نزدیک بہت معیاری اور معرکۃ الآراء کتاب تھی، اس کے پڑھانے کا عجیب طرز تھا، مولانا کو دن بھر محنت کر کے پورا سبق تیار کرنا پھر آموختہ کی طرح سنانا پڑتا تھا، صحیح عبارت، نحوی وصرفی وجوہ سے واقفیت، سوالوں کا جواب اور عبارت کا پورا مفہوم سمجھنا ضروری ہوتا، انشاء کی مشق بھی ہوتی تھی، عربی میں بولنا بھی لازم کر دیا گیا تھا، اردو بولنے پر جرمانہ عائد ہوتا تھا، نحو کے ابتدائی مسائل کے لئے ابوالحسن الضریر کی جامع ومختصر کتاب "الضریری" بھی عرب صاحب نے پڑھائی، یہ انداز تعلیم مولانا کی استعداد اور قوت مطالعہ کی اصل کلید تھا جس کی مدد سے ہر قفل کھلتا چلا جاتا تھا، "کلیلة ودمنة" کے بعد "مجموعة من النظم والنثر" شروع ہوئی، عرب صاحب نے نظم کا حصہ پہلے پڑھایا اور اسے زبانی یاد کرایا، مولانا لکھتے ہیں کہ:

> "وہ زبانی یاد کیا ہوا حصہ اگرچہ فراموش ہو گیا لیکن حافظہ اور ذوق میں وہ اس طرح تحلیل ہو گیا تھا کہ اس کے اجزاء واثرات جزء بدن ہو گئے اور تحریر وانشاء میں اس کا رنگ نمایاں ہوا، عرب صاحب کے طریقہ تعلیم کی یہ بھی خوبی تھی کہ وہ اچھے الفاظ، تعبیرات ومحاورات کا اس طرح چٹخارہ لیتے، ان کی لذت وحلاوت کا اس طرح اظہار کرتے کہ وہ ہم لوگوں کے دل ودماغ پر مرتسم ہو جاتے، اور ہم سمجھتے کہ ان الفاظ کا لطف لینا اور ان کی قدر ضروری ہے۔

دوسری خوبی یہ تھی کہ وہ ہم لوگوں کے ذہن پر یہ اثر قائم کرتے کہ یہ الفاظ وتعبیرات کسی کی ذاتی ملکیت نہیں اور نہ یہ سر بمہر خزانہ ہیں، یہ ہر اس شخص کی ملکیت ہے جو اس کو صحیح طریقہ پر استعمال کر سکے، بعض اوقات انھوں نے ہماری انشاء کی کاپیوں میں کسی محاورہ، ضرب المثل یا جملہ کے صحیح استعمال پر اپنی مسرت کا اظہار کیا جیسے ہم لوگوں نے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہو، اور بعض اوقات انھوں نے اس پر انعام بھی عطا کیا۔"(۱)

ادب کے متوسطات کی تعلیم کے بعد عرب صاحب نے اپنے دینی ذوق کے پیش نظر قرآن کا وہ حصہ پڑھانا شروع کیا جس کا مرکزی مضمون توحید ہے، سورۃ الزمر اور اس کے بعد کی چند سورتوں کا درس دیا، صحیح مسلم کی کتاب المغازی بھی شروع کرائی، قرآن وحدیث کے ان دو اسباق کے علاوہ باقی ہر وقت عربی ادب ہی کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، عربی میں نثر پر زیادہ توجہ تھی، نظم نسبتاً کم پڑھائی جاتی تھی، نظم میں قصیدۂ بانت سعاد، دیوان حماسہ، عشر قصائد، شنفریٰ کا قصیدۂ لامیۃ العرب، معری کا دیوان سقط الزند شامل ہے، قدیم معیاری کتابوں میں عرب صاحب کو "نہج البلاغۃ" بھی بہت پسند تھی، لیکن انھوں نے صرف اس کے خطوط کا حصہ پڑھایا جو ادب عالی کا بہت کامیاب نمونہ ہے، مقامات حریری عرب صاحب کو پسند نہ تھی، لیکن درسی ونصابی ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے بیس مقامات پڑھائے، عبدالقاہر جرجانی کی کتاب "دلائل الاعجاز" ان کی پسندیدہ کتاب تھی جسے پڑھاتے وقت انھیں بڑا لطف اور وجد آیا کرتا تھا اور اس کا حق ادا کیا کرتے تھے، بحتری کے اشعار بھی بہت پسند تھے وہ بھی پڑھائے، تعلیم کے آخری مرحلہ میں مشہور صاحب طرز مصری ادیب مصطفیٰ لطفی منفلوطی کی کتاب "النظرات" کا بھی عرب صاحب نے مطالعہ کرایا، مولانا کو اس کا

اسلوب بے حد پسند آیا، بلکہ دل و دماغ پر چھا گیا اور بہت سے مضامین میں اس کی تقلید بھی کی، عرب صاحب کا یہ امتیاز تھا کہ وہ پڑھاتے وقت گویا فنافی الکتاب و الدرس رہا کرتے تھے اور جمعہ کے علاوہ کسی اور دن کی رخصت کے روادار ہرگز نہ تھے، عرب صاحب کے اصول تعلیم کا یہ ضابطہ تھا کہ ایک وقت میں ایک ہی زبان وفن پر پوری توجہ مرکوز کر کے تعلیم حاصل کرنی چاہیے، یہ ضابطہ تجربات کی روشنی میں دوسرے سارے طریقوں کے مقابلہ میں کامیاب اور مفید ترین ثابت ہوا، حضرت مولانا نے عرب صاحب کے یہاں دو ڈھائی سال صرف عربی زبان و ادب کی تعلیم ہی میں گذارے، مولانا لکھتے ہیں:

> یہی ہمارا اوڑھنا بچھونا تھا یہی ہمارا منتہائے نظر اور سرمایہ زندگی، اسی میں کمال پیدا کرنا ہمارے نزدیک سب سے زیادہ کامیابی اور عزت کی بات تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے تمام قوائے فکریہ، تمام حواس ظاہری و باطنی اس فن کے حصول اور اس کی ترقی میں مصروف اور مرکوز تھے، ہم ان کے یہاں عربی بولتے تھے، عربی میں سوچتے اور لکھتے تھے اور یہی ہماری دنیا تھی۔'' (۲)

عرب صاحب کے طرزِ تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے۔

> ''اپنے ذوق ونظر کو اپنے طلبہ تک منتقل کر دینے اور ان کے رگ وریشہ میں اتار دینے کی عجیب وغریب قابلیت، زیر درس کتاب میں جان ڈال دینے، فن کا صحیح ذوق پیدا کر دینے اور مصنف کا ہم زبان اور ہم مذاق بنا دینے کی ان میں وہ بے نظیر قدرت تھی جو ہزاروں میں سے کہیں کسی ایک استاد اور ماہر فن میں ہوتی ہے، یہ قابلیت کسبی نہیں بلکہ وہبی ہے، عربی زبان وادب کا وہ ذوق سلیم

وذوق صحیح ، پھر اس ذوق کو منتقل کرنے کی وہ قابلیت جو عرب صاحب میں دیکھی وہ نہ صرف ہندوستان بلکہ ممالک عربیہ کے اعلیٰ علمی وعربی حلقوں میں بھی شاذ ونادر ہی شاید پائی جائے۔'' (۳)

مزید لکھتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ اس مدرسہ (خلیل عرب صاحب کے خانگی مدرسہ) سے ہندوستان میں عربی تعلیم اور عربی انشاء وتحریر کے اس نئے دور کا آغاز ہوا جس کو علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی کی آمد اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ وفضلاء نے نقطۂ عروج تک پہنچادیا۔'' (۴)

صرف ونحو کی بعض قدیم کتابیں میزان ومنشعب، صرف میر ونحو میر، پنج گنج وغیرہ مولانا نے اپنے چچا مولانا سید عزیز الرحمٰن حسنیؒ سے پڑھیں اس کے علاوہ صرف ونحو کی مزید تعلیم اپنے پھوپھا مولانا سید محمد طلحہ حسنیؒ سے بھی حاصل کی جو صرف ونحو کے امام تھے، اور عملی مشق کرانے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ:

''صحیح عبارت پڑھنے اور صرف ونحو کے ضروری مسائل کے جزوِ دماغ بن جانے میں ان کا بڑا دخل ہے، وہ ادبی نحوی صرفی غلطی ،عبارت کا غلط پڑھنا معاف نہیں کرتے تھے، اور کئی کئی دن تک اس پر طنز فرماتے اور چٹکیاں لیتے رہتے، جس کی وجہ سے بڑا چوکنا اور ہوشیار رہنا پڑتا تھا، عربی زبان وصرف ونحو کے علاوہ ان سے اور بہت سے علمی فوائد حاصل ہوئے۔'' (۵)

۱۹۲۷ء میں مولانا نے لکھنؤ یونیورسٹی کے فاضل ادب میں داخلہ لیا، داخلہ کے امتحان میں کامیاب ہوئے، یہاں بھی پورے شعبہ میں عرب صاحب ہی چھائے ہوئے تھے، ۱۹۲۹ء میں مولانا نے فاضل ادب کا کورس مکمل کیا اور امتیازی نمبرات کے ساتھ سند

حاصل کی، اس دوران مولانا نے اردو کے ادبِ عالی کی مشہور اور ہم کتابوں کا بھی مطالعہ جاری رکھا جس سے مولانا کو عصری زبان وتعبیر میں اپنی دعوتی و تصنیفی سرگرمیاں انجام دینے میں بڑی مدد ملی۔

۱۹۳۰ء میں علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی نے (جو عربی زبان وادب کے محقق عالم اور ذوق آفریں تھے) ندوۃ العلماء میں تدریسی ذمہ داریاں قبول کیں۔ مولانا نے ان سے باضابطہ دیوانِ نابغہ پڑھا، شرح شذور الذہب کے دروس میں شریک ہوئے۔ اور تفسیر قرآن میں استفادہ بھی کیا، اسی دوران مولانا نے حضرت سید احمد شہید کے سلسلہ میں ایک اردو مضمون کا ترجمہ عربی میں کیا۔ ہلالی صاحب نے تھوڑی سی تصحیح کے بعد اپنے تعارفی مکتوب کے ہمراہ علامہ سید رشید رضا مصری کے معروف مجلّہ ''المنار'' میں اشاعت کے لئے ارسال کر دیا، علامہ رشید رضا نے وہ مضمون شائع کیا اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اگر صاحب مقالہ چاہیں تو میں اسے الگ رسالہ کی صورت میں بھی طبع کرا سکتا ہوں، تھوڑے ہی عرصہ میں یہ مقالہ ''ترجمة الامام السيد احمد بن عرفان الشهيد'' کے نام سے طبع ہو کر آ گیا، مولانا کی یہ پہلی تصنیف تھی جو ۱۶ رسال کی عمر میں منظر عام پر آئی۔

مولانا کے برادرِ بزرگ اور مربی جناب ڈاکٹر سید عبد العلی صاحبؒ عربی اخبارات ورسائل کے مطالعہ کے بے حد شوقین تھے۔ اسی لئے بہت سے عربی رسائل وجرائد اور اخبارات ان کے پاس آتے تھے، مولانا نے ان کی مدد سے اخبارات پڑھنے شروع کئے، رفتہ رفتہ سمجھنے لگے اور اس سے تعبیر واظہارِ خیال میں وہ قدرت نصیب ہوئی جو کسی اور کتاب سے نہیں ہو سکی، ان مجلّات میں دمشق کا اخبار ''فتى العرب'' اور فلسطین کا ''الجامعة الاسلامية'' سرفہرست تھے۔ اس کے بعد مولانا نے متعدد عربی مضامین لکھنے شروع کئے، ۱۹۳۲ء میں ندوۃ العلماء سے عربی رسالہ ''الضیاء'' شائع ہونا شروع ہوا تو اس نے مولانا کے عربی ذوق اور تحریری مشق پر مہمیز کا کام کیا، اور اس سے

قلم میں روانی وجولانی پیدا ہوئی، اس دوران متعدد عربی رسائل اور تصنیفات کے مطالعہ کا شغف بھی رہا۔

پھر ۱۹۳۴ء میں جب مولانا ندوۃ العلماء کے استاذ منتخب ہوئے تو عربی ادب کی بعض کتابیں آپ سے متعلق رہیں جن میں دیوان حماسہ، القرأۃ الرشیدہ، حکایات الاطفال وغیرہ ہیں، اس وقت ندوہ کی پوری فضا پر عربی زبان وادب، انشاء وخطابت چھائی ہوئی تھی مشہور ادیب مولانا مسعود عالم ندوی کی رفاقت میں مولانا کی ادبی وعلمی سرگرمیاں تیز تر ہوتی گئیں، عربی زبان کی تعلیم میں عرب صاحب کی طرح گھول کر پلا دینے اور ہر طرح سے مشق کرانے کا اہتمام مولانا نے خوب خوب کیا، عرب ادباء میں مولانا کو امیر شکیب ارسلان اپنی تحریروں کی اسلامیت اور پختگی کی وجہ سے پسند آئے، لیکن اس سے بھی زیادہ مولانا علی میاںؒ سید عبدالرحمٰن کواکبی کی تخیلی کتاب ''ام القریٰ'' سے متأثر ہوئے جس میں امت اسلامیہ کے حقیقی امراض کی تشخیص اور علاج کی تجویز بڑی بالغ نظری اور باریک بینی سے کی گئی ہے۔

اس کے بعد مولانا کی ادبی تحریری وتقریری سرگرمیاں تا آخر باقی رہیں، جن کی کچھ تفصیلات آرہی ہیں۔

عربی ادب کے نصاب کی ترتیب اور دیگر ادبی سرگرمیاں

ندوۃ العلماء کی تحریک کا ایک اہم مقصد ایسا نصاب تیار کرنا تھا جس کے ذریعہ عربی زبان کو ایک زندہ اور جیتی جاگتی زبان کی طرح پڑھا جاسکے اور براہِ راست عربوں میں دعوت وتبلیغ کا کام کیا جاسکے، اس کی مکمل کوشش پورے طور پر منظم انداز میں سب سے پہلے ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ کے دور نظامت میں شروع ہوئی، ڈاکٹر صاحب نے سب سے پہلے مصری وزارت تعلیم کی چند عربی ریڈروں کو داخل نصاب کرنا چاہا چنانچہ مجلس انتظامی کی تائید سے ''القرآۃ الرشیدۃ'' اور کامل کیلانی کی

''حکایات الاطفال'' وغیرہ داخل درس کی گئیں، لیکن ایک بڑی خامی ان میں یہ تھی کہ یہ اگرچہ مبتدی طلبہ کی نفسیات اور زبان کی تعلیم کے جدید اصول کے مطابق مرتب کی گئی تھیں مگر ان میں کوئی دینی اور اخلاقی تعلیم بالکل نہ تھی اور ہر صفحہ پر تصویریں بھی تھیں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے دل میں نئے نصاب کی ترتیب کا داعیہ بڑی تیزی سے پیدا ہوا، اس کام کا آغاز ''مختارات من ادب العرب'' کی ترتیب سے ہوا جو جو قرن اول سے لے کر عصر حاضر تک کے عربی نثر وادب کے اعلیٰ نمونوں پر مشتمل ہونے کے ساتھ سجع وقافیہ اور تصنع اور تکلف سے آزاد اور صالح مقاصد اور صحت مند خیالات کی آئینہ دار بھی ثابت ہوئی، یہ کتاب ۱۹۴۰ء میں مکمل ہوئی اور ۱۹۴۲ء میں پہلی بار زیور طبع سے آراستہ ہوئی، یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے، یہ کتاب بے حد مقبول ہوئی اور دمشق یونیورسٹی کے کلیة الشریعة میں ادب عربی کے نصاب میں داخل کی گئی، مشہور ادیب علی طنطاوی نے اس کتاب کے بارے میں اپنے تأثرات یوں ظاہر کئے:

> ''اگر کسی ادیب کے ذوق کی دلیل اس کا انتخاب ہے تو قارئین کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ہم نے کچھ عرصہ ہوا ادبی منتخبات اور نمونوں کے مجموعوں کو جمع کیا تا کہ ان میں سے کسی کو ثانویات شرعیہ کے طلبہ کے سامنے رکھیں، ہماری کمیٹی کے ممبران نے'' (جو سب ادباء میں سے تھے) علیحدہ علیحدہ تلاش وجستجو شروع کی، اور اس موضوع کی کتابوں کا جائزہ لیا آخر میں ہم سب متفقہ طور اس نتیجہ پر پہنچے کہ درسی منتخبات کے مجموعوں میں سب سے بہتر ابوالحسن علی ندوی کا مرتب کردہ مجموعہ مختارات ہے جو زبان کی اصناف اور ادب کے متنوع نمونوں کا سب سے جامع مجموعہ ہے۔'' (۶)

مختارات زیادہ تر جدید حلقوں اور یونیورسٹیوں کے ایم اے عربی کے کورس میں داخل ہوئی جن میں علی گڈھ، الہ آباد، حیدر آباد، مدراس، دہلی اور لکھنؤ کی یونیورسٹیاں نمایاں ہیں، سعودی عرب کی وزارت تعلیم نے بھی اس کو اپنے یہاں کے نصاب میں داخل کیا، پاکستان و بنگلا دیش، عرب ممالک اور بعض مغربی ممالک میں بھی یہ داخل درس ہوئی، لیکن اس کتاب پر سب سے زیادہ جفاکس ستمگر نے کی یہ مولاناؒ کی زبان میں پڑھئے:

البتہ اس کو ہمارے قدیم مدارس میں بڑی مشکل سے بار ملا، اور ملا بھی تو جلد اس کو چھٹی دے دی گئی، کہ ان حلقوں کا ردعمل "انظر الیٰ ما قال و لاتنظر الیٰ من قال کے بجائے انظر الیٰ من قال و لاتنظر الیٰ ما قال" پر ہے۔"(۷)

مولانا نے اس سلسلہ کی دوسری کتاب "القراۃ الراشدۃ" مرتب کی جو تین حصوں میں منظر عام پر آئی اور بے حد مقبول ہوئی، یہ اصلاً مصری ریڈر "القراۃ الرشیدۃ" کا متبادل ہے۔ مولانا نے تحریر فرمایا ہے کہ:

"کتاب میں اس کا التزام ہے کہ حتی الامکان کوئی سبق دینی موعظت سے خالی نہ ہو اور آخر میں اس کا کوئی اخلاقی و دینی نتیجہ نکلتا ہو یا کسی دینی تعلیم یا آداب کی طرف رہبری ہوتی ہو، لیکن اس طرح کہ طالب علم کو محسوس نہ ہو کہ کوئی چیز اوپر سے یا باہر سے لائی جارہی ہے، یا اس کو کوئی خارجی انجکشن دیا جارہا ہے۔"(۸)

اس سلسلہ کا تیسرا اور سب سے اہم سلسلہ "قصص النبیین" کا ہے جو کامل کیلانی کی حکایات الاطفال کا نعم البدل ہے، حکایات الاطفال میں تصویروں کے ساتھ لغو قصوں کا طومار ہے

جو اخلاقی لحاظ سے کسی بھی طرح مفید نہیں ہے۔اس کام کی طرف مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ نے متوجہ کیا تھا،اس کتاب میں مولانا نے چند امور کا التزام کیا ہے۔ایک تو یہ کہ الفاظ کا ذخیرہ (Vocabulary) کم سے کم ہو لیکن اعادہ وتکرار سے اسے ذہن میں نقش کر دیا جائے، دوسرے یہ کہ کتاب قرآن کی زبان میں لکھی جائے اور آیاتِ قرآنی جگہ جگہ نگینہ کی طرح جڑ دی جائیں، تیسرے یہ کہ اسلام کے بنیادی عقائد (توحید، رسالت، اور معاد) کی تلقین وتعلیم ضمناً ہو جائے، چوتھے یہ کہ قصوں کو پھیلا کر لکھا جائے اور ان میں ایسی رہنمائی کا سامان ہو کہ بچوں کے دلوں میں کفر وشرک کی نفرت، ایمان وتوحید کی محبت اور انبیاء علیہم السلام کی عظمت راسخ ہو جائے اور یہ سب غیر شعوری طریقہ پر ہو۔(۹)

یہ سلسلہ بے حد مقبول ہوا،اس کے دوسرے ایڈیشن پر مشہور ادیب ومجاہد سید قطب شہید کا مقدمہ شائع ہوا جو بے حد مؤثر ہے انھوں نے لکھا ہے کہ:

میں نے کثرت سے وہ کتابیں پڑھی ہیں جو بچوں کے لئے لکھی گئیں اور جن میں انبیاء کرام کی حکایات وقصص بھی شامل ہیں خود ایک سلسلہ کتب کی ترتیب میں میں نے شرکت کی جو "القصص الدینی للأطفال" کے نام سے مصر میں مرتب ہوا اور جس کے لئے مواد قرآن مجید سے اخذ کیا گیا تھا لیکن میں تکلف اور خوشامد کے بغیر اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ "قصص النبیّن للاطفال" کے مصنف کا کام (جس کا ایک نمونہ حضرت موسیٰ کے قصہ میں نظر آتا ہے) ہمارے وضع کئے ہوئے سلسلہ سے زیادہ

کامیاب اور مکمل ہے اس لئے کہ اس میں ایسی لطیف رہنمائیاں، قصے کے مقاصد پر روشنی ڈالنے والی تشریحات اور بین السطور میں ایسے اشارات آگئے ہیں جو بیش قیمت ایمانی حقائق کی نقاب کشائی کرتے ہیں" (۱۰)

مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ نے اس سلسلہ کو بچوں کا علم کلام قرار دیا، مولانا مسعود عالم ندوی نے بھی لکھا ہے کہ:

"اس کتاب میں زبان اور دین کو اس طرح ایک دوسرے سے پیوست کر دیا جیسے گوشت اور ناخن۔" (۱۱)

یہ کتاب عالم عربی کے متعدد جامعات میں داخل ہوئی، برصغیر کے مدارس وجامعات نے دل کھول کر اس کا استقبال کیا اور داخل درس کیا۔ لیکن وہی طبقہ یہاں بھی مولانا کی تکلیف کا سبب بنا، مولانا کی زبان میں:

"اگر مصنف کو اپنی کسی کتاب کے داخل نصاب نہ ہونے پر استعجاب اور دوستانہ شکوہ ہوسکتا ہے تو اس کتاب پر کہ وہ زبان آموزی اور دینی تلقین کا بیک وقت کام کرتی ہے لیکن جماعتی اور مدرسی عصبیت بڑے بڑے حقائق پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ تجربہ سے معلوم ہوا کہ اس بارے میں جدید تعلیمی ادارے اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ زیادہ فراخ دل اور وسیع النظر واقع ہوا ہے۔" (۱۲)

مولانا دریا آبادی نے اس سلسلہ کو (جو تیسرے حصہ پر حضرت موسیٰ کے قصہ تک آکر رک گیا تھا) مکمل کرنے پر اصرار کیا مگر یہ سلسلہ بہت دنوں تک موقوف رہا اور تقریباً تیس سال بعد ۱۹۷۵ء میں ماہِ رمضان میں اس کی تکمیل کا داعیہ مولانا میں پیدا ہوا اور چوتھے اور پانچویں حصہ کی تکمیل ہوئی، پانچواں حصہ سیرت رسول اللہ سے متعلق ہے

اور ضخیم ہے، یہی آگے چل کر مولانا کی مشہور کتاب ''السیرۃ النبویۃ'' (نبی رحمت) کا محرک ثابت ہوا۔

قصص النبیین کا یہ سلسلہ ''ادب الأطفال'' کے خلا کو پر کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوا اور کوئی بدل ابھی تک اس کا سامنے نہیں آسکا ہے، نصاب تعلیم کے تعلق سے دیگر فضلاء ندوہ نے بھی کام کیا ہے اور کتابیں تیار کی ہیں، جن میں ''تاریخ الأدب العربی، الأدب العربی بین عرض و نقد، معلم الانشاء، منثورات، مختار الشعر العربی، تمرین الصرف والنحو، علم التصریف'' وغیرہ نمایاں ہیں۔

قصص النبیین کے سلسلہ کے علاوہ مولانا کی ایک کتاب ''قصص من التاریخ الاسلامی'' بھی ادب الأطفال کے سلسلہ کی چیز ہے، ادب الأطفال (Childrens's Literature) کے علاوہ ادب نبوی کو واضح کر کے پیش کرنے میں مولانا کا اہم رول رہا ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی ان احادیث کو مولانا نے منتخب کر کے اپنی کتابوں میں جمع کر دیا ہے جن میں صدق واخلاص، جمال وبلاغت، شیرینی وچاشنی، ساتھ ہی پیغمبرانہ بلاغت واعجاز کے عناصر پوری طرح ملتے ہیں، مولانا نے انتخاب میں صحت سند کا بڑا اہتمام کیا ہے، یہ احادیث ادب عربی کا سب سے کامیاب نمونہ ہیں۔

ادب اطفال اور ادب نبویؐ کے علاوہ تیسری قسم مناجات اور دعاؤں کے ادب کی ہے، احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں جن دعاؤں کا ذکر ہے ان کی تاثیر، جمال اور بلاغت وجاذبیت بے نظیر ہے، یہ دعائیں خود رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی قطعی دلیلیں اور مستقل معجزے ہیں جو کسی انسان کے بس میں نہیں، ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کا نور، آپ کی بندگی وسادگی، عجز وانکساری اور خشوع وخضوع سب کچھ واضح ہو جاتا ہے، اور ان سے دعا ومناجات کے طریقے اور اسالیب اخذ کئے

جاسکتے ہیں۔اس کے مختلف نمونے مولانا نے ذکر کئے ہیں، یہاں ہم ان میں سے ایک نقل کرتے ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی ہے۔

''اللهم انك تسمع كلامي ، وترى مكاني ، وتعلم سري و علانيتي،لايخفى عليك شيئ من أمري،وأناالبائس الفقير، المستغيث المستجير، الوجل المشفق ، المقر المعترف بذنبه، أسألك مسئلة المسكين وأبتهل اليك ابتهال المذنب الذليل و أدعوك دعاء الخائف الضرير ، دعاء من خضعت لك رقبته وفاضت لك عبرته ، وذل لك جسمه ،ورغم لك أنفه ،اللهم لا تجعلني بدعائك شقيا، وكن لي رؤوفا رحيما ، يا خير المسئولين و ياخير المعطين''

الٰہی !تو میری بات سنتا ہے اور میری جگہ کو دیکھتا ہے، میرے پوشیدہ وظاہر کو جانتا ہے، تجھ سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی، میں مُصیبت زدہ ہوں، محتاج ہوں، فریادی ہوں، پناہ جو ہوں، پریشان ہوں، ہراساں ہوں، اپنے گناہوں کا اقرار کرنے والا ہو ں، اعتراف کرنے والا ہوں، تیرے آگے سوال کرتا ہوں، جیسے بیکس سوال کرتے ہیں ، تیرے آگے گڑگڑاتا ہوں جیسے خوفزدہ آفت رسیدہ طلب کرتا ہے جیسے وہ شخص طلب کرتا ہے جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہو اور اس کے آنسو بہہ رہے ہوں اور تن بدن سے وہ تیرے آگے فروتنی کئے ہوئے ہو، اور اپنی ناک تیرے سامنے رگڑ رہا ہو، اے اللہ تو مجھے اپنے سے دعا مانگنے میں مجھے

ناکام نہ رکھ اور میرے حق میں بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہو جا
اے سب مانگے جانے والوں سے بہتر! اے سب دینے والوں
سے اچھے۔"

مولانا لکھتے ہیں:

"کیا خدا کی عظمت و کبریائی اور اپنی ناتوانی و بے نوائی اور فقر
واحتیاج، عجز و مسکنت کے اظہار و اقرار کے لئے اور رحمت خداوندی
کو جنبش میں لانے کے لئے ان سے زیادہ پر تاثیر، پر خلوص اور دل
نشیں الفاظ انسانی کلام میں مل سکتے ہیں؟ اور اپنے دل کی کیفیت
اور عجز و مسکنت کا نقشہ الفاظ میں اس سے بہتر کھینچا جا سکتا ہے؟ یہ
الفاظ تو دریائے رحمت میں تلاطم پیدا کرنے کے لئے کافی ہیں، آج
بھی ان الفاظ کو ادا کرتے ہوئے دل امنڈ آتا ہے، آنکھیں اشکبار
ہو جاتی ہیں اور رحمت خداوندی صاف متوجہ معلوم ہوتی ہے۔"(۱۳)

اس انداز میں مولانا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا و مناجات کا ذکر کیا ہے اور اس کے ادبی مقام کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، واقعہ ہے کہ ادب میں صداقت وخلوص کا عنصر حقیقی روح پیدا کرتا ہے اور بقائے دوام بخشتا ہے، اور یہ عنصر جس طرح دعا و مناجات میں ملتا ہے کسی اور صنف ادب میں نہیں ملتا۔

چوتھی قسم سفرناموں کے ادب کی ہے۔ مولانا نے اس موضوع پر جو تحریر فرمایا ہے وہ ان کے ذاتی تجربات کا نچوڑ ہے۔ مولانا نے مشرق و مغرب کے متعدد اسفار کئے ہیں۔ جن کی تفصیلات ان کی خودنوشت سوانح حیات "کاروان زندگی" (فی مسیرۃ الحیاۃ) اور ان کے سفرناموں مذکرات سائح فی الشرق العربی (شرق اوسط کی ڈائری) من نھر کابل الی نھر الیرموک (دو ہفتے مغرب اقصی مراکش میں)

اور أسبوعان فی ترکیا (دو ہفتے ترکی میں) وغیرہ میں ملتی ہیں۔

ادب کی اس صنف میں مولانا نے زائر وسیاح کو معاشرہ اور سماج کا باریک بینی سے مطالعہ کرنے، واقعات ومشاہدات کا اپنی قلبی واردات وافکار اور احساسات وجذبات نیز خیالات کی روشنی میں مخلصانہ اور ہوشمندانہ تجزیہ کرنے کی دعوت دی ہے۔ مولانا کی تصنیف "مذکرات سائح فی الشرق العربی" میں یہ بیحد نمایاں ہے جس سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ ادیب اپنے تبصرہ وتجزیہ کے ذریعہ سفرنامہ کو مؤثر ترین بنا سکتا ہے۔ اور اس میں جان ڈال سکتا ہے۔ ایک سفرنامہ کی ادبی حیثیت اسی وقت مسلم ہوسکتی ہے کہ جب اس میں سیاح کے دل کی دھڑکنیں اور ضمیر کی سرگوشیاں محسوس ہوں اور مشاہدات وواقعات کے ذکر کے ساتھ نفسیاتی اثرات، ردعمل، افکار وخیالات بھی بے کم وکاست، کسی احتیاط وتکلف کی رعایت کے بغیر مذکور ہوں، یہی وہ عنصر ہے جو سفرنامہ کو ادب بناتا ہے اور اسی کی رعایت ودعوت حضرت مولانا علی میاںؒ کے ہاں ملتی ہے۔ (۱۴)

پانچویں قسم سیر وسوانح کا ادب ہے، سیر وسوانح ایک مستقل فن ہے جس کی کچھ شرطیں مولانا نے بیان کی ہیں ہم اس کا مختصراً ذکر کرتے ہیں۔

۱- سیرت وسوانح کا کام شروع کرتے وقت اس کام کے لئے کوئی اہم محرک وداعی (مثلاً قلبی رغبت، ضمیر کی آواز، جذبہ دفاع، اعتراف حق، محبوبیت فضل وکمال سے متأثر ہونا وغیرہ) ضرور موجود ہونا چاہئے۔ یہ محرکات نہ ہوں تو تحریر بے وزن اور بے قیمت ہوجاتی ہے۔

۲- صاحب سوانح کی صحبت میں رہ کر یا واقعات واخبار کے علم اور غیر جانبدارانہ مطالعہ کے ذریعہ اس سے گہری اور ناقدانہ واقفیت بھی اہم شرط ہے۔ سوانح نگار اور صاحب سوانح کے درمیان کوئی نہ کوئی تعلق بہرحال ضروری ہے۔ جس کی بنیاد پر سوانح نگار صاحب

سوانح کی خصوصیات سے واقف ہو اور اس کے حالات واقعات کا امانتداری کے ساتھ جائزہ لے۔

۳- الفاظ و معلومات کا ایسا خزانہ بھی ہونا لازمی ہے جس کی مدد سے سوانح نگار اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح بیان کرنے پر قادر ہو سکے۔

۴- احساسِ ذمہ داری و امانت داری و دیانت اور صاحب سوانح کی شخصیت کی قدر و قیمت، قد و قامت اور مرتبہ و منزلت کے اظہار کی پوری قدرت بھی ضروری ہے۔

۵- سوانح نگار یہ حقیقت بھی ذہن نشین رکھے کہ الفاظ کا ایک درجۂ حرارت (Temperture) ہوتا ہے اس کی پوری رعایت کی جائے اور ''أنزلوا الناس منازلهم'' کے اصول پر پورا عمل ہو، افراط و تفریط اور غلو و مبالغہ سے ذرا بھی کام نہ لیا جائے۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شخصیات پر کچھ لکھنا آسان کام نہیں، جوئے شیر لانے اور پتہ مارنے کے مرادف ہے۔ مولانا کو چونکہ خود اس کا تجربہ تھا اور وہ اس راستہ سے بڑی احتیاط اور خوش اسلوبی سے گذرے تھے۔ سوانح نگاری ان کی تصنیفات میں بہت نمایاں ہے، تاریخ نگاری اور تاریخ سے شغف ان کی زندگی کا روشن باب ہے، اس لئے مولانا کے یہ تجربات اور اصول بڑے کارآمد اور بنیادی ہیں۔

چھٹی قسم مقدموں کے ادب کی ہے۔ کسی معاصر یا بلند پایہ عالم یا رفیق کی تصنیف پر مقدمہ لکھنا صرف ایک تقلیدی عمل نہیں ہے جسے رواداری اور مروّت کے تقاضے نبھانے یا مؤلف و ناشر کی دلجوئی کرنے اور خواہش پوری کرنے کے لئے انجام دیا جائے۔ بلکہ یہ تو ایک گواہی ہے کہ جس کے آداب، احکام اور ذمہ داریاں ہیں، یہ شہادت اگر ٹھیک نہ دی جائے کتاب کا علمی جائزہ نہ لیا جائے تو اس سے کتاب کی علمی

قدر و قیمت گھٹ جاتی ہے۔ مقدمہ محض تعریف اور مدح سرائی کا نام نہیں ہے، بلکہ اس میں کتاب کے موضوعات و مقاصد، مؤلف کے مقام و حالات اس کی علمی و عقلی نشو و نما، تالیف کے محرکات و اسباب کا ذکر اور مؤلف کی کامیابی و ناکامی کا تفصیلی جائزہ سب کچھ ہونا چاہئے، اس لئے مقدمہ نگار کو کتاب کے موضوع اور مؤلف سے تعلق ہونا چاہئے تاکہ اسے مؤلف کے عقلی، فکری و جذباتی نشو و نما، موضوع کے ساتھ اس کے تعلق و انصاف اور محنت و کامیابی کا اندازہ ہو سکے، اس سے واقف ہوئے بغیر مقدمہ نگاری با مقصد اور منصفانہ نہیں ہو سکتی۔ حضرت مولانا نے جو قیمتی مقدمات تحریر فرمائے ہیں ان میں یہی اصول اپنایا ہے اور اسی کی دعوت بھی دی ہے۔

اس کے علاوہ دیگر اصنافِ ادب (جن میں شعر و نظم کا خصوصاً استثناء ہے) میں بھی مولانا کی تحریریں موجود ہیں۔

مولانا کا عربی اسلوب پرکھنا ہم جیسوں کے بس کی بات نہیں، عربی کے چوٹی کے ادباء نے مولانا کے اسلوب کی رفعت و پاکیزگی، بلاغت و روانی اور حلاوت و جمال کی داد دی ہے۔ علامہ عبدالعزیز میمن نے مولانا کے بارے میں یہ فرمایا کہ عربی زبان پر لکھنے کی جو قدرت مولانا علی میاںؒ کو حاصل ہے وہ ہندوستان میں کسی کو میسر نہیں۔

اردو ادب میں بھی مولانا کا حصہ کسی سے کم نہیں ہے جس کا اندازہ برصغیر کے مشہور ادباء کے اعتراف سے کیا جا سکتا ہے، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے کئی بار یہ اعتراف کیا کہ مولانا اردو بڑی اچھی لکھتے ہیں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ:

> "ذاکر صاحب کا کسی کی انگریزی یا اردو کے بارے میں یہ رائے رکھنا میرے نزدیک مصنف کے لئے بڑی معتبر سند ہے۔" (۱۵)

رابطۂ ادب اسلامی کا قیام اور سرگرمیاں

حضرت مولانا علی میاںؒ نے ادب کو پیشہ اور فن کے طور پر اپنانے، محدود و مخصوص

کرنے، عبارت آرائی وتزئین کے ذریعہ ایک دوسرے سے بازی لے جانے، اپنی مہارت وکمال کا سکہ بٹھا کر اپنے مادی مقاصد کی تکمیل کی ہمیشہ مخالفت کی، مولانا ایسے ادب کو صرف صنعت وفن کاری اور تقلید سمجھتے ہیں جو زور وشور، روح، جدت وندرت، اور دلآویزی کے جو ہر سے خالی ہوتا ہے۔ یہ روایتی ادب ہے جو اس وقت رائج ہے۔

اس کے مقابلہ میں ایک اور ادب ہے جو فطری، رواں، سلیس دلآویز اور قلب وروح کو تسخیر کر لینے والا ہے، اس ادب سے کتب خانے بھرے پڑے ہیں۔ لیکن مصنوعی ادب اس لئے چھا گیا ہے کہ یہ رواں اور سلیس ادب ان افراد کا شاہکار ہے جو ادباء کی وردی میں نہیں ہیں، اور جنھوں نے ادب کو ذریعہ مُعاش اور پیشہ نہیں بنایا۔ اور اس کی تاریخ بھی قدیم ہے کیونکہ مکاتیب وخطوط اور قصوں کہانیوں کے تقلیدی ادب کی تدوین سے بہت پہلے ہی حدیث وسیرت کی کتابوں میں یہ فطری اور سحر انگیز ادب مدوّن ہو چکا تھا۔ لیکن ادب کے مؤرخین اور تحقیق وریسرچ کا کام کرنے والوں نے اپنی ساری توجہ تقلیدی اور روایتی ادب پر مرکوز کر دی، وہ اسی زنداں کے اسیر اور اسی لکیر کے فقیر رہے، جو استاد اول نے کھینچ دی تھی، اسی طرح اُس ادب پر پردہ پڑا رہا جس سے عربی زبان کی صلاحیت وبرتری اور اس کی گہرائی ظاہر ہوتی ہے اور اہل زبان کا کمالِ فن ''ملکہ'' اور زبان پر ان کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے اور درحقیقت وہی ادب کی اولین اور حقیقی تربیت گاہ ہے۔ اوپر ادبِ نبوی کا ذکر آیا ہے کہ وہ مولانا کی توجہ کا مرکز شروع سے رہا ہے اور اس موضوع پر مولانا کے مقالات بھی ہیں۔ ۱۹۵۷ء میں دمشق کی معروف علمی اکیڈمی ''المجمع العلمی'' نے مولانا کو رکن منتخب کیا تو مولانا سے مضمون کا مطالبہ کیا تو ''عربی زبان کا کتب خانہ از سرنو کھنگالنے کا محتاج ہے'' کے عنوان سے عربی ادب اور اس کی تاریخ کے دوبارہ جائزہ اور ان ہیرے جواہرات کو سامنے لانے کی ضرورت پر مضمون لکھا جو خزف ریزوں کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ مولانا ادب برائے ادب ''الفن للفن'' (Anb ism)

کے داعی وقائل کبھی نہیں رہے، انھوں نے ادب برائے زندگی اور زندگی برائے بندگی کا ہمیشہ برملا اعلان کیا۔ مولانا نے ادب کو دعوت اسلامی کا سب سے اہم وسیلہ سمجھا اور عقیدہ وجوش، جذبہ واخلاص اور صدق کی بنیادوں پر ادب اسلامی کے فروغ ورواج کی آواز سب سے پہلے ۱۹۵۷ء میں لگائی یہ وہ آواز تھی جو رفتہ رفتہ تحریک بنی اور پھر عالمی رابطہ ادب اسلامی کی شکل میں سامنے آئی۔

رابطہ ادب اسلامی کا قیام مشہور ادیب ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت پاشا کی تحریک ودعوت پر منظم شکل میں سامنے آیا۔ پاشا صاحب نے اپنی معروف کتاب ''نحو مذهب اسلامی فی الأدب و النقد'' میں لکھا ہے کہ:

> ''ادب میں ایک اسلامی مدرسہ بنانے اور قائم کرنے کی صدا سب سے پہلے ہم نہیں لگا رہے ہیں، ہم مسلمانوں کے بلند پایہ ادباء واہل کمال کی پیروی کر رہے ہیں، اس موضوع پر سب سے پہلے جس نے لکھا اور توجہ دلائی وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ذات گرامی ہے۔ یہ کام مولانا نے دمشق کی ''المجمع العلمی'' کی رکنیت کے بعد کیا، آپ نے ایک مقالہ پیش کیا جس میں ایک اسلامی ادب قائم کرنے اور اس پر توجہ دینے کی دعوت دی۔ اس طرح مولانا اس کام کے سب سے پہلے داعی اور محرک ہیں۔ مولانا کے بعد سید قطب شہید، محمد قطب، نجیب کیلانی، عمادالدین خلیل وغیرہ نے بھی اس کام کو آگے بڑھایا۔'' (۱۶)

مئی ۱۹۸۴ء میں مکۃ المکرّمہ میں مولانا سے سعودی عرب کے ممتاز ادباء کا ایک وفد ملا جس میں ڈاکٹر عبدالباسط بدر، استاذ حیدر غدیر، ڈاکٹر عبدالقدوس ابوصالح اساتذۂ جامعۃ الامام محمد بن سعود ریاض وجامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ شامل تھے۔ ان حضرات نے

مولانا سے رابطۂ ادب اسلامی کے اغراض ومقاصد کا ذکر کیا، اس کے آئین کا مسودہ پیش کیا، اور مولانا سے اس کی سربراہی قبول کرنے اور اسے بین الاقوامی تنظیم کی حیثیت سے قائم کرنے کی اجازت چاہی، یہ بھی طے ہوا کہ عرب دانشوروں کی ایک مجلس بنادی جائے، اور عالم عربی کے تمام علاقوں سے ادباء واہل قلم کو شریک کیا جائے، یہ بھی طے ہوا کہ اس کا ہیڈ آفس ندوۃ العلماء لکھنؤ ہوگا، نائب صدر ڈاکٹر عبد القدوس ابوصالح اور جنرل سکریٹری مولانا سید محمد رابع حسنی مدظلہ ہوں گے۔ اس سے پہلے اپریل ۱۹۸۱ء میں ایک بین الاقوامی سیمینار ''مذاکرۂ ادبیات اسلامی'' کے عنوان سے ندوۃ العلماء میں ہو چکا تھا جس میں اہم موضوع ''عربی ادب میں خصوصاً اور دوسری زبانوں کی ادبیات میں اسلامی عناصر کی تلاش'' تھا۔ یہ دعوت وتحریک بہت مقبول ہوئی، علماء وادباء عرب اور مفکرین برصغیر کا ایک ممتاز ومؤقر وفد بڑی تعداد میں شریک ہوا، مولانا نے اس موقعہ پر جو خطاب کیا وہ بے حد فکر انگیز تھا۔ اس سیمینار میں ادب کے راستہ سے آنے والے الحاد وتشکیک اور فحاشی وعریانیت کے سیلاب کی روک تھام پر زور دیا گیا جو مصر میں خصوصاً بڑی قوت سے بہہ رہا تھا، اور ادب کو تخریب کے بجائے تعمیر کے لئے استعمال کرنے، عربی ادب وانشاء اور تنقید وتاریخ ادب کو صحیح رخ دینے، جدید نسل کو صالح غذا پہونچانے کے لئے ایک نیا ذخیرۂ کتب اور ایک جدید مکتب خیال پیدا کرنے اور منتشر الذہن، ضعیف العقیدہ اور غیر جانبدارانہ ادباء کی اجارہ داری ختم کرنے کی آواز اٹھائی گئی۔ اسی میں رابطۂ ادب اسلامی کا خاکہ سامنے آیا جو ۸۴ء میں عملی شکل اختیار کر گیا۔ رابطہ کے قیام کے بعد ۱۹۸۴ء کے اخیر میں اس کی مجلس عاملہ کا پہلا مشاورتی اجتماع ندوۃ العلماء میں منعقد ہو جو بے حد کامیاب رہا۔ جنوری ۱۹۸۶ء میں رابطۂ ادب کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں رابطہ کے دستور اساسی کو آخری شکل دی گئی۔ تنظیمی انتخابات ہوئے اور حضرت مولانا کو تاحیات صدر منتخب کیا گیا۔ اس موقع پر عالم عرب کے بعض ادباء وشعراء موجود تھے جن

میں معروف شاعر بہاء الامیری قابل ذکر ہیں۔ ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں اور اداروں کے ممتاز مفکرین وعلماء بھی شریک ہوئے مولانا نے اپنے مقالہ ''ہندوستان کا اسلامی ادبی اسکول'' کے عنوان سے پیش کیا جس میں خصوصیت سے یہ ذکر کیا گیا کہ عرب ممالک اور دیگر اسلامی ملکوں میں بدقسمتی سے دینی عنصر ادب کے میدان سے دور ہوگیا ہے لیکن ہندوستان کا اردو ادب اس سے بڑی حد مستثنیٰ ہے۔ مولانا نے اپنے مقالہ میں علامہ شبلی نعمانی، حالی، محمد علی جوہر، اقبال اور دیگر ادباء وشعراء کے تذکرے اور ان کی اسلامیت کی طرف اشارے بھی کئے۔ جون ۱۹۸۶ء میں رابطہ کا عالمی اجلاس استنبول (ترکی) میں منعقد ہوا، مولانا نے اپنے خطاب میں ترکی کے اسلامی ادب میں انقلابی اور قائدانہ کردار ادا کرنے کے سلسلہ میں مولانا جلال الدین رومی اور ان کی مثنوی کی تاثیر کا ذکر کیا۔ دوسرے خطاب میں مولانا نے اقبال کی معرکۃ الآرا نظم ''طلوع اسلام'' کو موضوع بنا کر گفتگو کی اور اقبال کا یہ شعر پڑھا ؎

عطا مؤمن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہن ہندی نطق اعرابی

فروری ۱۹۸۷ء میں ''اسلامی ادب اور مغربی ادبی تحریکات'' کے عنوان سے رابطہ ادب کا ایک سیمینار جے پور میں منعقد ہوا۔ یہ سیمینار رابطہ کی ہندوستانی شاخ کے زیر اہتمام منعقد ہوا، متعدد وقیع مقالات اس میں پیش کئے گئے۔ حضرت مولانا نے سیمینار میں جو تقریر فرمائی وہ مغرب کے پورے فکر ونظام پر ایک ناقدانہ تبصرہ تھا بہت مؤثر ثابت ہوئی۔ آخری تقریر میں مولانا نے احتسابِ کائنات اور وقیع ووسیع علمی وتحقیقی کاموں کی طرف توجہ دلائی۔ نومبر ۸۷ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ایک عظیم سیمینار ''اردو ادب پر حضرت سید احمد شہید کی تحریک کا اثر'' جیسے اہم موضوع پر منعقد ہوا۔ موضوع کی مناسبت سے مقالات وخطبات پیش کئے گئے، مولانا نے بھی تحریک

سید احمد شہید اور اس کے دائرہ کار اور اثرات کا جائزہ لیا۔ اگست ۱۹۸۹ء میں ترکی میں رابطہ ادب اسلامی کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں عالم عرب کے بڑے وفود نے شرکت کی، مولانا نے ادب کی حقیقت اور اس کے اصل کردار کے عنوان سے خطاب کیا اور ادب واخلاق کے رشتہ کو مضبوط تر کرنے کی دعوت دی۔ اس سیمینار میں مولانا سعید الرحمٰن اعظمی مدیر ''البعث الاسلامی'' نے مولانا کی تصنیف ''قصص النبیین'' کے پانچوں حصوں کی فنی وادبی خصوصیات پر ایک مقالہ پیش کیا جسے بڑی توجہ سے سنا گیا، اس سیمینار میں اسلامی ادب اور تعلیمات کی روشنی میں بچوں کے ادب پر بین الاقوامی انعامی مقالہ کا فیصلہ بھی کیا گیا۔

اکتوبر ۱۹۸۹ء میں حیدرآباد میں رابطہ ادب کا پانچواں مذاکرہ علمی منعقد ہوا۔ مولانا نے اپنے خطبہ صدارت ''تحریکِ آزادی اور اصلاح عوام میں ادبِ اسلامی کا حصہ'' کے عنوان سے پیش کیا۔ اس کے علاوہ متعدد علمی مقالات بھی سنائے گئے۔

اکتوبر ۱۹۹۰ء میں ''حمد ومناجات'' کے عنوان سے رابطہ کا ایک تاریخی سیمینار رائے بریلی میں بلایا گیا۔ مولانا نے اپنا خطبہ'' حمد ومناجات اور ان کی دینی وادبی قدر وقیمت'' کے عنوان سے پیش کیا جو بہت مؤثر ثابت ہوا۔

اکتوبر ۱۹۹۱ء میں بھوپال میں رابطہ کا اجلاس منعقد ہوا جس میں دعوتی واصلاحی ادب کے عنوان سے متعدد مقالے پیش کئے گئے۔ حضرت مولانا نے اپنے خطاب میں ادب کے انقلاب آفرینی اور غیر معمولی تاثیر اور بقائے دوام کے لئے سوز وساز اور جذب وخلوص کا لازما اختیار کرنے کی دعوت دی۔ مولانا نے فرمایا:

''یہ بھی تاریخ کا عجیب معمہ ہے کہ جس طبقہ کو سب سے زیادہ حقیقت شناس، فراخ دل اور متوازن ہونا چاہئے تھا، اسی طبقہ نے کوتاہ نظری اور تنگ دلی کا مظاہرہ کر کے خود کو حرف ونقش میں قید کر لیا ہے۔ جن لوگوں کا قلب وجگر جمال وکمال سے آراستہ ہونا

چاہئے تھا انھوں نے ہی ادب کو چند محدود اصلاحات اور مقاصد تک محدود کرلیا ہے۔ اقبال نے صحیح کہا ہے ۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر (۱۷)

اگست ۱۹۹۳ء میں استنبول میں رابطہ کا ایک اجلاس ہوا جس میں مولانا نے عملی طور پر ادب اسلامی کا نمونہ بننے کی دعوت دی۔ اس کے علاوہ جو اہم سیمینار رابطۂ ادب اسلامی کے زیر اہتمام ہوئے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

اپریل ۱۹۹۴ء میں ''حدیث نبویؐ کے ادبی مقام وامتیازات'' کے عنوان سے جامعہ سلفیہ بنارس میں سیمینار۔

اپریل ۱۹۹۵ء میں ''ادب میں سفرناموں کی اہمیت'' کے موضوع پر اورنگ آباد میں سیمینار۔

نومبر ۱۹۹۵ء میں اعظم گڈھ میں دارالمصنفین کی دعوت پر رابطہ کا اجلاس بموضوع ''سوانحی ادب وتذکرہ نگاری''۔

اگست ۱۹۹۶ء میں ترکی میں رابطہ کا عظیم سیمینار اور اسی کے تحت حضرت مولانا رحمۃ اللہ سے متعلق ایک اعزازی اجلاس۔

نومبر ۱۹۹۶ء میں حیدرآباد میں رابطہ کا مذاکرۂ علمی بموضوع ''ملفوظات ومواعظ ادب کے آئینہ میں''۔

۴/۵/۶/ اکتوبر ۱۹۹۷ء کو پٹنہ میں رابطہ کا اجلاس پھر ۲۴/۲۵/ اکتوبر ۱۹۹۷ء ہی کو لاہور میں رابطہ کا تاریخی بین الاقوامی سیمینار بموضوع ''حرمین شریفین کے سفرنامے جدید تحدیدیات کے تناظر میں''۔

جون ۱۹۹۸ء میں پونہ کا سیمینار بموضوع ''تاریخ کا جائزہ ادب کے تناظر میں''۔

فروری ۱۹۹۹ء میں بنگلور میں ''ادب اسلامی میں قصہ نگاری'' کے عنوان سے منعقدہ سیمینار''۔

ان سارے سیمیناروں میں مولانا شریک رہے۔ ہندوستان کے علاوہ رابطہ کی شاخیں پاکستان، بنگلادیش، ملیشیا، انڈونیشیا، ترکی، ساؤتھ افریقہ، مغرب عربی کے ممالک، سعودیہ عربیہ، مصر واردن ہر جگہ قائم اور مصروفِ عمل ہیں۔ دین کو ادب، فکر، سیاست، اقتصاد سے اور تمام عملی گوشوں سے الگ کرنے کی جو دشمنانہ سرگرمیاں جاری ہیں ان کا مقابلہ رابطہ ادب نے مولانا کی قیادت میں بڑی شدت سے کیا ہے۔ اور ادب اسلامی کا رجحان عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

رابطہ ادب اسلامی کے پلیٹ فارم سے ادبِ اسلامی کا پیام عام کرنے کے لئے سیمیناروں کے علاوہ متعدد کتابیں، اردو عربی رسائل بھی شائع ہوتے رہے ہیں جن میں حضرت مولانا کی کتاب ''نظرات فی الأدب'' اور متعدد چھوٹے رسائل سرفہرست ہیں۔ عربی اردو کے دو مجلّات (الأدب الاسلامی، کاروان ادب) ندوۃ العلماء سے بھی شائع ہوتے ہیں۔

حضرتؒ مولانا علی میاںؒ کا ایک بہت بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ قول وعمل کے جامع تھے۔ جس ادب کے فروغ کا انھوں نے پیغام دیا اسے برت کر دکھایا۔ اسی جامعیت کو مولانا کے تلامذہ ومنتسبین اختیار کر رہے ہیں۔ اور یہی ذمہ داری ہر اس شخص پر عائد ہوتی ہے جس کا ادب وعلم سے کوئی بھی رشتہ ہو کہ علم کی اصل روح عمل ہے۔ ادب وعلم اگر جو ہر عمل سے خالی ہوں تو وہ ان کھوکھلے درختوں کی طرح ہوتے ہیں جن کو اندر سے گھن لگ گیا ہو۔ شیخ سعدی نے بھی اسی کو بیان کیا ہے

علم چندانکہ بیشتر خوانی
چوں عمل درتو نیست نادانی

مولانا کی اہم تصنیفات، ترجمے اور خصوصیات

حضرت مولانا تین سو سے زائد کتابوں اور رسائل کے مصنف ہیں۔ عربی میں ۱۷۷ر تصانیف ہیں۔ سب سے پہلی باضابطہ عربی تصنیف ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' (مطبوعہ ۱۹۵۰ء) ہے اور اردو کی سب سے پہلی تصنیف ''سیرت سید احمد شہید'' (مطبوعہ ۱۹۳۹ء) ہے۔

مولانا کی ان تصانیف نے ایک دنیا کو متاثر کیا۔ ان کی قابل فخر تصنیفات میں ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین اپنے مضامین و مشمولات کی جامعیت، نزاکت و اعتدال اور اسلوب بیان کی سحر آفرینی اور اثر اندازی کی وجہ سے اسلامی دنیا میں ایک فکری اور عملی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ یہ صرف ایک کتاب نہ تھی۔ ایک نسخۂ شفا تھا جس سے مریضوں نے اپنا مرض پہچانا، علاج کیا اور بیماری دور کی۔ ایک مدرسہ اور مکتب فکر کی اساس تھی جس کے زیر سایہ ہزاروں تلامذہ اور منتسبین تیار ہوئے اور یہ فکر دنیا کے ہر گوشہ تک پہنچانے میں لگ گئے۔ کتاب پڑھئے تو ایسا لگتا ہے کہ ایک آبشار ہے جس سے جھرنے بہہ رہے ہیں نگہ بلند، سخن دلنواز اور جانِ پرسوز کے جو اوصاف کسی بھی میر کارواں کا رختِ سفر، زادِ راہ اور سرمایۂ حیات ہوتے ہیں وہ حضرت مولانا کی شخصیت میں کردار میں اور تصانیف میں خصوصاً ''ماذا خسر العالم'' میں بہت نمایاں طور پر محسوس کئے جاسکتے ہیں۔ کتاب کے صفحہ صفحہ سے مولانا کے دل کا گداز، فکر کی سلامتی اور پاکیزگی، معلومات و مطالعہ کی وسعت، عالم اسلام کے حالات کا باریک بینی سے جائزہ اور تمام مسائل و مشاکل کے حل کی بے لوث کوشش مسلمانوں کو ان کی ذمہ داری اور فرائض یاد دلانے کا ذوق و جذبہ نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ ماذا خسر العالم میں ایک مضمون ''محمد رسول اللہ روح العالم العربی'' کے عنوان سے ہے۔ یہ کتاب کا سب سے جاندار اور طاقتور حصہ ہے۔ مولانا اس کو اپنے لئے نجات

وسعادت کا سرمایہ سمجھتے تھے۔خود مولانا نے تحریر فرمایا کہ:

''اگر کسی بدعت اور فتنہ کا اندیشہ نہ ہوتا تو مصنف وصیت کر جاتا کہ کتاب کے یہ صفحات اس کے کفن میں رکھ دیئے جائیں کہ وہ ان کو اپنے لئے ذریعہ مغفرت اور وسیلہ شفاعت سمجھتا ہے۔''(۱۸)

یہ مضمون اقبالؔ کے اس بلیغ شعر کی شرح ہے ؎

نہیں وجود حدود وثغور سے اس کا
محمدِ عربی سے ہے عالم عربی

ماذا خسر العالم کا اردو ترجمہ ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' بھی اپنی اثر پذیری میں پیچھے نہیں رہا۔اس کے علاوہ مولانا کی اہم تصنیفات میں ''الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ والفکرۃ الغربیۃ فی الأقطار الاسلامیۃ'' (مسلم ممالک میں اسلامیت ومغربیت کی کشمکش) رجال الفکر والدعوۃ (تاریخ دعوت وعزیمت) السیرۃ النبویۃ (نبی رحمت) روائع اقبال (نقوش اقبال) الطریق الی المدینۃ (کاروان مدینہ) اذا ھبت ریح الایمان (جب ایمان کی باد بہاری چلی) الصراع بین الایمان والمادیۃ (معرکہ ایمان ومادیت) النبوۃ والانبیاء فی ضوء القرآن (منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین) العقیدۃ والعبادۃ والسلوک (دستورِ حیات) المرتضیٰ، القادیانی والقادیانیۃ، المسلمون فی الھند، الارکان الأربعۃ (ارکان اربعہ) التفسیر السیاسی للاسلام (عہد حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح) حیاتِ عبدالحیٔ، مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت، سوانح مولانا عبدالقادر رائے پوری، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ، تذکرۂ مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی الی الاسلام من جدید صحبتے با اہل دل، پاجا سراغ زندگی

قرآنی افادات، صورتان متضادتان، (دو متضاد تصویریں) وغیرہ فہرست ہیں۔

مولانا کی تصنیفات میں کتاب وسنت پر اعتماد اور انھیں سے اخذ واقتباس، مناظرانہ اسلوب سے بعد، اسرارِ شریعت کا فہم، تاریخ اسلام اور تاریخ عالم سے استدلال اور عبرت وموعظت کے پہلوؤں پر توجہ اور حقیقت بینی کے عناصر بہت نمایاں محسوس ہوتے ہیں۔ تصنیفی وتالیفی کام ان کے نزدیک ذریعہ کسب اور وسیلۂ معاش نہیں تھا۔ اس لئے مولانا کا قلم کہیں بھی انحراف کا شکار نہیں ہوا ہے۔ علمیت، نکتہ رسی، گہرائی وگیرائی عالم اسلام کے مشاکل ومسائل کا باریک بینی اور دوراندیشی سے جائزہ اور انھیں حل کرنے کی کوشش کے ساتھ پیغمبرانہ اخلاق اور سلف صالح کے زہد واستغناء اور نجابت وشرافت کے نمونے بھی مولانا کے ہاں خوب ملتے ہیں۔

مولانا کی عربی وادبی عبارتوں میں بے پناہ جاذبیت اور سحر ہے۔ یہ امتیاز انھیں بلند پایہ افراد کو میسر آتا ہے جو بات کی تہہ اور حقیقت تک پہنچ جائیں۔ یہ قرآن کے شغف وبرکت کا نتیجہ ہے۔ مولانا کی کوئی تحریر وتقریر قرآن وسنت کے حوالوں سے خالی نہیں ہے بلکہ اس میں ایسی حلاوت وتاثیر ہوتی ہے جو معاصرین کے یہاں ناپید ہے۔ ساری تالیفات میں یہی جوش وجذبہ کارفرما ہے کہ اسی لئے پڑھنے والا مولانا کے پاکیزہ احساسات، دل کی دردمندی، عقل کی بلندی اور فکر کی سلامتی کا گرویدہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ مشاہیر اہل کمال اور علماء کے تاثرات مولانا کی کتابوں کے سلسلہ میں اتنے زیادہ ہیں کہ وہ خود مستقل کتاب بن سکتے ہیں۔ ان میں بعض تاثرات کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

حضرت مولانا کا یہ بہت بڑا امتیاز ہے کہ انھیں عربی، اردو، فارسی اور انگریزی چاروں زبانوں پر عبور تھا۔ چنانچہ انگریزی مراجع ومصادر سے استفادہ کرنے میں مولانا کو کبھی کوئی دقت نہیں ہوئی اور ان کے حوالے مولانا کی کتابوں میں جا بجا ملتے ہیں۔ تصنیف کے علاوہ مولانا کو ترجمہ پر بھی بے مثال قدرت حاصل تھی۔ ماذا خسر العالم،

القادیانی والقادیانیۃ وغیرہ کا اردو ترجمہ بھی مولانا نے خود ہی کیا ہے۔اس کے علاوہ شاہ اسماعیل شہید کے رسالہ توحید کو مولانا نے عربی میں منتقل کیا ہے۔علامہ اقبال کے متعدد قصائد کا عربی میں ترجمہ کیا۔مجدد الف ثانی کے بعض رسائل کا بھی عربی ترجمہ فرمایا۔اس کے علاوہ ترجمہ کے سلسلہ میں مولانا کے اور بھی قابل قدر کام ہیں۔

مولانا کی تصنیفات میں انگریزی ترجمہ شدہ کتابوں کی تعداد ۷۰ر سے زائد ہے۔انگریزی ترجمہ کا کافی کام ڈاکٹر محمد آصف قدوائیؒ کا رہین منت ہے۔وہ انگریزی کے کہنہ مشق صاحب قلم اور مترجم تھے۔سب سے پہلے انھوں نے "ماذا خسر العالم" کا ترجمہ (Islam and the World) کیا جس کے بارے میں بہت سے انگریزی کے ماہرین کا یہ خیال ہے کہ کسی غیر انگریزی کتاب کا ابھی تک انگریزی میں اس کتاب سے بہتر ترجمہ نہیں ہوا ہے ۔اس کے علاوہ آصف صاحبؒ نے نقوش اقبال، کاروانِ مدینہ، ارکان اربعہ وغیرہ کا ترجمہ بھی کیا اور ہر موقعہ پر کامیاب رہے۔آصف صاحب کے علاوہ اور متعدد انگریزی داں افراد نے بھی مولانا کی کتابوں کا بڑے سلیقہ سے ترجمہ کیا ہے۔جن میں سید محی الدین صاحب سابق سیکشن آفیسر حکومت یوپی سرفہرست ہیں۔انگریزی کے علاوہ مولانا کی تصنیفات کا ترجمہ فرانسیسی، فارسی، بنگالی، ترکی، ملیشین، روسی، گجراتی، تامل، ملیالم، ہندی وغیرہ متعدد عالمی وعلاقائی زبانوں میں ہوا ہے۔ترکی زبان میں ترجمہ کا کام جناب یوسف قراچہ ندوی (ترکی نژاد) نے کیا ہے۔

مولانا کی کتابوں کے اردو، عربی مترجمین میں مولانا محمد الحسنیؒ مولانا سعید الرحمٰن اعظمی، مولانا نور عظیم ندویؒ، ڈاکٹر شمس تبریز خاں، ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی، مولانا سید سلمان حسینی ندوی، مولانا شمس الحق ندوی، مولانا نذر الحفیظ ندوی وغیرہ سرفہرست ہیں۔

میں اپنے محدود مطالعہ کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ مولانا کی کتاب "روائع

اقبال'' کا ترجمہ نقوش اقبال (جو ڈاکٹر شمس تبریز خاں کے قلم سے ہے) ترجموں میں سب سے کامیاب اور مؤثر ترجمہ ہے۔ اور اس کا ہر ہر پیراگراف شاہکار ہے۔ اسی مترجم کے قلم سے ''تہذیب وتمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات'' (الاسلام اثرہ فی الحضارۃ وفضلہ علی الانسانیۃ) ندوۃ العلماء ایک دبستانِ فکر، ایک رہنما تحریک (ندوۃ العلماء مدرسۃ فکریۃ شاملۃ) منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین (النبوۃ الانبیاء فی ضوء القرآن) دو ہفتے مغرب اقصی مراکش میں (أسبوعان فی المغرب الأقصیٰ) حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب امیدوں اور اندیشوں کے درمیان (کیف ینظر المسلمون الی الحجاز وجزیرۃ العرب) وغیرہ بہت مؤثر ترجمے ثابت ہوئے۔

مولانا محمد الحسنیؒ بھی بہت کامیاب مترجم تھے، اور انھوں نے کافی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کچھ ترجمے (جن کی تعداد ایک دو سے زائد نہیں) بعض حضرات نے بڑی رواروی، سرسری اور خشک انداز میں کئے ہیں، اور ان میں اصل کتاب کا جوش اور ادبیت نہیں آسکی ہے اور انھیں دیکھ کر یہ محسوس فوراً ہوجاتا ہے کہ یہ ترجمہ ہے۔ ان میں سرفہرست مولانا کی کتاب ''مذکرات سائح فی الشرق العربی'' کا اردو ترجمہ ''شرق اوسط کی ڈائری'' ہے۔ ایسے ترجموں کو مزید مؤثر اور دلچسپ بنانے کے لئے نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ کے عربی واردو اسلوب کے نمونے

ہم یہاں مولانا کے عربی اور اردو اسلوب کے دو نمونے پیش کر رہے ہیں۔ ان سے مولانا کے زورِ قلم اور تاثیر وبلاغت کا کچھ اندازہ ہوگا۔

مولانا نے ۲۰ ربیع الاوّل ۱۳۷۰ھ مطابق ۳۰ دسمبر ۱۹۵۰ء میں ایک پیغام عربوں کے نام تحریر فرمایا جس کا مضمون یہ ہے:

"لو جمع لی العرب فی صعید واحد واستطعت أن أوجّه الیهم خطاباً تسمعه آذانهم وتعیه قلوبهم لقلت لهم! أیّها السادة ان الاسلام الّذی جاء به سید نا محمد العربی ﷺ هو منبع حیاتکم ،ومن أفقه طلع صبحکم الصادق ، وأن النّبی ﷺ هو مصدر شرفکم وسبب ذکرکم، وکلّ خیر جاء کم بل وکلّ خیر جاء العالم ، فاما هو عن طریقه وعلی یده، أبی الله الا أن تتشرفوا بانتسابکم الیه وتمسککم بأذیاله والاضطلاع برسالته والاستماتة فی سبیل دینه ، ولا راد لقضاء الله ولاتبدیل لکلمات الله ، العالم العربی بحر بلا ماء کبحر العروض حتیٰ یتخذ سیدنا محمد ﷺ اماماً وقائداً لحیاته وجهاده، وینهض برسالة الاسلام کما نهض فی العهد الأول، ویخلّص العالم المظلوم من براثن مجانین أوربا۔ الّذین یأبون الا أن یقبروا المدنیّة ویقضوا علی الانسانیة القضاء الأخیر بأنانیتهم واستکبارهم وجهلهم ویوجّه العالم من الانهیارالی الازدهار، ومن الخراب والدمارو الفوضی والاضطراب الی التقدم والانتظام والأمن والسلام ، ومن الکفر و الطغیان الی الطاعة والایمان ، وانه حق علی العالم العربی سوف یُسأل عنه عند ربه فلینظر بماذا یجیب؟" (۱۹)

ترجمہ: اگر راقم کے لئے عرب ایک میدان میں جمع کردیئے جائیں

اور اس کے امکان وقدرت میں ہو کہ وہ ان سے براہ راست خطاب کر سکے جس کو ان کے کان سنیں اور دل قبول کریں تو میں ان سے کہوں گا کہ میرے قابل احترام بھائیو! وہ دین اسلام جس کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے وہ تمہاری زندگی کا اصل سرچشمہ ہے اور اسی کے افق سے تمہاری صبح صادق طلوع ہوئی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی نسبت تمہارے لئے شرف کا باعث اور تمہاری اہمیت وعظمت کا سبب ہے، ہر خیر ونعمت جو تم کو ملی بلکہ ہر خیر جو دنیا کو پہنچی وہ آپ ہی کے ذریعہ سے اور آپ ہی کے دین کے راستہ سے ملی۔ اللہ تعالیٰ کو منظور نہیں کہ تم کو آپ کی طرف انتساب، آپ کا دامن پکڑے، آپ کے پیغام حامل بنے اور آپ کے دین کے راستہ میں ہر طرح قربانی کے لئے تیار ہوئے بغیر کوئی عزت ملے۔ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کو ٹالنے والی اور اس کے ارشادات کو تبدیل کرنے والی کوئی طاقت نہیں، عالم عربی فن عروض کی اصطلاح ''بحر'' کی طرح نام کا سمندر رہے جس میں پانی کا ایک قطرہ نہیں ہوتا اور یہ صورتحال اس وقت تک باقی رہے گی جب تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا امام اپنی زندگی وجدوجہد کا قائد نہ بنالیا جائے۔ اور عرب اسلام کی دعوت اور پیغام لے کے پھر اس طرح نہ اٹھیں جیسے عہدِ اول میں اٹھے تھے۔ اور اس ستم رسیدہ دنیا کو یورپ کے ان ستم گروں کے پنجہ سے آزاد نہ کریں جو صالح تمدن اور حقیقی انسانیت کا کام تمام کر دینا چاہتے ہیں، اور پھر عالم عربی اس معاملہ میں صف آرا ہو کر عالم انسانیت کو انتشار بلکہ احتضار سے بچا نہ لے اور اس کو

توحید وحدت، امن وسلامتی، طاعت وایمان کی لائن پر نہ ڈالے یہ عالم عربی کا فریضہ ہے جس کے بارے میں اللہ کے یہاں سوال ہوگا۔ دیکھنا ہے کہ عرب اس کا کیا جواب دے گا۔" (۲۰)

مولانا اسماعیل کے تذکرہ میں مولانا علی میاںؒ نے تحریر فرمایا ہے:

"۲۴ رذی قعدہ ۱۲۴۶ھ سے لے کر اس دن تک شاید کوئی دن طلوع ہوا ہو جس کی صبح کو اس شہید اسلام کی، جس کی اور فضیلتیں برطرف اس کی شہادت مسلم اور شہداء کی مغفرت مسلم، تکفیر وتضلیل میں کوئی فتویٰ نہ نکلا ہو، لعنت وسب وشتم کا کوئی صیغہ نہ استعمال کیا گیا ہو، علماء کی مجلس میں اس پر اتنی لعنت کی گئی جتنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر بنی امیہ کے دربار میں نہیں کی گئی، فقہ وفتویٰ کی کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جو اس کے کفر کے ثبوت میں نہ پیش کی گئی ہو، وہ ابوجہل وابولہب سے زیادہ دشمن اسلام، فرعون وہامان سے زیادہ مستحق نار، کفر وضلالت کا بانی، بے ادبوں، گستاخوں کا پیشوا، شیخ نجدی کا مقلد وشاگرد بتایا گیا، اور یہ ان لوگوں نے کہا جن کے جسم نازک میں آج تک اللہ کے لئے پھانس بھی نہیں چبھی، جن کے پیروں میں اللہ کے راستہ میں کبھی کوئی کانٹا نہیں گڑا، جن کو خون چھوڑ کر کہ اس کا ان کے یہاں کیا ذکر اسلام کی صحیح خدمت میں پسینہ کا ایک قطرہ بہانے کی سعادت بھی حاصل نہیں ہوئی۔ اور یہ ان لوگوں نے کہا جن کی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی عزت وعصمت بچانے کے لئے اس نے اپنا سر کٹایا، تو کیا اس کا یہی گناہ تھا اور کیا دنیا میں احسان فراموشی کی اس سے بڑھ کر نظیر مل سکتی ہے؟ جس

وقت پنجاب میں مسلمانوں کا دین وایمان، جان ومال عزت وآبرو محفوظ نہ تھی، سکھوں کے گھروں میں مسلمان عورتیں تھیں، مساجد کی بے حرمتی ہورہی تھی اور ان میں گھوڑے باندھے جاتے تھے اس وقت یہ غیرت ایمانی وحمیت اسلامی والے جو ایک کلمہ کفر برداشت نہیں کرسکتے تھے کہاں تھے؟ اور کیا آج شاہ ولی اللہؒ کے پوتے کے سوا کوئی کافر نہیں؟

سودا قمارِ عشق میں شیریں سے کوہ کن
بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہوسکا

حواشی:

(۱) پرانے چراغ اول ص ۱۲۶ (۲) ایضاً ص ۲۱۷ مختصراً (۳) کاروان زندگی اول ص ۹۰/۹۱ (۴) پرانے چراغ اول ص ۲۰۹ (۵) کاروان زندگی اول ص ۱۰۱ (۶) ایضاً ص ۲۱۱ (۷) ایضاً ص ۲۱ (۸) ایضاً ص ۲۱۴ (۹) ایضاً ص ۲۱۶/۲۱۷ مختصراً (۱۰) ایضاً ص ۲۱۸ (۱۱) ایضاً ۲۱۷ (۱۲) ۲۱۸ (۱۳) دعائے خیر البشر از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ص ۱۸/۱۹ (۱۴) دیکھئے مقدمہ مذکرات سائح فی الشرق العربی (۱۵) پرانے چراغ دوم ص ۱۸۰ (۱۶) نحو مذہب اسلامی فی الأدب والنقد ص ۹۴/۹۵ (۱۷) کاروان زندگی پنجم ص ۵۴ (۱۸) کاروان زندگی اول ص ۲۶۳ (۱۹) ماخوذ از ''وصایا أساطین الدین والادب بولسیاسیۃ للشبان مرتبہ عبداللہ مزروع (۲۰) کاروان زندگی ہفتم ص ۱۵۲/۱۵۳ (۲۱) ماخوذ از ''دعوت وعزیمت کے روشن ستارے'' مصنفہ آبادشاہ پوری ص ۲۳۲/۲۳۳۔

مستقبل کی فکر

''ہمارے بزرگوں نے ہمارے آباء واجداد نے اپنی پوری ذمہ داری کے ساتھ اپنے ایمانی صفات وکمالات کو ہم تک پہونچا دیا اب ہمارا اور آپ کا فرض ہے کہ ہم اپنے ایمان کو اپنی تہذیب وروایات کو اور اپنے عقیدہ و مسلکِ زندگی کو اپنی اولاد تک پہونچائیں اور اس کی کوشش کریں کہ ہمارے بچے اور ہماری آئندہ آنے والی نسلیں اس نعمت سے محروم نہ ہونے پائیں''۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

ڈاکٹر منجد مصطفیٰ بہجت
ترجمہ: مولوی عبدالجلیل ندوی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

ایک مایہ ناز ادیب، ایک قابل فخر داعی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے میری پہلی ملاقات اور تعارف تیس سال قبل اس وقت ہوا جب میں نے ان کی شہرۂ آفاق کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' کا مطالعہ کیا، میں نے ان کے افکار وخیالات کو بڑے اشتیاق سے پڑھا اور میرے دل میں ان کی بڑی قدر پیدا ہوئی، اس کے معنی ومفاہیم آج بھی میرے دل ودماغ میں مستحضر ومحفوظ ہیں، جنہیں کتاب کا خلاصہ اور مغز کہا جاسکتا ہے، صاحب کتاب نے اپنے ادبی اور بلیغ اسلوب میں مسائل کا حل یہ پیش کیا ہے کہ ''عالم اسلام کا احیاء صرف اسی پیغام کے ذریعہ ہوسکتا ہے جسے عالم اسلام کے بانی اور معمار محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا ہے۔ اس کے لئے ایمان راسخ، یقین کامل اور دین کی راہ میں مرمٹنے اور جان نچھاور کردینے کا جذبۂ بے پناہ ہردم دل میں موجزن رہنا چاہئے یہ پیغام محمدی انتہائی واضح اور صاف شفاف پیغام ہے، جس سے زیادہ متوازن اور بہتر پیغام پوری دنیائے انسانیت کو آج تک میسر نہ آسکا، قرآن کریم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت وہ عظیم

قوتیں ہیں جن کے ذریعہ عالم اسلام میں ایمان اور جوش وجذبہ کی چنگاریاں اور شرارے مشتعل ہوسکتے ہیں اور ہر زمانے میں ایک عظیم انقلاب برپا کرسکتے ہیں۔"

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ سے میری پہلی براہ راست اور بالمشافہ ملاقات رابطہ ادب اسلامی کے زیر اہتمام استنبول (ترکی) میں (۲۴ تا ۲۶/۳/۱۴۱۷ھ بمطابق ۸ تا ۱۰/۸/۱۹۹۶ء) میں منعقد ہونے والی سہ روزہ کانفرنس کے دوران ہوئی۔ جلسہ کا افتتاح حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے مختصر خطاب سے ہوا، خطاب کے اخیر میں مولانا نے پوری قوت وصراحت کے ساتھ یہ بات رکھی" کہ اسلام صرف عقائد اور خاص قسم کی لگی بندھی عبادات پر منحصر نہیں بلکہ زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے۔ اگر عالم اسلام کے تمام ادباء ومفکرین جمع ہوجائیں اور ان کا مقصد انسانیت کو اس سلامتی اور عزت وشرف کے راستہ پر گامزن ہونے کی دعوت دینا ہو جو اس کا طرۂ امتیاز اور مایہ افتخار رہا ہے تو اس کے لئے انہیں ان قرآنی کلمات سے زیادہ مؤثر، دلآویز اور بلیغ الفاظ ہرگز نہیں مل سکتے مثلاً:

"کلمة طيبة كشجرة طيبة اصلها ثابت وفرعها في السماء تؤتي أكلها كل حين باذن ربها"

"اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں ہر آن اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے۔"

یہ احساس میں کسی بھی طرح اپنے دل میں چھپا نہیں سکتا کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو میں پہلی بار براہ راست سن رہا تھا اور ان کے خطاب کی تاثیر سے گویا میں سحر زدہ سا ہوگیا تھا۔ اس کے بعد میں نے دوسرے اصحاب علم وفکر ادباء کے خطبات بھی بغور سنے لیکن میرا یہی تاثر تھا کہ مولانا علی میاں ندویؒ کی زبان سے جو الفاظ

نکلے ہیں وہ کسی ایسے چشمۂ صافی کا فیض ہیں جس کے سامنے دوسرے چشمے گدلے نظر آتے ہیں، یہ وہ روشنی ہے جو مشکوٰۃ نبوت سے مستنیر ہے، زبان وبیان کی یہ سلاست اور وہ بھی ایک عجمی نژاد کی زبان سے واقعہ یہ ہے کہ ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

اس موقع پر مجھے مولانا کی عربی دانی، رسوخ علمی، اعتماد وایمان کامل، فضل وکمال اور عمل وتقویٰ کا بخوبی اندازہ ہوا، میری بصارت نے میری سماعت کی تائید کی اور مشاہدہ نے مطالعہ کو حرف بحرف صادق قرار دیا۔

تیسری ملاقات اس وقت ہوئی جب میں نے ملیشیا کی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں ''جهود الشيخ ابى الحسن الندوى فى التأصيل الاسلامى للغة العربية و آدابها: عرض و نقد'' (عربی زبان وادب کو اسلامی بنیادوں اور مبادی پر استوار کرنے کے سلسلہ میں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی خدمات وسرگرمیاں ایک جائزہ اور مطالعہ) کے عنوان سے ایک طالب علم محمد عبدالسلام آزادی کے ایم، اے، کے مقالہ کی سرپرستی قبول کی، یہ مقالہ دسمبر ۱۹۹۸ء میں پاس ہوا۔ اس وقت مجھے مولانا ندویؒ کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا اتفاق ہوا، یہاں مزید تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں لیکن میں ریسرچ اسکالرس اور علماء کو اس بات کی طرف متوجہ کرتا ہوں کہ شیخ ندویؒ کو مقالات اور تحقیقات کے ذریعہ ہمیشہ یاد اور زندہ رکھیں، لوگوں کو ان سے بہت زیادہ تعلق تھا، ان کی باتیں ہر مجلس کی رونق اور زینت ہوتی تھیں، اللہ ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے، یہی وہ چیز ہے جس کی آج ہمارے نوجوانوں کو بہت زیادہ ضرورت ہے، میری گذارش تمام یونیورسٹیز اور تحقیقی اداروں سے ہے اور خاص طور سے رابطہ ادب اسلامی سے جس کے وہ خود صدر نشیں تھے، رابطہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ایک بین الاقوامی

کانفرنس بلائے اور علامہ ندویؒ کی متنوع و ہمہ گیر خدمات، دعوتی سرگرمیوں اور ان کے طریقہ کار و افکار اور مخلصانہ کوششوں کو زیادہ سے زیادہ عام کرے۔

پیدائش: حضرت مولاناؒ خود اپنے بارے میں رقمطراز ہیں، کہ ۶ رمحرم ۱۳۳۳ھ بمطابق ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوا، گھر والوں نے بچپن ہی سے عربی کی طرف توجہ مرکوز کردی تھی۔ جو بھی ان کے خاندان کی تاریخ کا مطالعہ کرے گا اسے محسوس ہوگا کہ اس خاندان کا عربی واسلامی علوم سے کتنا گہرا تعلق رہا ہے، جیسا کہ ان کے والدؒ صاحب نزھۃ الخواطر، (جنھیں بجا طور پر ہندوستان کا ابن خلکان کہا جاسکتا ہے) علامہ سید عبدالحی حسنیؒ ہیں، جنھوں نے ہندوستان کے علماء کے تراجم سے متعلق ۸ رجلدیں بڑی دیدہ ریزی سے بعد مرتب فرمائیں، ۹ رسال کی عمر میں والد کا انتقال ہوگیا، تو ان کی تربیت والدہ سیدہ خیر النساء (۱۹۶۸ء) نے کی جو ایک حافظہ قرآن زاہدہ اور شاعرہ تھیں ان کی کئی کتابیں بھی ہیں۔

ان کی ابتدائی ادبی کاوش یہ تھی کہ تیرھویں صدی کے مجدد حضرت سید احمد شہیدؒ کے تعلق سے ''ترجمۃ السید الامام احمد بن عرفان الشہید'' کے عنوان سے ایک مقالہ قاہرہ سے شائع ہونے والے مجلّہ ''المنار'' میں ۱۹۳۰ء میں طبع ہوا، اس وقت ان کی عمر بمشکل ۱۶ رسال کی تھی، بعد میں اس کو علامہ سید رشید رضاؒ نے ایک کتابچہ کی شکل میں ۱۹۳۴ء میں شائع کیا، اس طرح انہوں نے اپنی تحریری اور علمی سرگرمیوں کا اغاز کیا، شیخ نے ۱۹۴۷ء سے اپنے اسفار کا آغاز کیا، جس میں عالم اسلام کے علاوہ ایشیا، افریقہ، یورپ اور امریکہ کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں اور علمی اداروں میں لکچرس دیئے، اکثر جگہوں سے انعامات اور اعزازی ڈگریوں سے بھی نوازے گئے، چونکہ ان کے دل میں ڈگریوں، انعامات، اور اعزازات کی حرص چھو کر بھی نہ گزری تھی اس وجہ سے بسا اوقات انہوں نے ڈگریوں کے قبول کرنے سے انکار بھی کیا۔

ایک یونیورسٹی میں دو ہفتہ تک محاضرے دینے کا معاوضہ قبول کرنے سے انکار

کیا (جو تقریباً چھ ہزار امریکی ڈالر کے مساوی ہوتا تھا) اور اس کے جواب میں انہوں نے جو کچھ فرمایا وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے، کہ ''دعوت اسلامی کی راہ میں اجرت ومعاوضہ کا تصور بھی ان کے دل ودماغ میں نہیں آتا تھا'' یہی وجہ ہے کہ عالمی پیمانے پر اللہ نے انہیں بے پناہ مقبولیت عطا فرمائی، ان کے نام مشاہیر کے خطوط کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے، جس کو ان کے جانشین اور خواہر زادہ عزیز حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی نے ترتیب دیا ہے اور کتابی شکل میں اسے ''رسائل الاعلام'' کے نام سے شائع کیا ہے، اس مجموعہ میں تقریباً پچاس مشاہیر علماء ادباء اور اہل قلم اور سربراہان ممالک کے ستر ۷۰ خطوط تین سو سے زائد خطوط کے ذخیرہ سے منتخب کر کے شامل کئے گئے ہیں، بطور خاص یہاں ہم دو نامور اور بلند پایہ مفکر وادباء شیخ محمد المجذوب اور شیخ علی طنطاویؒ کے تاثرات نقل کرتے ہیں، شیخ محمد المجذوب نے لکھا ہے کہ:

> ''علامہ ندویؒ کی تحریر کو پڑھنے والا محسوس کریگا کہ ان کی عبارت میں ایک غیر معمولی اثر ہے، جو کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے، ان کی تحریروں کو پڑھنے والا مسحور سا ہو جاتا ہے، وہ ان خاص اہل دل افراد میں سرفہرست ہیں جو اپنے جذبات کی شدت ووفور اور جولانی وروانی کو قرطاس تک منتقل کر دیتے ہیں یہ وہ جوہر گرانمایہ ہے جو خاص روحانی ذوق رکھنے والے ادباء کے یہاں ملتا ہے، جو قرآنی ادب کے رمز شناس ہوتے ہیں، شیخ طنطاویؒ مولاناؒ کے طرز دعوت اور اسلوب تعلیم وتزکیہ کو سراہاتے ہوئے بار بار کہتے ہیں: ''برادرم ابوالحسن آپ اور آپ کی جماعت اپنے طریقہ پر قائم اور دائم رہے، تمام داعیان دین کے اسالیب میں آپ کے اسلوب سے بہتر کوئی اسلوب میرے علم میں نہیں ہے جب مضبوط اور مستحکم

قلعہ کا معمار عظیم شمار کیا جاسکتا ہے تو مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے تو اپنے شاگردوں کی شکل میں اسلام کے بہت سے قلعے تیار کردیئے ہیں، اور علماء صالحین اور مخلص داعیوں کی ایک امت تیار کردی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''موجودہ دور کے جتنے بڑے داعیان ہیں ان میں مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا شمار اکابر میں ہوتا ہے، مزید یہ کہتے ہیں کہ علامہ ندویؒ علم وادب اور حسب ونسب دونوں کے جامع ہیں، اور یہ ایسی خصوصیت ہے جس کے بعد کسی اور خصوصیت کی حاجت نہیں رہ جاتی''۔

علامہ ندویؒ کی نمایاں خصوصیات میں دعوت اسلامی کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر شرکت اور ادب کو ایک طاقتور ذریعہ اور وسیلہ کے طور پر اپنانا ہے، اور پوری قوت وطاقت سے اسلامی پیغام کو عام کرنے کی کوشش بے حد اہم ہے، اس ادبی قافلہ کے سربرآوردہ ارکان میں امام حسن البناء، سید قطب شہید، شیخ محمد الغزالی وغیرہ ہیں۔ جنہوں نے موجودہ اسلامی دعوت کو نقطہ عروج تک پہونچادیا ہے۔ فکر کو ادب سے الگ کرکے آگے بڑھانا ممکن نہیں، اس طرح اسلام کی دعوت عربوں اور غیر عربوں کو عربی اسالیب کی رعایت اور حکمت کے لحاظ کے بغیر مشکل ہے، کیونکہ عربی زبان کو اسلامی فکر سے نکالنا گویا روح کو جسم سے نکالنے کے مرادف ہے، بقول علامہ طنطاویؒ:

''برادرم ابوالحسن! ادب کی طرف سے بھی میرا اعتماد اٹھنے لگا تھا چونکہ ادیبوں میں وہ آسمانی نغمہ عرصہ سے نظر نہیں آیا جس کی لے میں شریف رضی کے وقت سے لے کر عبدالرحیم برعی تک شعراء گاتے رہے، جب میں نے آپ کی کتاب پڑھی تو یہ کھویا ہوا نغمہ پھر سے مل گیا، یہ نغمہ مجھے آپ کی اس نثر میں ملا جو کہ حقیقتاً شاعری

ہے، لیکن بے ردیف اور قافیہ کی شاعری، برادرم ابوالحسن! آپ کا
صد ہزار شکریہ کہ آپ نے دوبارہ میرے اندر اپنی ذات اور اپنے
ادب پر اعتماد بحال کر دیا۔" (کاروان مدینہ ص ۱۱)

شیخ یوسف القرضاوی نے مولاناؒ کی دعوتی فقہ پر قلم اٹھایا تو ان کے چھ خصلتوں کو نمایاں کر کے پیش کیا ان میں ایک ممتاز خصلت، ادبی ملکہ اور دوسری خصلت دلِ زندہ وتابندہ ہے، واقعہ یہ ہے کہ ملکہ ادبی اگر دل زندہ سے ہم آہنگ ہو کر کوئی تخلیق منظر عام پر لاتا ہے تو اس کی تاثیر وتسخیر عجیب وغریب بلکہ فاتح عالم ہوتی ہے۔

ادب اور زبان کے تین اصول ہیں! میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ علامہ ندویؒ نے عربی زبان وادب میں دو اصول پیش کئے ہیں، پھر ایک تیسرا اصول ان دونوں کی تعلیم سے متعلق پیش کیا، کیونکہ علامہ نے ایسے عمومی قواعد وضوابط وضع کئے ہیں جن سے عمومی طور پر ادب کے اثر اور دائرہ کار پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ اکثر مصنفین اور ناقدین نے اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ ادبی نظریات سب کے سب مغرب کی دین ہیں لیکن علامہ کے ادبی نظریات کی بنا پر ہم اس پر فخر کر سکتے ہیں کہ انہوں نے ادب اسلام کی قائدانہ صلاحیت واہمیت کو ادب اور نقد دونوں میدانوں میں پیش کیا ہے، اور عربی زبان کی شان کو دوبالا کیا ہے اور ایسے وقت میں کیا جب ہمارے درمیان عربی زبان کی شان کو اسلامی وقار کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت تھی۔

شیخ نے ترکیبات، اسالیب، اصطلاحات اور مفردات کے بارے میں بھی اچھی گفتگو کی ہے، اور عربی زبان کے ارتقائی عناصر کو چار قسموں میں تقسیم کیا ہے، ضرورت، عاطفہ، جذبہ اور لگن، نفع وافادہ، اسی کے ساتھ عربی زبان کی تعلیم اور طریقہ تدریس پر بھی توجہ فرمائی انہوں نے محسوس کیا کہ تعلیم سے اعراض اور بے توجہی نسل کشی کا سب سے مؤثر طریقہ ہوتا ہے، بقول اکبر ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

حضرت مولانا کے نزدیک تعلیم مقصد بھی ہے اور وسیلہ بھی، انہوں نے ان نظریات پر تکیہ کرنے اور ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کیا، جو مشرق و مغرب میں ظاہر ہوئے انہوں نے ان نظریات کو انسانی تجربات قرار دیا جو صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی، اس طرح انہوں نے اس سے بھی خبردار کیا کہ امت اپنے روشن اقدار اور قابل فخر تاریخ سے دست بردار اور غافل ہوتی جارہی ہے۔ اور یہ واضح کیا کہ زندگی کے معرکہ میں دوبدو حصہ لے کر مفاسد پر تیشے چلانے اور منافع اسلام کے حصول و تنفیذ کے لئے ادب کو ایک طاقتور اور مؤثر وسیلہ کے طور پر استعمال کرنا اور کام لینا ازبس ضروری اور حالات زمانہ کا تقاضا ہے، نیز جدید تربیتی طریقوں سے فائدہ اٹھانا اور حالات کے مطابق نتائج اخذ کرنا اور معتدل اور متوازن تبدیلیوں اور اضافوں کے لئے ذہن و دماغ کو کشادہ اور تیار رکھنا نیز فراخدل ہونا بھی لازمی ہے۔

مولاناؒ نے ادب کے میدان میں اسلامی ادب کے مفہوم کو واضح کیا، اس میں جغرافیائی حدود کے وجود سے انکار کیا۔ اسلامی ادب اور اس کے بنیادی عناصر کو چار قسموں میں تقسیم کیا ہے، عقیدہ، جذبہ، اخلاص، صدق، یہ وہ بنیادی چیزیں ہیں جن کو فنی شرائط سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا کا ادبی نظریہ و موقف مکمل طور سے اس وقت سامنے آیا جب انہوں نے اصناف ادب کی اہمیت واضح کی۔ مثلاً شعر، ادب اطفال، سفرنامے اور ادب سوانح، مقدمہ نگاری وغیرہ۔

حضرت مولانا نے ادب کے سلسلہ میں نظریہ سازی کے ساتھ ہی ساتھ عملی طور پر ادب کی تطبیق و تنقید میں خود بھی حصہ لیا ہے اور مختلف مذکورہ اصناف ادب میں اپنا قیمتی سرمایہ چھوڑا ہے۔

قصوں کے ادب کے متعلق سید قطب حضرت مولانا کے سلسلہ میں رقم طراز ہیں کہ ''بلا تکلف یہ بات کہتا ہوں کہ علامہ ندوی کی کوششوں میں موسیٰ علیہ السلام کا قصہ اپنی ادبیت کے لحاظ سے واضح تر اور فائق تر ہے، جس میں قصہ کے ساتھ اس کے متعلقات کی طرف اشارہ، متوازن تشریحات وتوضیحات شامل ہیں، مزید انہوں نے ''قصص النبیین'' سے متاثر ہو کر کہا کہ اس کتاب کے ذریعہ میں نے علامہ ندویؒ کو پہنچانا جس میں ان کی شخصیت کی سلامتی اور قلم کے جولانی دونوں گھل مل گئی ہیں، میں نے ان میں اسلامی جذبات سے معمور اور ایمانی افکار سے مخمور قلب ودماغ اور عقل وخرد پائی ہے، میں نے محسوس کیا کہ ان کی زندگی کا سارا تانا بانا اسلام ہی سے بنا ہوا ہے، یہ حق کی شہادت ہے جو میں دے رہا ہوں، اس مختصر سے مقالہ میں ادب ولغت کے میدان میں علامہ ندویؒ کی کوشش کا احاطہ خارج از استطاعت ہے، اس پر قلم اٹھایا جائے تو تفصیلی کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ ع

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

سچے محبّ وطن اور ملک دوست

"ہم سچے محبّ وطن اور ملک دوست اس وقت تک نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ اس ملک کی ساری اچھی اور حسین اور مفید چیزوں پر فخر کرنا اور ان کی حفاظت کرنا اور ان کو زندہ رکھنا اپنا فرض نہ سمجھیں۔ ہندوستانی کنبہ کی ان شخصیتوں کو کیوں خارج کیا جائے جن کا خمیر اس سرزمین سے اٹھا اور جنہوں نے اپنی ساری صلاحیتیں اس ملک کو زرخیز بنانے میں صرف کیں اور پھر اسی سرزمین میں آسودۂ خاک ہیں اور ہم جن کی ہمت و بصیرت سے اپنی زندگی کا چراغ جلا سکتے اور اسکی لَو بڑھا سکتے ہیں اور دنیا کی بزمِ کمال میں اونچی جگہ پا سکتے ہیں"۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

پروفیسر سید رضوان علی ندوی

مفکر اسلام، نابغہ روزگار
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

نہ صرف ہندوستان اور برصغیر اور نہ صرف عرب بلکہ پورا عالم اسلام جمعہ ۲۳ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو ایک ایسی عظیم شخصیت سے محروم ہو گیا جو مجسم خیر و برکت تھی۔ عالم اسلام کے لئے ایک روشنی تھی اس روشنی کی کرنیں نہ صرف عالم اسلام کو منور کر رہی تھیں بلکہ یورپ و امریکہ میں بھی وہ ضیاء پاشی کر رہی تھیں۔ چودہ پندرہ سال قبل آکسفورڈ یونیورسٹی میں مولانا مرحوم کا قائم کردہ اسلامک ریسرچ سینٹر اس کا گواہ ہے اور اس سے کافی قبل مولانا نور اللہ مرقدہ کے جنیوا کے اسلامک سینٹر کے دورے، جو مرحوم مصری اخوانی لیڈر ڈاکٹر سعید رمضان نے ساٹھ کی دہائی میں جنیوا (سوئیٹزرلینڈ) میں قائم کیا تھا اور جس کی مجلس انتظامیہ کے مولانا ایک اہم اور ایکٹو ممبر تھے اور جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے جس کا ایک دورہ مولانا مرحوم کافی پہلے ستر کی دہائی میں کر چکے تھے وہاں آپ کی اسلامی تعمیری فکر عام ہے اور روحانی فیض بھی جاری ہے کہ مولانا کی تصنیفات انگریزی میں عام ہیں اور ہر گھر کی زیب و زینت، اسی طرح آپ سے ذاتی تعلق رکھنے

والے بھی دنیا کے ہر خطے میں پائے جاتے ہیں، اس طرح ایمان و یقین اور للّٰہیت و عبودیت کا چراغ جو آپ نے ہندوستان میں روشن کیا تھا وہ آپ کی تصنیفات اور آپ کے معتقدین و متوسلین کے واسطے سے دنیا کے تقریباً ہر خطے میں روشن ہوا۔

مولانا مرحوم حسنی سادات کی ایک مشہور و متبرک شاخ سادات قطبیہ کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے جداعلیٰ امیر کبیر الشیخ قطب الدین المدنی (وفات ۶۷۷ھ) ساتویں صدی ہجری کے نصف اول میں اپنے رفقاء کے ساتھ بغداد سے براہ غزنی ہندوستان تشریف لائے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب تاتاریوں کے ایران و ماوراء النہر اور پھر عراق پر حملوں اور تاراجی سے مجبور ہو کر کتنے ہی خاندان سادات و غیر سادات بغداد اور عراق کے دوسرے شہروں سے ہندوستان آئے جو اس وقت دہلی میں خاندان غلاماں کی ترک اسلامی حکومت کے سبب عراق و عجم کے لٹے پٹے مسلمانوں کے لئے ایک ملجا و ماوی (Safe haven) تھا۔ یہاں امیر قطب الدین اپنے علوئے نسب اور شرف فضیلت کے سبب شیخ الاسلام کے عہدے پر فائز ہوئے پھر آپ نے اس وقت کی بڑھتی ہوئی مسلمان حکومت میں جہاد کا فریضہ بھی انجام دیا۔ آپ کی قیادت میں موجودہ ضلع الہ آباد (بھارت) میں کڑا مانک پور کا علاقہ فتح ہوا جو سلطان دہلی نے آپ کو بطور جاگیر عطا کیا، آپ کی قبر آج بھی وہاں موجود ہے۔

ان کے بعد ان کی ذریت میں سے ایک بزرگ شیخ علم اللہ عالمگیر کے عہد میں ۱۶۷۳ء اپنے آبائی علاقے سے رائے بریلی (موجودہ اتر پردیش بھارت) شہر سے باہر دریائے سئی کے کنارے آکر آباد ہوئے۔ آپ نے وہاں ایک چھوٹی سی مسجد بنائی جو آج بھی آباد اور پر رونق ہے۔ عالمگیر بادشاہ نے شیخ علم اللہ کو جاگیر دی لیکن انھوں نے قبول نہیں کی اور درویشانہ زندگی کو ترجیح دی۔ اس طرح سادات کے خاندان میں سیاست و امارات کے بجائے اب زہد و درویشی اور علم و تصوف کا چرچا شروع ہوا، خود شاہ علم اللہ مشہور صوفی بزرگ حضرت آدم بنوریؒ کے خلیفہ تھے۔

شاہ علم اللہ کے تقریباً ایک سو سال بعد اس خاندان میں برصغیر کی ایک عظیم ترین مجاہد شخصیت یعنی سید احمد شہید رائے بریلیؒ پیدا ہوئے جن کی ذات فروسیت و عسکریت اور للّٰہیت و روحانیت کی جامع تھی جہاں لاکھوں انسانوں کو راہ ہدایت دکھائی وہاں انہوں نے ہندوستان کے اس دور دراز علاقے سے اپنے مریدین و جانثاروں کے ساتھ سرحد کے علاقے میں براہ سندھ افغانستان آکر سنت جہاد زندہ کی، پشاور اور سرحد کے دوسرے علاقوں کو سکھوں کے تسلط سے آزاد کرایا۔ بالآخر ہندوستان میں آنے والے اپنے پہلے مجاہد سید عبداللہ الاشتر بن محمد النفس الزکیہ شہید بن عبداللہ المحض سید حسن مثنیٰ بن سیدنا حسن کی طرح اس سرزمین ہند میں اسلام کی سربلندی کے لئے اپنی جان قربان کی۔

برصغیر پر اس حسنی خاندان کے دو احسانات ہیں۔ ایک سیدنا حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتے کے پوتے سید عبداللہ الاشترؒ کی ۱۴۵ھ میں سندھ میں آمد اور یہاں ان کی شہادت (ان کی لاش عباسی حکومت کے خوف سے دریائے سندھ میں بہا دی گئی تھی، عبداللہ غازی کے مزار کو عبداللہ اشتر کا مرقد کہنا سراسر غلط ہے (دیکھئے مصنف کی تازہ کتاب تحقیقات و تاثرات میں عبداللہ غازی سے متعلق مقالہ) اور دوسرے سید احمد شہید کی بالاکوٹ میں شہادت (۱۸۳۱ء)۔

سید احمد شہیدؒ کے بعد ان کی آبائی بستی کی اہمیت بہت بڑھ گئی جو تکیہ کے نام سے مشہور ہوئی (تکیہ خانقاہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے) اس خاندان میں علم و فضل کا چرچا تسلسل کے ساتھ رہا۔ مولانا مرحوم کے دادا سید فخر الدینؒ خیالی اپنے وقت کے ایک روشن ضمیر مصنف اور شاعر تھے، آپ نے مہر جہانتاب لکھی۔ مولانا مرحوم کے والد مولانا حکیم عبدالحیٔ حسنیؒ برصغیر کے ایک انتہائی مشہور مورخ و ادیب تھے جن کی اردو ادب کی تاریخ ''گل رعنا'' برصغیر کی ایک بے مثال اور ضخیم ثقافتی، سیاسی اور تمدنی تاریخ ہے جس میں برصغیر کی تمام اہم شخصیتوں کا صدی بہ صدی ذکر ہے اس کے کچھ حصوں کا اردو ترجمہ

بھی ہو چکا ہے۔ مولانا حکیم عبدالحئی صاحبؒ مولانا شبلیؒ کے رفقاء میں تھے اور ندوۃ العلماء کے تاحیات ناظم رہے۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں اس خاندان کے کچھ افراد میں انگریزی وعصری علوم کا شوق پیدا ہوا، بعض لوگ انگلستان سے بیرسٹر ہو کر آئے اور ایک صاحب امریکہ سے انجینئرنگ پڑھ کر اور کام کر کے آئے لیکن شرافت کے اثر سے دین کا چراغ خاندان میں باقی رہا، خود مولانا مرحوم کے بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ نے لکھنؤ کے مشہور کنگ کالج سے ایم بی بی ایس کیا اور ساتھ ہی حکمت پڑھی اور دیوبند میں حدیث کی تعلیم حاصل کی اور اپنی وفات تک مطب کرتے رہے۔ مرحوم اپنے والد کی جگہ ندوۃ العلماء کے ناظم بھی منتخب ہوئے اور آخر تک اس ذمے داری کو بخوبی انجام دیتے رہے۔ ۱۹۶۱ء میں ان کی وفات کے بعد ندوۃ العلماء کی نظامت مولانا علی میاں مرحوم کے حصے میں آئی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ کالج کے قیام انیسویں صدی کے اواخر میں برصغیر کچھ دردمند اور دقیقہ رس علماء کو دین و دنیا کی تعلیم میں پائی جانے والی اور بڑھتی ہوئی خلیج کے اثرات بد کا اندیشہ لاحق ہوا اور انہوں نے ایک ایسی علمی انجمن قائم کرنے کا عزم کیا جو دین و دنیا کی جامع اور ہمہ گیر تعلیم کا منصوبہ بنانے اور اس کو عملی جامع پہنائے اور اس طرح مولانا محمد علیؒ اور دوسرے علماء کے اشتراک سے جن میں حکیم مولانا عبدالحئی اور مولانا شبلیؒ بھی شریک تھے۔ ندوۃ العلماء کی انجمن ۱۸۹۳ء میں ایک دارالعلوم کی بنیاد لکھنو میں ڈالی۔ یہ چھوٹا سا ابتدائی مدرسہ مولانا شبلیؒ کے دور سے ترقی کرتے کرتے اب ایک عظیم الشان اسلامک عربی یونیورسٹی ہے جس میں عربی ادب، تفسیر، حدیث، فقہ کے ساتھ عصری علوم بھی پڑھائے جاتے ہین اور ان اسلامی علوم میں وہاں تخصص (Specialization) کی ڈگری دی جاتی ہے۔

اس طرح ندوہ مولانا مرحوم کے خاندان اور خاص طور پر مولانا علی میاں مرحوم کے ذاتی اثر ورسوخ اور خلوص وجدوجہد کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ندوہ نے جو ترقی مولانا مرحوم کے عہد میں کی وہ اس سے قبل کبھی نہ ہوئی، ساؤتھ ایشیا میں اس مرتبے کی کوئی دینی درسگاہ نہیں۔ مولانا علی میاں مرحوم ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے، اس طرح وفات کے وقت آپ کی عمر ۸۵ سال تھی۔ آپ بچپن میں یتیم ہوگئے تھے کیوں کہ جب آپ کی عمر ۹ سال تھی تو آپ کے والد کا انتقال ہوا۔ مولانا مرحوم کی تعلیم وتربیت ان کے محبوب و شفیق بھائی سید عبدالعلی صاحب مرحوم کی زیرنگرانی ہوئی اور ایک مخصوص طرز پر یعنی آپ کو ایک ایک علم کی مستقل اور علیحدہ تعلیم دی گئی۔ پہلے عربی پھر قرآن وتفسیر، پھر حدیث پھر فقہ۔ آپ نے تعلیم اپنے زمانے کے مشہور استاد خلیل عرب صاحب سے اور پھر کافی بعد میں مراکش کے ڈاکٹر تقی الدین ہلالی سے حاصل کی۔

مولانا مرحوم کا گھرانہ علم وادب اور دین داری وللّٰہیت کا گھرانہ تھا جس میں خداپرستی کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کا بہت رواج تھا۔ مولانا مرحوم کے دادا اور والد کی تصنیفات کا ذکر ہو چکا ہے، مولانا مرحوم کی والدہ سیدہ خیرالنساء حافظہ قرآن، شاعرہ اور مصنفہ تھیں، اسی طرح مولانا کی ایک بہن امۃ اللہ تسنیم کی حدیث میں کتاب زادِ سفر (ترجمہ ریاض الصالحین عربی) بہت مشہور ہے۔

مولانا مرحوم کی اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز سولہ سال کی عمر میں ہوا جب آپ نے سید احمد شہیدؒ پر عربی میں ایک مقالہ لکھا اور یہ مقالہ کتابی شکل میں مصر میں چھپا اور وہاں کے علماء نے اس کی داد دی۔ مولانا مرحوم کی پہلی اردو کتاب سیرت سید احمد شہیدؒ ۱۹۳۹ء میں چھپی جب آپ کی عمر صرف ۲۵ برس تھی اور اس نے ملک کے مشہور علماء وبزرگان دین سے خراج تحسین حاصل کیا۔ جن میں مولانا اشرف علی تھانویؒ مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد سے تو مولانا مرحوم کے قلم سے تصانیف کا ایک سیل

رواں تھا جو زندگی کے آخری ایام تک موجیں مارتا رہا۔

آپ کی زندگی کے علمی و عملی و روحانی پہلو اتنے متنوع ہیں کہ ایک دو مضامین میں ان کا ذکر کرنا ممکن نہیں ہے ان کی زندگی میں ان پر اردو، عربی میں متعدد کتابیں لکھی گئیں ہیں اور آئندہ لکھی جائیں گی۔ مولانا ممشاد علی قاسمی کی کتاب مولانا ابوالحسن علی ندوی مشاہیر امت کی نظر میں طبع ہو چکی ہے اور اسی طرح گزشتہ سال دمشق سے عربی زبان میں ایک نوجوان ہندوستانی مصنف عبدالماجد الغوری الندوی کی ابوالحسن علی ندوی الامام المفکر و الداعیہ الادیب چھپی ہے۔ تازہ ترین کتاب مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کے قلم سے میر کارواں ہے جس میں مولانا مرحوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

راقم کا ذاتی تعلق مولانا مرحوم سے پورے ۴۳ سال پرانا ہے، یہ تعلق جو ۱۹۵۷ء میں قائم ہوا تھا تادم وفات قرب و بعد کے ساتھ جسمانی یا تحریری طور پر قائم رہا۔ مولانا مرحوم کی رفاقت مجھے لکھنو، رائے بریلی، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، ریاض، دمشق، کراچی، لاہور میں حاصل رہی انگلستان اور لیبیا اور پاکستان سے برابر مراسلت رہی۔ میں نے اپنی زندگی میں ہندو پاکستان اور مصر و شام و حجاز میں بہت سے علماء و بزرگوں کو دیکھا ہے لیکن میری نظر میں مولانا مرحوم جیسا کوئی نیک نفس، عالی حوصلہ، قناعت پسند، شفیق و دردمند، بلند نظر، بلند ہمت، صاحب قلم و صاحب دل نہیں دیکھا۔

مولانا کی تصنیفات کی تعداد ۱۷۶ ہے۔ ایک نوجوان ندوی مصنف طارق زبیر نے مولانا کی تصنیفات کی ایک فہرست گزشتہ سال ۱۹۹۸ء میں شائع کی ہے جس میں یہ تعداد تفصیل سے مذکور ہے۔

مولانا کی مشہور ترین تصنیف وہ ہے جو آپ نے ۱۹۴۷ء میں عربی زبان میں لکھی تھی۔ یعنی ''ماذا خسر العلم بانحطاط المسلمین'' اس کا اردو ترجمہ ''مسلمانوں

کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا'' عربی اصل سے قبل چھپ چکا تھا جو مولانا مرحوم کے ہی قلم سے تھا۔ اصلی عربی کتاب مصر کے ایک مشہور علمی ادارے ''لجنة التاليف و الترجمة و النشر'' کی طرف سے ۱۹۵۰ء میں چھپی اور اس نے سارے عالم عرب سے خراج تحسین حاصل کیا۔ بہت سے عرب مصنفین کے بقول بیسویں صدی کی یہ سب سے زائد چھپنے والی عربی کتاب ہے۔ میر کارواں کے مصنف کے بقول اب تک اس کے ۷۰ قانونی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ غیر قانونی اس کے علاوہ ہیں۔ یہ کتاب مولانا مرحوم کے بقول مصر، شام سوڈان کے پہلے سفر میں ان کا وزٹنگ کارڈ تھا۔ مولانا کی دیگر تصانیف کی طرح یہ کتاب بہت سے ممالک کی عرب یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔ اس کا انگریزی، فارسی، ترکی، انڈونیشی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ انگریزی ترجمہ کا نام ''اسلام اینڈ دی ورلڈ'' ہے۔ حقیقت ہے کہ یہ ایک تاریخ ساز کتاب ہے۔

مولانا کی دوسری انتہائی اہم اور حوالہ (ریفرنس) کی کتاب اردو میں ''تاریخ دعوت عزیمت'' ہے جو سات جلدوں میں اور چھ اجزا میں لکھنؤ اور کراچی سے شائع ہوئی ہے اور برابر چھپ رہی ہے۔ اس میں مولانا مرحوم نے عالم اسلام کی ان ہستیوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے ہر دور میں اسلام کی خدمت اور اس کے پیغام کو تازہ کرنے کا کام انجام دیا۔ یہ عمر بن عبدالعزیزؒ سے لے کر سید احمد شہیدؒ پر ختم ہوتی ہے۔ اس آخری جزو کی دو جلدیں ہیں یہ عربی زبان میں بھی چار جلدوں میں دمشق میں شائع ہو چکی ہے۔ مولانا مرحوم نے اپنی تصنیفات میں تحقیق و جستجو کا وہ معیار قائم کر رکھا ہے جس کی بنا شبلیؒ و سلیمان ندویؒ نے ڈالی تھی بلکہ عصری تقاضوں کے مطابق اس کو کچھ مزید ترقی دی ہے۔ مولانا مرحوم نے اپنے زمانے اور ماقبل کے بہت سے بزرگوں کی سوانح عمریاں بھی لکھی ہیں جن میں تذکرہ فضل رحمان گنج مرادآبادیؒ، سوانح عبدالقادر رائے پوریؒ، مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت، ملفوظات مولانا محمد یعقوبؒ اور سوانح مولانا محمد زکریاؒ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

آپ کی کتاب ارکان اربعہ (نماز، روزہ، حج، زکواۃ) بھی اپنے موضوع پر منفرد کتاب ہے۔ اس کا عربی ایڈیشن کویت و دمشق سے مسلسل شائع ہو رہا، ہے پرانے چراغ (تین (جلدوں میں) ان لوگوں کے سوانحی خاکے ہیں جن کو مولانا نے دیکھا اور جن سے رفاقت رہی۔ تاریخ کے علاوہ یہ ادب کی انتہائی معیاری کتاب ہے۔ مولانا مرحوم کی عربی نثر کی دل آویزی اور اثر انگیزی کے سارے عرب ادیب معترف ہیں اور اسی طرح اردو نثر کی معترف آل احمد سرور اور مرحوم ڈاکٹر ابواللیث جیسی شخصیات رہی ہیں۔

مولانا کے یورپ، امریکہ اور عالم عرب کے سفرنامے بھی خاصے کی چیز ہیں۔ آخر میں مولانا نے خود آپ بیتی کا سلسلہ ''کاروان زندگی'' کے نام سے شروع کیا تھا جس کی سات جلدیں چھپ چکی ہیں۔ وفات سے ڈیڑھ ماہ قبل مولانا مرحوم نے مجھے ساتویں جلد کی اشاعت کی خبر دی تھی۔ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کا ادارہ جس نے مولانا مرحوم کی بیشتر اردو کتابیں شائع کیں۔ کاروان زندگی کی ساتویں جلد شائع کر چکا ہے۔

مولانا مرحوم کی آپ بیتی صرف اپنی ذات کی داستان نہیں بلکہ یہ عالم عرب، ہندوستان، یورپ و امریکہ اور خاص کر پورے عالم اسلام اور مسلمانان عالم کی داستان ہے۔ ہندوستان کے اسلامی مورخ کے لئے تو اس میں بے انتہا علمی سرمایہ ہے۔

عالم عرب کے بہت سے فرمانرواں خصوصاً سعودی عرب کے حکمرانوں سے مولانا کا ناصحانہ تعلق رہا۔ شاہ فیصلؒ سے آپ کی متعدد ملاقاتیں اور مراسلت رہی، اسی طرح ملک سعود بن عبدالعزیز، اردن کے ملک عبداللہ مرحوم اور پاکستان کے صدر ضیاء الحق مرحوم ہیں جو مولانا سے عقیدت مندانہ تعلق رکھتے تھے۔ مولانا عالم اسلام کی تنظیموں کے رکن اساسی یا ممبر تھے۔ آپ رابطہ عالم اسلامی مسلم ورلڈ لیگ، مکہ و مدینہ اسلامک یونیورسٹی کے فاؤنڈر ممبر تھے۔ اسی طرح دمشق کی عرب اکیڈمی، اسلامی انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد فقہ اکیڈمی، جدہ وغیرہ۔ آپ کا یورپ میں اہم کارنامہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں

اسلامک ریسرچ سینٹر قائم کرانا تھا۔ جو چودہ سال قبل بعض عرب شخصیات اور یونیورسٹی کے تعاون سے قائم ہوا وہ جس کے مولانا چیئر مین رہے۔ اسی طرح آپ نے رابطہ ادب اسلامی قائم کیا جس کے جلسے ترکی، اردن، پاکستان وغیرہ میں ہوتے رہے۔

مولانا مرحوم عملی سیاست کے آدمی نہیں تھے لیکن ہندوستان میں جب اسلام اور مسلمانوں پر براوقت پڑا تو مولانا مرحوم پوری قوت اور تندہی کے ساتھ اس کے لئے سرگرم ہوگئے۔ اپنے دوسرے رفقاء کے ساتھ فسادات اور ہندوؤں کے مظالم سے مسلمانوں کو بچانے کیلئے مسلم مجلس مشاورت قائم کی جس سے قبل اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر مولانا نے جمشید پور کا دورہ کیا جہاں مسلمانوں کا قتل عام ہوا تھا اور پوری ہمت وحکمت کے ساتھ ہندوستانی حکومت کو اس پر متنبہ کیا۔ تعلیم میں جب ہندو افکار واصنام پرستی کی آمیزش شروع ہوئی تو مولانا نے اس کے لئے دینی تعلیمی کونسل کی سربراہی قبول کی اور اپنی تقریروں اور دوروں سے سارے ہندوستان میں اس کے لئے کام کیا۔

مسلم پرسنل لاء کو جب خطرہ لاحق ہوا اور ہندوستان میں یونیفارم سول کوڈ کی آوازیں بلند ہوئیں تو شاہ بانو کیس کے سلسلے میں اس میں دوسرے مسلمان لیڈروں کے ساتھ سینہ سپر ہوئے اور وفود کی قیادت کی جو راجیو گاندھی سے ملا اور بالآخر ۱۹۸۴ء میں ہندوستان کی پارلیمینٹ نے مسلمانوں کے پرسنل لاء کی خودمختاری کا قانون پاس کیا۔ غرض مولانا مرحوم عرب ممالک اور خاص طور پر سعودی عرب میں اپنی دعوتی اور علمی مصروفیات کے باوجود بھرپور طریقے سے ہندوستان کے مسلمانوں کی عملی خدمت کرتے رہے۔

مولانا نے کبھی بھی کسی حکمراں سے کوئی ہدیہ، کوئی مدد قبول نہیں کی، وہ درویشی و استغناء کا پیکر تھے۔ انہوں نے کافی عرصے قبل شاہ فیصل ایوارڈ کی کثیر رقم وہیں سعودی اداروں اور جہاد افغانستان میں دے دی تھی (۱۹۹۹ء)، گزشتہ سال رمضان میں امارات کی حکومت کی طرف سے ان کو بھی ایک کروڑ بیس لاکھ روپے کا ایوارڈ ملا۔ مولانا مرحوم نے

اپنے پاس اس رقم سے ایک پیسہ بھی نہیں رکھا بلکہ سب ہندو پاک کے علمی و دینی اداروں کو دے دیا۔ مولانا علماء اور دینی حلقوں کی طرح مشرق و مغرب کی نئی نسل میں بھی انتہائی محبوب شخصیت تھے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں عالم اسلام میں مولانا مرحوم سے زیادہ کوئی مقبول و محبوب شخصیت نہیں۔ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی قبر پر انوار کی بارش کرے۔ آپ کو فردوس میں جگہ عطا فرمائے اور آپ کے فیوض کو قائم و دائم رکھے۔

عارف جنید

اسلام کی نشأۃ ثانیہ میں

''حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا قائدانہ کردار''

مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی خدمات اتنی وسیع وہمہ گیر ہیں کہ ان کے احاطے کے لئے کوئی اکیڈمی ہی بہتر کام کرسکتی ہے، البتہ اس مرحلہ میں سنجیدگی کے ساتھ علم وتحقیق کی روشنی میں انفرادی جائزہ آگے کے لئے بڑا مفید ومعاون ثابت ہوسکتا ہے۔

میں مولانا سے بہت زیادہ قریب تو نہ تھا، البتہ آپ کو قریب سے دیکھا ضرور ہے اور آپ سے کچھ تعلق بھی تھا، ندوہ میں قیام کے دوران جن طلبہ کو مولانا نے مخصوص طور پر خود سے استفادہ کا موقع دیا ان میں میں بھی تھا، اور مدینہ منورہ میں تو مولانا کے ساتھ وقت گذارانے کا کچھ زیادہ ہی موقع ملا، مختلف علمی ودعوتی پروگراموں میں شرکت کے لئے ان دنوں آپ کثرت سے حاضری دیا کرتے تھے، میں نے مولانا کی کتابوں کا ذوق وشوق سے نہ صرف مطالعہ کیا ہے، بلکہ میں نے اپنی آنکھوں سے یہ بھی دیکھا ہے کہ عالم عرب کی ممتاز ہستیاں کس قدر آپ کی عزت واحترام کرتی ہیں، اور آپ کے لئے

پلکیں بچھاتی ہیں۔

مولانا کی شخصیت میں بڑی جاذبیت اور آپ کا ہر انداز نرالا ہوتا تھا، آپ جہاں بھی گئے شمع انجمن بن کر رہے، اور انھیں محفلوں کو رونق افروز کیا جنھوں نے آپ کے کام کی قدر و قیمت کو پہچانا۔

جس وقت آپ کی پہلی تصنیف "ماذاخسر العالم بانحطاط المسلمین" منظر عام پر آئی اسی وقت دوربین نگاہوں نے محسوس کیا تھا کہ یہ شخصیت آگے چل کر آسمان اسلام پر تارہ بن کر چمکے گی، اور مسلم بیداری میں اہم کردار ادا کرے گی، اور آپ کی رحلت کے بعد سارے عالم نے بے ساختہ کہا کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور صحوۃ اسلامیہ کا علمبردار رخصت ہوگیا، ایسے لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے جو آپ کی خدمات کو تجدیدی کارناموں سے موسوم کرتے ہیں۔

تجدیدی اور احیاء دین کیا ہے؟ ایک معاصر اہل قلم عالم دین نے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے تجدیدی کاموں کو ۹ شعبوں میں درج کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جن میں یہ ساری صفات ہوں گی وہ مجدد کامل ہے، لیکن جو ان میں سے کچھ ہی صفات سے بہرہ ور ہوگا وہ جزوی مجدد ہے۔ ان کے بقول وہ نو شعبے اس طرح ہیں:

۱۔ اپنے ماحول کی صحیح تشخیص کہ جاہلیت کہاں کہاں کس حد تک سرایت کر گئی ہے۔

۲۔ اصلاح کی تجویزیں جو جاہلیت کی گرفت کو توڑنے، اور اسلامی تعلیمات کے لئے راستہ ہموار کرے۔

۳۔ اپنی قوت وصلاحیت کا صحیح اندازہ کرے کہ وہ کس حد تک اور کون سا کام کر سکتا ہے۔

۴۔ ذہنی انقلاب کی کوشش، یعنی لوگوں کے خیالات کو بدلنا، عقائد وافکار اور اخلاقی نقطہ نظر کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنا، نظام تعلیم وتربیت کی اصلاح اور علوم اسلامی کا احیاء اور فی الجملہ اسلامی ذہنیت کا از سر نو تازہ کرنا۔

۵۔ علمی اصلاح کی کوشش یعنی جاہلی رسوم کو مٹانا ،اخلاق کا تزکیہ کرنا، اتباع شریعت کے جوش سے لوگوں کو سرشار کرنا۔

۶۔ دین کے اصول کو کلید سمجھنا اور یہ تعین کرنا کہ اصول شرع کے ماتحت تمدن کے پرانے متوارث نقشے میں کس طرح ردوبدل کیا جائے جس سے شریعت کی روح برقرار رہے،اس کے مقاصد پورے ہوں،اور تمدن کے صحیح ارتقاء میں اسلامی دنیا کی امامت کر سکے۔

۷۔ اسلام کو مٹانے اور دبانے والی سیاسی طاقت کا مقابلہ کرنے اور اس کے زور کو توڑ کر اسلام کے لئے ابھرنے کا راستہ پیدا کرنا۔

۸۔ احیاء نظام اسلامی یعنی حکومت کو عملاً اس نظام پر قائم کر دینا جسے صاحبِ شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خلافت علی منہاج النبوۃ کے نام سے موسوم کیا ہے۔

۹۔ ایسی طاقتور عالمگیر تحریک برپا کرنا جس سے اسلام کی اصلاح وانقلابی دعوت عام انسانوں میں پھیل جائے ،وہ تمام دنیا کی غالب تہذیب بنے۔اس تفصیل کو اگر تسلیم کرلیا جائے تو مولانا کو قریب سے جاننے والے اور آپ کے کاموں پر نظر رکھنے والے واقف ہیں کہ ان میں سے اکثر صفات مولانا علی میاں علیہ الرحمۃ میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

مولانا کا تعلق ایک ایسے خانوادہ سے ہے جو بدعات اور جاہلی رسوم وافکار سے ہمیشہ دور رہا ہے ،اور دین سے وابستگی اور صحیح اسلامی تعلیمات پر انحصار اس کے مزاج میں داخل ہے،اس خاندان کی خالص علمی اور دینی ماحول میں آپ کا بچپن گذرا،آپ کے لئے تعلیم وتربیت کا مخصوص انتظام ہوا،عرب وعجم کے چیدہ ومتبحر علماء سے اکتساب فیض کا آپ کو موقع ملا ،اور مسلک ومشرب کی حد بندیوں سے پرے اٹھ کر آپ نے دینیات پر موجود بہترین اور بنیادی کتابوں کا مطالعہ کیا،جس کا نتیجہ نکلا کہ عقائد وافکار اور اسلامی

تعلیمات کے تعلق سے آپ کا ذہن صاف تھا، اور آپ نے بآسانی محسوس کرلیا کہ وہ کون سے خیالات وعادات ہیں جو مسلم معاشرہ میں دخیل ہیں۔ اور امت مسلمہ کی پسپائی وذلت کا سبب بن رہے ہیں، اور کس طرح ان پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

مدارس اسلامیہ جو ذہن سازی کے کارخانے ہیں، اور جن میں اخلاق وکردار کو ڈھالا جاتا ہے، آپ کی علمی زندگی وہاں سے شروع ہوتی ہے، ندوہ میں اصلاح نصاب کی تحریک پہلے سے موجود تھی، اور وہ فنون جو وقت گذرنے کے ساتھ اپنی افادیت کھو چکے تھے نصاب سے ہٹادیئے گئے تھے۔ اور ان کی جگہ دوسرے ضروری ومفید علوم وفنون نے لے لی تھی، لیکن اس کام میں جو تیزی مولانا مرحوم کے ندوہ سے جڑنے کے بعد آئی وہ پہلے ناپید تھی، مولانا ندوہ میں ادب وتفسیر کے استاذ ہوئے، اور آپ نے اپنی فراست اور گہرے مطالعہ سے جلدی ہی اندازہ لگالیا کہ طلبہ کی ذہنی تعمیر اور فکری اصلاح میں ادب طاقتور وسیلہ بن گیا ہے، پس پھر کیا تھا، آپ نے اپنے رفقاء کی مدد سے ادب عربی کا بالکل نیا نصاب تیار کرڈالا، جس میں بقول مولانا مسعود عالم ندوی ''زبان اور دین کو اس طرح ایک دوسرے سے پیوست کردیا ہے جیسے گوشت اور ناخن''۔

قصص النبیین، القراءۃ الراشدہ اور مختارات آپ کی وہ درسی کتابیں ہیں، جو تقریباً ہندوستان کے ہر دینی مدرسہ میں داخل نصاب ہیں، اور عصری درسگاہوں میں بھی ان کو خاصی اہمیت حاصل ہے، مولانا کی دوسری عربی تصنیفات بھی اہم دینی مدارس میں طلبہ کے مطالعہ کے لئے تجویز کی جاتی ہیں، مختارات دو حصوں میں عالمگیر شہرت وقبولیت حاصل کرتی جارہی ہے، شام کے مشہور ادیب شیخ علی طنطاوی رقمطراز ہیں کہ ہم کو شام کے دینی مدارس کے طلبہ کے لئے ایک ادبی مجموعہ کی تلاش تھی، اس کام کے لئے ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل کی گئی اور اس کے ہر ممبر کو پابند کیا گیا کہ وہ اپنی پسند کا مجموعہ پیش کریں، تلاش وجستجو کے بعد بالآخر ہر ایک کی یہی رائے رہی کہ ادبی تقاضوں کی رعایت کے ساتھ دینی

مدارس کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے شیخ ابوالحسن علی کی مختارات سے بہتر دوسرا ادبی مجموعہ نہیں ہے۔

یہ کتابیں طلبہ کو ادب کے زیور سے آراستہ کرتی ہیں، ان میں فہم کا ملکہ اور گویائی کی صلاحیت پیدا کرتی ہیں، انھیں ان کو جذبہ ایمانی سے لبریز اور جوش عمل سے سرشار بھی کرتی ہیں۔

مولانا کی تربیت کا اسلوب بھی بڑا انوکھا تھا، جن لوگوں کو آپ سے براہِ راست استفادہ کا موقع ملا ان کو معلوم ہے کہ مولانا کس طرح اپنی بات دل میں اتار دیتے تھے اور سامنے والے کو اعتماد سے پر کر دیتے تھے۔

ادب عربی میں اپنا خاص مقام رکھنے اور فن کی باریکیوں میں مہارت کے باوجود ایک دفعہ مولانا نے بلا تردد طلبہ کے سامنے بیان کر دیا کہ کسی بات پر زور دینے کے لئے عربی میں کیا تعبیر اختیار کی جاتی ہے اس کو انھوں نے ایک عربی عالم کی زبان سے ایک کانفرنس کی ذیلی کمیٹی کے دوران اُخذ کیا، اور پھر آپ نے پورا قصہ سنایا، الارکان الاربعہ کے درس کے دوران جب کوئی نادر تعبیر آتی تو آپ اس کی خوبیوں کو مزے لے لے کر بیان کرتے اور فرماتے کہ آپ نے یہ تعبیر کہاں سے لی ہے۔

اسلامی تحریکوں سے جڑے صف اول کے عرب علماء بھی اپنے کو مولانا مرحوم کا شاگرد مانتے ہیں اور آپ کے علمی استفادہ کا فخر کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔

آپ نے اپنے علم و فضل اور حکیمانہ کوششوں سے ندوہ کو بلندیوں کی انتہا تک پہنچا دیا، اور اس کو عالم اسلام کا مرجع و مرکز بنا دیا آج ندوہ میں حاضری کی امت مسلمہ کی بزرگ ہستیاں اپنی سعادت سمجھتی ہیں، اور اس کے سایے میں ہند و بیرون ہند سے بے شمار تعلیمی ادارے پنپ رہے ہیں۔

دین تعلیمی کونسل کے ذریعہ اور اپنے ذاتی اثرات و کمالات سے مولانا نے عصری

درسگاہوں کو بھی متاثر کیا، اور اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ آپ کے افکار وخیالات اور آپ کی کتابوں اور تربیت سے فائدہ اٹھانے والے آج پوری دنیا میں کلیدی مناصب پر فائز ہو کر اسلام کا دفاع اور امت مسلمہ کی رہنمائی کر رہے ہیں۔

تدریس اور خلق کی عمومی تربیت، دینی مدارس کے لئے نصاب کی تیاری، عصری درسگاہوں کے رشتہ کی دین سے استواری، دعوتی و تعلیمی اسفار، مسلم تنظیموں اور اداروں کی رہنمائی، دینی و علمی کانفرنسوں میں شرکت اور امراء و حکام کی نصیحت اور انسانی ہمدردی کی تلقین جابجا آپ کے زندگی میں دیکھی جاسکتی ہیں لیکن تاریخ پر گہری نظر اور اس کے اسباب ومحرکات کا پتہ لگالینا اور وقائع واحداث کی معقولا توجیہ اور ان سے دقیق نتائج کا اخذ کرنا اور ادب کے رشتے کو دین سے قائم کرنا آپ کے ایسے کارنامے ہیں جن میں آپ کی ہمسری کا دعویٰ کم ہی لوگ کریں گے۔

مولانا کو تصنیف وتالیف کا ذوق ورثہ میں ملا تھا اور اس کی طرف آپ کا میلان فطری تھا۔ آپ نے اپنے کو بعد میں اسی کے لئے وقف بھی کر دیا اور مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کرنے اور مستقبل کے بارے میں ان کا عزم وحوصلہ بلند رکھنے اور دین پر ان کا ایمان ویقین تازہ رکھنے کے لئے چھوٹی بڑی ۱۷۶ کتابیں انؒ کے نذر کیں۔

مولانا کو کتاب وسنت سے لگاؤ کے ساتھ بلاتفریق اسلامی شخصیات کے احترام کی تعلیم دی گئی تھی، اور ان زبانوں پر آپ کو مکمل عبور تھا جن میں اسلام کا سارا دینی سرمایہ موجود ہے، اس لئے جب آپ تصنیف کی طرف متوجہ ہوئے تو پورے عہد اسلامی پر پھیلے ہوئے علوم ومعارف کے عطر کو کشید کر کے رکھ دیا، اور آپ کی نگہ بلند اور جوہر شناس طبیعت نے تاریخ سے ایسے ایسے گوہر آبدار ڈھونڈھ نکالے کہ دنیا محوِ حیرت رہ گئی۔

مشہور مصری عالم ومصنف وادیب علامہ یوسف قرضاوی کہتے ہیں کہ مولانا کی کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' کے ذریعہ ہم نے پہلی مرتبہ جانا کہ رستم کے

روبرو ربعی بن عامر کے مشہور قول: ''ان اللہ ابتعثنا لنخرجکم من ضیق الدنیا الی سعتھا'' اللہ نے ہمیں کھڑا کیا ہے تاکہ ہم تم لوگوں کو دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی وسعتوں کی طرف لی جائیں کا معنی و مدلول کیا ہے؟ ورنہ اس سے پہلے اس کی گہرائیوں کو ہم جانتے ہی نہ تھے، اور نہ ہی ہمارے علم میں آپ سے پہلے کسی نے اس پر روشنی ڈالی۔

اپنی بات لوگوں کے دلوں میں اتارنے کا آپ کو کمال درجہ کا ملکہ تھا، اور مولانا مرحوم کو اپنی اس صلاحیت کا اندازہ تھا اور اللہ نے اس کے استعمال کا آپ کو سلیقہ بھی خوب دیا تھا، چنانچہ آپ نے اپنی تصنیفات کے لئے عربی زبان کا انتخاب کیا اور ان کی اشاعت کے لئے عرب ممالک کو ترجیح دی، خدانخواستہ اگر ایسا نہ ہوتا تو گوشہ گمنامی سے نکل پانا آپ کے لئے مشکل ہو جاتا۔

ہمارے ہندوستان میں تعصب و تنگ نظری کی وبا عام ہے اور لوگوں میں صرف اپنے حلقہ کی کتابوں کو پڑھنے کا مزاج ہے، اور یہ معلوم ہے کہ اہل ندوہ اور مولانا نے الگ سے اپنا حلقہ بنانے کی کوشش نہیں کی، آپ جماعت اسلامی سے جڑے لیکن آپ کا تعلق دیرپا ثابت نہیں ہوا، ایسا ہی کچھ تبلیغی جماعت کے معاملہ میں پیش آیا، یہ توفیق خدواندی ہی کہی جاسکتی ہے کہ مولانا کی صلاحیتوں کا مظاہرہ عربوں کے درمیان ہوا، جہاں وسعت قلبی و فراخ دلی کے ساتھ اسلامی بیداری کی لہر موجود تھی، چنانچہ عربوں نے مولانا کی تحریروں کو سینے سے لگایا، اس کو اپنے مطالعہ اور مذاکرہ کے حلقوں میں شامل کیا، اور اس کی اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور آپ کو وہ عزت و توقیر دی جس کے آپ مستحق تھے، آپ کے موقف کو دل سے جو تائید و تقویت ملی اس نے مقامی طور پر بھی کام کیا اور بے زاری و مخاصمت کو تعلق و یگانگت میں بدل دیا، اور وقت گذرنے کے ساتھ امت مسلمہ ہندیہ کی قیادت متفقہ طور پر آپکے کاندھوں پر ڈال دی گئی۔

مولانا کو اندرون ملک طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، اور ہر سطح

پر آپ کو ذہنی اذیت میں مبتلا رکھنے کی کوشش کی گئی، لیکن آپ پامردی واستقلال کے ساتھ اپنے موقف پر قائم رہے، اور اپنی ذمہ داریوں کو جرأت وحکمت کے ساتھ نبھاتے رہے اور مسلمانانِ ہند کو مختلف امتحان وآزمائشوں سے کامیابی کے ساتھ باہر نکالا۔

مولانا کی تحریروں کا مرکز ومحور مسلمانوں میں خود اعتمادی کی روح، اسلام کی طرف بازگشت کا جذبہ اور جوش عمل پیدا کرنا ہے، ان چیزوں کو مولانا نے اپنی زندگی کا مشن بنالیا تھا، آپ ''مسلم ممالک میں اسلامیت ومغربیت کی کشمکش'' کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ :فکر ونظر اور مسلمانوں میں احساس خودی پیدا کرنے اور ان کی شخصیت کو ابھارنے کے جس سلسلے کا آغاز عربی میں ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' اور اردو میں ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' سے کیا گیا تھا اس کی اس کتاب کے ذریعے تکمیل کی گئی، اس طرح وہ اس سلسلہ کی پہلی اور یہ اس کی دوسری کڑی ہے، پہلی کتاب کا اختتام اقبال کے اس شعر پر کیا گیا تھا، ''معمارِ حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز'' اور اب اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ عالم کی تعمیر نو میں اب کن حقائق وواقعات کا لحاظ اور کن پہلوؤں کی رعایت کرنی ہوگی۔

آپ کی تصنیفات میں جس طرح تاریخی، سیاسی، سماجی اور اخلاقی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے، عبادات وسلوک کو بھی آپ نے پوری اہمیت دی ہے اور اہل تصوف وطریقت کے افکار وطریق کار کا استحسان کے ساتھ ذکر کیا ہے جن کو عالم کی تعمیر نو میں آپ ضرور خیال کرتے ہیں، مولانا کی طرف سے یہ آخری کوشش بعض دینی حلقوں میں ناپسندیدگی کے ساتھ دیکھی گئی اور اس پر نکیر کی گئی۔

مولانا جس مقصد کی طرف گامزن تھے، اہل بصیرت نے اس کو ابتداء ہی میں تاڑ لیا اور آپ کی سادگی اور بے نیازی نے آپ کے کام کو اور بھی آسان بنادیا، آپ کے مخاطب محسوس کرتے تھے کہ آپ کی باتوں میں سچائی ہے، اخلاص ہے، انسانیت کا درد

ہے، آپ کا انداز حکیمانہ ہوتا اور مقابل کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے آپ اپنی طاقت صرف کر دیتے تھے۔

آپ اسلام کو سربلند اور مسلمانوں کو متحد اور عظیم طاقت اور دنیا کی قیادت کرتے دیکھنا چاہتے تھے، آپ کو گوارہ نہیں تھا کہ طریقِ کار اس راستے میں رکاوٹ بنے، دو عرب عالموں کے مابین طریق کار کے اختلاف کی وجہ سے کچھ خلش تھی، آپ نے ان کو سمجھایا کہ مفاد عام کو مقدم رکھنے کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے طریقِ کار کو خود تک محدود رکھیں، آپ کی اسی وسعت نظر نے ہر طبقہ میں آپ کو محبوب بنا دیا تھا، اور ہر جماعت سے آپ کے احترام واکرام پر مبنی تعلقات تھے۔

آپ کو متعدد ایوارڈ ملے، اور آپ کی خدمات اور مقام ومنزلت کو دیکھتے ہوئے علمی اکیڈمیوں اور دینی کانفرنسوں میں آپ کی شرکت ضروری سمجھی گئی، آپ مستقل طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے ترجمان وسفیر تھے، لیکن یہ آپ کا مطمح نظر نہیں تھا کہ آپ ان کے پیچھے اسلامی طاقتوں کو ابھارنے اور ان میں عزم وحوصلہ پیدا کرنے کے لئے کوشاں رہیں، آپ نے اس مقصد کے لئے عالمی رابطہ ادب اسلامی کی داغ بیل ڈالی اور ساری دنیا میں منتشر تعمیری صلاحیتوں کو اکٹھا کر کے ان میں تعاون واتحاد کی شکل پیدا کی اور اسلامی ذہن رکھنے والوں کو امت مسلمہ کی رہنمائی اور اسلامی تعلیمات کی ترجمانی کے لئے زبان وقلم کی طاقت کا احساس دلایا۔

عالمی رابطہ ادب اسلامی کے موجودہ صدر کا اعتراف ہے کہ اس انجمن کا قیام اور عالمی پیمانے پر اس کا فروغ واستحکام صرف مولانا ابوالحسن علی ندوی کے مقام اور کوششوں کا رہین منت ہے۔

آپ کے مقام کو دنیا نے پہچانا، عالم اسلامی کے صالح حکمرانوں نے آپ کی خدمات کو سراہا، آپ کے پند ونصائح پر توجہ دی اور مختلف انداز سے آپ کو نوازا، آپ کی

گراں قدر خدمات کا مظہر شاہ فیصل ایوارڈ، متحدہ عرب امارات کا اسلامی شخصیت کا ایوارڈ، شاہ برونی ایوارڈ اور کلید کعبہ کو پانے کا امتیازی شرف ہے، لیکن آپ کی عظمت وقبولیت کا سب سے بڑا ثبوت رمضان المبارک کے عشرہ اخیرہ میں عین جمعہ سے پہلے عالم ارواح میں ائمۃ الہدیٰ کی صف میں آپ کی شمولیت ہے۔

رحمه الله رحمة واسعة

مولانا شمس الدین آفریدی

حضرت مولانا علی میاںؒ کی علمی خدمات

موت وحیات ایک تسلسل ہے اور قیامت تک یہ جاری رہے گا دنیا میں جو بھی ذی روح ہے موت سے اس کو دوچار ہونا ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ دنیا میں اس سے کسی کا انکار بھی نہیں۔

موت وحیات کا یہ منظر دنیا نے ہمیشہ دیکھا ہے اور آئندہ بھی یہ دیکھتی رہے گی کہ اس کرہ ارض پر روزانہ کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی شکل میں خوشی وغم کے ملے جلے تأثرات پائے جاتے ہیں۔ آج اگر کسی مولود کی پیدائش پر خوشی کے گیت گائے جاتے ہیں تو کل وہیں کسی کی موت پر غم وماتم کی صفیں بچھتی ہوئی نظر آتی ہیں، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس دنیا میں ہر قسم کی اموات ہوتی ہیں اور ان اموات پر لوگوں کے تأثرات بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ ان کی موت خوشی کا باعث ہوتی ہیں اور ان کی موت پر نہ دل رنجیدہ ہوتے ہیں اور نہ آنکھیں نم ہوتی ہیں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ ان کے انتقال سے ان کے محبین ومتوسلین اور عقیدت مندوں کا پورا حلقہ سوگوار بن جاتا ہے اور وہ آنسوؤں، سسکیوں اور ہچکیوں میں ڈوب جاتے ہیں اور کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ ان کی وفات پورے عالم کی وفات ہوتی ہے۔ ان

کی وفات اپنے، پرائے، دوست واحباب، اعزہ واقرباء متعارف اور غیر متعارف ہر ایک کے لئے غم واندوہ کا باعث ہوتی ہیں وہ لوگ جن سے زندگی میں نہ ملاقات نہ بات اور نہ راہ ورسم ہر ایک پر ایک غم طاری ہوتا ہے اور یہ غم اسے بیتاب کئے رہتا ہے کبھی وہ اشکوں سے منھ دھوتا ہے کبھی وہ دہاڑیں مار کر رونے لگتا ہے اور کبھی وہ ہچکیوں میں مرنے والے کی خوبیاں اور اوصاف بیان کرنا شروع کر دیتا ہے، غرضیکہ ایسے انسان کی وفات سے انسانی طبیعتیں تڑپ اٹھتی ہیں۔ روحیں مچل جاتی ہیں اور دل ودماغ سوچنے سمجھنے اور کام کرنے سے عاجز نظر آتے ہیں۔ انسان پر ایک بیخودی اور سکتہ کی کیفیت طاری رہتی ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمۃ کی وفات بھی کچھ ایسے ہی اثرات کی حامل تھی ایک سال قبل جب اس کی اطلاع ملی تو پورا عالم سوگوار ہو گیا تھا اور بقول بعض ایک صدی کا خاتمہ تھا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس دن سے پہلے ''دامت برکاتہم'' ''مدظلہ العالی'' اور ''زید مجدہم'' تھے مگر اب ''رحمۃ اللہ علیہ'' اور ''نور اللہ مرقدہ'' ہو گئے، مولانا کی وفات سے ملت یتیم ہو گئی اور ملک ایک ناقابل تلافی نقصان سے دوچار ہو گیا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایک ہمہ جہت متنوع صفات اور عالم گیر شخصیت کے مالک تھے قدرت نے آپ کو ہر طرح سے نوازا تھا، تحریر وتقریر آپ کو ورثہ میں ملی تھی زبان پر قدرت کے علاوہ الفاظ کا ذخیرہ آپ کے پاس بے انتہا تھا جس طرح چاہتے اپنے مافی الضمیر کو ادا کر لیتے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی پورے پچاسی سال اس دنیائے رنگ وبو میں سانس لے کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے آپ یوپی کے ایک چھوٹے سے قصبہ رائے بریلی کی ایک چھوٹی سے بستی دائرہ شاہ علم اللہ کلاں میں ۵ر دسمبر ۱۹۱۳ء بروز جمعہ پیدا ہوئے آپ کا گھرانہ دینی تھا پورا ماحول دین کا گہوارہ تھا، آپ کی تعلیم وتربیت خالص دینی ماحول ومزاج میں ہوئی والد ماجد اور والدہ ماجدہ دونوں دینی اور مذہبی ذہن ومزاج

کے تھے اس لئے آپ پر دینی اثرات بچپن ہی سے پڑتے چلے گئے۔

موجودہ دور اور موجودہ اکابر میں آپ کثیر التصانیف مصنف کی حیثیت سے جانے جاتے تھے، آپ کی کتابیں ہندو پاک اور دیگر اسلامی ملکوں میں کافی مقبول ہوئیں کچھ ایسی بھی کتابیں ہیں کہ وہ دیگر ملکوں کے کورس میں شامل ہیں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی! نہ صرف برصغیر بلکہ عالم اسلام کی ایک معتبر اور بلند و بالا شخصیت تھے، اپنے علم و فضل، فکر و فن، زیرک و دانائی اور سیرت و کردار اور اخلاق کی وجہ سے ہر دل عزیز اور محبوب خاص و عام تھے مولانا ایک مفکر بھی تھے اور مدبر بھی، مورخ بھی تھے اور مصنفِ بھی، ادب و انشاء میں مولانا کو ید طولیٰ حاصل تھا، مولانا کی تحریر و تقریر میں فکر و حکمت اور دینی رنگ رچا بسا تھا اور شعر و اشعار کی جلوہ نمائی بھی رہتی تھی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی! معمار قوم و ملت اور نباض وقت اور حالات تھے قوم و ملت کی انہوں نے فکری تعمیری کی ہے اور وقت و حالات کے تقاضے کو سمجھا ہے اور پورا کیا ہے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی علمی، ادبی اور تصنیفی خدمات نصف صدی سے زیادہ عرصہ پر محیط ہیں مولانا نے لکھا اور خوب لکھا، عربی اور اردو دونوں زبانوں میں مولانا کی تحریریں منظر عام پر آئیں اور مولانا نے تقریریں بھی خوب کیں، ان کی اکثر تقریریں اب کتابی شکل میں لوگوں کے سامنے ہیں، اور اہل فکر و دانش کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہیں۔

عربی زبان میں مولانا کی ڈیڑھ سو کتابیں اور اردو زبان میں دو سو سے زیادہ کتابیں ہیں اسی سے مولانا کی جلالت شان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے سات جلدوں میں مولانا کی خودنوشت سوانح حیات ''کاروانِ زندگی'' خود ان کا منھ بولتا کارنامہ ہے اس کے مطالعہ سے حضرت کی زندگی اور صدی کے احوال کا تجزیہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی! ایک کثیر المطالعہ اور وسیع المشاہدہ عالم دین

کے علاوہ ہندوستان کے ایک معروف صحرانورد مورخ بھی رہے ہیں۔ مولانا نے ہندوستان اور بیرون ہند کے بے شمار سفر کئے اور ہر سفر میں اپنی چھاپ چھوڑی۔ مولانا ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان کی کئی تنظیموں اور تحریکوں سے وابستہ رہے ہیں اور ہر ایک میں آپ نے فعال قیادت کی ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی! ایک مایہ ناز عالم دین کے علاوہ ایک ہندوستانی سپوت اور محبت وطن بھی رہے ہیں، وطن اور انسانیت کے لئے مولانا کا دل ہمیشہ دھڑکتا ہی رہتا تھا ''پیام انسانیت'' کی تحریک دراصل یہی جذبہ تھا کہ انسانوں کے دل مل جائیں اور وہ بھائی بھائی ہو جائیں وفات سے ایک روز قبل ہندوستانی جہاز کے اغوا کنندگان کی مذمت کرنا آپ کے ہندوستانی سپوت ہونے کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو ہندوستان اور بیرون ہندوستان کی طرف سے اہم اور قابل فخر اعزازات دیئے گئے، مسجد حرام میں دخول کعبہ کے وقت آپ کو کلید پیش کی گئی تو آپ نے فرمایا کہ ''مسجد حرام میں دخول کعبہ کے لئے کلید بیت اللہ پیش کیا جانا رائے بریلی کے یتیم کے لئے سب سے بڑا اعزاز ہے''۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے کوئی اولاد نہیں تھی لیکن روحانی اور فیض رسانی کے لحاظ سے آپ لاولد نہیں تھے، موجودہ دور کے اکثر مولوی آپ کے خوشہ چیں ہیں اور ندوی برادری تو آپ کی مرہون منّت ہے کہ ان کو جو کچھ ملا آپ کی بدولت ملا، ہندوستان میں بھی اور ہندوستان سے باہر بھی آپ کا نام جتنی عقیدت اور جتنے احترام سے ہندوستان میں لیا جاتا تھا اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ غیر ممالک میں بھی لیا جاتا تھا یہ آپ کی علو مرتبت اور رفعت شان کی ایک ادنیٰ جھلک ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی! اپنے اثر ورسوخ سے بہت سے فتنے کو عوام تک آنے سے پہلے ہی ختم کر دیتے تھے آپ میں ملی تڑپ، قوم کی ہمدردی، اور ملکی امن

وسلامتی تھی، آپ کے کام ملک وملت کے فلاح وبہبود میں ہوتے تھے انسانیت کی تعمیر اور ملک وملت کا مفاد ہمیشہ آپ کے پیش نظر تھا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی وفات ایک ایسے وقت میں ہوئی کہ لوگ جمعہ کی تیاری کررہے تھے جنگل کی آگ کی طرح آپ کی وفات کی خبر پورے ملک میں پھیل گئی ہندوستانی ادارے، انجمنیں اور تنظیمیں حرکت میں آگئیں، فوراً ہنگامی میٹنگ بلائی گئی اور آپ کو خراج عقیدت پیش کیا گیا دینی مدارس نے اپنے اپنے یہاں تعزیتی جلسے منعقد کئے آپ کی شخصیت پر متفرق پہلوؤں سے روشنی ڈالی اور آپ کی وفات کو ملک وملت کا عظیم نقصان قرار دیا۔

۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء مطابق ۲۳ر رمضان ۱۴۲۰ھ بروز جمعہ موعود گھڑی آپہنچی جس کو خلاق عالم نے ہر انسان کے لئے مقرر کررکھی ہے حضرت مولانا کی بے تاب روح قفس عنصری سے پرواز کرکے رفیق اعلیٰ سے جاملی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

ناانصافی اور وطن دشمنی

"اس ملک میں مسلمانوں کی حکومت وتہذیب کا ایک دور گذرا ہے جو چھ سات سو برس کی طویل مدت ہے۔ یہ ہندوستان کی تہذیب وترقی کا ایک شاندار دور ہے جس کو ہندوستان کی تاریخ سے خارج کرنا اس ملک کے ساتھ بڑی ناانصافی اور وطن دشمنی ہے اس دور میں ملک کی ترقی وشادابی کے بہت سے ایسے کام ہوئے جن سے ہمارا ملک ابھی تک فائدہ اٹھا رہا ہے اور صدیوں تک فائدہ اٹھائے گا۔ اس زمانہ کے بہت سے نقش ایسے ہیں جو ہمارے ملک کی خوبصورتی اور ناموری کا باعث ہیں۔ اس دور میں ایسی ہستیاں پیدا ہوئیں جس پر ساری دنیا اور پوری انسانیت کے سامنے اس ملک کو فخر کرنے کا حق ہے اور جن سے ساری دنیا میں اس ملک کی عظمت قائم ہے"۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

حسین امین

رابطہ ادب اسلامی

مولانا علی میاں کی فکری قیادت اور تحریک ادب اسلامی کا ثمرہ

عالم اسلام کے مؤقر ادبی ادارے رابطہ ادب اسلامی عالمی کے سہ ماہی اردو ترجمان ''کاروان ادب'' کے زیر نظر شمارے میں ایک ادبی مضمون کے ساتھ حاضر ہونے کی فرمائش راقم الحروف کے لئے جتنی باعث فخر بات تھی اتنی ہی اس فکر کا باعث بھی تھی کہ کس موضوع کا انتخاب کیا جائے، مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اکثر فرمایا کرتے تھے کہ کسی وبا کا پھوٹ پڑنا اتنی تشویش کی بات نہیں ہے جتنی یہ کہ اس کا علاج کرنے والا کوئی نہ ہو، یا کہیں فساد ہو جانا اتنی باعث تشویش بات نہیں ہے جتنی یہ کہ اس کو روکنے والا کوئی نہ ہو۔ حضرت کے ان اقوال زریں کی رعایت سے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ محض ادیب یا شاعر بن جانا اتنی خاص بات نہیں ہے جتنی یہ کہ مذہب اور خدا سے بغاوت پر مبنی ادبی تحریکوں کے جو معاشرہ کو اخلاقی اور تہذیبی نیز انسانی قدروں سے دور مادہ پرستی اور الحاد کی طرف لے جا رہی ہیں، مقابلے پر صالح اور تعمیری ادبی تحریک چلانے کے لئے باقاعدہ اور منظم طور پر رہنمائی کرنے کی فکر کرنے والا بھی کوئی ہو۔

اس مرحلے پر قدرتی طور سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی معروف

بہ علی میاں کا نام دماغ میں آیا جو نہ صرف خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے، بیسویں صدی کی ایک غیر معمولی شخصیت تھے، عربی زبان کے جید ادیب اور خطیب تھے بلکہ ایک ایسے انقلابی ذہن کے بھی حامل تھے جس نے ادبی، دینی، دعوتی، علمی، تاریخی اور فکری تصنیفات پر اکتفا نہیں کی بلکہ زبان وادب کی طاقت کو اس حیثیت سے سمجھ کر کہ یہ طاقت تعمیری بھی ہوسکتی ہے اور تخریبی بھی وہی وہ ''کوئی'' بن کر بالکل نوعمری میں صالح، تعمیری، بامقصد اور موثر ادب کی تخلیق کی اپنی فکر کو ایک تحریک چلائی جو بالآخر رابطہ ادب اسلامی عالمی کی شکل میں ڈھل کر سامنے آئی، جو شریفانہ اور مہذب ادب کو فروغ دے رہی ہے۔

اسلامی ادب کی تحریک مولانا علی میاں کا ایسا کارنامہ ہے جو ہمیشہ عصری تقاضوں کو پورا کرتا رہے گا، رابطہ ادب اسلامی کے نام کا ادارہ ایک ارتقائی دور سے گذر کر تکمیل تک پہنچا ہے اور عربی، اردو، ترکی، بنگالی سمیت کئی زبانوں میں ادیبوں کی صلاحیتوں کو تعمیری مقصد کی سمت دے رہا ہے۔

مولانا علی میاں کی متنوع کمال شخصیت بھی عجیب تھی جس کا ہر پہلو تابناک تھا، صحیح معنوں میں اقبال کے ''مردمومن'' تھے، ان کی ہمہ جہت شخصیت بیک وقت دینی، دعوتی، علمی، انسانی وغیرہ سرگرمیوں پر محیط تھی، انہوں نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا سے لے کر جب انہوں نے مفکر اسلام، شاعر مشرق علامہ اقبال کی مشہور نظم چاند کا عربی نثر میں ترجمہ کیا اور اپنے پھوپھا مولانا سید محمد طلحہ کے ساتھ علامہ کی خدمت میں بمقام لاہور حاضر ہوکر اس ترجمہ کو ان کی خدمت میں پیش کرنے کا شرف حاصل کیا، اور انتہا اپنے مالک حقیقی کے حضور میں پہنچنے سے چند ماہ قبل اپنی خودنوشت سوانح بعنوان ''کاروان زندگی'' کی ساتویں اور آخری جلد پر ہوئی، دینی، دعوتی فکری، تاریخی، علمی، صحافتی، انسانی اور ادبی واصلاحی موضوعات پر قابل قدر تصنیفات سے علمی خزانوں کو مالامال کیا جو عربی، اردو میں تو تھی ہی لیکن انگریزی، فرانسیسی، جرمن، ترکی، بنگالی سمیت مختلف زبانوں

میں ان کے ترجمہ نے مولانا کی علمی شخصیت میں چار چاند لگا دیئے، یہ تصنیفات انسانیت کے لئے مسلسل فکری غذا فراہم کر رہی ہیں۔

مولانا علی میاں کی علمی شخصیت کی شناخت، عمر کا بڑا حصہ گذر جانے کے بعد نہیں ہوئی، اقبال کی نظم کا ترجمہ تو علی میاں کے آفتاب کی لو پھوٹنے سے پہلے کی سرخی تھی جس کے بعد ۱۶ ربرس کی عمر میں یعنی ۱۹۳۱ء میں عربی میں ان کا پہلا مقالہ جو سید احمد شہید کی تحریک سے متعلق تھا سید رشید رضا مصری کے مجلّہ المنار میں شائع ہوا جو بعد میں الگ رسالہ کی شکل میں شائع ہوا، پھر اردو میں ان کی پہلی تصنیف بعنوان سیرت سید احمد شہید ۱۹۳۸ء میں منظر عام پر آئی ۱۹۴۷ء میں ان کی مشہور زمانہ عربی تالیف ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین شائع ہوئی۔

آخری الذکر تالیف نے مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی عالم عرب میں شہرت اور مقبولیت کے لئے وہی کام کیا جو اول الذکر تصنیف نے برصغیر میں کیا تھا، درمیان میں مولانا نے مختارات من ادب العرب، قصص النبیین اور القراۃ الراشدہ کے سلسلے مکمل کئے جس نے عالم عرب میں ان کی پہچان کو اور مضبوط کیا، خاص طور سے مختارات من ادب العرب نے جو دراصل وہ پودا تھا جو اب رابطہ ادب اسلامی کے نام کا ایک تناور درخت ہے۔

مولانا علی میاں کو عربی زبان پر ایسی قدرت حاصل تھی کہ اہل زبان انگشت بدنداں رہتے تھے اور اردو تو ان کی اپنی زبان تھی ہی، اس کے علاوہ ان کو انگریزی فارسی اور کچھ حد تک ترکی زبان پر دسترس حاصل تھی انہوں نے بچوں اور عورتوں سے متعلق ادب بھی تخلیق کیا، ان کی بے شمار تصنیفات عالم عرب کے تعلیمی اداروں کے نصاب میں داخل ہیں۔

مولانا علی میاں کے گہر بار قلم کے جادو کی ایک دلچسپ مثال ان کے کچھ مضامین کے مجموعوں بعنوان ''کاروان مدینہ'' میں ملتی ہے جس کے اردو اور انگریزی

ایڈیشن لکھنؤ میں اور عربی ایڈیشن مدینہ طیبہ میں شائع ہوئے۔ مولانا نے سعودی عرب میں مقیم شام کے ممتاز ادیب ودانشور اور استاد علی طنطاوی سے کتاب پر مقدمہ لکھنے کی فرائش کی تھی جس کے جواب میں انہوں نے ایک مختصر مگر جامع مضمون ارسال کیا اور اس میں بتایا کہ میرا اپنے بارے میں اعتماد متزلزل ہوگیا تھا، جب آپ کی کتاب ''الطریق الی المدینہ'' (کاروان مدینہ) کو پڑھا تو میں نے محسوس کیا کہ شوق میرے اندر پھر انگڑائی لینے لگا ہے، میرا دل جو ہر محبت سے خالی نہیں ہوا ہے لیکن افکار زمانہ اور وقت نے اس جوہر کو گرد آلود کر دیا تھا، آپ کی کتاب نے اس گرد کو ایک بار پھر صاف کر دیا، انہوں نے لکھا کہ ادب کی طرف سے میرا اعتماد اٹھنے لگا تھا، چونکہ ادیبوں میں وہ آسمانی نغمہ عرصہ سے نظر نہیں آیا جس کی لے میں (عہد عباسی کے نامور شاعر) شریف رضی سے لے کر (مشہور عارف وشاعر) سیدی عبدالرحیم البرعی تک شعراء گاتے تھے، جب میں نے آپ کی کتاب پڑھی تو یہ کھویا ہوا نغمہ پھر مجھے مل گیا، یہ نغمہ مجھے آپ کی اس نثر میں ملا جو کہ حقیقتاً شاعری ہے، آپ کا صد ہزار شکریہ کہ آپ نے دوبارہ میرے اندر اپنی ذات اور اپنے ادب پر اعتماد بحال کر دیا۔

عراق کی محترم تاریخی راجدھانی بغداد میں جامعہ اعظمیہ کے خطیب اور ممتاز عالم دین اور ادیب ڈاکٹر شیخ المحروس نے جو رائے بریلی میں مولانا محمد ثانی ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام رابطہ ادب اسلامی کے بین اقوامی سمینار میں شرکت کرنے آئے تھے یہ اعلان کیا تھا کہ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی شخصیت نے ساری دنیا کو متاثر کیا ہے اور عالم عرب ان کی تصنیفات پر انحصار کرتا ہے، علماء اور ائمہ کے اسی مشہور علمی شہر بغداد میں القادریہ ٹرسٹ کے چیرمین اور ''بڑے پیر'' حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ'' کی ساتویں پشت کے ممتاز فرد یوسف جیلانی صاحب نے جیلانیؒ کے مزار کے قریب کھڑے ہو کر راقم الحروف کو بتایا تھا کہ القادریہ کامپلکس کی لائبریری کی زینت جن کتابوں سے ہے ان میں مولانا علی

میاں کی کتابیں بھی شامل ہیں۔

انگلستان کے شہر مانچسٹر میں ''مانچسٹر اکیڈمی'' کے صدر علامہ خالد محمود کے بقول امام غزالیؒ کے بعد مولانا علی میاںؒ پہلے مجدد تھے جو عقل اور نقل دونوں کے جامع تھے۔

مولانا علی میاں کے بارے میں یہ تاثرات تو محض ''ٹپ آف دی آئس برک'' کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی برف کے سمندری پہاڑ کے پانی کے اوپر نظر آنے والی وہ یخ بستہ چوٹی جسے دیکھ کر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ نیچے پہاڑ کتنا وسیع ہے، مولانا علی میاں کی کوہ پیکر شخصیت پر ممتاز ماہر لسانیات مکہ کی ام القریٰ یونیورسیٹی کے سابق پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کی تصنیف ''میر کارواں'' اور مولانا ممشاد علی قاسمی کی تالیف ''مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اکابرین ومشاہیر کی نظر میں'' اس ''ٹپ'' سے بہت نیچے گہرائی تک لے جاتی ہے۔

اس عظیم شخصیت ـــــ مولانا علی میاں ـــــ نے ہمیشہ تصنیف وتالیف کے میدان میں نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ آنے کے لئے اور حصول علم کے لئے کتب خانوں اور بہترین کتابوں کے انتخاب کے لئے ایک دعوتی مہم جاری رکھی، یہ فکران کو نوعمری سے لاحق تھی، وہ ہمیشہ انتہائی باخبر انسان رہے، بے حد حساس بھی تھے اور ادب کو خدابیزاری، اخلاقی پستی، الحاد اور مادہ پرستی کی طرف لے جانے کا ذریعہ بنائے جانے کی تحریکوں سے بے چین رہتے تھے۔

مولانا علی میاں کا استاد کی حیثیت سے تقرر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ۱۹۳۴ء میں ہوا تھا جب ان کی عمر ۲۰ ربرس کی تھی، وہ تفسیر وحدیث اور عربی ادب کے مضامین پڑھاتے تھے، کبھی کبھی تاریخ اور منطق بھی پڑھاتے تھے، نوعمری میں مولانا علی میاں کی تحریروں نے عالم اسلامی میں ان کی پہچان بنادی تھی اور علمی اداروں کو مولانا نے اس حد تک متاثر کیا تھا کہ شام کے قدیم اور عظیم گہوارہ علم وادب دمشق کے مشہور اور باوقار علمی ادارہ المجمع العلمی العربی نے علی میاں کو ادارے کا رکن بنایا، یقیناً اس اعزاز سے ندوہ کو فخر کا

وہی احساس ہوگا جو ہندوستان کو اس وقت ہوا تھا جب مفکر اسلام مولانا علی میاں کی خدمت میں کلید کعبہ پیش کی گئی تھی۔

دمشق کی اس اکیڈمی کی رکنیت پانے کے بعد مولانا علی میاں نے جب حسب روایت اکیڈمی کی سہ ماہی میگزین میں مقالہ لکھا تو انہوں نے بین اقوامی سطح پر اہل قلم حضرات کو دعوت دی کہ عربی ادب کا از سر نو جائزہ لیا جائے اور اس میں سے اسلامی ادب کو ممتاز کیا جائے، یہیں سے اسلامی ادب کی تحریک نے جنم پایا، انھیں کی تجویز پر امام محمد بن سعود یونیورسیٹی ریاض کے شعبۂ ادب کے صدر ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت الپاشا نے کام شروع کیا، ادب اسلامی کی اصطلاح یقیناً ایک قدیم اصطلاح ہے جیسا کہ خود کاروان ادب کے ایک ''ابتدائیہ'' میں کہا گیا ہے، عربی میں یہ اصطلاح اصلاً اسلام کے اول ادبی عہد کے لئے استعمال کی جاتی رہی ہے جو آغاز اسلام سے ۱۳۲ھ تک پھیلا ہوا تھا اور جس میں عہد نبویؐ کے دس برس، عہد خلافت راشدہ کے تیس برس اور عہد اموی کے نوے برس شامل ہیں۔ یہ تین دور ادبی خصوصیات کے سبب سے ادب اسلامی کے دور تھے، کبھی کبھی ادب کے لئے اسلامی کی صفت کا استعمال اسلامی تصور وفکر کی بنیاد پر کیا گیا لیکن وہ اصطلاح نہیں بنا تھا، اس حیثیت سے دراصل مغربی ادبی فلسفہ وفکر کے حملوں کے وقت سے ادب کو دیکھا جانا شروع ہوا، اس میں ادب کے مختلف اسلامی مکتب فکر کے لوگوں کا قیمتی حصہ ہے، ادب کی اس اصطلاح کو قدیم وجدید دونوں ادبی سرمایوں تک وسیع کرنے کا کام اصلاً سب سے پہلے مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے ذہن میں آیا جس کی عکاسی ان کے اس مقالے میں ہوئی جو دمشق کی اکیڈمی کے میگزین کے لئے لکھا تھا۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت الپاشا نے بھی اپنی ایک تحریر میں لکھا ہے کہ ''ہمیں یہ دعویٰ نہیں کہ ہم نے سب سے پہلے اسلامی ادب کی دعوت دی بلکہ ہم نے دراصل چند مسلم مشاہیر ادباء کی تقلید کی ہے، اس موضوع پر سب سے پہلے لکھنے والے عالم باعمل

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ہیں جب انہوں نے المجمع العلمی العربی کا ممبر منتخب ہونے کے وقت ادب میں اسلام کے تصور کی طرف توجہ دلائی تھی، اس طرح وہ اس ادب کے پہلے داعی اور اس طرف متوجہ کرنے والوں کے سرخیل ہیں، پھر شہید اسلام سید قطبؒ نے اس موضوع پر ایک مقالہ لکھا اور اسے اپنی کتاب "التاریخ فکرۃ و منہاج" میں شامل کیا۔

مولانا علی میاں نے اپنی اس اچھوتی فکر کے اظہار اور اہل قلم کو اس طرف توجہ دینے کی دعوت کے بعد جس میں انہوں نے اپنے دل کے جذبات کو گویا زبان دی اپنے اسلامی ادب کے تصور کو عملی شکل دینے کے لئے "مختارات من ادب العرب" کے عنوان سے کتاب لکھی جس میں انہوں نے ادب اسلامی کے نمونے جمع کئے، اس نوعیت کی اور بھی کتابیں لکھیں جیسے قصص من التاریخ الاسلامی وغیرہ۔

مولانا علی میاں کی ادب اسلامی کی تحریک کے زور پکڑنے میں دیر نہیں لگی، عرب علماء اور دانشوروں نیز اہل قلم نے اس دعوت کی جس طرح سے پذیرائی کی وہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ ادبی اور فکری خلاء پر ہو گیا جو ایک عرصہ سے چلا آرہا تھا، یہ تحریک ادب کے میدان میں ایسے تصنیفی رجحانات پیدا کرنے کا ذریعہ بن گئی جو معاشرے کو اخلاقی انحطاط سے بچائے رکھے، ایسے ادب کی تخلیق پر توجہ دی جانے لگی جو عقیدۂ توحید سے وابستہ ہو، ادیب اپنے مطالعہ اور تحریر کے وقت یہ شوق اور جذبہ رکھتا ہو کہ وہ دوسری اقوام کے ادب کی وہی چیزیں پیش کرے جو ہمارے ذہن و اخلاق سے میل کھاتی ہوں، جیسا کہ شیخ عبداللہ بن ابراہیم الانصاری ناظم مذہبی امور قطر نے لکھا ہے۔

مولانا علی میاں کے بقول ادب ادب ہے خواہ وہ کسی مذہبی انسان کی زبان سے نکلے، کسی پیغمبر کی زبان سے ادا ہو، کسی آسمانی صحیفہ میں ہو، اس کی شرط یہ ہے کہ بات اس انداز سے کہی جائے کہ دل پر اثر ہو، کہنے والا مطمئن ہو کہ میں نے بات اچھی طرح کہہ دی، سننے والا اس سے لطف اٹھائے اور اس کو قبول کرے، لیکن اب اس دور میں یہ

شرط لگادی گئی ہے کہ جب تک آدمی ترقی پسندی کی باتیں نہ کرتا ہو، جب تک قدیم چیز کا مذاق نہ اڑاتا ہو، جب تک مذہبی صحیفوں پر بھی کوئی چھینٹ نہ ڈال دیتا ہو، اس وقت تک وہ ادب نہیں، مولانا فرماتے ہیں کہ ادب کی سب سے پہلی زیارت جو نصیب ہوئی وہ آسمانی صحیفوں میں نصیب ہوئی، ادب تھا کہاں؟ لیکن جب خدا نے انسانوں کو سمجھانے کے لئے اپنے پیغمبروں کو بھیجا اور ان کو زبان دی اور ان پر معنی کے ساتھ الفاظ وارد کئے تو معلوم ہوا کہ ادب اسے کہتے ہیں، پھر قرآن مجید نے آکر تو اس پر ہمیشہ کے لئے مہر لگادی''۔

مولانا علی میاں کی ادب اسلامی تحریک کے نتیجے میں ذہن سازی کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا، عالم عربی کے ممتاز اہل قلم حضرات کی اس تحریک میں شمولیت بڑھنے لگی، لکھنؤ میں ندوہ کے پچاسی سالہ تعلیمی جشن میں عرب سمیت دنیا بھر کے علماء اور دانشوروں نے ادب اسلامی کی تحریک پر تبادلۂ خیال کیا اور پھر ندوہ میں ۱۹۸۱ء میں ادب اسلامی پر ایک بین الاقوامی سمینار میں ادب اسلامی کے مختلف پہلوؤں پر مقالات پیش کئے گئے، تین درجن سے زیادہ عرب ادباء اور اہل علم نے سمینار میں شرکت کی، اس میں کئی تو وزیر کی سطح کے تھے اور کئی اپنے اپنے علاقے میں دینی اور علمی سربراہ تھے، ہندستان کی یونیورسیٹیوں کے پروفیسیر اور اساتذہ بھی شامل تھے، اس کے تین برس بعد سوانح، افسانہ اور تنقید کا اسلامی نظریہ کے عنوان سے ایک اور بین الاقوامی اجتماع ندوہ میں ہوا، ۱۹۸۱ء میں رابطہ کی داغ بیل تو عملاً ڈالی ہی جاچکی تھی اب اس کو باقاعدہ تنظیمی صورت دے دی گئی۔

مولانا علی میاں کو عالم اسلام کی ممتاز شخصیات نے اپنا فکری قائد مان لیا تھا، ان کی علمی حیثیت ۱۹۸۰ء میں شاہ فیصل ایوارڈ ملنے کے بعد مستند اور معتبر تو ہو ہی چکی تھی لیکن ان کی تحریک ادب اسلامی نے گویا ادباء کو ایک مقصد اور پلیٹ فارم فراہم کردیا تھا، تحریک

اب تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی، یہاں تک کہ مولانا علی میاں جب ۱۹۸۴ء میں اردن کے سفر کے بعد سعودی عرب پہنچے تو ۹ رمئی ۸۴ء کو مصر، شام، یمن اور سعودی عرب کے ممتاز ادیبوں نے ان سے ملاقات کی اور ادب اسلامی کیلئے ایک تنظیم کی تشکیل کی تجویز پیش کی اور مولانا علی میاں کو اس کی صدارت کی دعوت دی، اور ان کو عہدہ قبول کرنے کے لئے رضامند بھی کرلیا، عرب ادیبوں نے بلاد عربیہ میں ادب اسلامی کی اس تحریک کو جو مولانا علی میاں کی ۱۹۵۷ء میں اس تجویز سے شروع ہوئی تھی کہ عربی ادب کا از سر نو جائزہ لیا جائے عالمی رابطہ ادب اسلامی کا نام دیا گیا اور پھر اس عالمی پلیٹ فارم سے ادب اسلامی کے مختلف موضوعات پر سیمناروں کا سلسلہ شروع کردیا گیا، ادب اسلامی کے نام کی تنظیم پر قطعی غور وخوض مکہ مکرمہ میں غار حرا کے زیر سایہ ایک مٹینگ میں ہوا تھا جہاں سے پوری انسانیت کو پہلی بار ''رب کے نام سے پڑھنے لکھنے'' کی اولین انقلابی دعوت دی گئی تھی، اسی کی برکت سے آج عالمی رابطہ ادب اسلامی اپنے مقاصد کے حصول میں تیزی سے بڑھ رہا ہے، ان مقاصد میں بچوں کے ادب پر خاص توجہ ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ بچوں کا مستقبل اسلام کے تعلق سے روشن رہے گا، عالمی رابطہ ادب اسلامی کو سہولت کے لئے دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے، ایک بلاد مشرقیہ کے لئے جس کا دفتر ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہے دوسرا بلاد عربیہ کے لئے جس کا دفتر ریاض میں ہے، ممتاز عالم اور اہل قلم مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی بلاد مشرقیہ کے حصے کے سربراہ ہیں۔

رابطہ ادب اسلامی مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا ایک ایسا خواب تھا جس کی تعبیر ان کی زندگی میں مل گئی، انہوں نے گویا ایک ایسا علمی وادبی کارخانہ قائم کردیا جہاں سے صالح، معتبر ومستند، تعمیری، بامقصد اور اخلاقی ادب کی تخلیق ہوتی رہے گی اور انحراف پسند، غیر اخلاقی، خدا بیزار ادب کا جو ارتداد پیدا کرنے کے مقصد سے ہے توڑ ہوتا رہے گا، مولانا علی میاں اگرچہ کہا کرتے تھے کہ ''ردۃ ولا أبابکر لھا'' (یعنی ارتداد ہے لیکن

اس کو روکنے کے لئے دوسرا ابوبکر نہیں ہے) لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا علی میاں کی تحریک ادب اسلامی ارتداد کے سدباب میں مؤثر کردار ادا کر رہی ہے، عالمی رابطہ ادب اسلامی کے تحت ترکی، اردن، سعودی عرب، بنگلہ دیش اور ہندستان کے متعدد شہروں بشمول لکھنؤ، رائے بریلی، بنارس، پٹنہ حیدرآباد، اورنگ آباد، جے پور، پونہ، بھٹکل، بنگلور اور اعظم گڑھ وغیرہ میں منعقد ہونے والے سمیناروں کے نتیجے میں مختلف موضوعات پر مقالات کی شکل میں جو تخلیقات سامنے آئی ہیں ان کا وزن ان حلقوں میں محسوس کیا جارہا ہے جو ترقی پسند ادب کی تحریک کے علمبردار ہیں، وہ تحریک کمیونزم کے نظریات سے متاثر رہی ہے جو پارہ پارہ ہو چکا ہے، ادب اسلامی کی تحریک اسلامی نظریات پر مبنی ہے جو قیامت کے بعد بھی قائم رہیں گے۔

مولانا راشد نسیم ندوی

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اور فکر ولی اللہی

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (۱۹۱۴ء۔۱۹۹۹ء) دنیائے علم ومعرفت کے تاجدار تھے۔ علوم جدید وقدیم کے سنگم قرآن پاک کے دانائے رموز، علوم حدیث وسیرت کے واقف اسرار، عربی زبان وادب کے امام ہمام، تاریخ وتذکرے کے مصنف بے مثال اور گلستان عشق وعرفان کے گل سرسبد تھے۔ لیکن اگر ابن خلکان کے طریقہ کار کے مطابق آپ کے حقیقی امتیازی دائرے کار کو نمایاں کیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ قسام ازل نے آپ کے لئے میدان دعوت وفکر اسلامی کو مقدر کیا تھا چنانچہ بیشتر تذکرے وکتب تاریخ جو مولانا مرحوم کے قلم وفکر کا نتیجہ ہے وہ صرف سوانح نگاری کے خشک خاکے اور تاریخ کی بے روح نوشت نہیں بلکہ مفکرین اسلام کی دعوت وعزیمت کا تاریخی مرقعہ ہے۔ جہاں تک فکری تالیفات کا تعلق ہے تو وہ عصر حاضر میں فکر اسلامی کی جو تشریح وتوضیح کی گئی اس کا عطر وخلاصہ ہے۔ ایک مؤرخ بجا طور پر یہ کہہ سکتا ہے کہ حضرت مولانا کا مابہ الامتیاز کارنامہ ان کا فکری ودعوتی سرمایہ ہے جو ایک کتب خانہ کی شکل میں

محفوظ ہے۔

حضرت مولانا کی فکری بنیادوں کی تلاش وجستجو سے پتہ چلتا ہے کہ اس عمارت کی بنیاد دراصل ولی اللہی فکر پر ہے، یہ حقیقت روز روشن کی طرح آپ کے ہر اہل تعلق پر عیاں ہے کہ مفکرین اسلام میں سے حضرت مولانا کا زیادہ جھکاؤ امام ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہ کی جانب تھا۔ اوران میں بھی مؤخرالذکر کی جانب قلبی میلان زیادہ تھا۔ نیز داعیان اسلام اور مصلحین امت میں حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کا اثر آپ کے قلب وذہن پر گہرا تھا۔ اور پھر یہ وابستگی سید صاحب کے معاملہ میں وارفتگی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ سید صاحب کی تحریک اصلاح وجہاد دراصل شاہ صاحب کے شجر طوبی کا سایہ دراز تھا۔ راقم کو اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا نے مجلس میں فرمایا تھا کہ شاہ ولی اللہ نے جو فکری خاکہ امت کے سامنے پیش فرمایا تھا سید صاحب نے اسی میں عملی رنگ اپنی دعوتی واصلاحی سرگرمی سے بھر دیا تھا۔ سطور بالا سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شاہ صاحبؒ ہی سید صاحبؒ کے فکر وعمل کا منبع وسرچشمہ تھے۔ جس کو ولی اللہی تحریک سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور دور حاضر میں حضرت مولانا اسی فکر کے نقیب وامین اور اسی دعوت وطریقہ کار کے عنوان وامتداد تھے۔ یہی وہ محرک ہے جس نے مقالہ نگار کو ہر دو کے فکر کی مشترک قدروں، عمل کی متقارب سمتوں کو نمایاں کرنے پر آمادہ کیا۔

حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی فکری عمارت

حضرت شاہ ولی اللہ (م ۱۱۷۶ھ مطابق ۱۷۶۲ء) عالم اسلام کی ان نابغہ روزگار شخصیتوں میں سے ہیں جن کے کارنامے لازوال اور نقوش ان مٹ ہیں۔ شاہ صاحب بجاطور پر حکیم الاسلام اور امام الہند ہیں۔ شاہ صاحب نے اگرچہ جو حالات پائے وہ ہمت شکن تھے، اس وقت ہندوستان بلکہ عالم اسلام میں اقتدار کا شیرازہ بکھرتا جارہا تھا۔ تقلید

وجمود نے امت کو مفلوج سا کر دیا تھا لیکن کاتب تقدیر نے ان کے لئے ایک دوسری دنیا آباد کر رکھی تھی۔ جس کو خود شاہ صاحب ''حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت باطنی'' سے تعبیر فرماتے ہیں۔ یعنی دعوت دین اور فکر اسلامی کی توضیح وتشریح کے لئے اللہ تعالیٰ نے شاہ صاحب کو منتخب فرمالیا تھا۔ چنانچہ شاہ صاحب نے تجدید واحیاء دین، کتاب سنت کی تفہیم وتشریح اور امت کی تربیت وکردار سازی کا وہ عظیم الشان کام کیا جس کی مثال آپ کے معاصرین ہی نہیں سابقین ولاحقین میں بھی کم ہی ملتی ہے۔ نیز آپ نے جو علمی وفکری سرمایہ چھوڑا ہے اس سے ہند وبیرون ہند کے مفکرین ومصلحین نہ صرف متاثر رہے بلکہ اس سرمائے کو اپنے لئے مشعل راہ اور سنگ میل بنایا۔ برصغیر ہند وپاک کی ہر دینی ودعوتی تحریک، تعلیمی تدریسی سرگرمی اور خانقاہی ترتیب شاہ صاحب ہی کی رہین منت ہے۔

مفکر اسلام کا حکیم الاسلام سے فکری ارتباط

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے شاہ صاحبؒ سے فکری ربط کے اسباب کچھ وہبی اور کچھ کسبی ہیں۔ حضرت کے حالات زندگی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ توافق توفیق کا نتیجہ تو ہے ہی ساتھ ہی اس میں چند عوامل بھی کارفرما رہے ہیں جن کا اعتراف از حد ضروری ہے۔ ان عوامل میں سے اہم ترین عامل آپ کا خاندانی ماحول ہے۔ کیونکہ خانوادۂ علم اللہی کا خانوادۂ ولی اللہی سے تعلق انتہائی گہرا اور دیرینہ رہا۔ جس کی اہم کڑیاں ان خاندانوں کی بعض نامور شخصیتیں بنیں جن کا تذکرہ ذیل میں قلم بند کیا جاتا ہے

شاہ ابوسعید حسنی رائے بریلویؒ

حضرت شاہ ابوسعید حسنی قطبی (م ۱۱۹۳ھ) حضرت شاہ علم اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے احفاد کرام میں سے تھے۔ اور سید احمد شہیدؒ کے حقیقی نانا تھے۔ آپ نے تحصیل علم کے بعد دہلی کا قصد کیا اور شاہ صاحب سے روحانی تعلق قائم کر کے اخذ فیض اس طور پر کیا کہ آپ

کا شمار شاہ صاحب کے اصحاب با اختصاص میں ہونے لگا اس کی شہادت خود شاہ صاحب کے مکاتیب دیتے ہیں جو آپ کے نام ہیں۔ جن کی تعداد مولانا نسیم احمد فریدی امروہی کی تحقیق کی رو سے گیارہ ہے اور جو کسی وقت مکتوب المعارف کے نام سے رسالہ کی شکل میں سہارنپور سے طبع ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں شاہ ابوسعیدؒ کے مراسم حضرت شاہ محمد عاشق پھلتی (شاہ ولی اللہؒ کے ماموں زاد بھائی وخلیفہ مجاز) اور حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی دیرینہ تھے ان تمام بزرگوں کے خطوط حسنی خاندان کے کتب خانے میں قلمی نوادر کی شکل میں محفوظ ہیں۔

حضرت سید نعمان حسنیؒ

ان خاندانوں کے روابط کی ایک اور کڑی سید نعمان حسنیؒ (م ۱۱۹۳ھ) کی شخصیت ہے، جو مجاہد کبیر حضرت سید احمد شہیدؒ کے حقیقی چچازاد بھائی اور شاہ علم اللہؒ کے پرپوتے تھے۔ آپ نے مختلف علماء اور اولیاء سے اکتساب فیض کرنے کے بعد دہلی کا رخت سفر باندھا، جہاں پر شاہ صاحبؒ کے فیوض و برکات اور توجہات خاص سے ہمکنار ہوئے، آپ شاہ صاحب کی وفات کے موقع پر وہیں موجود تھے۔ اور واقعہ وفات کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ اپنے مکتوب میں کیا جو مکتوب المعارف میں شامل ہے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ

ہر دو خانوادوں کے تعلقات کی تیسری کڑی سید احمد شہیدؒ (۱۲۰۱ھ) کی ذات گرامی ہے، سید صاحبؒ کا حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ سے ربط و تعلق تاریخ کے ان مسلمات میں سے ہے جس کے اثبات کے لئے شواہد کی چنداں ضرورت نہیں۔ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ (ابن شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہم) کا حضرت سید صاحبؒ سے قرب واختصاص اظہر من الشمس ہے مفکر اسلامؒ کا یہ وہ خاندانی پس منظر ہے

جس سے صرف نظر کرنا مشکل ہے۔ اور اس ماحول نے آپ کو شاہ صاحب کے فکری سرمایہ سے اس قدر استفادے کے مواقع فراہم کردئے کہ جو شائد ہی کسی دوسرے مفکر یا محقق کو میسر آسکے ہوں۔

فکر بوالحسنی پر فکر ولی اللہی کے غیر معمولی اثرات کا دوسرا عامل آپ کی تعلیم ہے بایں طور کہ آپ کے تعلیمی سفر کی اہم ترین منزل ندوۃ العلماء رہی جو روز اول سے فکر و دعوت ولی اللہی کا مرکز رہا۔ پھر آپ نے لاہور کا قصد کیا۔ جہاں پر مفسر وقت حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ (۱۸۳۱ھ مطابق ۱۹۶۲ء) سے استفادہ کیا جو شاہ ولی اللہؒ سے گہری فکری مناسبت رکھتے تھے۔ اور حضرت مولانا کے الفاظ میں حضرت لاہوریؒ کی گھٹی میں شاہ صاحب کی عقیدت پڑی ہوئی تھی۔ پرانے چراغ میں آپ نے یہ بھی تحریر کیا کہ حجۃ اللہ کا درس سوائے مولانا لاہوریؒ کے کہیں اور بالاستقلال نہیں ہوتا تھا۔ حضرت مولانا کو ان دروس میں باضابطہ شرکت کا موقع ملا جو کبھی کبھی چار چار گھنٹوں تک جاری رہتے تھے۔ اور آپ نے امتیاز کے ساتھ اس کے امتحان میں بھی کامیابی حاصل کی۔ اس طرح بچپن میں ولی اللہی فکر کے جو نقوش ذہن پر مرتسم ہوئے تھے وہ مزید نکھرتے چلے گئے۔

اور پھر یہ نقوش حضرت مولانا کی فکری بنیاد بنتے چلے گئے کیونکہ آپ نے جب تصنیف و تالیف کے مرحلہ میں قدم رکھا تو سب سے پہلے سیرت سید احمد شہیدؒ کی تالیف کی۔ اور لازمی طور پر اس ذیل میں شاہ صاحب کے کارناموں کا مفصل جائزہ لینا پڑا ہوگا۔ اور یہ علمی سفر تاریخ دعوت و عزیمت کی جلد پنجم کی تالیف پر انتہائی کمال کو پہنچ گیا۔ یہ وہ عوامل ہیں جن کی وجہ سے حضرت مولاناؒ کی فکری سمتیں ولی اللہی رخ پر گامزن ہوگئی۔ اور ہر دو فکروں کا ایسا امتزاج ہوگیا کہ ادنیٰ تامل سے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

فکر ولی اللہی کی خصوصیت

شاہ صاحب اور حضرت مولاناؒ کی فکر کی مشترک قدروں کی تلاش سے قبل

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود شاہ صاحب کی فکری خصوصیات کو ضبط تحریر کیا جائے۔ اس زاویے سے شاہ صاحب کی تصنیفات پر نگاہ ڈالی جائے تو اس سرمایہ کی بے پناہ خوبیاں اور لاتعداد خصوصیات نظر آتی ہیں۔ ہم ان کو تین خصوصیات میں ذکر کر سکتے ہیں۔ اور جن کو جامعیت، عدالت اور اصالت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

ولی اللہی افکار کا پرتو بوالحسنی نکات پر

عنایت الٰہی نے شاہ صاحبؒ کی فکری صفات و خصوصیات کو حضرت مولاناؒ کے وجود میں سمو دیا تھا۔ جس کا جائزہ ذیل میں لیا جائے گا۔

جامعیت

حضرت مولانا نے اپنے فکری و علمی سرمائے میں اس قدر متنوع تالیفات چھوڑی ہیں جو جامعیت کا مکمل مصداق ہے۔ تاریخ و تذکرہ، اسرار شریعت و رموز دین، قرآن و حدیث کا تعارف و ترجمانی، سیرت و تصوف کے حقائق، تصور ادب و تذکرہ ادباء، آپ کے پسندیدہ موضوعات رہے۔ ان تمام گوشوں پر آپ نے فکری جہتوں سے روشنی ڈالی، جس کے نتیجہ میں ایک وقیع و وسیع کتب خانہ وجود میں آ گیا۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، اسلامیت و مغربیت کی کشمکش اور مذہب و تمدن فکر ساز کتب ہیں۔ تاریخ دعوت و عزیمت، سیرت احمد شہید اور مختلف تذکرے میدان تاریخ کا سرمایہ ہے۔ نبی رحمتؐ، کاروان مدینہ اور منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین، سیرت و حدیث کے عمیق و وسیع مطالعہ کا نچوڑ ہے۔ مطالعہ قرآن کے اصول و مبادی، معرکہ ایمان و مادیت اور اشارات قرآنی، کتاب کے اسرار و رموز کا عطر کشید ہے۔ دستور حیات و ارکان اربعہ اسرار شریعت کی ترجمانی کرتی ہیں۔ نقوش اقبال، پرانے چراغ اور کاروان زندگی اسلامی ادب کے شاہکار ہیں۔ اس شش جہات علمی، ادبی و فکری ذخیرہ کا تحقیقی جائزہ فرصت و تفصیل، علم

وبصیرت کا طالب ہے۔

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

اعتدال رائے وتوازن عمل

حضرت مولانا کا لٹریچر اعتدال رائے اصابت فکر اور سلاست طبع کا نمونہ ہے۔ نہ عقیدت نے غلو پر آمادہ کیا اور نہ مخالفت نے تشدد پر نیز آپ نے قادیانیت، شیعیت وغیرہ پر بھی قلم اٹھایا۔ کفر کو کفر لکھا، گمراہی کو گمراہی اور لغزش کو لغزش، یہ وہ صفت ہے جو شاہ ولی اللہ کا طغرائے امتیاز ہے۔ شاہ صاحب تطبیق بین الحدیث والفقہ میں نمایاں ہیں۔ حضرت مولانا نے لفظیت وعقلیت کو قربتیں دی۔ شاہ صاحب کے پاس تحقیق وتالیف، دعوت اصلاح اور تربیت وتزکیہ بیک وقت نظر آتے ہیں۔ اور یہی انداز حضرت مولانا کا رہا۔ غرض کہ عدالت ولی اللہی فکر بوالحسنی میں پوری طرح جلوہ گر ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت مولانا علی میاںؒ کے فکری سرمائے کی ان مشترک قدروں کے ساتھ انداز دعوت میں بھی یکسانیت صاف طور پر محسوس ہوتی ہے شاہ صاحب نے امت کے تمام طبقات کو خطاب کیا۔ اور ہر ایک طبقہ کو اس کی عقلی سطح کے مطابق خطاب کیا۔ اور اسلام کا ان سے کیا مطالبہ ہے یاد دلایا۔ حضرت مولانا نے شاہ صاحبؒ کے کارنامے کو اس طرح خراج تحسین پیش کیا۔

> ''اس سلسلہ میں شاہ ولی اللہ صاحب کا کارنامہ سب سے زیادہ روشن اور تابناک نظر آتا ہے، انھوں نے سلاطین اسلام، امراء، ارکان دولت، فوجی سپاہیوں، اہل صنعت وحرفت مشائخ کی اولاد (پیرزادوں) غلط کار علماء، متقشف اور خوردہ گیر واعظوں اور تارک الدنیا اور عزلت گزیں زاہدوں کو علیحدہ علیحدہ خطاب کیا ہے، ان کی دکھتی ہوئی رگوں پر انگلی رکھی ہے، اور ان کی اصلی بیماریوں اور

خود فریبیوں کی نشاندہی کی ہے، ان سب کے علاوہ امت اسلامیہ سے عمومی اور جامع خطاب فرمایا ہے، اور ان کے امراض کی تشخیص کی ہے، اور ان کا علاج بتایا ہے، ان خصوصی خطابات میں شاہ صاحب کے دل کا درد، اسلامی حمیت کا جوش دعوت کا جذبہ اور زور قلم اس نقطہ عروج پر ہے، جس کی مثال سابق الذکر مصلحین و ناقدین اور ان کی مذکورہ بالا کتابوں میں ملنی مشکل ہے۔

یہی انداز دعوت حضرت مولانا کا رہا۔ آپ کے رسائل و کتب کے دفتر میں حکمرانوں سے بھی خطاب ملے گا عوام الناس سے بھی، علماء، واہل مدارس سے بھی مخاطب ہیں اور جدید تعلیم یافتہ سے بھی، ادباء کی جانب بھی روئے سخن ہے اور عامیوں سے بھی اہل ثروت سے پیغام انفاق ہے تو تنگ دستوں کو دعوت بے نیازی، غرض امت کے تمام طبقوں سے الگ الگ رنگ و انداز میں تخاطب کیا جس کا نقش اول ہندوستان میں شاہ صاحب نے قائم کیا تھا۔

عارف عزیز

مفکر اسلام اپنی "فکر و نظر" کے آئینہ میں

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا شمار بجا طور پر ملک اور بیرون ملک کی اہم ترین علمی شخصیتوں میں ہوتا ہے، وہ بیک وقت مفکر، مدبر، مصنف محقق، مؤرخ، ادیب مصلح، نباض وقت اور زمانہ شناس تھے، قدرت نے انھیں جہاں وسعت نظر، فراست وفہم، رسوخ فی العلم کا وافر حصہ عطا کیا تھا وہیں اس کو بروئے کار لا کر عہد حاضر کی ضرورتوں وتقاضوں کے مطابق دین وشریعت کو پیش کرنے کا ملکہ وجذبہ بھی خوب بخشا تھا، انھوں نے اپنی زندگی کی طرح فکر ونظر کو بھی کسی ایک خانہ تک محدود نہیں رکھا یہی وجہ ہے کہ ان کی فکر میں تنوع اور عملی زندگی میں ہمہ رنگی ملتی ہے، قوم، ملک، اور ملت کے لئے جو مفید اور نفع بخش نظر آیا اس کو کہتے سنتے، بولتے اور لکھتے رہے۔

آج اہل علم وفضل تو بہت ہیں لیکن علم کے ساتھ اپنی فکر، اپنا تدبر، ہستی کردار، انکساری وتواضع، بے نفسی وخندہ پیشانی، خلوص وبے لوثی اور اپنوں وپرایوں کا درد ہو، انسانیت کے ایسے بے غرض پیامی کی بڑی کمی ہے۔ اور حضرت کا شاد عظیم آبادی کے الفاظ میں ایسے ہی کم یاب اہل علم میں شمار ہوتا ہے بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ ۲۰ ویں صدی کے ان علمائے عظام میں سے ہیں جن کی نظیر ہم عصروں میں مشکل سے ملا

کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی میں بھی بڑی برکت عطا فرمائی تھی کتابوں کی تصنیف وتالیف، اداروں کی سرپرستی وسربراہی، مختلف براعظموں کے اسفار، بیرونی ومقامی مہمانوں سے ملاقات کے علاوہ ''ندوۃ العلماء، مسلم پرسنل لا بورڈ، رابطہ ادب اسلامی، رائے بریلی کی خانقاہ'' کے علاوہ عوام وخواص کی مجالس سے خطاب، جلسوں اور علمی مباحثوں میں شرکت اوران میں پوری جرأت ایمانی کے ساتھ حق وصداقت کا ایسا برملا اظہار کہ علمائے سلف کی یاد تازہ ہوجائے اور فراست ایمانی کا وہ مظاہرہ جو اللہ کے مقرب بندوں کا امتیاز رہا ہے اور جس کا ذکر قرآن حکیم کی سورہ توبہ میں داعی ونذیر کی حیثیت سے ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو پوری امت مسلمہ اور عالم انسانیت کے لئے ایک فکرمند دل دے کر پیدا کیا تھا اور زبان بھی ایسی فصیح وبلیغ عطا فرمائی تھی کہ سامع اور قاری ان کی فصاحت ولطافت میں کھوجاتے تھے عربی زبان وبیان پر ان کی قدرت ومہارت کا یہ عالم تھا کہ اہل عرب بھی اس پر رشک کرتے تھے حالانکہ اہل زبان بہت کم کسی غیر زبان کی زبان دانی کا اعتراف کرتے ہیں لیکن حضرت مولانا اس عہد کے غالباً واحد عجمی تھے جن کی زبان دانی کو عرب بھی رشک بھری نظروں سے دیکھتے اور سحر زدہ ہوکر سنتے تھے، ان کی زبان کا یہی اعجاز اور اس سے زیادہ اپنی ''فکر ونظر'' کا برملا اظہار تھا جس نے شاہ فیصل جیسے حکمراں کو مبہوت کردیا تھا اور وہ ہمہ تن گوش ان کے سامنے کھڑے تھے اور حضرت فرمارہے تھے۔

> ''میں سوچ رہا ہوں کہ ہمارے ہاں بھی ایک بادشاہ گزرا ہے، آج کے ہندوستان و پاکستان، سری لنکا، برما، نیپال اور دور تک اس کی حکومت تھی، اس نے اپنے باون سالہ عہد اقتدار میں بیس برس گھوڑے کی پیٹھ پر گزارے، اس کے دور میں مسلمان آزاد تھے، خوشحال تھے، ان کے لئے آسانیاں تھیں لیکن بادشاہ کا حال یہ

تھا کہ وہ پیوند لگے کپڑے پہنتا تھا، وہ قرآن مجید کی کتابت کر کے اور ٹوپیاں بن کر گزر اوقات کرتا، رات بھر اپنے پروردگار کے حضور میں کھڑا رہتا اور اس کے دربار میں آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتا، اس وقت مسلمان حکمراں غریب و سادہ تھے اور عوام خوشحال اور آسودہ آج آپ کے محل میں قدم رکھا تو اس تقابل میں کھو گیا کہ سب کچھ بدل گیا ہے آج ہمارے بادشاہ خوشحال ہیں اور دوسری طرف مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ بے گھر بے در ہیں۔"

راوی کا بیان ہے جب مولانا علی میاں خاموش ہوئے تو شاہ فیصل کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا اور اتنی شدت سے ان کی ہچکی بندھ گئی تھی کہ محافظ تشویش میں مبتلا ہو کر دوڑ پڑے، شاہ فیصل نے انھیں ہاتھ کے اشارے سے باہر جانے کو کہا اور مولانا سے مخاطب ہو کر بولے۔

"وہ بادشاہ اس لئے ایسے تھے کہ انھیں آپ جیسے ناصح میسر تھے، آپ تشریف لاتے رہیں اور ہم جیسے کمزور انسانوں کو نصیحت کرتے رہیں۔"

حضرت کے اس علمی جاہ وجلال اور مومنانہ فکر ونظر سے ہندوستان کے حکمراں بھی بار ہا مرعوب ومتأثر ہوئے ۱۹۷۶ء میں اس وقت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی کو ایمرجنسی کی غلطیوں پر ٹوکنے کا حوصلہ وہی کر سکتے تھے "شاہ بانو مقدمہ" میں سپریم کورٹ کے سیاسی فیصلے کی زد مسلم پرسنل لا پر پڑی تو ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ میں ترمیم کا مسودہ قانون وزیر اعظم راجیو گاندھی کے سپرد کرنے والی اور اس کو پارلیمنٹ سے منظور کرانے کی ضرورت و اہمیت واضح کرنے والی حضرت کی ہی ذات والا صفات تھی۔ حق گوئی اور فراست ایمانی کی ان مثالوں کے علاوہ اپنی کوتاہی سے بے تامل رجوع کرنے اور کھلے

دل سے غلطی کا اعتراف کرنے میں بھی حضرت کے ثانی کم ہوں گے، جس کی ایک مثال ۱۹۹۰ میں وی پی سنگھ کے دور حکومت کا واقعہ ہے ایک صدارتی فرمان کے ذریعہ بابری مسجد اور اس سے ملحقہ تمام آراضی کو بحق سرکار ایکوائر کرنے کی کارروائی کی گئی وی پی سنگھ سے حسن ظن کی وجہ سے حضرت نے اس کی فوراً تائید کردی لیکن غلطی کا احساس ہوا تو ۲۴ گھنٹے کے اندر اس سے رجوع کرلیا، وی پی سنگھ کو بھی حضرت کی اس مراجعت کے بعد پوری کارروائی کو کالعدم قرار دینا پڑا۔

کانگریس کی صدر سونیا گاندھی مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوئیں تو آپ نے ان کے سامنے ملک کے جمہوری ڈھانچے، عدم تشدد، سیکولر اصولوں کو برقرار رکھنے کی ضرورت واضح کی اور ملک وقوم کے استحکام کے لئے انھیں ناگزیر قرار دیا۔ وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی عیادت کے لئے گئے تو شدید علالت اور نہایت کمزوری کے باوجود ملک کے حالات پر فکر مندی کا اظہار کیا اور کوئی بات نہیں کی سوائے اس کے کہ ''گاندھی جی، مولانا آزاد، پنڈت نہرو نے جمہوریت، عدم تشدد اور سیکولرازم کے جو اصول طے کئے تھے وہ برقرار رہیں ورنہ ملک تباہ ہوجائے گا'' علاوہ ازیں مختلف رہنماؤں، سیاست دانوں اور ریاستی وزراء اعلیٰ کو خطوط لکھنا، ان سے ملاقات کرنا، اپنے در پر وہ آئیں تو انسانیت کا سبق پڑھانا، کبھی عام جلسوں اور اجتماعوں میں ان کو سراغ زندگی سمجھانا حضرت کا زندگی بھر معمول رہا اور غالباً اس کا آغاز ۱۹۳۵ء میں اس وقت ہوا جب آپ کی عمر بمشکل ۲۱ سال تھی اور آپ نے ڈاکٹر امبیڈکر کو ان کی قیام گاہ بمبئی جا کر اسلام کی دعوت دی اس کی تفصیل حضرت کی خودنوشت سوانح حیات ''کاروان زندگی'' میں ملتی ہے اور اس سے آپ کی داعیانہ فکر ونظر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

دنیا سے بے رغبتی، اقتدار سے دوری اور سیاست کی آلائشوں سے اپنا دامن بچائے رکھنے کے مخصوص مزاج کی وجہ سے ہی حضرت نے حکمرانوں اور سیاست دانوں

سے ایک خاص دوری برقرار رکھی تاہم دعوت و اصلاح کی ضرورتوں کا جہاں تک تقاضا تھا تو نہ صرف ایسے بااثر لوگوں سے رابطہ قائم کیا بلکہ ان کی اصلاح کی کوشش بھی کی، انھیں اسلامی تعلیمات سے متعارف کرانے اور احکام الٰہی کی پیروی پر مائل کیا، یہ کام ایک ایسا عالم اور مفکر ملت ہی انجام دے سکتا تھا جو علمی جمال اور اخلاقی کمال دونوں لحاظ سے بلند مرتبہ پر فائز ہو اور عالم اسلام کے حکمرانوں میں بھی اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو، حضرت اپنے علم و فضل، حکمت و تدبر اور عالم اسلام کے عوام و خواص پر اپنے گوناگوں اثرات نیز ذاتی سیرت و کردار کی وجہ سے اس منصب کی ادائیگی کے لئے نہایت موزوں تھے لہٰذا جب بھی عرب و عجم کے مسلم حکمرانوں سے ملاقات کرتے تو آپ کا مدعا یہی ہوتا کہ وہ برسر اقتدار رہتے ہوئے امت مسلمہ کی آبیاری اور دین اسلام کی سرسبزی و شادابی کے لئے اپنے اوپر عائد ذمہ داری کو کما حقہ ادا کریں، حضرت کی اس معتدل فکر و مزاج نے انھیں حکمرانوں اور بااثر سیاست دانوں کے درمیان کام کرنے میں بڑی مدد کی، ان کی فکر و نظر کا یہ پہلو طبقہ علماء میں اپنی مثال آپ ہے اور دنیا کے کسی دوسرے مفکر یا عالم کے حصہ میں یہ سعادت نہیں آئی، عالم اسلام کے سلاطین اور سربراہان مملکت حضرت کو اپنے یہاں مدعو کرنا خوش نصیبی تصور کرتے، جب تشریف لاتے تو ایک محسن کی طرح ان کا استقبال کرتے اور حضرت کے ارشادات کو ہمہ تن گوش ہو کر سنتے نیز انھیں اپنے مفاد میں اور عوام میں نیک نامی کا ذریعہ سمجھتے، حکمراں طبقہ میں کام کرنے کی تفصیلات آپ کے خودنوشت سوانح ''کاروان زندگی'' میں مزید دیکھی جا سکتی ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں حکمت و دانائی کے کتنے اعلیٰ مقام پر فائز کیا تھا، کیسی جرأت ایمانی، اور فہم و بصیرت سے نوازا تھا، جس نے بھی انھیں بادشاہوں اور حکمرانوں کے دربار میں اسلام یا امت مسلمہ کے ''سفیر'' کا لقب دیا وہ کتنا مناسب تھا۔

حضرت گفتار کے ہی نہیں کردار کے بھی غازی تھے، علم کے ساتھ ان کے اندر

جو مومنانہ بصیرت تھی اس سے وہ دام ہم رنگ کو پہچان لیتے تھے، جب بھی کوئی زہر میٹھی گولی کی شکل میں ملت کو دیا جاتا تو اس کی نشاندہی کر کے مستقبل کے خطرات سے آگاہ فرمادیتے تھے، بالخصوص شعائر اسلامی اور عقائد دینیہ پر جب بھی ملت کے حریفوں کی طرف سے حملہ ہوتا تو اس کے دفاع میں پہلی فلک شگاف آواز آپ کی ہی بلند ہوتی، سال گذشتہ اتر پردیش کے اسکولوں میں طلباء کے لئے ''وندے ماترم'' اور ''سرسوتی وندنا'' لازم کیا گیا تو حضرت نے پوری جرأت ایمانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کو مسلمان بچوں کے لئے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ریاستی حکومت پر یہ باور کر دیا کہ اگر وہ اپنا فیصلہ واپس نہیں لیتی تو مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا کہ وہ اپنے بچوں کو سرکاری اسکولوں سے اٹھالیں مولانا کی یہ تنبیہ کسی دنیاوی طاقت کی بناء پر نہیں بلکہ محض تائید خداوندی پر تھی اور اس کا اثر اتنا ہوا کہ حکومت وقت گھبرا گئی اور فیصلہ کے محرک وزیر تعلیم کو عہدہ سے ہٹایا گیا نیز ذمہ داران حکومت کو خدمت میں حاضر ہو کر معذرت کرنا پڑی۔

حضرت کی ذات میں فکر و دعوت اور تحریک جیسے گوناگوں عناصر یکجا ہو گئے تھے، انھوں نے جہاں ادب کے میدان میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے وہیں دعوت فکر و عمل کو بھی اپنی مجتہدانہ شان بصیرت سے نئے نئے زاویے عطا کئے مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت مذہبی و وطنی جذبات خیر سگالی کے ساتھ انجام دی، ملت اسلامی میں اسے جو مقام ملا وہ حضرت کی مخلصانہ کوششوں کا ہی ثمرہ ہے ایک نہایت خطرناک مرحلہ پر بورڈ کو بیجا مذہبی جذبات پسندی سے پوری جرأت کے ساتھ بچالینا کوئی معمولی کام نہ تھا ورنہ یہ ادارہ ملک کے اندر شریعت اسلامیہ کی حفاظت کرنے کے قابل نہ رہتا۔

''تحریک پیام انسانیت'' کے ذریعہ بھی حضرت سے برادران وطن کو ایک مہذب شہری بننے، وسعت نظر اور وسعت قلبی پیدا کرنے اور ہندوستان کی متنوع تہذیب کے ماننے والوں کے ساتھ شرافت و انسانیت سے پیش آنے اور ایک کشتی کا

سوار گردانے کی دعوت دی اس تحریک کا مسلمانوں کو میٹھا پھل یہ ملا کہ کئی مرتبہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے قیام اور گرم فضا کو معتدل بنانے میں اس سے مدد ملی۔ اور اعلیٰ سطح کے قومی دانشوروں نے بھی اسے بنظر استحسان دیکھا اور سمجھا۔

حضرت کو ''مفکر اسلام'' کا خطاب کس نے دیا اور کب دیا اس بارے میں تفصیلات کا علم نہیں لیکن سچائی یہ ہے کہ اسلام کی ترویج واشاعت کے لئے اللہ تعالیٰ نے انھیں جو فکر و درد عطا کیا تھا وہ بجا طور پر اس خطاب کا انھیں مستحق قرار دیتا ہے، بقول جسٹس محمد تقی عثمانی مفکر ملت کی داعیانہ ''فکر ونظر'' کا چہار سو آج اعتراف اس لئے بھی ہو رہا ہے کہ آپ نے کبھی راستہ کو منزل نہیں بنایا اور صحیح منزل کی طرف جانے والے ہر راستہ کی کھلے دل سے قدر کی، اس کے برعکس بہت سی ایسی تحریکات اٹھیں جنھوں نے اپنے بانیوں کے نظریات کو اپنی شناخت قرار دیا اور اس کے نتیجہ میں وہ جلد ہی فرقوں کے رنگ میں رنگ گئیں لیکن مفکر ملت نے اپنی دعوت کا محور ہمیشہ ان بنیادوں کو قرار دیا جن پر امت کا اتفاق تھا اسی لئے ان کی ''فکر ونظر'' کا آج ایک جہاں معترف ہے۔

حالات کو سپر ڈالنی پڑے گی

''قوموں کے اجتماعی فیصلوں نے دنیا کے نقشے اور قوموں کی تقدیریں بدل دی ہیں۔ آج جس چیز کی ہم کو سب سے زیادہ ضرورت ہے اور جو تمام موانع اور رکاوٹوں پر غالب آسکتی ہے اور جس کے سامنے حالات کو سپر ڈالنی پڑے گی وہ ہمارا یہ فیصلہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کی دینی تعلیم کو ہر تعلیم پر مقدم رکھیں گے اور بغیر اس ضروری دینی تعلیم کے جس وہ اپنے پیدا کرنے والے کو اپنے پیغمبرؐ کو اور اپنے عقیدہ اور فرائضِ دینی کو پہچان سکیں، خالص رواجی یا معاشی تعلیم دلانا گناہ اور اپنے مذہب سے بغاوت سمجھیں گے۔ اگر ہمارا یہ فیصلہ ہے اور ہم اس میں سچے صراطِ مستقیم سے ہٹا نہیں سکتی اور ہماری نسلوں کو اسلام کی نعمت سے محروم نہیں کر سکتی۔''

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

مولانا احسن علی خاں ندوی

تحریک پیام انسانیت

میرے لئے انتہائی مسرت واعزاز کا مقام ہے کہ اس مبارک اجلاس میں شرکت کی سعادت حاصل کررہا ہوں۔ عالم اسلام کی مایہ ناز شخصیت کی خدمات سے متعلق یہ سیمینار وقت کی ایک اہم ضرورت تھی۔ میں مولانا ندوی کی عظیم خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں، جنھوں نے اسلامی تشخص کی حفاظت، اور مسلمانوں کا اپنے ایمان وعقائد سے رشتہ برقرار رکھنے، غیر مسلموں کو اسلام سے قریب لانے، ان کے دلوں سے اسلام سے متعلق شکوک وشبہات کو دور کرنے، اور اسلام مخالف رجحانات کا ڈٹ کا مقابلہ کرنے کے لئے جدوجہد کی جنھوں نے اسلامی عقیدہ کو نشانہ بنانا شروع کردیا تھا۔

اسلام ایک دین رحمت ہے، یہ دین اعتدال اور رواداری کا علمبردار ہے، ساری انسانیت پر اس دین حق کے بے پناہ احسانات ہیں، اسلام نے بنی نوع انسان کی ترقی اور تمدن کی راہ روشن کی اور ایسے اصول وضوابط پیش کئے جو انسانی زندگی کو منظّم کرتے ہیں اور اس کو سچائی کا راستہ دکھلاتے اور گمراہی کی تاریکیوں سے بچاتے ہیں، اسلام انسانیت کے لئے پیام رحمت ہے، یہی سبق تحریک پیام انسانیت کے ذریعہ مولانا نے دینا چاہا۔

ہمارا ملک ہندوستان سیکولرازم اور جمہوریت کا علمبردار ہونے کی وجہ سے دنیا کے ممالک میں ایک خاص امتیاز رکھتا ہے، جس طرح ہر سیکولر ملک کا قانون اپنی

رعایا کو بنیادی حقوق میں آزادی وحریت دیتا ہے، ہمارملک بھی ہمیں یہ بنیادی حقوق عطا کرتا ہے اور ہمیں تحریر وتقریر اور مذہبی وسیاسی سرگرمیوں کی اجازت دیتا ہے، قانون کے دائرے میں رہ کر ہم جو چاہیں بول اور لکھ سکتے ہیں، بلا کسی روک ٹوک، پابندی اور بندش کے ہم اپنے مذہبی امور ادا کر سکتے ہیں، سیاسی طور پر بلا کسی قید وبند کے سرگرم عمل ہو سکتے ہیں۔

ہمارے ملک ہندوستان میں، دستور، آئین اور عدالتیں ہیں، جن سے ہم بوقت ضرورت قانونی طور پر مدد حاصل کر سکتے ہیں، دستوری تحفظات موجود ہیں، ان کے دائرے میں رہ کر بہت کچھ کرنے کے مواقع ہم کو حاصل ہیں، ہمیں حکومت کی تابعداری ہی نہیں بلکہ اس میں حصہ داری کا حق قانوناً حاصل ہے، ہمیں سیاسی میدان میں سرگرم عمل ہونے، سیاسی پارٹی تشکیل دینے اور اپنے ووٹ کو آزادانہ استعمال کرنے کی مطلق آزادی ہے، ہمیں ملک وقوم کی خدمت کرنے، ترقی کی راہ پر گامزن ہونے، اور انسانی جماعت کی فلاح وبہبود اور اس کے سدھار کے لئے سعی وکوشش سے قانونی طور پر کوئی روکنے والا نہیں۔

قانون کے عطا کردہ ان سیاسی حقوق اور حاصل شدہ آزادی وحریت کے باوجود مسلمان گوناگوں مسائل سے دوچار اور مختلف مشاکل کا شکار رہے اور آج آزادی کو ۵۲ سال گزر چکے لیکن ہمارے مسائل ومشاکل بدستور باقی ہیں۔

مولانا ندوی مرحوم نے گہرائی سے اس پر غور کیا، ان کو نظر آیا کہ ہمارا ہندوستانی معاشرہ مختلف عقائد، مذاہب، اور نظریات رکھتا ہے، عقائد کے اختلاف، مذاہب میں منافرت، اور نظریات میں ٹکراؤ سے پیچیدگی پیدا ہوتی ہے، عقائد ومذاہب میں اختلاف تو فطری ہے، لیکن جب ایک نظریہ یا عقیدہ کو دوسرے نظریہ یا عقیدہ پر مسلط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اصل خرابی پیدا ہوتی ہے۔

اسی کے ساتھ جب مولانا نے دیکھا کہ ہندوستان نے آزادی کے بعد سے ہی لاقانونیت فسطائیت اور خانہ جنگی کی طرف اپنے قدم بڑھانا شروع کر دیئے، سیاسی پارٹیوں کا مقصد، حصولِ اقتدار، اور پھر اس اقتدار کی بقا و سلامتی کے علاوہ کچھ اور نہیں رہ گیا، ملک کی تعمیر و ترقی سالمیت اور ملک میں اتحاد و یکجہتی سے دلچسپی اسی حد تک رہی کہ جب تک اقتدار پر ضرب لگنے کا خطرہ نہ ہو، لیکن حصولِ اقتدار کی راہ میں، یا بقاء اقتدار کے لئے ہر چیز کی قربانی دینے کو ہر سیاسی جماعت نظر آنے لگی۔

اس ذہنیت کا اثر ہندوستان کے تمام باشندوں پر پڑنا ناگزیر تھا، اس لئے اس کا مداوی کرنا اور اس بیماری کا علاج تلاش کرنا، قوم کے ہر مخلص ہمدرد کی ذمہ داری تھی، مولانا نے اپنی مختلف مصروفیات کے باوجود اس طرف خاص توجہ دی، کیونہ مولانا کو صاف نظر آرہا تھا کہ اگر اس ذہنیت کو فروغ حاصل ہوا تو اس کا نقصان زیادہ تر اقلیتوں اور پسماندہ طبقات کو ہونا ہے، اس لئے سیاسی، سماجی اور تعلیمی میدان میں جو جتنا زیادہ پچھڑا ہوگا، نقصان کے اعتبار سے اس کا حصہ اتنا ہی زیادہ ہوگا۔

اسی طرح جب مولانا نے دیکھا کہ مسلمانوں کی تمام تحریکیں اور ان کے جائز مطالبات جو دستور ہند کی رو سے انھیں حاصل ہونا چاہئیں، ان میں مسلمانوں کی سنی ان سنی جو کی جاتی ہے اس کی اصل وجہ ہمارے انتشار، اختلاف، گروہی عصبیت اور سیاسی عدم سوجھ بوجھ ہے کہ ہماری ہر جدوجہد، ہر کوشش، صدا بہ صحراء ثابت ہوتی ہے، نتیجتاً جیسا کہ مولانا نے بار بار تحریر کیا ہے، خود بھی ڈوب رہے ہیں اور ملک بھی ڈوب رہا ہے۔

مولانا سمجھتے تھے کہ ہندوستانی مسلمان، سیاسی، دینی اور اخلاقی میدان میں اہم رول ادا کر سکتے ہیں، لیکن کسی بھی سطح پر مسلمانوں کو صحیح سیاسی رہنمائی حاصل نہیں ہو رہی ہے اسی وجہ سے وہ بالکل بے اثر ہیں۔ مرکزی، ریاستی اور مقامی، کسی بھی سطح پر ان میں ٹھوس نظم و ضبط نہیں ہے، اسی وجہ سے مسلمانوں کو سیاسی سطح پر بلیک میل کیا جاتا ہے جس کا سیاسی

سماجی، تعلیمی، تہذیبی کسی بھی سطح پر مسلمانوں کو کوئی خاصی فائدہ نہیں ہوتا، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں اپنے عدم تحفظ کا احساس بڑھتا ہے اور مسلمان ایک شہری کی حقیقت سے اپنے حقوق واختیارات کی لڑائی صحیح اور منظم طریقہ سے نہیں کر پاتے، جب بھی مسلمان کوئی مطالبہ لے کر اٹھتے ہیں اور ان میں اتحاد واتفاق کی فضا ہموار ہونا شروع ہوتی ہے تو انھیں مختلف ہتھکنڈوں کے ذریعہ کسی ثانوی مسئلہ میں الجھا دیا جاتا ہے یا پھر ان کے تحفظ کا مسئلہ کھڑا کر دیا جاتا ہے، اس طرح ان کی تمام توانائیاں اصل مسئلہ سے ہٹ کر اس ثانوی مسئلہ میں صرف ہونے لگتی ہیں۔

ہندوستان میں یہ کھیل عرصہ سے کھیلا جا رہا ہے، مولانا اس کھیل کو روکنا چاہتے تھے اور اس کے لئے ہماری اجتماعی عمل کی صلاحیتوں کو بیدار کرنا چاہتے تھے، ان کو ملال تھا کہ ہم اتنی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود ہندی یا انگریزی میں کوئی وقیع روزنامہ نہیں رکھتے اور نہ ہی ہماری کوئی نیوز ایجنسی ہے ہمارے اندر اپنی موت وحیات کے اس اہم ترین مسئلہ سے متعلق کچھ کرنے کا حوصلہ نہیں، جبکہ ہم ایسے اخبار اور ایسی ایجنسیاں بہ سہولت قائم کر سکتے ہیں، مولانا اس مسئلہ کے لئے کتنے حساس اور فکرمند تھے اس سے وہ لوگ جو مولانا کے قریب رہے ہیں، بخوبی واقف ہیں۔

مولانا ندوی مرحوم ایک دردمند اور حساس انسان تھے، مسلمانوں کی زبوں حالی وپستی، ان میں پیدا شدہ احساس کہتری وکمتری، باہمی اختلاف اور نفرت وعداوت کی زور بازاری اور ساتھ ہی ملک کی بگڑتی حالت، ایسی چیزیں جن پر مولانا نے ہمیشہ اپنی زبان اور قلم کے ذریعہ اظہار کیا، اور عملی طور پر جدوجہد کے میدان میں قدم رکھا، اور ان علماء ومشائخ کے لئے راستہ کا تعین فرمایا جن کو مسلمانوں کے قومی زوال کی فکر دامن گیر نہیں جنھیں ہندوستان اور دنیا میں آرہے انقلاب مسلمانانِ عالم کے خلاف کی جارہی سازشوں اور ان کو مٹانے وبرباد کرنے کے پلانوں اور منصوبوں کا یا تو حقیقی علم نہیں یا جو ان کو دنیا

داری اور سیاست کا نام دے کر ان سے چشم پوشی اختیار کرتے ہیں، جب بھی ضرورت پڑی مولانا نے درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کی اپنی دنیا سے نکل کر سیاست کی وادی پرخار میں قدم رکھا کیونکہ اسلام نام دین ودنیا کا ہے دونوں کو ہی ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔

مولانا ندوی میں دعوت واصلاح، اسلام کی سربلندی، مسلمانوں کی فلاح وبہبود کا جو جذبہ موجزن تھا اس نے انھیں مختلف اوقات میں، مختلف جماعتوں کے ساتھ شرکت پر مجبور کیا، مولانا نے ہمیشہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھا ہے کہ اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کے استحکام کے لئے جماعتی کام کی اشد ضرورت ہے، ساتھ ہی سمجھدار مخلص اور مضبوط قیادت کی بھی اشد ضرورت ہے، جس قائد یا لیڈر یا مصلح میں مولانا کو یہ اوصاف نظر آئے اس کا ساتھ دینے لئے مولانا ہمیشہ کمربستہ رہے۔

۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی میں شامل ہوکر لکھنؤ کے حلقہ کے ذمہ دار رہے پھر حضرت مولانا الیاسؒ سے ملاقات اور تبلیغی کام کے مطالعہ کے بعد تبلیغی جماعت سے تعلق رہا اور لکھنؤ میں اس کام کے آغاز کے ساتھ عملی طور پر مسلمان محلوں، دیہاتوں اور قصبوں میں دعوت کا کام انجام دیا، پھر مجلس مشاورت، مسلم پرسنل لاء وغیرہ، ہر وہ جماعت یا تنظیم جس میں مولانا کو مسلمانوں کے لئے استحکام کی کوئی صورت نظر آتی اور ہر وہ جماعتی کام جو مسلمانوں کے لئے مفید وسودمند ہوسکتا تھا مولانا نے ہمیشہ اس کا ساتھ دیا، اور اپنے مقدور بھر اس کی پشت پناہی کی، آپ نے مختلف میدانوں میں اسلام کی سربلندی کے لئے کام کرنے والوں کے کام کو ہمیشہ سراہا اور کبھی نہ تو کسی کے کام میں رکاوٹ بنے اور نہ ہی کسی کی تنقیص کی۔

حقیقت یہ ہے کہ خود مولانا کا ایک دعوتی مزاج اور دعوتی طریقہ تھا، اس لئے مولانا کسی بھی داعی یا قائد ورہبر کے افکار ونظریات کو من وعن قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوسکے، مولانا نے ٹکراؤ کے بجائے صلح جوئی کی، مخالفت ومنافرت کے بجائے دوستانہ

طریقہ کو ہمیشہ ترجیح دی، اور دلائل و براہین کے ذریعہ ذہنوں کی تعمیر کا کام کیا، اس طرح مولانا اپنے جدامجد سید احمد شہید اور اخوان المسلمین وغیرہ جماعتوں کے بجائے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے طریقہ پر عمل پیرا ہوئے۔

مولانا کا یہی نظریہ تھا جس نے انھیں ہندوستان میں پیام انسانیت جیسی تنظیم قائم کرنے پر آمادہ کیا، تقسیم کے بعد مولانا نے ایک مضمون ''ہندوستانی سماج کی جلد خبر لیجئے'' تحریر فرمایا تھا، ہم اس مضمون کو پیام انسانیت کی طرف پہلا قدم قرار دے سکتے ہیں، پھر مولانا کی وہ تمام تقریریں، بیانات، مقالات جن میں جابجا مولانا نے انسانیت کا درس اور خدا کے بندوں کی عزت واحترام کا سبق دیا ہے ان کو پیام انسانیت کی طرف دوسرا قدم مان سکتے ہیں۔

مولانا کی یہ تقاریر بعد میں پیام انسانیت کے نام سے ہی شائع ہوئیں۔

دسمبر ۱۹۷۴ء کے اواخر میں مولانا نے اپنی اس تحریک کا الہ آباد سے باقاعدہ آغاز فرمایا جس کا کام بلا نام رکھے وہ عرصہ سے انجام دے رہے تھے، مولانا خود تحریر فرماتے ہیں:۔

> ''الہ آباد سے ہم نے کام شروع کیا، کیونکہ اس کا نام الہ آباد خدا کی نگری ہے یہیں سے خداپرستی کی تحریک اور انسانیت کے احترام کی دعوت شروع ہونا چاہیے خدا کے بندوں کی عزت، انسانیت کو نئی زندگی دینے، اور انسانوں کو انسانیت واخلاق کو بھولا سبق یاد دلانے کا کام اسی شہر سے ہونا چاہیے جو خدا کے نام سے آباد ہے''۔

مولانا مرحوم کی پیام انسانیت کی تحریک دوسرے معنوں میں اسلامی تعلیمات اور اسلامی اخلاق کی دعوت ہے، ''کلکم من آدم و آدم من تراب'' کا سبق ہے

جسے دنیا بھول گئی ہے، اس تحریک کے ذریعہ مولانا انسانی فکر کی تعمیر اور معاشرہ میں سدھار لانا چاہتے تھے، اس وجہ سے مولانا نے بلاتفریق مذہب وملت ہر طبقہ سے رابطہ قائم کیا، اور اس میں وسعت دیکر ''کل ہند حلقۂ پیام انسانیت کا قیام فرمایا۔

پیام انسانیت کی اس تحریک کے ذریعہ مولانا اسلام، اور اسلامی ثقافت وتہذیب سے خاص طور پر غیر مسلم بھائیوں کو روشناس کرانا چاہتے تھے، تاکہ اسلام اور اسلامی ثقافت وتہذیب کی طرف سے جو شبہات ان کے دلوں میں ہوں وہ دور ہوسکیں، دونوں میں جو بُعد اور بے تعلقی ہے اس کا ازالہ ہوسکے، اور نتیجتاً غیر مسلم بھائی اسلام سے قریب آئیں۔ ان کے شکوک دور ہوں اور وہ کھلے دل سے اسلام اور اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کرسکیں۔

اور پھر اس طرح اسلامی ثقافت کو غیر اسلامی ثقافت میں ضم کرنے کی جو سازشیں رچی جارہی ہیں ان کا بھی سدّ باب ہوسکے۔

اس لئے مولانا نے پیام انسانیت کے جلسوں میں اس بات کو بار بار دہرایا کہ ہر مذہب والا اپنے مذہب پر عمل پیرا رہے، اور اپنے مذہب کو دوسروں کے مذاہب پر مسلط کرنے کی کوشش نہ کرے، بلکہ تمام مذاہب مل جل کر ایک اچھے پڑوسی کی طرح ہندوستانی معاشرہ میں رہیں، تاکہ ملک کی فضا سازگار رہو، حالات معتدل ہوں اور پھر ہر طرح کا تعمیری کام بہ سہولت کیا جاسکے۔

اسی لئے مولانا نے غیر مسلم اکثریت کے ساتھ انھیں متوجہ کرنے کے لئے جو طریقہ کار اپنایا، وہ یہ تھا کہ ان کے ساتھ گفتگو میں ایسے مسائل کو اختیار کیا جائے جو اکثریت اور اقلیت میں مشترک ہوں، ان سے بحث ومباحثہ اور علمی مناقشہ کے وقت، ''انسانیت'' اور اخلاق جیسے مسائل کو موضوع بنایا جائے، اور مسائل کو حل کرنے کی تجاویز میں بھی مشترکہ پیش آیند مسائل کو حل کرنے کی تدابیر پر غور وخوض کیا جائے۔

انسان کی انسانیت کو بیدار کرنا، اس کی روحانی قدروں کو اجاگر کرنا اور ہر مذہب

کو اپنے دائرہ میں رہتے ہوئے انسانیت کے فروغ کے لئے سعی وکوشش کرنا تاکہ مرور وقت کے ساتھ ساتھ باہمی تنافر کی فضا ختم ہوکر سننے سمجھنے کا سازگار ماحول پیدا ہو سکے۔

انہی باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس تحریک کے اغراض ومقاصد مولانا نے کچھ اس طرح مقرر فرمائے ہیں:-

۱۔ ملک میں عام محبت اور بھائی چارے کی فضا قائم کرنا۔

۲۔ اخلاقی گراوٹ کو ختم کرنے کی سعی وکوشش کرنا، اس لئے مختلف زبانوں میں اخلاقی لٹریچر کی اشاعت کے ساتھ، جلسوں اور سیمینار کے ذریعہ عوامی رابطہ پیدا کرنا۔

۳۔ خدمت خلق کا جذبہ پیدا کرنا۔

۴۔ لوگوں کو زندگی کے حقیقی مقصد سے روشناس کرانا۔

۵۔ معاشرہ سے رشوت، اقرباء پروری، بدعنوانی، ذخیرہ اندوزی فرقہ پرستی اور معاشرتی استحصال کو دور کرنا۔

۶۔ عریانی، بے حیائی کے خلاف بھرپور جدوجہد کرنا۔

۷۔ ظالمانہ رسم ورواج کے خلاف صف بستہ ہونا، اوران کے انسداد کی کوشش کرنا۔

۸۔ بلا امتیاز مذہب وملت، مظلوم، پس ماندہ، غریب، اور پریشان افراد کی مدد کرنا۔

۹۔ نوجوان نسل، خاص طور پر طلباء میں سنجیدگی، علمی لیاقت اور سماج کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا۔

۱۰۔ اور سب کو مل جل کر پورے ملک میں برادرانہ ماحول پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنا۔

مولانا نے اپنی اس تحریک اوران اغراض ومقاصد کو عام کرنے کی غرض سے ملک کے کئی طویل وعریض دورے کئے، بہار، راجستھان، ہریانہ، اترپردیش اور مدھیہ

پردیش کے دوروں کے دوران پبلک جلسوں کے ذریعہ مولانا نے اپنا پیغام پہنچایا۔

پیام انسانیت کی تحریک خود مولانا کی فکر کی پیداوار ہے، مولانا اپنی اس تحریک اور دوسری جماعتوں اور تحریکوں میں اپنی شرکت کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ :-

> ''اس وقت تک ہندوستان کی جن جماعتوں اور تحریکوں میں اپنی شرکت ورفاقت کا ذکر کیا گیا اور جن ملکی وملی مسائل سے اپنی گہری دلچسپی اوران کے ساتھ اپنے تعاون اوراشتراک عمل کا تذکرہ کیا گیا، ان کی اولیت وقیادت اوران کا خیال پیدا ہونے کا شرف کسی طرح مجھے حاصل نہیں تھا، واقعات وحقائق کے مطالعہ اور ضرورت کے احساس نے اس کاروانِ عمل میں شریک ہوجانے کا مشورہ ہی نہیں دیا بلکہ ضروری قرار دیا، اوراس میں اپنی صلاحیتوں، مناسبت، ذوق، اوروقت وفرصت کے مطابق حصہ لیا، لیکن تحریک ''پیام انسانیت'' کا معاملہ اس سے زیادہ مختلف ہے، اس کا خیال خود دل کی گہرائیوں سے ابھرا، اوراس نے قوت فکر اوراعصاب پر اپنا تسلط قائم کرلیا، اوراس کا داعی وشارح بنادیا''۔

لیکن نہایت افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ اپنی افادیت کے باوجود مولانا کی یہ تحریک عوام الناس میں زیادہ مقبول نہ ہوسکی، اورعوام اورعلماء وزعماء کی اس کی طرف خاص توجہ نہ ہوسکی، جبکہ پیام انسانیت کی یہ تحریک صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستانی معاشرہ کے لئے ایک مفید اورضروری تحریک ہے اوراس کے ذریعہ معاشرہ کے بہت سے امراض کا کامیاب علاج آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔

نہ گھروں میں ماحول نہ محلّہ اور بستی میں فضا

"کیا دین کے منافی ماحول میں دین وایمان سے محروم ہوجانے کے احتمالات، جانی خطرات کے احتمالات سے زیادہ قوی نہیں ہیں۔ ہمارے بچے جو پڑھ رہے ہیں، جن کو آپ نے ایک دن نہیں بتایا کہ توحید کیا ہے؟ آپ نے کوئی انتظام اپنے شہر میں دینی مکاتب کا نہیں کیا، جہاں بچے پڑھ کر پھر اسکولوں میں جاتے اور اپنا ایمان بچانے کے قابل ہوجاتے، نہ گھروں میں وہ ماحول نہ محلّہ اور بستی میں یہ فضا، اسکولوں کو میں کیا کہوں۔ میں عربی مدرسوں کا آدمی ہوں وہاں یہ حالت ہے کہ اب جو بچے آرہے ہیں وہ بھی ایسی بنیادی باتوں سے ناواقف ہیں جن کا ہمارے بچپن میں خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ کوئی مسلمان بچہ ان سے ناواقف ہوگا۔"

مولانا ضیاء الدین اصلاحی

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

صاحب اسلوب ادیب اور نقاد

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی شہرہ آفاق عالم و مصنف تھے۔ ان کے مرغ شہرت کی پرواز ہندوستان کی فضا سے لے کر دنیا کے کونے کونے تک وسیع تھی، مشرق سے لے کر مغرب تک اور شمال سے لے کر جنوب تک ان کا غلغلہ بلند تھا اور وہ عرب و عجم میں یکساں محبوب و مقبول اور مکرم و محترم تھے۔

هذا الذی تعرف البطحاء وطأته

البیت یعرفه و الحل و الحرم

مولانا دنیا کے سرخیل علماء میں تھے، وہ جس زمانے میں پیدا ہوئے تھے اس زمانہ میں ہندوستان میں دینی علوم اور ملک کی زبان و ادب کے درمیان سرحدیں قائم ہوگئی تھیں اور ملک میں یک فنی علماء پیدا ہونے لگے تھے۔ جو ادب و شاعری کو ثقاہت و سنجیدگی کے خلاف سمجھتے تھے، سلیس و شیریں اردو میں تصنیف کرنا عالمانہ شان کے منافی خیال کیا جاتا تھا۔ جغرافیہ و تاریخ سے ناواقفیت علماء کا شعار ہوگیا تھا۔ فقیہ و محدث کے لیے خشک ہونا اور عالم کے لیے شعر کو غیر موزوں پڑھنا شرط لازم بن گیا تھا۔ متکلم ادیب

وانشاء پرداز نہیں ہوتے تھے اور ادیب وانشاء پرداز علوم دینیہ سے سروکار نہیں رکھتے تھے۔ مدرس تصنیف وتالیف کے نااہل اور مصنف ومقرر تدریس کا اہل نہیں ہوتا تھا لیکن مولانا سید ابوالحسن علی ندوی یک فنی عالم نہ تھے۔ وہ علوم دینیہ کے فاضل اور متبحر عالم ہونے کے باوجود ممتاز ادیب وانشاء پرداز بھی تھے اور جس درجہ کے عالم و مدرس تھے اسی درجہ کے مصنف اور ادیب بھی تھے۔

اس کے اسباب متعدد ہیں، وہ ندوۃ العلماء کی تحریک کے روح رواں تھے، اس کا تخیل اور طرز فکر ان پر چھایا ہوا تھا، ان کی بنیادی تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہوئی جس کے فضلاء قدیم و جدید کی واقفیت، علمی تبحر، ادبی ذوق، نقاد ومؤرخ کی حقیقت پسندی اور سنجیدگی، ادباء اور انشاء پردازوں کی شگفتگی اور حلاوت اور فکر ونظر کے لوچ اور مطالعہ کی وسعت کے جامع ہوتے تھے۔ فارسی اور اردو کا یکساں مذاق تھا اور شعر وادب کا ذوق اور سخن شناسی وسخن سنجی دونوں سے حصہ وافر ملا تھا۔

وہ جس گھر اور خاندان کے پروردہ تھے اس میں خالص دینی تعلیم اور دولت باطنی کے ساتھ ادب وانشاء اور شعر وشاعری کا اعلیٰ مذاق اور نقد سخن کا ملکۂ راسخ تھا، تاریخ وسوانح کی طرف مکمل اعتناء طبقات علماء اور مراتب رجال سے خصوصی مناسبت اور گہری واقفیت تھی، زندگی کے ضروری کاموں کے ساتھ ملکی زبان کی طرف توجہ اور سلیس وصاف، شیریں وشگفتہ اردو تحریر، علوم وفنون کی جامعیت اور کمالات کی رنگارنگی پائی جاتی تھی، تعشف کی حد تک مذہبی پابندی کے ساتھ نفاست پسندی و نستعلیقی، احساس جمال ورعنائی خیال، فقر وسادگی میں خیالات کی رفعت اور مقاصد کی عظمت، مکمل یکسوئی اور باطنی مشغولی کے ساتھ دین وملت کی خدمت کا جذبہ اور اجتماعی کاموں کا ذوق اور صلاحیت، مطالعہ اور تصنیف کی محویت اور استغراق کے ساتھ جو ہمیشہ سے شرکت ودوئی کا دشمن ہے ایک بڑی دینی وعلمی تحریک وادارہ انجمن ندوۃ العلماء اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی ذمہ

داری اور سربراہی اور اسلام کی سربلندی کا جذبہ کارفرما تھا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے والد بزرگوار کی مشہور تصنیف گل رعنا کے پیش لفظ میں ہندوستان میں جدید نظام تعلیم کے رواج سے قبل انگریزوں کے دور اقتدار کے رائج نظام تعلیم کا جائزہ لیا ہے جو فارسی وعربی درسیات، زبان کے قواعد، ریاضی، منطق وفلسفۂ ادب، (نثر ونظم) بلاغت وفن عروض سے لے کر علوم دینیہ، فقہ، اصول وحدیث وتفسیر وعلم کلام پر مشتمل تھا، اس کے بارے میں تحریر فرمایا کہ اس کی بدولت ملک کی انتظامیہ کے اعلیٰ عہدیداروں یہاں تک کہ وزیر سلطنت، محاسب اعلیٰ، (اکاؤنٹنٹ جنرل) منشی ودبیر (انشاء پرداز وسکریٹری) اور قاضی ومفتی یکساں طور پر پیدا ہوتے تھے، غرض اس عہد میں ہر طرح کے باصلاحیت تعلیم یافتہ افراد پیدا کرنے کے لیے جو ہر طرح کی ذمہ داری سنبھال سکیں اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ تعلیم یا اختصاص پیدا کرنے کا کوئی شعبہ موجود نہ تھا، جس طالب علم میں جس فن کی فطری صلاحیت اور خداداد مناسبت ہوتی تھی یا اس کے مخصوص محرکات جمع ہو جاتے تھے وہ اس میں امتیاز واختصاص پیدا کر لیتا تھا اور اس کو اپنی زندگی کا مشغلہ بنا لیتا تھا، فارسی ادبیات کا اتنا وافر حصہ اور اس کے ایسے دلکش ودلآویز نمونے نصاب میں داخل تھے اور بالعموم اساتذہ ان کو ایسی دلچسپی ودل سوزی سے پڑھاتے تھے کہ عام طور پر فارسی کا ذوق اور شعر وادب سے لطف لینے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی اور فارسی واردو سے گہرے تعلق کی بنا پر اردو میں بھی اس سے بڑی مدد ملتی تھی، مولانا کے خیال میں اس زمانے میں نصاب تعلیم، زندگی، ملک کی زبان وادب اور مجالس ومعاشرت سے الگ تھلگ کوئی چیز نہ تھی جیسا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے واضح طریقہ پر نظر آنے لگا، جو باکمال اساتذہ مسند درس پر بیٹھ کر منطق وفلسفہ کی خشک وبے مزہ کتابیں پڑھاتے تھے اور علمی مباحث اور دقیق مضامین میں بال کی کھال نکالتے تھے اور حدیث وتفسیر کے درس کے وقت وقار وتمکنت کی تصویر ہوتے، دوسرے وقت اپنے شہر وقریہ کی

ادبی مجلسوں میں بے تکلف شریک ہوتے، اچھے شعر کی دل کھول کر داد دیتے، خود بھی طبع آزمائی کرتے اور شعر کا کھرا کھوٹا خوب پرکھتے بلکہ اکثر اوقات ان ہی کا قول اس بارے میں قول فیصل ہوتا۔

ادبی و علمی محفلوں میں اسی قدیم نصاب کے ساختہ و پرداختہ فضلا صدر نشیں ہوتے، وہی زبان وادب کی اس ملک میں سربراہی اور رہنمائی کا فرض انجام دیتے، ان ہی کا قول ان اصناف میں حجت مانا جاتا، ان ہی کے قلم سے ان مباحث پر بلند پایہ تصنیفات نکلتیں اس لئے کہ پورے ملک میں یہی سب سے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ تھا، مولانا علی میاں اس ضمن میں مولوی امام بخش صہبائی، مولانا عبداللہ خاں علوی، مفتی صدرالدین خاں آزردہ اور مولانا فضل حق خیر آبادی کا نام لیتے ہیں، کہ جس طرح علوم معقول ومنقول میں اپنے دور کے امام مانے جاتے تھے اسی طرح نکتہ شناسی، دیدہ وری وسخن فہمی میں بھی معیار تسلیم کئے جاتے تھے اور ان کا قول حرف آخر اور زبان وادب کے بارے میں بھی ''فتویٰ'' کی حیثیت رکھتا تھا، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ بھی اسی نظام تعلیم کے فیض یافتہ و پروردہ تھے جن کی سخن فہمی اور نکتہ رسی کی بنا پر غالب تک کو کہنا پڑا:

غالب بہ فن گفتگو نازد بہ ایں ارزش کہ او
نہ نوشت در دیواں غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نہ کرد

مولانا ابوالحسن علی فرماتے ہیں کہ اس دور کے بعد بھی اسی طبقہ کے ہاتھ میں ملک کی علمی وادبی قیادت رہی، مولوی محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی اور علامہ شبلی نعمانی اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان ہی کے قلم سے آب حیات، مقدمہ شعر وشاعری اور موازنہ انیس ودبیر جیسی معرکۃ الآراء ادبی کتابیں نکلیں، مولانا اپنے والد حکیم سید عبدالحیٔ کو بھی اسی دور واپسیں کی آخری یادگاروں میں بتاتے ہیں، جنھوں نے آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا تو گھر گھر شعر وسخن کے چرچے تھے، شہر

تو درکنار قصبات اور بڑے دیہاتوں میں بھی مشاعرہ کی محفلیں آراستہ ہوتیں اور نوجوان تو نوجوان بچے تک شعر موزوں کرنے کی کوشش کرتے، ان کے والد مولوی سید فخر الدین خیالی پُر فکر شاعر اور کہنہ مشق ادیب ونثار تھے، جب یہ لکھنؤ میں تحصیل علم میں مشغول تھے اس وقت منشی امیر احمد مینائی، حکیم ضامن علی جلال، شیخ امیر اللہ تسلیم اور مولوی محمد محسن کاکوری کی شاعری کی دھوم مچی ہوئی تھی، بچہ بچہ کی زبان پر ان کا نام اور کلام تھا، ادھر مرزا سلامت علی دبیر اور میر ببر علی انیس کے مراثی کی دھوم مچی ہوئی تھی اور سارا شہر ان کے کلام سے مست ہو رہا تھا، وہ خود دردمند دل اور موزوں طبیعت لے کر آئے تھے، اردو تو ان کی زبان تھی، عربی وفارسی ادب وزبان سے ان کو فطری مناسبت تھی، بھوپال گئے تو وہاں بھی والا جاہ نواب صدیق حسن خاں بہادر جو مفتی صدر الدین خاں آزردہ کے عزیز شاگرد تھے، کی جوہر شناسی اور قدر دانی سے باکمال اور صاحب ذوق علماء وادباء کا مرکز بنا ہوا تھا۔

اس عہد وماحول اور ایسے صاحب فضل وکمال باپ دادا کے آغوش میں مولانا علی میاں کی پرورش ہوئی تھی تو وہ ادب، انشاء اور شعر وسخن کے کوچے سے ناآشنا کیسے رہتے، اگر ایسے ماحول اور اس اندازِ تعلیم وتربیت کے باوجود ان میں شعر وسخن کا ذوق سلیم اور سخن فہمی کا مذاق صحیح پیدا نہ ہوتا تو تعجب ہوتا۔

سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ ابتدائے عمر ہی میں ان کو اردو زبان وادب کی معیاری کتابیں پڑھنے کا چسکا لگ گیا تھا، مولانا شبلی کی الفاروق ہاتھ لگی تو اسے کئی بار پڑھا، آب حیات کئی بار پڑھی، اس کے بہت سے مضامین بھی مستحضر ہو گئے تھے، اشخاص، شعراء اور ان کا کلام دماغ پر نقش ہو گیا، گلِ رعنا تو ان کے گھر کی کتاب تھی، اسے اتنی بار پڑھا کہ اردو شاعری کی تاریخ اور شعراء کے متعلق اتنی معلومات ہو گئیں کہ اس موضوع پر مجلس میں گفتگو کرنے اور گفتگو میں حصہ لینے کی استعداد پیدا ہو گئی، ان کے ایک ماموں زاد بھائی حافظ سید حبیب الرحمٰن جامعہ ملیہ میں پڑھتے تھے، ان کو اردو شعر وشاعری کا بڑا شوق تھا، وہ بچوں سے اساتذہ

کے اشعار کا مطلب پوچھتے اور اردو میں تقریر و تحریر کے مقابلے کرواتے، مومن، غالب، ذوق اور لکھنؤ کے شعراء میں آتش اور امیر مینائی کے کلام سے ان کو خاص ذوق تھا، اس کی وجہ سے مولانا کو ان شعراء کے اشعار سننے اور ان کا مطلب بیان کرنے کے لئے دماغ پر زور ڈالنے اور مشکل اشعار کے سمجھنے کی عادت پڑی، مولانا کی شعر فہمی اور ذوق آفرینی میں حافظ صاحب کے بڑے بھائی مولوی سید ابوالخیر برق کا بھی حصہ تھا جو لکھنؤ کی زبان کے عاشق، محاورات اور الفاظ کی تذکیر و تانیث میں سند اور استاد کا درجہ رکھتے تھے، اور خود بھی اچھا شعر کہتے تھے، اس زمانے میں مشاعروں کا بڑا زور تھا، مولانا کے گاؤں میں بھی کئی مشاعرے ہوئے اور دیکھا دیکھی انھوں نے بھی کچھ موزوں کرنے کی کوشش کی مگر ان کے بڑے بھائی اور مربی مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی سابق ناظم ندوۃ العلماء نے سختی نے منع کیا اور یہ شغل جاری نہ رہ سکا۔

عمر کے اس ابتدائی دور اور زبان و ادب کے اس ابتدائی ذوق میں مولوی محمد حسین آزاد کی نثر کا جو نثر فنی کا ایک مرصع نمونہ ہے ان پر بہت اثر پڑا، بہت دنوں تک نیرنگ خیال اور آب حیات کی تقلید میں بہت سے صفحے لکھے جو فائدے سے خالی نہیں تھے، اس زمانے میں انھیں ہر چھپی ہوئی چیز پڑھنے کا مرض ہو گیا تھا، مولانا شبلی، مولانا حالی اور مولوی نذیر احمد، شرر مرحوم اور رتن ناتھ سرشار کی بھی چند کتابیں پڑھیں، مولانا ابوالکلام آزاد کے شہرۂ آفاق جریدہ ''الہلال'' کے کئی سال کے فائل بڑے ذوق و شوق سے پڑھے اور ان کے زور قلم اور جوش بیان کا پورا اثر ان کی طبیعت نے قبول کیا۔

مولانا نے اپنی اردو مضمون نویسی میں ابتدائی اثر اپنے والد مرحوم کی کتاب ''یاد ایام'' کا بتایا ہے جو ان کے بقول زبان کا ایک شگفتہ نمونہ ہے اور جس میں تاریخ کی متانت کے ساتھ زبان کا بانکپن بھی موجود ہے، اسے وہ اپنے والد اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی تحریر کا مشترکہ جوہر قرار دیتے ہیں، اسی زمانے میں انھوں نے قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی کتاب رحمۃ للعالمین کو بڑے ذوق و شوق اور عقیدت

محویت کے ساتھ پڑھا جس کو وہ اپنی محسن و مربی کتابوں میں خیال کرتے تھے اور کہتے تھے کہ کم کتابوں نے دل و دماغ پر ایسا گہرا اثر ڈالا ہوگا۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی میں ادب وانشاء کا جوہر، شعر وسخن سے دلچسپی اور دیدہ وری اور نکتہ رسی شروع ہی سے موجود تھی، وہ عام علماء کی طرح نہیں تھے، جن کو نہ اردو شعر وادب کا اچھا ذوق ہوتا ہے اور نہ ان کو سخن شناسی اور شعر فہمی سے زیادہ مناسبت ہوتی ہے، وہ اصلاً داعی الی اللہ تھے اور ان کی زندگی سدا دعوت ہی کے لئے وقف رہی، اس اہم اور ضروری فریضہ کو ادا کرنے کے لئے بھی زبان و بیان پر مکمل قدرت اور ادب وانشاء پردازی میں کمال ضروری ہے، جس کے سارے اسباب ووسائل بچپن ہی سے قدرت نے انھیں مہیا کر دیئے تھے، وہ اس کی ضرورت واہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''دین کے جن داعیوں اور علماء کو آغاز عمر میں اپنے ملک کی زبان وادب کا مطالعہ اور اس کا ذوق پیدا کرنے کا موقع نہیں ملتا یا بڑی عمر میں وہ انکا مطالعہ کرتے ہیں، ان کو دین کی مؤثر دعوت دینے اور دینی حقائق کی تفہیم وتعلیم میں نیز جدید تعلیم یافتہ طبقے میں دینی مقاصد کو دلنشیں کرنے میں دقت پیش آتی ہے اور ان کی انشاء وتحریر میں وہ طاقت اور دل آویزی نہیں ہوتی جس کی اس عہد میں ضرورت ہے''۔

مولانا نے اس ضرورت کو محسوس کر کے رابطہ ادب اسلامی کے نام سے ایک مستقل ادارہ قائم کیا تھا جس کا مرکز ہندوستان اور بلاد عربیہ دونوں جگہ تھا اور مولانا دونوں کے صدر تھے، اور اس کے سالانہ اجلاس برابر ہوتے رہتے تھے، اس کے قیام کا مقصد یہی تھا کہ اسلام کے داعی ومبلغ اپنے ملک کی زبان میں اچھی دستگاہ پیدا کریں اور اس کے علمی

وادبی ذخیروں کا جائزہ لے کر سنجیدہ ادیب، لائق انشاء پرداز اور مشاق اہل قلم بنیں اور اپنی دینی دعوت اور اصلاحی خیالات کو مؤثر اور دلنشیں انداز میں پیش کریں۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے دور میں علامہ شبلی اور حکیم مولانا سید عبدالحیٔ کے بعد بھی ان کی طرح طبقہ علماء میں خواہ ان کی تعداد کم ہو ایسے لوگ پیدا ہوئے جو ممتاز عالم وداعی ہونے کے باوجود صاحب کمال اور صاحب طرز ادیب وانشاء پرداز تھے جن کی تحریر وانشاء زور وقوت اور دل کشی ودل آویزی سے معمور اور ادبی حیثیت سے بلند پایہ تھی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا مسعود عالم ندوی کو اردو کی ادبی تاریخ میں جگہ نہ دینا ظلم وناانصافی ہے، قدیم علماء ومشائخ کو بھی اسی طرح نظر انداز کیا جاچکا ہے، حالانکہ وہ ادیب وانشاء پرواز ہی نہیں صاحب طرز صاحب اسلوب بھی تھے، مولانا علی میاں نے اس سلسلے میں شیخ شرف الدین یحیٰ منیری اور مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی کا نام خاص طور پر لیا ہے، ان کو پیشہ ور ادیبوں کی اس زیادتی کا شدت سے احساس تھا، جو حضرت شیخ منیری کے تذکرہ میں اس طرح بھڑک اٹھتا ہے:

> ''دنیا کی اکثر زبانوں اور علم وادب کے بارے میں یہ زیادتی کی گئی ہے کہ صرف ان شخصیتوں کو ادیب، صاحبِ اسلوب اور انشاء پرداز تسلیم کیا گیا ہے اور انھیں کی تحریر اور نتائج فکر کو ادب کے نمونے کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے جنھوں نے ادب وانشاء کو ایک پیشہ یا ذریعہ اظہار خیال کے طور پر انتخاب کیا یا جو قدیم زمانہ میں سرکاری دربار سے متعلق تھے اور کوئی تحریری خدمت ان کے سپرد تھی یا جنھوں نے انشاء میں صناعی اور تکلف سے کام لیا، اس کا

نتیجہ یہ ہے کہ عربی ادب کی تاریخ میں انشاء پرداز اور صاحب اسلوب کی حیثیت سے ہمیشہ عبدالحمید الکاتب، ابواسحاق الصابی، ابن العمید، صاحب بن عباد، ابوبکر خوارزمی، ابوالقاسم حریری اور قاضی فاضل کا نام لیا جاتا ہے، حالانکہ ان کی تحریروں کا بڑا حصہ مصنوعی، زندگی اور روح سے محروم اور تاثیر سے خالی ہے، ان کے مقابلے میں امام غزالی، ابن جوزی، شیخ محی الدین ابن عربی، ابوحیان توحیدی، ابن قیم، ابن خلدون کہیں بڑھ کر انشاء پرداز کہلانے کے مستحق ہیں اور ان کی تصنیفات میں صحیح اور طاقتور انشاء، خیالات وجذبات کے اظہار اور انسانی تأثرات واحساسات کی تصویر کے نہایت دلکش اور دل آویز نمونے ہیں لیکن ان بے گناہوں کا گناہ یہ کہ انھوں نے کبھی ادب وانشاء کو اپنا مستقل پیشہ یا اظہار خیال کا ذریعہ نہیں بنایا اور ان کی اکثر تحریروں کا موضوع دینی وعلمی ہے۔

دلچسپ اور عبرت انگیز بات یہ ہے کہ ایک ہی مصنف دو کتابیں لکھتا ہے، ایک تو سراسر تکلف اور تصنع سے بھری ہوئی ہوتی ہے اور دوسری سادہ اور بے تکلف، اس کے زمانے کی سوسائٹی اور ادبی حلقے پہلی تصنیف کی داد وتحسین کی صداؤں سے گونج جاتے ہیں اور شاید وہ مصنف خود بھی اس کتاب کو حاصل زندگی اور سرمایۂ نازش وافتخار سمجھتا ہے، لیکن حقیقت پسند زمانہ اور انقلاب روزگار اپنا صحیح فیصلہ صادر کرتا ہے، پر تکلف تصنیف کتب خانوں کی زینت ہو کر رہ جاتی ہے اور دوسری کتاب کو بقائے دوام کا خلعت عطا ہوتا ہے اور وہ گلشن بے خزاں کی طرح سدا بہار بن جاتی ہے، ابن

جوزی کی مایہ ناز تصنیف جس کا انھوں نے بڑے فخر کے ساتھ ''المدہش'' (حیرت میں ڈال دینے والی کتاب) نام رکھا تھا پردۂ خفا میں ہے، لیکن ان کی بے تکلف کتاب ''صید الخاطر'' جس میں انھوں نے نہایت سادہ طریقہ پر اپنی زندگی کے تجربات اور روز مرہ کے تاثرات قلم بند کئے تھے اور جس کو شاید وہ خاطر میں بھی نہ لاتے ہوں آج مقبول عام اور ادب کے طالب علموں کا مرکز توجہ بنی ہوئی ہے۔

ہندوستان کے فارسی ادب کی تاریخ کا جائزہ لیجئے تو یہاں کے ادب وانشاء پر ظہوری، ابوالفضل اور نعمت علی خاں چھائے ہوئے نظر آتے ہیں حالانکہ اگر انشاء کے لئے جذبات وحقائق کے مؤثر اظہار کو معیار قرار دیا جائے تو ان کی تحریروں کا بڑا حصہ جن میں لفاظی، صنائع وبدائع اور لفظی رعایتوں کا زور ہے، اپنی قیمت کھو دیتا ہے اور بہت تھوڑا حصہ ادب وانشاء کے فطری معیار پر اترتا ہے، ان کے مقابلے میں ایسی بہت سی تصنیفات لائق اعتناء ٹھہرتی ہیں جن کو عام طور پر مؤرخین ادب اور خوگرِ تقلید ناقدین نے ہمیشہ نظر انداز کیا، حضرت شیخ شرف الدین منیری اور حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی فاروقی کے ''مکتوبات'' کا بڑا حصہ عالم گیر کے رقعات، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی ازالۃ الخفاء اور شاہ عبدالعزیز کی تحفہ اثنا عشریہ کے بہت سے ٹکڑے فارسی ادب وانشاء کا کامیاب نمونہ ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر زبان میں ادب کا جو دائرہ کسی پیش رو نے کھینچ دیا، اس کے حدود اربعہ سے باہر نکلنے، دوسرے علوم وفنون کے ذخیرے کو کھنگالنے اور نئے ادبی شاہ کاروں کو دریافت کرنے

کی دردسری عام طور پر گوارا نہیں کی گئی اور اس طرح صدیوں تک
ان ادبی جواہرات پر خاک پڑی رہی۔"

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جیسے عظیم داعی و مصلح کے لئے یہ ممکن نہ تھا اور نہ ان کو اتنی فرصت تھی کہ وہ ادب کو پیشہ یا ذریعہ اظہار کمال بناتے تاہم ادب وانشاء اور مؤثر طریقہ بیان ان کی گھٹی میں داخل تھا، اس لئے ان کی دعوتی، تاریخی اور سوانحی تحریریں بھی ادب وانشاء کے بانکپن، لطافت، رعنائی خیال اور جادو بیانی سے خالی نہیں ہوتی تھی جس کی کچھ مثالیں آگے پیش کی جائیں گی۔ علامہ اقبال پر ان کی کتاب ایک شاہ کار ہے جس کو ادبی ذخیرے میں شامل کرنے پر مؤرخین ناقدین ادب کو بھی اعتراض نہیں ہوسکتا تھا مگر یہ عربی میں لکھی گئی تھی جس کا نہایت سلیس اور شگفتہ اردو ترجمہ مولانا شمس تبریز خاں نے انہی کے طرز واسلوب میں کیا تھا، لیکن اس سے اور مولانا روم اور جگر مرادآبادی پر لکھے گئے ان کے مضامین سے ہم قطع نظر کرتے ہیں اور ان کی ایسی ادبی تحریر کو زیر بحث لانا چاہتے ہیں جس سے اردو شعر وادب پر ان کی گہری نظر، شعر وشاعری سے دلچسپی، سخن فہمی اور نکتہ رسی کا بہ خوبی اندازہ ہو جائے گا۔

مولانا نے حیات عبدالحی میں "گل رعنا" پر تبصرہ کرتے ہوئے جو کچھ لکھا تھا ان کا یہ مضمون گل رعنا کے نئے عکسی اڈیشن میں بھی شامل ہے، اس سے اردو شعر وشاعری کے متعلق بہت سی مفید باتیں اور دلچسپ نکتے ہاتھ آتے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ ۱۹۵۷ء کے کچھ بعد تک ترکی وافغانی النسل حکمرانوں کے اثر سے فارسی تصنیفی ودفتری زبان تھی اور ہر قسم کا سنجیدہ وعلمی وتحریری کام اسی زبان میں ہوتا تھا، اردو شعراء کے تذکرے بھی فارسی ہی میں لکھے جاتے تھے، مولوی محمد حسین آزاد مرحوم نے آب حیات لکھ کر پہلی مرتبہ اردو والوں کو اردو شاعری کی کہانی اردو میں سنائی، مولانا علی میاں نے اس کو بڑا علمی وادبی کارنامہ اور اردو پر احسان قرار دیا ہے، اس موقع پر آزاد کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کی آزاد

شناسی کے علاوہ اردو زبان وادب کے وسیع اور گہرے مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے:

"وہ اردو زبان وادب وشاعری کے گہوارے میں پلے تھے اور اردوئے معلیٰ کے اجڑنے سے پہلے اس کی بہار دیکھی تھی، استاد ذوق جیسے استاد کے عزیز شاگرد تھے، ذوق، غالب، مومن، شیفتہ کی مجلسیں اور بے تکلف صحبتیں دیکھی تھیں، لکھنؤ بھی وہ اس وقت آئے تھے جب ناسخ وآتش کے تذکروں سے محفلیں گرم اور دبیر وانیس کی خوش نوائی سے لکھنؤ کا چمن بول رہا تھا، سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ پیدائشی طور پر سخن فہم وسخن شناس تھے، ان کا خمیر شعر وادب سے اٹھا تھا اور اس کا ذوق ان کے رگ وریشہ میں پیوست ہو گیا تھا، پھر وہ اس درجہ کے انشاء پرداز ہیں کہ ان کی انشاء پردازی دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے کلاسیکل ادب اور انکے ادبی شہ پاروں سے آنکھیں ملاتی ہے۔"

اسی مضمون میں مولانا ادب اور تاریخ کا فرق بیان کر کے اپنی طبعی لطافت، ادبی نکتہ سنجی اور بلاغت شناسی کا ثبوت دیتے ہیں، وہ مولوی محمد حسین آزاد کو پیدائشی ادیب اور ادب وانشاء کو ان کے تیغِ قلم کا اصل جوہر بتاتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"ادبی مزاج اور تاریخی مزاج میں ایک طرح کا بُعد ہے، اس میں اور ادبی تقاضوں میں بعض اوقات تعارض پایا جاتا ہے، ادب تخیل پسند ہوتا ہے اور تاریخ حقیقت پسند، ادب اپنی پرواز کے لئے آزاد اور بے قید فضا چاہتا ہے، تاریخ اپنے سفر کے لئے ایک محدود اور نپا تلا راستہ، ادب تشبیہ واستعارہ اور تخیل سے آب ورنگ پیدا کرتا ہے اور تاریخ حوالوں، واقعات اور قدیم تحریروں کی پابندی

سے گراں بار ہوتی ہے، محمد حسین آزاد کا اصل مزاج اور رجحان طبیعت، ادب وانشاء پردازی ہے، وہ خواہ کسی تاریخی موضوع پر قلم اٹھائیں یہ ذوق ان پر غالب آکر رہتا ہے، اس کی مثال دیکھنا ہو تو دربار اکبری کا مطالعہ کیا جائے۔"

مولانا حکیم سید عبدالحئی کا تذکرہ "گل رعنا" آب حیات کے بعد کی تصنیف ہے، مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اس نئی تصنیف کی ضرورت کے متعدد اسباب بتائے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ اور شعراء کے طبقات پر ان کی عمیق نظر تھی، مثلاً ایک سبب یہ ہے کہ آب حیات میں ہر دور کے شعراء کی ایک بڑی تعداد ان شعراء کی ہے جن کا تذکرہ آب حیات میں آیا ہے اور بعض اپنے ان خوش قسمت معاصرین سے جن کا آب حیات میں تذکرہ آگیا ہے بلند پایہ تھے نظر انداز ہوگئی ہے جن کے تذکرے کے بغیر اردو شاعری کی مسلسل تاریخ میں بیچ بیچ میں خلا محسوس ہوتا ہے۔ مولانا علی میاں نے طبقہ متقدمین، دور متوسطین اور دور متاخرین کے ایسے شعراء کے نام دیئے ہیں اور ان کے فن پر جچا تلا تبصرہ کر کے دکھایا ہے کہ یہ کسی طرح آزاد کے سے جوہر شناس اور کمال کے سچے قدرداں کی قدردانی سے محروم ہونے کے لائق نہ تھے۔

دوسری وجہ یہ لکھی ہے کہ آب حیات میں متعدد تاریخی فروگزاشتیں پائی جاتی ہیں اور بعضے بیانات کی تصدیق ان اصل کتابوں سے نہیں ہوتی جن کا حوالہ دیا گیا ہے، مولانا نے اس کی بھی متعدد مثالیں دی ہیں، مثلاً میر تقی میر کے تذکرہ "نکات الشعراء" کے حوالے سے کئی ایسی باتیں آزاد نے لکھی ہیں جو اس میں سرے سے موجود نہیں ہیں، بلکہ مولانا تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ میر تقی میر کا تذکرہ "نکات الشعراء" آزاد کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔

آب حیات کی تیسری بڑی کمی یہ بیان کی گئی ہے کہ اساتذہ سخن کے تذکرے،

ان کے محاسن وکمالات کا اعتراف واظہار اور ان کے مرتبہ ومقام کے تعین نیز بعض ہم عصر اور باہم دیگر مقابل شعراء کے موازنہ کے بارے میں کچھ ایسی خامیاں پائی جاتی ہیں جن کو اگر آزاد کے احترام میں ناانصافیاں نہ کہیں تو ناہمواریاں ضرور کہہ سکتے ہیں، جیسے متعدد مقامات پر ان کے مذہبی جذبات یا ذاتی تعلقات غیر جانبدارانہ تاریخ نویسی کے تقاضوں پر غالب آگئے ہیں، مولانا علی میاں کو اس بے اعتدالی کا سب سے زیادہ احساس مرزا مظہر جانِ جاناں کے تذکروں کے موقع پر ہوا ہے، ان کے نزدیک مصحفی اور انشا کے تقابل میں بھی اندرونی جذبہ ابھر کر سامنے آگیا ہے، آزاد جیسے نقاد، سخن فہم اور اردو شاعری کے اداشناس اور مزاج داں سے ان کو اس کی بالکل توقع نہیں تھی کہ وہ مصحفی جیسے مسلم الثبوت استاد اور صاحب طرز شاعر پر جن کے کمالات وفتوحات کی سرحدیں بارہا میر وسودا کی سرحدوں سے مل گئی ہیں اور انکے بعض اشعار صرف اردو شاعری میں نہیں بلکہ مطلق شاعری کی تاریخ اور اس کے منتخب اشعار میں جگہ پانے کے مستحق ہیں، سید انشاء کو ترجیح دیں گے، آخر زمانہ نے اپنا فیصلہ صادر کردیا، سید انشا کی ہنگامہ خیزیاں، بزم آرائیاں اور بذلہ سنجیاں ان کے ساتھ گئیں اور ان کے کلام کا بیشتر حصہ بھی اپنے ساتھ لے گئیں، مصحفی کا کلام باقی ہے اور زمانہ جتنا گزرتا جاتا ہے اس کی آب وتاب بڑھتی جارہی ہے اور تحقیق وتحسین کے نئے نئے گوشے پیدا ہوتے جارہے ہیں۔

حضرت مولانا کو اصل مناسبت تاریخ، تذکرہ وسوانح سے تھی اور یہی ان کا خاص فن اور موضوع تھا، ان کی تحریری وتصنیفی زندگی کا آغاز تذکرہ وسوانح سے ہوا، سولہ سترہ برس کی عمر میں ان کے برادر معظم اور مربی مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب نے ''توحید'' امرت سر میں شائع شدہ مولانا محی الدین قصوری کا ایک اردو مضمون ''تیرہویں صدی کا مجاہد اعظم'' عربی میں ترجمہ کرنے کے لئے دیا جو علامہ سید رشید رضا کی ادارت میں نکلنے والے وقیع ترین رسالہ ''المنار'' میں بالاقساط شائع ہوا اور بعد میں انھوں نے اس کو علٰحدہ

رسالہ کی شکل میں شائع کیا۔

یہ آغاز اتنا مبارک ثابت ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں مولانا کے قلم سے ''سیرت سید احمد شہید'' جیسی عظیم الشان کتاب شائع ہوئی جس سے وہ علمی و دینی حلقوں میں متعارف ہو گئے اور اسی کے تخم سے تاریخ دعوت وعزیمت کا سلسلہ شروع ہوا جس کی پانچ جلدیں اس کے علاوہ شائع ہوئیں، درمیان میں مولانا محمد الیاس کی سوانح، مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کا تذکرہ، سوانح مولانا عبدالقادر رائے پوری، حیات عبدالحی، پرانے چراغ، نبی رحمت اور المرتضیٰ اور خودنوشت حالات کاروان زندگی کے نام سے لکھی، اس فن سے ان کی دل چسپی موروثی بھی تھی، ان کے والد محترم اور جدگرامی کا بھی خاص فن یہی تھا، اس لئے مولانا کے قلم سے اس موضوع پر جو کتابیں نکلیں وہ طویل غور وفکر اور وقیع مشاہدہ وتجربہ کا نتیجہ ہیں، اپنی اس خصوصیت کا ذکر خود انھوں نے اس طرح کیا ہے۔

> ''سیر وتراجم'' کے ذوق ومطالعہ پھر خصوصیت کے ساتھ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مولانا حکیم سید عبدالحیٔ سابق ناظم ندوۃ العلماء کی جلیل القدر تصنیف یا کتب خانہ ''نزہۃ الخواطر'' کی آٹھ جلدوں کے بار بار مطالعہ وخدمت نے شخصیتوں کو غور سے دیکھنے اور ان کی خصوصیات و اخلاق کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے اور ان کے اسلاف کے معیار پر جانچنے کی عادت پیدا کر دی۔''

اس فن کے نشیب وفراز سے آگاہ ہونے اور اس کی خامیوں اور نقائص پر نظر ہونے کی بنا پر انھوں نے اس موضوع کی کمی اور کم مائیگی کی جا بجا نشاندہی کی ہے، مثلاً طبقات اور تراجم رجال کی ہندوستانی تصنیفات کا ایک نقص اختصار ہے یعنی ان میں چند ہی شخصیتوں کے تراجم ہیں، تمام ہندوستان کا احاطہ نہیں کیا گیا، بعض کتابیں تو دو ہی یا تین صدی کے حالات پر ختم ہو جاتی ہیں اور اکثر کسی خاص طبقہ، مسلک یا فرقہ کے ساتھ

مخصوص ہیں، دوسری کمی یہ ہے کہ ان کتابوں میں اپنے زمانہ کا ذوق ورجحان اور ایرانی طرز تحریر وانشاء چھایا ہوا تھا، جس کا امتیاز پر تکلف عبارت، استعاروں اور تشبیہات کی کثرت اور صنائع وبدائع کی رعایت ہے۔ ان میں کسی سیرت وشخصیت کا مکمل ڈھانچہ کھڑا کرنے، شخصیت کا صحیح تخیل قائم ہونے اور اس کے خط وخال اور حقیقی کارناموں پر روشنی پڑنے والے بنیادی اور کارآمد تاریخی مواد کی بڑی کمی ہوتی ہے، پچاسوں صفحے پڑھ جانے کے بعد بھی ایک صفحہ کا مفید مواد مشکل سے ملتا ہے۔

مولانا کے نزدیک اس میدان میں ہندوستان کا علمی کارنامہ بہت سی حیثیتوں سے عرب مصنفین ومؤرخین کے علمی کارنامہ کے مقابلہ میں پست اور محدود رہا ہے، اس میں کچھ تو ہندوستانی مصنفین کی حد سے بڑھی ہوئی خوش اعتقادی اور شخصیت پرستی کو دخل ہے اور کچھ ایرانی مصنفین ومؤرخین کی مبالغہ آرائی، غلو پسندی اور فارسی طرز تحریر کے معائب کو جو دور آخر میں شدید انحطاط اور تصنع اور اغراق کا شکار ہو گیا تھا اور جس پر شاعرانہ انشاء پردازی اور مشکل پسندی کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اس کا تذکرہ وخاکہ نگاری بھی ایک مستقل صنف ادب ہے جو مولانا ابوالحسن علی ندوی کی اقلیم ادب میں بھی داخل ہے، اس میں مولانا کی کتاب ''پرانے چراغ'' ان کی ادبی حلاوت ولطافت اور انشاء پردازی کے زور وطاقت کے لحاظ سے بڑی اہم ہے، یہ تین حصوں میں ہے، اس میں انھوں نے اپنے معاصرین میں مشاہیر علماء ومصنفین، اساتذہ وشیوخ، احباء واہل تعلق، رفیقوں اور عزیزوں کے متعلق اپنے احساسات، تاثرات قلم بند کئے ہیں اور ٹھیٹ ادیبوں اور شاعروں کو موضوع بحث نہیں بنایا ہے، اس سے اور دوسری کتابوں سے کچھ مثالیں پیش کر کے مولانا کی جادو نگاری اور دلآویزی طرز نگارش کی خوبیاں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

پرانے چراغ میں مولانا ابوالحسن علی نے مختلف علمی، ادبی اور دینی شخصیتوں کا سراپا بھی بیان کیا ہے، اس میں جا بجا ان کے دلچسپ خاکے اور دلکش مرقعے موجود ہیں،

اس کی ابتدا مولانا ابوالحسن علی نے اپنے موقر استاد مولانا سید سلیمان ندوی کے ذکر جمیل سے کی ہے، ان کا یہ دلآویز خاکہ ملاحظہ ہو:

"سراپا وقار، مجسم متانت، قد میانہ مائل بہ پستی، چہرہ سے معصومیت اور شرافت نمایاں، دیکھ کر دل شہادت دیتا تھا کہ ان میں دوسروں کو ایذا پہنچانے اور دل دکھانے کی صلاحیت ہی نہیں، لباس نہایت صاف ستھرا جس پر کہیں نکتہ چیں اور دور بیں کو بھی کوئی دھبہ یا شکن نظر نہ آئے، ہر چند نفاست اور نستعلیقی پر دال، شیروانی کسی قدر لانبی، عمامہ سر پر نہایت سفید اور صاف اور اس کے پیچ نہایت خوبصورتی سے دیئے ہوئے..... آواز پست جو قرب کے باوجود بغیر قدر دانی اور شوق کے سنی نہ جا سکے، بالعموم کم گو اور بہ قدر ضرورت بولنے والے، آنکھوں سے حیا اور ذہانت کا اظہار، کچھ نہاں کچھ آشکار، جب کہیں آتے مخالف اور موافق فضل و کمال کے معترف اور ان کے منکر دونوں احترام پر مجبور ہو جاتے....."

اسی کے ساتھ ان کی عالمانہ شخصیت کا جلوہ بھی دیکھئے کہ ان کے وجود پر علم کس طرح چھایا اور رگ و ریشہ میں سرایت کئے ہوئے تھا، مولانا علی میاں رقم طراز ہیں:

"سید صاحب کے لئے علم کا معاملہ کسی پیشے یا ضرورت یا کسی مجبوری اور مصلحت کا معاملہ نہ تھا، علم ان کا گوشت پوست بن گیا تھا اور ان کے خون میں جاری و ساری ہو گیا تھا، وہی ان کی غذا تھی، وہی ان کی تفریح اور وہی ان کا اوڑھنا بچھونا، اکثر دیکھا کہ ان کا تانگہ دارالعلوم کے پھاٹک میں داخل ہوا اور جو پہلا شخص ملا اس سے کہا فلاں فلاں استادوں کو خبر کر دو یا کتب خانہ سے فلاں فلاں

کتاب لے آؤ، مہمان خانہ پہنچ کر شیروانی اتاری، ہاتھ منھ دھویا اور چائے کے انتظار میں بیٹھے، حدیث وفقہ کے استاذ آگئے اور کسی علمی مسئلہ پر مذاکرہ شروع ہوگیا۔ کتب خانہ سے کتاب پہنچ گئی اس کا مطالعہ شروع ہوگیا، اس میں کسی فن کی تخصیص نہ تھی، کبھی حدیث کا مسئلہ ہوتا، کبھی فقہ کا، کبھی کوئی تاریخی بحث ہوتی، کبھی تذکرے اور تراجم کی کوئی کتاب، جب تک قیام رہتا ان کی مجلسوں میں علمی مذاکرے اور بحث وتحقیق کے سوا کوئی موضوع نہ چھڑتا، کسی سیاسی شخصیت یا عمائد شہر میں سے کسی کے آجانے سے کچھ موضوع بدل جاتا لیکن اس کی جملہ معترضہ سے زیادہ حیثیت نہ ہوتی۔''

مولانا علی میاں نے معنوی چیزوں کی بھی مصوری کی ہے، ان کی نگاہ میں مولانا سید حسین احمد مدنی کی شخصیت وزندگی کی کلید اور سب سے نمایاں جوہر اور مرکزی وصف عزیمت وحمیت تھی، حمیت کے کرشمے اور کارنامے ملاحظہ ہوں:

''حمیت آپ کی کتاب زندگی کا نہایت روشن عنوان ہے، اسی حمیت نے انگریزوں کی مخالفت کا جذبہ پیدا کیا جس کی آسودگی اس وقت تک نہیں ہوئی جب تک انگریز اس ملک سے چلے نہیں گئے، تحریک خلافت اور جمعیۃ علماء کی جدوجہد میں یہی روح کام کرتی رہی تھی اور یہی آپ کو سدا جوان، مستعد وسرگرم رکھے ہوئے تھی اور اسی نے سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کو متحرک بنا رکھا تھا، یہی حمیت تھی جس نے آپ سے مہینوں دشمن اسلام طاقتوں کے خلاف قنوت نازلہ اس جوش وولولہ سے پڑھوائی کہ معلوم ہوتا تھا کہ محراب میں شگاف پڑ جائیں گے اور الفاظ نہیں ہیں شرارے ہیں

جو آپ کے دل سے نکل رہے ہیں، یہی حمیت ہے، جو کسی منکر شرعی اور خلاف سنت فعل کو دیکھنے کی روادار نہ تھی اور جس کی حرارت اور آنچ آس پاس بیٹھنے والے کو اکثر محسوس ہوتی۔"

اس تذکرے میں مولانا سید سلیمان ندوی کی لطافت وظرافت کا تذکرہ بھی آگیا ہے، ایک جگہ ان کے اور خلیل عرب صاحب کے ساتھ خوش طبعی اور بے تکلفی کے معاملے کا ذکر کرتے ہوئے فن ظرافت اور مزاح کی خصوصیت اور اس کا ابتذال سے فرق دکھایا ہے، لکھتے ہیں:

"سید صاحب اپنے بے تکلف احباب میں بڑے ظریف، نکتہ سنج، سبک روح اور خوش مزاج تھے، لیکن ان کے مذاق میں بھی ایک علمی وادبی شان ہوتی تھی۔ عرب صاحب بھی باوجود اس کے کہ ان کا زیادہ تر سابقہ عربی سے تھا اردو کا اچھا مذاق رکھتے تھے اور لکھنؤ میں طویل مدت گزارنے کی وجہ سے زبان کی باریکیوں اور مزاح ولطافت کی نزاکتوں سے واقف تھے کہ ذرا سی بے احتیاطی سے مذاق کس طرح ابتذال اور خوش طبعی کس طرح اشتعال کے حدود میں داخل ہو جاتی ہے۔"

ضلع جگت، لفظی رعایت اور نکتہ آفرینی وغیرہ میں سید صاحب کی مہارت وکمال کا ذکر بھی مولانا علی میاں کے ادبی مذاق اور طبیعت کی لطافت کا ثبوت ہے، فرماتے ہیں:

"سید صاحب ضلع جگت، لفظی رعایت اور نکتہ آفرینی میں بڑا کمال رکھتے تھے، ان کے اس ذوق نے ان کے بڑھے ہوئے وقار اور متانت اور سنجیدگی کو خشکی اور یبوست تک پہنچنے نہیں دیا تھا، یہ

ذوق اس وقت خاص طور پر نمایاں ہوتا تھا جب مولانا عبدالماجد صاحب جیسے خوش مذاق اور زبان کے اداشناس یا لکھنوی مذاق کے کوئی بزرگ تشریف لاتے۔''

بعض مضامین، تحریروں اور اصحاب علم وادب کے متعلق اظہار خیال فرمایا ہے جس میں کسی کتاب کی ادبی حیثیت اور اس کے مصنف کے اعلیٰ ذوق اور انشاء پردازی میں مہارت اور کمال کا اعتراف کیا ہے، اس سے بھی مولانا علی میاں کے حسن ذوق اور ادبی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے، انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی سے اپنی تصنیف سیرت سید احمد شہید پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''سید صاحب نے مقدمہ لکھا اور دل کھول کر لکھا ان کی تحریر میں بڑی دل آویزی، آمد اور ادبیت ہے غالباً یہ مقدمہ اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے انکی تحریروں میں نمایاں مقام رکھتا ہے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس میں دماغ کے ساتھ دل اور علم وزورِ انشاء کے ساتھ عشق ووجدان بھی شامل ہے۔''

مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب ''النبی الخاتم'' پر ان کا یہ تبصرہ ان کے رچے ہوئے ادبی ذوق کا نمونہ ہے:

''کتاب عجیب البیلے انداز میں لکھی گئی ہے، صحف سماوی کا اندازِ بیان، خطیبوں کا جوش وبرجستگی، عشاق کی مستی اور وارفتگی، عقل وجذب کی لطیف آمیزش، حسب معمول معمولی اور مشہور واقعات سے لطیف نکتے اور عظیم نتیجے نکالتے چلے جاتے ہیں اور وہ اس سرعت وکثرت کے ساتھ کہ پڑھنے والا مصنف سے شکایت کرنے لگتا ہے کہ ع

دامان نگہ تنگ وگل حسن تو بسیار

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے شیخ شرف الدین یحیٰ منیری کی یادگار اوران کے علمی کمالات کے آئینہ مکتوبات کو نادر مجموعہ اور معارف وحقائق کے پورے اسلامی ذخیرہ میں ممتاز بتایا ہے، وہ اس کو اور حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات کو علوم ومعارف اور حقائق کے اعتبار سے پورے اسلامی کتب خانہ میں بے نظیر سمجھتے تھے، شیخ کے مکتوبات کے ادبی درجہ ومرتبہ کو واضح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''یہ مکاتیب زور قلم، قوت بیانی اور حسن انشاء کا بھی اعلیٰ نمونہ ہیں اوران کے بہت سے ٹکڑے اس قابل ہیں کہ دنیا کے بہترین ادبی نمونوں میں شامل اور ''ادب عالی'' میں شمار کئے جائیں۔''

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی علمی وادبی بلند پائیگی کا حال یہ بتاتے ہیں:

''آپ کا ادبی ذوق اتنا بلند اور پاکیزہ تھا کہ امیر خسرو جیسے سر آمد روزگار شاعر (جو اپنے طرز میں بے نظیر اور فارسی کے صف اول کے شعراء میں ہیں) کو شاعری میں مشورہ دیا اور رہنمائی فرمائی، سیر الاولیاء میں ہے کہ ابتدا میں امیر خسرو جو غزل کہتے تھے اس کو حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں بہ نظر اصلاح پیش کرتے تھے، ایک روز حضرت نے فرمایا کہ صفاہانیوں کے طرز میں کہا کرو۔''

جہاں مولانا علی میاں کے قلم نے دو شاعروں یا ادیبوں اور مصنفوں کا موازنہ ومقابلہ کیا ہے اس سے ان کی نکتہ سنجی اور سخن شناسی کا اندازہ ہوتا ہے گو بعض اہل نظر اور اصحاب فن نے اس کو مولانا کے رجحان طبیعت پر محمول کر کے اس سے اختلاف کیا ہے، تاہم اس سے ان کے ادبی ذوق اور نقدِ سخن کے ملکہ کا اندازہ ہوتا ہے، اس لئے ہم اس کی بعض مثالیں نقل کرتے ہیں۔

مولوی محمد حسین آزاد نے انیس و دبیر کی معنی آفرینی، نازک خیالی اور بلند پروازی اور شکوہِ الفاظ کی دل کھول کر داد دی ہے لیکن مولوی محمد محسن کاکوروی جن کے متعلق امیر مینائی کہتے ہیں" ان کا کلام ایک عالم ہے خیالات نادرہ کا کہ اس کو دیکھ کر انسان حیران ہو جاتا ہے اور ان کا ہر شعر معراجِ بلاغت ہے" مولانا علی میاں لکھتے ہیں:

"ان کی نظمیں صبح تجلی، چراغ کعبہ اور سراپا وغیرہ کے بند پڑھے جائیں، وہ نازک خیالی، مضمون آفرینی تشبیہات واستعارات کی تازگی اور لطیف تلمیحات میں کسی طرح سے انیس و دبیر سے کم نہیں، فرق یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ساری ذہانت ومحنت نعتِ نبوی اور مدیح خیر المرسلین میں صرف کی اور انیس و دبیر نے مرثیہ ومنقبت، مصائب اہل بیت اور واقعۂ کربلا کے بیان کرنے میں جس سے آزاد کے دل کو زیادہ لگاؤ اور وابستگی تھی، اپنی ذہانت اور قوتِ شاعری صرف کی۔"

مولانا شبلی اور ان کے تلمیذ رشید مولانا سید سلیمان ندوی کے موازنے میں ایک حیثیت سے ایک کا پلڑا بھاری بتایا ہے اور دوسری حیثیت سے دوسرے کا، ملاحظہ ہو:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ سید صاحب کی تحریر میں مولانا شبلی کی برجستگی و بے ساختگی اور فارسی ترکیب کی چستی نہیں مگر شیرینی وسلاست اور ادبی محاسن پورے پورے موجود ہیں اور ان کی علمی تصنیفات تک کے بعض ٹکڑے ادبی شہ پارے معلوم ہوتے ہیں، خطبات مدراس کے بعض پیراگراف سیرۃ النبی کے بعض صفحات اور معارف کے بہت سے شذرات وہ تحریریں ہیں جن پر ہمارے ادب عالی کو ملکیت کا دعوی ہے، نقوش سلیمانی کے بعض نقش ادبی

حیثیت سے تعویذ بنا کر رکھے جانے کے قابل ہیں۔"

آگے لکھتے ہیں:

"ہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ سید صاحب اپنے علم و تحقیق اور وسعت مطالعہ میں اپنے استاد و مربی مولانا شبلی مرحوم سے بہت آگے بڑھ گئے تھے، نئی نئی کتابوں کی اشاعت مسلسل غور و فکر اور محنت و مطالعہ کی بنا پر اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں۔"

مولانا غلام رسول مہر اپنے طرز نگارش، فارسی کے اعلیٰ ذوق اور انشاء پردازی میں مولانا ابوالکلام آزاد کے کامیاب ترین متبع خیال کئے جاتے ہیں مگر مولانا علی میاں نے بعض پہلوؤں سے تابع کو متبوع سے فائق قرار دیا ہے، تحریر فرماتے ہیں:

"لیکن وہ اپنے تحقیقی ذوق، مؤرخانہ احتیاط اور مدلل طریقے پر بات کہنے میں کچھ فائق ہی ہیں اور یہ غالباً مشاغل زندگی کی نوعیت کے فرق کا اثر ہے، تاریخ و تصنیف کی بادیہ پیمائی، سیاست کے ہفت خواں کو طے کرنے سے بہت مختلف ہے، اول الذکر کے لئے فراغ خاطر، حالات کا اعتدال اور علمی ماحول ضروری ہے اور سیاست کے بیڑے کو طوفانوں اور آندھیوں سے مفر نہیں، ان ناہموار حالات اور طوفانی موسم میں بھی مولانا آزاد نے جتنا کام کرلیا اور جو نقوش چھوڑے وہ ان کی اعلیٰ ذہنی صلاحیت اور غیر معمولی قوت ارادی کی دلیل ہے۔

مہر صاحب، فارسی کے برمحل اشعار کا جتنا صحیح استعمال کرتے ہیں اور جیسے اشعار انھوں نے اساتذہ ایران کے کلام سے انتخاب

کئے ہیں اور ان کو انگشتری میں نگینے کی طرح اس طرح جڑ دیا ہے کہ وہ کسی طرح تذکرہ اور غبار خاطر کے فارسی اشعار کے انتخاب سے کم نہیں بلکہ اس حیثیت سے اس میں زیادہ برجستگی اور بے ساختگی معلوم ہوتی ہے کہ وہ ان کے لئے پہلے سے زمین تیار نہیں کرتے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اسی موقع کے لئے یہ شعر کہا تھا۔

ان کے قلم سے عرب مصنفین حافظ ابن قیم اور ان کے استاد حافظ ابن تیمیہ کا یہ تقابل پڑھئے:

"ان کی تصنیفات حسن ترتیب اور تالیفی سلیقہ میں اپنے شیخ ابن تیمیہ کی تصنیفات سے بھی ممتاز ہیں، اس کے علاوہ ان کی کتابوں میں تصوف کی حلاوت، عبارت کی سلاست اور دل آویزی زیادہ پائی جاتی ہے، یہ غالباً ان کے مزاج کا نتیجہ ہے جس میں جلال سے زیادہ جمال ہے۔"

مولانا ابوالحسن علی ندوی علم وادب کا رشتہ کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، خشک اور علمی موضوع کو بھی ان کا بہار آفریں قلم شگفتہ اور تازہ بنا دیتا ہے، تاریخ وسوانح کی کتابوں کو ان کے بیان کی دل آویزی اور تحریر کی حلاوت، ادب وانشاء کا ایک حسین گلدستہ بنا دیتی ہے وہ اپنے فطری ادبی ذوق اور انشاء پردازی کے خداداد ملکہ سے سادہ واقعات اور خشک تحریروں میں ایسی کشش اور جاذبیت پیدا کر دیتے ہیں کہ دل بے اختیار ان کی طرف کھنچنے لگتا ہے اور طبیعت وجد کرنے لگتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک صاحب طرز واسلوب ادیب تھے، ان کے خاص اسلوب بیان اور منفرد طرز تحریر کی اصلی خوبی تاثیر اور دل نشینی ہے اور یہی دراصل کسی کلام کی جان ہوتی ہے جس کے لئے رعنائی خیال کی طرح حسن بیان بھی ضروری ہوتا ہے، مولانا کا کمال یہی ہے کہ ان کی رعنائی بیان اور حسن

اسلوب نے ان کی تحریر میں جادو کا سا اثر پیدا کر دیا ہے۔

مولانا کے منفرد اسلوب نگارش کی خاص خوبی سنجیدگی، متانت اور ٹھہراؤ ہے جس میں سادگی کے باوجود پرکاری اور دل آویزی ہوتی ہے، ایک مثال ملاحظہ ہو:

''ہماری اس صدی کے آغاز میں اگرچہ انگریزوں کے دم قدم سے مادیت کے قدم اس ملک میں جم گئے تھے اور اہلِ دل بڑے درد سے کہہ رہے تھے کہ: ع

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

پھر بھی عشق الٰہی کی کہیں کہیں دکانیں قائم تھیں جہاں سے جذب وشوق اور درد ومحبت کا سودا ملتا تھا، ان دکانوں میں دو دکانیں خاص طور پر مرجع خاص وعام تھیں، ایک گنگوہ میں اور ایک گنج مراد آباد میں، دونوں نے اپنی اپنی جگہ درد ومحبت اور اتباع سنت کا بازار گرم کر رکھا تھا اور اس جنس نایاب کو وقف عام کر دیا تھا۔

یوں تو اس دنیا میں خدا کا دیا سب کچھ ہے لیکن اگر اس بھرے بازار میں ایک درد ومحبت ہی کی دکان نہیں جہاں سے قلب کی حرارت اور عشق کی دولت مل سکتی ہے تو پھر دنیا ایک قمار خانہ اور زندگی سود وسودا مکر وفن ہے اور اس میں وہی کامیاب ہوگا جو اس فن میں طاق ہوگا۔

اس زندگی کی آبرو اور اس باغ ہستی کی ساری بہار اور سارا وقار اور اس دنیا کا سارا ہنگامہ وجود اسی درد محبت کے دم سے ہے، اس کے بغیر یہ محفل سونی اور یہ گھر بے چراغ ہے، خرمن کائنات میں یہی ایک کام کا دانہ ہے اگر یہ نہیں تو پھر سب خس وخاشاک ہے۔

یورپ کا صنعتی انقلاب اور مادی تہذیب اگرچہ ساری دنیا کا رخ ''من'' سے ''تن'' کی طرف پھیر چکی ہے اور دلوں کی انگیٹھیاں عرصے سے سرد ہیں، عصر حاضر کے اداشناس اقبال نے آج سے برسوں پہلے کہا تھا: ع

دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش

لیکن ابھی اس خاکستر میں محبت کی چنگاری موجود ہے اور دل کا چراغ بالکل گل نہیں ہوا ہے خصوصاً ہمارے ملک ہندوستان میں (جس کے خمیر میں درد و محبت) ابھی دل کی یہ پیاس اور روح کی یہ پکار موجود ہے، مادیت کے عروج اور بحران نے بھی کہیں کہیں اس خالص مادیت سے بےزاری اور روحانیت کی تلاش پیدا کر دی ہے، تقسیم کے انسانیت سوز ہنگامہ نے جب دلوں کو زخمی کیا اور لاکھوں انسانوں نے اس دنیا کی بےثباتی اور زندگی کی بےوفائی کا منظر دیکھ لیا تو ان کو بھی زخم دل کے لئے اس مرہم کی ضرورت ہوئی۔ آج دونوں طرف بےخانماں اور شکستہ دل انسانوں کو اہل درد و محبت کے حالات اور تذکروں کی سب سے زیادہ تلاش ہے۔''

اس عبارت میں نہ جوش و اشتعال اور گھن گرج ہے اور نہ ولولہ و طنطنہ مگر تحریر کی سادگی و سلاست اور متانت نے اسے کیسا پر اثر بنا دیا ہے، ان کے اسلوب تحریر میں بے جا جوش و خروش نہ ہونے کے باوجود ایک زور و قوت ہوتی ہے، جو تحریر کو مؤثر و دل کش بنا دیتی ہے۔ مثلاً:

''انسانی شعور کا تعلق، عمر، انسان کی اندرونی صلاحیتوں اور ذہانت ہی سے نہیں ہے، ماحول، واقعات اور خارجی دنیا سے بھی

ہے، کوئی طوفان بلا خیز، کوئی خبر صاعقہ آسا، کوئی فتنہ عالم آشوب یا شہر آشوب کسی کمسن بچے کے شعور کو قبل از وقت بیدار کر دیتا ہے اور وہ کام کرتا ہے جو ماہ وسال کی گردش اور تعلیم وتربیت کی مسیحائی نہیں کرتی، صور اسرافیل پر اگر مردے جی اٹھیں گے تو ہنگامہ رستخیز پر سوتوں کا جاگ جانا، شعور کا بیدار ہو جانا اور بچوں کا بڑوں کے بہت سے احساسات اور گرد وپیش کے واقعات سے باخبر ہو جانا اور ان کا اپنے سن وفہم کے مطابق اپنے بزرگوں کے رنج وغم کا ادراک کرنا محل تعجب نہیں، کچھ ایسا ہی واقعہ میرے ساتھ پیش آیا۔ جنھوں نے اکیس بائیس کا زمانہ نہیں دیکھا ان کو کیا بتایا جائے کہ ہندوستان کس طرح کوہ آتش فشاں بنا ہوا تھا۔''

مولانا محمد علی کے اس تذکرہ میں خلافت کے زمانہ کے پُر آشوب حالات کے متعلق بتایا ہے کہ کمسنی کے باوجود ان کا شعور وادراک کیوں ہے، جوش وخروش نہ ہونے کے باوجود اسلوب بیان نے تحریر کو کتنا پرزور اور پر اثر بنا دیا ہے۔

مولانا کے اسلوب میں اعتدال وتوازن کا سر رشتہ کہیں ہاتھ سے جانے نہیں پاتا، اس کی مثالیں بہت ہیں، علامہ شبلی اور مولانا عبدالحئی کے اختلافات کے ذکر میں کس حد تک احتیاط ملحوظ رکھی ہے اور علامہ ابن تیمیہ کی مخالفت کے اسباب بیان کرتے ہوئے بھی انہوں نے بڑے اعتدال وتوازن سے کام لیا ہے۔

مخاطب کے حالات اور موقع ومحل کے اعتبار سے صاحب طرز ادیب کا اسلوب بدلتا رہتا ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے نزدیک بھی مقتضائے حال کے مطابق کلام کا ہونا ضروری ہے، وہ اپنے والد مولانا عبدالحئی کی کتاب'' دہلی اور اس کے اطراف'' کے تعارف میں جب ان کے ایسے مقامات میں پہنچنے کا ذکر کرتے ہیں جن

سے مسلمانوں کی گزشتہ عظمت اور تاریخ وابستہ تھی تو ان کا یہ انداز ہوتا ہے:

"قلعۂ معلیٰ کا اجڑا ہوا کرّ وفر اور اس کے خزاں رسیدہ بلکہ تاراج و پامال چمن کو دیکھ کر ان کا قلم آنسوؤں کا سیل رواں بہا دیتا ہے اور ان کی غیرت ملی فوارہ کی طرح جوش مارتی ہے، پھر وہ جب دہلی پر الوداعی نظر ڈالتے ہیں تو صبر و قرار کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور ان کا دردمند اور رواں قلم دل کھول کر روتا ہے، اس وقت ان کا زورِ قلم اور جوش تحریر اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ جاتا ہے۔"

مولانا کے اسلوب تحریر کی ایک خصوصیت برمحل اشعار کا استعمال ہے، اردو، عربی اور فارسی کے جو اشعار انھوں نے لکھے ہیں وہ حسب موقع ہونے کے علاوہ معیاری اور منتخب بھی ہیں۔

مولانا کے اسلوب تحریر میں ان کی طبیعت کی دردمندی، سوز دروں اور اندرونی جذبہ نے جو تاثیر، دل نشینی اور جاذبیت وحلاوت پیدا کی ہے وہ اور کہیں نظر نہیں آتی، انھوں نے خود بھی اس پر جابجا زور دیا ہے، سید صاحب نے ان کی کتاب سیرت سید احمد شہید کا مقدمہ لکھا تو اس میں ان کو دماغ کے ساتھ دل اور علم وزورِ انشاء کے ساتھ عشق و وجدان کی کارفرمائی نظر آئی، مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب "النبی الخاتم" کے بارے میں لکھتے ہیں:

کتاب پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف علم وانشاء پردازی کی کرشمہ سازی نہیں ہے، اس کے اندر ان کا سوز دروں اور خونِ جگر بھی شامل ہے۔ اور واقعہ یہی ہے کہ ؎

رنگ ہو یا خشت وسنگ چنگ ہو یا حرف صوت
معجزہ فن کی ہے خون جگر سے نمود

حضرت شرف الدین یحیٰ منیری کے مکتوبات کی اثر آفرینی اور انقلاب انگیزی دکھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ادب وانشاء کے سلسلے میں عام مؤرخ ونقاد اکثر اس حقیقت کو نظر انداز کردیتے ہیں کہ تحریر کی قوت، کلام کی تاثیر اور قبول عام وبقائے دوام کے لئے سب سے زیادہ معاون عنصر لکھنے والے کی اندرونی کیفیات، اس کا یقین، دلی جذبہ، کسی حقیقت کے اظہار کے لئے اس کی بے چینی اور بے قراری ہے، ایسے کسی شخص کو جو اس اندرونی کیفیت سے سرشار اور اس کو دوسروں میں پیدا کرنے کے لئے مضطرب وبے قرار ہو جب قدرت کی طرف سے ذوق سلیم عطا ہو، الفاظ واسالیبِ بیان پر ضروری حد تک قدرت بھی حاصل ہو اور اس کی تحریر میں علم وادب، عقل واستدلال اور حسن بیان کے ساتھ سوز دروں اور خونِ جگر بھی شامل ہو تو اس کی تحریر میں ایسا زور واثر پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں ہزاروں دلوں کو زخمی کرتی ہے اور سیکڑوں برس گزر جانے کے بعد بھی اس کی تازگی وزندگی اور اس کی تاثیر وقوت تسخیر قائم رہتی ہے۔

تحریر وتقریر کو بہتر اور کامیاب بنانے کے لئے جتنی صفات، صلاحیتیں اور بلاغت کے اصول وقوانین ضروری ہیں ناقدین ادب نے ان سب کا تفصیلی جائزہ لیا ہے.....ان میں ایک بڑا مؤثر اور ناقابل فراموش عنصر یا عامل صاحبِ کلام کا اخلاص اور دردمندی ہے، ادب وانشاء کے ذخیرہ کا ایک نئے اور زیادہ حقیقت پسندانہ اور گہرے نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے تو اس کو دو قسموں پر تقسیم کرنا

بے جا نہ ہوگا، ایک وہ تحریریں یا اظہار خیال جو اندرونی تقاضے اور داعیہ اور کسی طاقتور عقیدہ یا یقین کے ماتحت وجود میں آئیں اور ان سے مقصد کسی فرمائش وحکم کی تعمیل، کوئی دنیاوی منفعت یا کسی صاحب اقتدار یا صاحب ثروت انسان کی رضامندی نہیں تھی بلکہ وہ خود اپنے ضمیر یا عقیدہ کے فرمان کی تعمیل تھی، جس میں اہل حکومت اور اہل ثروت کے فرمان سے زیادہ قوت ہوتی ہے..... دوسری قسم وہ ہے جو کسی فرمائش کی تعمیل میں ہو، ادب کی ان دونوں قسموں میں زمین آسمان کا فرق ملے گا، پہلا ادب ''ہر کہ از دل خیزد بر دل ریزد'' کا مصداق ہے، وہ طویل عرصہ تک زندہ رہتا ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر اس کا موضوع دینی اور اخلاقی ہے تو اس کا قلب اور اخلاق پر گہرا اور انقلاب انگیز اثر پڑتا ہے، ہزاروں آدمیوں کے دل میں اس کے پڑھنے سے اصلاح کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اس کے برخلاف دوسری قسم کا ادب داد وتحسین اور عارضی سرور وخوش وقتی کے سوا روح اور قلب پر اپنا کوئی دیرپا اثر نہیں چھوڑتا، اس کی زندگی اور عمر محدود ومختصر ہوتی ہے، پہلے ادب میں بے ساختگی اور بے تکلفی ہوتی ہے، دوسرے ادب میں صنعت اور اہتمام..... بعض اہلِ دل کے کلام میں جو غیر معمولی حلاوت اور قوت ہے وہ ان کی روح کی لطافت اور قلب کی پاکیزگی اور اندرونی کیفیت وسرمستی کا نتیجہ ہے اور اس کے لئے وہ کسی خارجی مدد اور مقام اور وقت کے محتاج نہیں ہوتے، ان کی خوشی وسرمستی کا سرچشمہ اور ان کی دولت کا خزانہ ان کے دل میں ہوتا ہے، خواجہ میر درد نے جو خود صاحب درد تھے اس

پورے گروہ کی ترجمانی اس شعر میں کی ہے۔

جایئے کس واسطے اے درد میخانے کے بیچ
کچھ عجب مستی ہے اپنے دل کے پیمانے کے بیچ

غرض اس باطنی کیفیت، یقین ومشاہدہ، دعوت کے غلبہ، اہل عصر واہل تعلق کوحقائق سے آگاہ کرنے اورمنزل مقصود پر پہنچانے کے جذبہ، اخلاص ودردمندی، روح کی لطافت اورقلب کی پاکیزگی اوراس سب کے ساتھ ذوق سلیم اورزبان پرقدرت نے حضرت شیخ شرف الدین کو ایک بلند ادبی مقام عطا کیا اور انھوں نے اپنے خیالات وجذبات کے اظہار کے لئے ایک مستقل اسلوب پیدا کرلیا ہے، جوانھیں کے ساتھ مخصوص ہے، ان کے مکتوبات نہ صرف فارسی ادبیات بلکہ اسلامی ادبیات میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں اور معارف وحقائق، دعوت واصلاح کے وسیع ذخیرے میں کم چیزیں ایسی ہوں گی جواپنی ادبیت اورقوت تاثیر میں ان کی نظیر ہوں۔

ضروری ضمانت

"میں اس سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور اس کو پھر دہراتا ہوں کہ مسلمانوں کا شعار یہ ہے کہ دنیا سے جانے اور رُخصت ہونے کے وقت وہ اطمینان کرلے کہ میری اولاد میرے مسلک پر رہے گی، میری ہم عقیدہ ہوگی یا نہیں، یہ سب سے زیادہ ضروری ضمانت ہے جو والدین کو اولاد سے متعلق حاصل ہونی چاہئے"۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

پروفیسر عتیق اللہ تابش

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا اسلوب
اور اس کے مضمرات

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ذہنی اور معنوی سلسلے مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا سید سلیمان ندوی سے ہوتے ہوئے مولانا شبلی نعمانی تک پہنچتے ہیں۔ محض اسی ایک سلسلے کو بنیاد بنالیا جائے تو علی میاں کے ذہن، ان کے طریق رسائی اور طریقۂ کار کے مضمرات کو سمجھنا ہمارے لیے زیادہ مشکل نہیں رہ جاتا۔ فکر کی وہ رو جو اساس دین سے روشنی کسب کرتی ہے اسے اپنے زندہ، حواسی اور تجربی عہد وعصر کے متعلقات کو ایک خاص معنی فراہم کراتی جاتی ہے جس کی تردید میں بھی ایک نیم فلسفیانہ اور حقیقت پسندانہ افکار کا پٹ تہہ نشین ہوتا ہے اور توثیق میں بھی جس کے دلائل، ہمیشہ حکمت اساس ہوتے ہیں، خالی از دلیل نہ تردید ہوتی ہے نہ توثیق اور نہ انکار اور نہ اقرار۔ مشرق وسطیٰ کی الہامی کتابوں کے سلسلے کی سب سے آخری کتاب، قرآن مجید ہے۔ زبور کا کلام سب سے زیادہ شعری تجرید کا حامل ہے۔ موجودہ دستیاب اناجیل کی اساس بیش از بیش فکشن پر ہے یہاں اجمال پر تفصیل مرجح ہے۔ جب کہ قرآن مجید میں غیر متعلق حوالوں اور غیر

ضروری تفصیلات سے گریز ملتا ہے۔ تمثیلی صراحتوں کے باوجود دلائل اور جواز ہر پارۂ کلام میں بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کلام مجید میں متشابہات کی تعداد محکمات کی نسبت اسی لئے قلیل تر ہے کہ یہاں قصد، ابلاغ ہر خاص و عام ہے تمثیلی مشابہتوں نے وہیں راہ پائی ہے جہاں تلقین، حکم یا ہدایت کو زیادہ سے زیادہ معنی گر اور اثر گر بنانا مقصود تھا۔ قرآن پاک کے تمثیلی استعارات کے پس پشت بھی ایک ایسی لسانی فضا کی تشکیل قائم ہے جس کے پہلے سے منشائے الٰہی اور احکام الٰہی کے مضمرات بیش از بیش روشن تر ہو سکیں۔ کلام مجید کے نظام لسان کے یہ وہ خصائص ہیں جنھوں نے ایک عظیم ذہن کی پرداخت میں زبردست حصہ لیا ہے اور یہ عظیم ذہن، شرق کا وہ ذہن ہے جو شعوری اور لاشعوری طور پر کلام پاک کے اسلوب سے اپنے زبان و بیان کی ترجیحات متعین کرتا ہے۔ مجھے اکثر اس امر پر حیرت ہوتی ہے کہ یونان قدیم کے دانشور عربی، فارسی، ترکی اور اردو کے علاوہ بہت سی ذیلی زبانوں کے مذہبی اور نیم مذہبی، فلسفیانہ اور نیم فلسفیانہ، علمی اور ادبی تحریروں کے ان اسالیب کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جن کی اصل کا سراغ کلام ربانی میں محفوظ ہے۔

مولانا سید ابوالحسن ندویؒ کے اسلوب کی اپنی ایک علیحدہ وضع اور شناخت ہے جس کی تشکیل میں کلام پاک کے اس حقیقت کیش اسلوب کی جھلک صاف نمایاں ہے جو صلابت آمیز اور اثر گیر ہے۔ مولانا موصوف کے موضوعات و مضامین کا احاطہ بھی کافی وسیع ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موضوع کی تبدیلی کا اثر اسلوب نگارش پر بھی پڑتا ہے لیکن اس قسم کی اسلوبیاتی تبدیلی بے حد ضمنی نوعیت کی ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ ان کے سوانح میں جہاں جہاں ذاتی وارداتیں معرضِ بیان میں آئی ہیں یا بعض شخصیات کی گرہ کشائی کے مواقع درپیش آئے ہیں، مولانا موصوف نے ضرور ایک خاص حد قائم کر لی ہے۔ اپنے قلم کو آزادیاں فراہم کی ہیں مگر قدغن کا حق بھی اپنے نام محفوظ رکھا ہے۔ گویا جذبہ اور تعقل کی کشمکش کی بجائے یہ وہ اسلوب ہے جہاں جذبے کی وہ آزادرو تو کارفرما

ہے جو یکے بعد دیگرے کئی متعلقات کے باب ہمارے سامنے کھول دیتی ہے لیکن ہر باب اپنے سابقے اور لاحقے سے بھی پوری طرح مربوط ہوتا ہے جس کے باعث مرکزیت کہیں تہس نہس نہیں ہو پاتی ۔ یہ صورت خطابت میں ہمیشہ متوقع ہوتی ہے۔ مولانا موصوف کے سلسلۂ کلام میں خطابت یا بلند آہنگی کی اپنی قدر ہے لیکن خطابت اگر محض جذبے کی محکوم بن کر رہ جائے تو اکثر وہ اعتبار کے درجے سے گر بھی جاتی ہے۔ تعقل کی رفاقت میں ہی استدلال کی راہ بھی روشن ہوسکتی ہے اور استدلال کی قدر دیرپا تاثر کی راہ روشن کرتی ہے۔ مولانا موصوف نے تمثیل کا پیرایہ اختیار کیا ہو یا حقیقت پسندانہ طریق کار کو فوقیت دی ہو، جذبے اور تعقل کا اشتراک ایک عمومی قدر کے طور پر ہر جگہ برقرار ہے۔

> ''چھٹی صدی مسیحی میں انسانیت کی گاڑی ایک ڈھلواں راستے پر پڑ گئی تھی۔ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا، راستے کا نشیب بڑھتا جا رہا تھا اور رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی، اس گاڑی پر انسانیت کا پورا قافلہ اور آدم کا سارا کنبہ سوار تھا، ہزاروں برس کی تہذیبیں اور لاکھوں انسانوں کی محنتیں تھیں، گاڑی کے سوار میٹھی نیند سو رہے تھے۔ یا زیادہ اور اچھی جگہ حاصل کرنے کے لئے آپس میں دست و گریباں تھے، تنک مزاج تھے، جب ساتھیوں سے روٹھتے تو ایک طرف سے دوسری طرف منہ پھیر کر بیٹھ جاتے، کچھ ایسے جو اپنے جیسے لوگوں پر حکم چلاتے، کچھ کھانے پکانے میں مشغول تھے، کچھ گانے بجانے میں مصروف، مگر کوئی یہ نہ دیکھتا کہ گاڑی کس غار کی طرف جا رہی ہے اور اب وہ کتنا قریب رہ گیا ہے؟''

دراصل اس پورے متن میں ایک ایسے پس منظر کی تفصیلات جمع کر دی گئی ہیں جو پڑھنے والے کے ذہن میں پیش سایہ افگنی کا بھی کام کر رہی ہیں۔ مولانا موصوف نے

فاعل کے نام نامی کو مقدر چھوڑ دیا ہے۔ لیکن استعاروں کی زبان میں جن آثار کی طرف اشارے کئے گئے ہیں وہ سارا تناظر محسن انسانیت رسول اکرمؐ کی ولادت بابرکات کے عہد اور اس کے قریب و بعید ماضی کا منظر ہے۔ مولانا موصوف کے اسلوب کی یہ ایک خاص خوبی ہے کہ وہ براہ راست اور فوری کسی مسئلے یا موضوع کو اپنے سامع یا قاری کے سامنے پیش نہیں کر دیتے۔ انسانی نفسیات کو ذہن میں رکھتے ہوئے مقصد کی وضاحت سے قبل کبھی حقیقت پسندانہ اور کبھی استعاراتی زبان میں افسانوی یا ڈرامائی تکنیک کو بروئے کار لاتے ہیں۔ جیسا کہ محولہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے، اس طرح آہستہ آہستہ وہ قبولیت کے لئے ذہن و دل میں جگہ بناتے چلے جاتے ہیں، بعد ازاں ایک مرحلہ وہ آتا ہے جہاں سے تلقین، ہدایت، شکوہ اور احتجاج کی آواز یک لخت بلند ہو جاتی ہے۔

> ''انسانیت درحقیقت ایک بڑا مرتبہ ہے لیکن انسانیت کے خلاف انسان ہمیشہ خود بغاوت کرتا رہا ہے، اس کو انسانیت کی سطح پر قائم رہنا ہمیشہ دوبھر اور مشکل معلوم ہوا ہے۔ وہ کبھی نیچے سے کترا کر نکل گیا اور اس نے کبھی اپنے آپ کو انسانیت سے برتر سمجھا، یعنی اس نے کبھی انسانیت سے بالاتر کہلوانے اور خدا اور دیوتا بننے کی کوشش کی، اور سچی بات تو یہ ہے کہ لوگوں نے خدا اور دیوتا بننے کی کوشش کم کی، لوگوں نے انھیں خدا اور دیوتا بنانے کی کوشش زیادہ کی۔''

دراصل اقتباس بالا میں سارے دعوے کا نچوڑ آخری جملے میں در آیا ہے اور واقعہ یہی ہے کہ مولانا کو محض اسی تلخ حقیقت کی پردہ کشائی مقصود تھی جسے انھوں نے ایک تھوڑے سے طویل بیان کے بعد جملۂ مؤخر میں ادا کر دیا ہے، میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ انسانیت کے عروج و زوال کی اس تاریخ پر ان کی گہری نظر ہے جسے خود انسانوں نے بار بار آزمائش میں ڈالا ہے جس کے خوبصورت خوابوں سے ذہن و دل کی انجمنیں آراستہ

کی ہیں اور جنھیں تار تار کرنے کا جرم بھی اسی ناعاقبت اندیش انسان سے سرزد ہوا ہے۔

مولانا موصوف محض قرآن مجید یا احادیث نبویؐ یا محسن اعظمؐ کی سیرت پاک کی مختلف مثالوں ہی سے اپنے استدلال کو معنی گیر نہیں بناتے بلکہ دیگر علوم اور تاریخ کے ان زمانوں سے بھی روشنی اخذ کرتے ہیں جن سے ان کے دعوے کو استحکام حاصل ہو سکا ہے۔

> ''میں عرض کروں گا کہ یورپ اور امریکہ.....کا اخلاقی معیار اس کی تعلیم و تہذیب کے مطابق نہیں جو ملک اپنے جیسے انسانوں کی گنجان شہری آبادیوں (ہیروشیما اور ناگاساکی) پر ایٹم بم گرا کر لاکھوں انسانوں، معصوم بچوں اور بے گناہ عورتوں کو ہلاک اور جیتے جاگتے شہروں کو خاک کا ڈھیر بنا رہا ہے اور جس ملک کا سب سے بڑا انسان جس کو اس ملک کا سب سے بڑا اعتماد حاصل ہے محض انتخاب جیتنے اور زیادہ ووٹ حاصل کرنے کے لئے کروڑوں عربوں کے جائز و فطری مطالبے کے خلاف پوری بے حیائی سے یہودیوں کو تقسیم فلسطین کی منظوری اور پھر یہودی ریاست کو تسلیم کرنے کی رشوت دے سکتا ہے اور جس یورپ کا ایک ذمہ دار ترین انسان (لارڈ ماؤنٹ بیٹن) اپنے ملک میں عزت اور تاریخ میں جگہ حاصل کرنے کے لیے فسادات کی روک تھام سے عمداً پہلو تہی کر کے لاکھوں بے گناہ انسانوں کو ہلاکت و مصیبت کا سبب بن سکتا ہے، اس ملک کو مہذب اور بااصول کہنا اصول و تہذیب پر دھبہ لگانا ہے۔''

اقتباسِ ہذا میں جو اسلوب ہے وہ تمثیلی اور ڈرامائی اسلوب سے مختلف ہے۔ یہاں حقیقتِ حال سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور اس تضاد کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے جو

ظاہر اور باطن، نیز قول اور فعل کے مابین واقع ہے۔ علم نے حلم کے بجائے قہر کی صورت اختیار کر لی ہے۔ مولانا موصوف کے کلام میں بعض تاریخی حقائق بڑی شدت کے ساتھ معرض بیان میں آئے ہیں۔ خیالات کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے جو دیر اور دور تک تھمنے اور رکنے کا نام نہیں لیتا۔ غور کیجئے! پورا اقتباس تقریباً ۲۰۰ الفاظ پر مشتمل ہے جو ایک طویل جملے کا حکم رکھتا ہے۔ پورے جملے میں ۹ حروف عطف واقع ہیں جن سے فقرہ بہ فقرہ جملہ ہٰذا نے توسیع پائی ہے۔ اس اسلوب میں خطابت کی شدت، جذبات کا اتار چڑھاؤ اور خیالات کی فراوانی موضوع کے عین موافق ہے جس کے باعث جملے کی طوالت تکان کا باعث نہیں بنتی۔ مقصد خبر نہیں آگہی ہے، ترجمانی نہیں تلقین ہے۔ اگرچہ تہ بہ تہ شکوہ و احتجاج کی لے موجزن ہے تاہم تلخی اور درشتی سے محفوظ، یہی وہ صفات ہیں جو مولانا موصوف کے اسلوب نگارش کی انفرادیت کا تعین کرتی ہیں اور جس کی ایک خاص خوبی اس کی ادبیت یعنی Litermen ہے، دوسرے لفظوں میں جس کی اپنی ایک خاص تخلیقی وضع اور تخلیقی ادائیگی ہے۔

مولانا علاء الدین ندوی

مولانا علی میاںؒ

تعمیری ادب کا اعلیٰ نمونہ

مولانا کے اسلوب کی بنیادی خصوصیات

مولانا کا علم وفن شعوری اور گہری فکر کا نتیجہ ہے، مستعار نہیں ہے، گہری اور شعوری فکر ونظر کے نتیجہ میں ظاہر ہونے والا علم ہی سرچشمہ حکمت ومعرفت ہوتا ہے۔ جب کہ مستعار علم صرف معلوماتی ہوتا ہے۔ مولانا کے ادب میں ایک رواں دواں اور پیہم جواں زندگی کا احساس ہوتا ہے۔ ایسی زندگی ادب وفن میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس میں خونِ جگر کی آمیزش کے ساتھ عشق وعمل کی روح پھونک دی گئی ہو۔

آپ کے ادب کی دوسری خصوصیت بوقلمونی ہے۔ بوقلمونی سے میری مراد موضوعات کا وہ تنوع بلکہ فکر وخیال کے وہ مختلف رجحانات ہیں جن میں ایک مضبوط تال میل اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

تیسری خصوصیت اتقان ہے۔ اتقان مضبوطی اور پختگی کو کہتے ہیں، یہاں اس سے مراد کمال ہے۔ مولانا کے کمال اسلوب کا خاصہ ہے کہ ان کی تحریروں میں

طبعیت کی جولانی، جذبات کی فراوانی، ایمان کی پختگی اور زبان کی شگفتگی کا حسین رچاؤ جادو جگاتا ہے۔ شبلیؒ وسلیمان ندویؒ کے مقالاتی اسلوب سے کسب فیض کے ساتھ آپ کے یہاں ہلکے قوافی، مترادفات کی بہار اور ازدواجیت کا رنگ نظر آتا ہے۔ جو اصل میں خطابت کا خاصہ ہے۔ یوں خطابت کی ہلکی چاشنی نے الہامی زبان سے تاثر کے رنگ وروغن کو گہرا کر دیا ہے۔

چوتھی خصوصیت پاکیزگی ہے۔ پاکیزگی سے مراد طہارت معصومیت اور تزکیہ ہے۔ کسی نے کہا ہے ''العقل السلیم فی الجسم السلیم'' میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ: ''الفکر السلیم فی القلب السلیم'' فکر سلیم قلب سلیم کا عطیہ ہے۔ مولانا کی سلامتی فکر ونظر، اور طہارت قلب وجگر کا یہ عالم تھا کہ کسی انسان کے شیشۂ دل پہ کبھی بال نہ آنے دیا۔ حد یہ کہ جب تنقید واحتساب کا خیر خواہانہ قلم سنبھالا تب بھی قلم کی پاکیزگی اور زبان کی شائستگی کو کبھی مجروح نہ ہونے دیا۔

عزت وشہرت اور ہر دلعزیزی ومحبوبیت کے بام عروج پر پہنچ کر انسان عجب، کبر اور خود پسندی کے پل سے باہر نکل آئے اگر یہ نادر نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ یہ نبویؐ اخلاق وسیرت کا عکس ہے۔ جو وارثینِ نبوتؐ پر جلوہ فگن ہوتا ہے۔

اعتدال وتوازن اور جامعیت مولانا کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت ہے۔ موضوع اور ہیئت کی بنیادی جہتیں ہوں انداز بیان کی پر کیف رنگینی ہو، فکر رسا کی گل افشانی ہو، اخلاق کی دلبری ہو یا آدم گری، اور کردار سازی کی پر پیچ راہیں ہوں، لب ولہجہ کی متانت ہمیشہ قائم رہے گی، اور اعتدال وجامعیت کا رنگ ہمیشہ نمایاں رہے گا، اور اسلوب بیان خوش اسلوبی کے ساتھ اپنا گہرا اور دیرپا اثر چھوڑے بغیر نہیں رہے گا۔ شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ کے اکثر فقروں میں شاعرانہ تب وتاب اور خطیبانہ رنگ وآہنگ ہوتا ہے جو دھیرے دھیرے قاری کے سرد جذبات کو تپا تا رہتا ہے۔

آپ کا اسلوب عطر مجموعہ ہے

مولانا کی شخصیت کی اٹھان، ان کے مزاج ومنہاج کی تشکیل اوران کے جامع دینی تخیل میں جس اسباب وعوامل کا حصہ ہے، ان میں ان کے دینی گھرانے کا موحدانہ اور حقیقت پسندانہ دینی مزاج بھی ہے۔ان کے بڑے بزرگوں اور مربیوں کی مومنانہ تربیت اور پدرانہ شفقت کی تاثیر بھی ہے۔حکمت ولی اللّٰہی اور سوز علم اللّٰہی کے سرچشمہ انوار کا فیض بھی ہے۔بزرگان قریۃ الصالحین (دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں) کے آداب سحر گاہی، اور سید احمد شہیدؒ کے جذبہ شہادت کا اثر بھی ہے۔صاحب نزہۃ الخواطر کی تبحر علمی اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کی بالغ نظری بھی ہے۔قرآنی تعلیمات کی پاکیزہ روح اوراس کا جلال وجمال بھی ہے۔سیرت طیبہ کی دلآویزی اوراس کی اثر آفرینی بھی ہے۔ اہل دل کا جذب وکشش بھی ہے۔اپنے ماحول کا منظراور پس منظر بھی ہے۔اغیار کی غلامی سے نفرت بھی ہے، سقوط خلافت کا زخم بھی ہے۔عالمی استعماری استبدادیت سے غیظ وغضب کا لاوا بھی ہے، جام شریعت بھی۔میدان کارزار کی گرمی بھی ہے، اور محفل شعروسخن کا خداداد ذوق بھی۔پھراس سب کے ساتھ ان کی اپنی شریفانہ خو ہے۔طبعیت کی نرمی ہے۔ان کے اخلاق کی رفعت ہے۔ان کی تواضع اور وضع داری ہے۔آپ کا ذوق نظر اور سوز دروں ہے۔علم کی گہرائی اور شخصیت کی دلآویزی ہے۔جامعیت کا کمال ہے اور بے ہمہ ذات کا حسن کردار ہے۔ان میں پہاڑوں کا شکوہ بھی ہے اور دریاؤں کا اضطراب بھی، متحرک زندگی کی سعی وتڑپ بھی اور تحقیق وجستجو کا پرسکون ماحول بھی ان ہی متنوع اور رنگارنگ پھولوں کے رس نے آپ کی شخصیت کو عطر مجموعہ بنا دیا ہے۔اس عطر مجموعہ کی خوشبو آپ کے طرز زندگی میں اوراسلوب نگارش میں بسی ہوئی ہے۔

مولانا احساس جمال اور کیفیات حسن کے دلدادہ ہیں، وہ ایک حساس اور باشعور انسان ہیں، اس لئے ان کی قوتِ وجدان حسن وجمال کا خوب ادراک کرتی ہے۔

انسان کی روح اور کائنات کی روح میں بڑی مماثلت ہے جو انسان اپنی روح کا کائنات کی روح سے اور اپنے ذوق جمال کو کائنات کے حسن و جمال سے ہم آہنگ کر پاتے ہیں، وہ اپنی غایت تخلیق کے اعتبار سے خلیفۃ اللہ ہونے کا حق ادا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں، اگر انسان اپنے جوہر ذاتی اور اس کے حسن کے ادارک کی جستجو میں لگ جائے تو یہ جستجو اسے خالق کائنات اور حسن ازل سے روشناس کراتی ہے۔ مولانا کا یہ تصور حسن و عشق، احساس بندگی کے گہرے شعور سے رونما ہوتا ہے اور احسان کی کیفیت سے نکھرتا ہے۔ لہٰذا جو تصورِ حسن و عشق اس روح سے تابندگی حاصل نہ کر سکے وہ مفلوج حسن ہوگا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''مولانا احساس جمال اور حسن کی کیفیت کے دلدادہ ہیں، مگر زندگی کی تازگی، قلب و اضطراب سے عاری فن کو مفلوج سمجھتے ہیں'' (۱)

مولانا کے اسلوب میں سلاست، حلاوت و قوت، ان کی روانی، ان کے قلب کی پاکیزگی، ان کی باطنی کیفیت و سرمستی، ان کے یقین کی لطافت، ان کی حمیت و غیرت، ان کی طبعیت کا جوش، ان کے جذبات کی فراوانی خود اعتمادی کا نتیجہ ہے۔ شیخ شرف الدین یحیٰ منیریؒ کے مکتوب کی ادبی تاثیر کے پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے حضرت مولانا خود اس حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ اس اقتباس کا لفظ لفظ آپ کی شخصیت کے لئے آئینہ بن گیا ہے فرماتے ہیں:

> ''ادب و انشاء کے سلسلہ میں عام مؤرخ و نقاد اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ تحریر کی قوت، کلام کی تاثیر اور قبول عام اور بقاء دوام کے لئے سب سے زیادہ معاون عنصر لکھنے والے کی اندرونی کیفیات، اس کا یقین، دلی جذبہ، کسی حقیقت کے اظہار کے لئے اس کی بے چینی اور بے قراری ہے، ایسے کسی شخص کو جو اس

کی اندرونی کیفیت سے سرشار رہو، اور اس کو دوسروں مین پیدا کرنے کے لئے مضطرب و بے قرار ہو، جب قدرت کی طرف سے ذوق سلیم بھی عطا ہو، الفاظ و اسالیب بیان پر ضروری حد تک قدرت بھی حاصل ہو اور اس کی تحریر میں علم، عقل و استدلال اور حسن بیان کے ساتھ سوزِ دروں اور خون جگر بھی شامل ہو تو اس کی تحریر میں ایسا زور پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے زمانے میں ہزاروں دلوں کو زخمی کرتی ہے۔ اور سیکڑوں برس گذر جانے کے بعد بھی اس کی تازگی و زندگی اور اس کی تاثیر و قوتِ تسخیر قائم رہتی ہے۔" (۲)

مولانا کلام نرم و نازک سے دل کے تاروں کر چھیڑنا اور پھول کی پتی سے ہیرے کے جگر کو کاٹنا خوب جانتے ہیں۔ سوئے ہوئے جذبات کو بیدار بھی کرتے ہیں۔ مگر سو کر اٹھنے والے کو جذبات کی رو میں بہہ جانے کے لئے چھوڑ نہیں دیتے بلکہ اس کی باگ کو بڑی دانشمندی (Wisdom) کے ساتھ علم نبوت کے ہاتھ میں تھما دیتے ہیں۔ مولانا کے احساس بندگی، احسان کے رتبۂ بلند پر پہنچنے کی تابندگی، زندگی کی اعلیٰ قدروں کی بازیافت مقصدیت کی بلندی، فکر اسلامی کے احیاء کی جدوجہد اور اسلامی مزاج کی تشکیل جدید، پھر اپنی گہری علمیت کے ساتھ گلشن ادب اور ذوق جمالیات سے فطری لگاؤ نے تاریخی، ادبی اور اسلامی ادب کا ایک نیا گلدستہ سجا دیا ہے۔ جہاں حسن کے عناصر اربعہ (اتقان، توازن و ہم آہنگی، پاکیزگی اور بوقلمونی) کی چمک نظر آتی ہے۔

مولانا کا اسلوب ان کے فکر کے تناظر میں

مولانا کی تاریخی اور فکری شخصیت کا دلکش سراپا ان کے ادبی اسلوب میں پنہاں ہے اس لئے ہم ان کے تاریخی اور فکری ادوار کو اسلوب حیات یا طرز نگارش کے تناظر میں تین مرحلوں میں تقسیم کرتے ہیں اگر چہ اس تنوع میں بھی یک رنگی و یکسانیت ہے۔

دور اول: یہ دور آپ کا عہد شباب سے شروع ہوتا ہے۔اسی دور شباب میں ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' اور'' ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین ''(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر) جیسی معرکۃ الآرا تصنیفات سامنے آئیں، اس دور کی فکر میں جاہلیت جدیدہ کے رخ سے نقاب ہٹا کر اس پر برملا تنقید کی گئی اور اسلام کو ایک مکمل نظام حیات اور تہذیب وتمدن کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔معبودان باطلہ (اپنے وسیع تر مفہوم میں) کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہوئے اسے مکمل طور پر اسلام کا حریف ورقیب گردانا گیا۔''سیرت سید احمد شہید'' کی تصنیف کو مسلمانوں کی اپنی کھوئی ہوئی عظمت رفتہ کی بازیافت کے لئے ایک مثالی کردار اور نشان منزل (Sign Post) کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔

دور ثانی: دور لا اور اِلّا کی زبردست آویزش وکشاکش میں جاہلیت جدیدہ پر برملا تنقید اور مجاہدانہ وانقلاب آفریں اسپرٹ کے مقابلہ میں دعوت وعزیمت اور ارشاد واصلاح کی اہمیت جتلائی گئی۔اس موقف کی تائید میں تاریخ دعوت وعزیمت اور متعدد اہل اللہ کے سوانحی تذکرے پیش کئے جاسکتے ہیں۔

تیسرا دور: اس دور میں پیام انسانیت کے پلیٹ فارم سے انسانی اور اخلاقی قدروں کے احیاء پر توجہ مرکوز کی گئی، اگرچہ اس کا عملی خاکہ آزادیٔ ہند کے چند برسوں بعد ہی سامنے آگیا تھا مگر پچھلی صدی کی ساتویں دہائی کے بعد سے اس میں رنگ بھرنے کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔

ان فکری مراحل حیات کے شفاف آئینہ میں آپ کی دلآویز وجامع شخصیت کے جلال وکمال کو اور اس کی سطح پر جھلکنے والے اسلوب کو صاف محسوس کیا جاسکتا ہے۔

عہد شباب کے اسلوب کا نمونہ

''سیرت سید احمد شہید'' گیارہ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ۲۴ سال کی عمر کے ایک

جواں سال قلم کی دین ہے۔ تذکرہ سید احمد شہیدؒ کا جن کی اصلاحی اور تجدیدی کوششوں نے لوگوں کی زندگیوں میں وہ انقلاب برپا کردیا کہ صحابہ کرامؓ کے عہد زریں کی یاد تازہ ہوگئی اور جن کی فقیرانہ امارت اور خدا ترس حکومت نے صدیقؓ وفاروقؓ کی تاریخ دہرادی، پھر قلم اس فرشتہ صفت انسان کا جس نے اس پاک طینت انسان کی محبت وعشق کے تسنیم وکوثر کا جام وسبو عہد طفلی ہی لنڈھایا تھا اور جس کی حرارت اور جوش وولولہ اس کی حمیت دینی اور غیرت اسلامی کو لو پہونچاتی رہی تھی، ان عناصر کے ساتھ زبان وبیان کی خداداد طاقت، موضوع سے حد درجہ شیفتگی، راہ سلوک کے رموز واشارات کے ذوق آشنا کتاب سوانح وتذکرہ نگاری کا اعلیٰ نمونہ اور تصنیف وتحقیق کا پیکر مجسم بن کر ایمان افروز بن گئی۔ جس کی سطر سطر الفاظ کا جادو جگاتی اور فکری بالیدگی پیدا کرتی ہے۔ یوں پوری کتاب وجدانی کیفیات کا شاہکار بن گئی ہے، نہ معلوم کتنے انسانوں نے کتاب پڑھی اور اپنے گرم گرم آنسوؤں سے دامن تر کئے۔ مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے الفاظ کہ ''اسے پڑھ کر اپنے اندر ایک آگ سی بھڑک گئی'' مولانا مودودیؒ کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تو یہ کتاب زیر مطالعہ رہی'' کتاب کے صفحات پڑھتے جایئے اور دل ودماغ کو روشن کرتے جایئے۔ مواد، ہیئت، وحدت اور حقائق ومعارف کی پردہ کشائی ہر زاویہ سے ایک مکمل تصنیف اور علمبردار ان اسلام کے لئے ایک نادر تحفہ، یہاں زندگی بخش اور دلآویز اسلوب کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

> ''اسلام کی تحریک ایک جاوداں تحریک ہے۔ جو زمان ومکان کے حدود وقیود سے آزاد ہے۔ جو آفتاب کی طرح ڈوب کر ابھرتی ہے۔ اور شمع کی طرح کشتہ ہوکر بھڑکتی ہے۔ وہ ہر زمانہ میں خدا کے معجزات ظاہر کرسکتی ہے، اس کے عجائب غیر متناہی ہیں....
>
> یہ زمانہ بعض حیثیتوں سے کام کرنے کے لئے زیادہ موزوں

ہے اور آج کام کرنے والوں کو وہ سہولتیں حاصل ہیں جو پہلے حاصل نہ تھیں۔ زمین صاف کرنے کا بہت سا کام ہوگیا ہے۔ دماغوں کی بہت سی الجھنیں دور ہوگئی ہیں۔ بہت سے اسلامی حقائق جو پہلے اسرار و رموز تھے اب زبان خاص و عام ہیں۔ اوہام و خرافات کا طلسم ٹوٹ چکا ہے۔ رسوم و بدعات کی جڑیں بھی اب زمین چھوڑ چکی ہیں۔ جاہلیت کے بہت سے مورچے اور قلعے بھی متزلزل ہوگئے ہیں۔ شرک و وثنیت کی غیر معنویت اب پہلے سے زیادہ واضح ہوچکی ہے۔ تکفیر کا فتنہ اپنا پورا زور صرف کر کے نڈھال ہو چکا ہے۔ اسلامی نظام زندگی کا پورا واضح تصور سامنے آتا جاتا ہے۔ اسلامی حکومت اور حکومت الٰہی کے الفاظ جو پہلے غیر مفہوم اور کانوں کے لئے غیر مانوس تھے اب زبانوں پر ہیں۔ کسی تحریک کی اشاعت اور کسی جماعت کی تنظیم کے وہ وسائل اور مواقع پہلے سے بہت زیادہ ہیں۔ عملیت روحانیت اور للّٰہیت کی بیشک کمی ہے اور یہ صحیح اسلامی تحریک کی بنیاد اور اسلامی جماعت کی روح ہے۔ لیکن قرآن وحدیث کے صحیفوں کی موجودگی اور ایسے انسانوں کی موجودگی جو قرآن وحدیث کے صحیفہ ناطق ہیں، یہ کمی پوری کی جاسکتی ہے۔ ان چراغوں کی لو سے اپنے بجھے ہوئے دیئے روشن اور ان کے سینوں کے تنور سے اپنے دل کی بجھی ہوئی انگیٹھیاں گرم کی جاسکتی ہیں۔ بعض گذشتہ بزرگوں کی سیرت میں بھی یہ خاصیت ہے کہ ان کی گرمی صدہا انسانوں تک منتقل ہوجاتی ہے۔ یہ سیرت بھی اسی سلسلہ کی ایک چیز ہے۔" (۳)

نوجوانان اسلام کو ایک انقلابی شان سے اٹھنے، اپنے اندر حرکت عمل پیدا کرنے اور زمانے کے رخ کو بدل دینے کا سبق سکھاتے ہوئے اپنے مخصوص صوت وآہنگ میں فرماتے ہیں:

''ناز کیا جو بدلا ہے زمانے نے تجھے
مردوہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

سلطنتوں کو فتح کرنے کا حوصلہ کریں کہ نوجوان نے یہ بھی کیا ہے، جسم کی آرائش وزیبائش چھوڑ کر بزم جہاں کی آرائش کی فکر کریں اور دیکھیں کہ کیا چیزیں کم ہیں کہ پوری کردیں، کیا رخنے ہیں کہ بھردیں، کیا چیزیں بیکار ہوگئی ہیں کہ نکال دیں۔'' (۴)

فکر اسلامی کے انقلابی تصور کا اظہار یوں فرماتے ہیں:

''اسلام کی خدمت اور نوع انسانی کی سعادت کا ایک ہی لائحہ عمل ہے جس کے مطابق جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے خلفائے راشدین اور بعض مجددین ملت نے عمل کیا یعنی دنیا میں اسلامی شریعت اور خلافت کا نظام قائم کرنا اور اسلام کے اخلاقی روحانی، مادی، سیاسی غلبے کی کوشش کرنا''۔ (۱)

''سیرت سید احمد شہیدؒ'' کے بعد دوسری انقلاب انگیز تصنیف ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' اردو ترجمہ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر) منظر عام پر آئی۔ آپ کی عمر لگ بھگ تیس سال کی ہوا چاہتی تھی۔ مولانا عبداللہ عباس ندوی مصنف ''میر کارواں'' نے اس دور کو ''زندگی کے انقلابی مراحل'' سے تعبیر کیا ہے۔

یہ ایک تجزیاتی، تحقیقی اور معروضی اسلوب کا شاہکار ہے، یہ کتاب تاریخی حقائق،

فلسفۂ تاریخ، اسلامی نقطۂ نظر سے تاریخ نویسی، اسلامی نشأۃ ثانیہ کی جدوجہد اور حیات انسانی کی فکری، تہذیبی اور تمدنی ارتقاء کی ایک جامع اور وسیع و وقیع دستاویز بن گئی ہے۔ معروضی بحث و تحقیق کے ساتھ ساتھ ادب کی جمالیاتی کیفیت، فکر کی لطافت، رواں اور شگفتہ زبان اور پختہ اور واضح اسلوب کا اعلیٰ نمونہ قرار پائی ہے۔ ڈاکٹر شکری فیصل جنھوں نے رسالہ ''الثقافہ'' میں کتاب پر جی کھول کر تبصرہ کیا ہے کہتے ہیں:

> ''حقیقت تو یہ ہے کہ کتاب کا ایک خاص وصف اس کا یہی واضح اسلوب ہے، اور شاید اسلوب کی یہی شگفتگی، عقیدہ و نظریہ کا نکھار اور اس پر ایمان و یقین کا عکس ہے۔ اس کے علاوہ یہ اسلوب بہت پختہ اور متین ہے، مصنف قرآن مجید سے استشہاد پر پوری طرح قادر ہیں.... عربی ترکیبوں کا بہترین استعمال، عنوانات کا لاجواب انتخاب اور تنوع اور ہر چیز کو اپنی جگہ رکھنا گویا وہ اسی کے لئے تھی، یہ سب باتیں ایک متین، پختہ اور شگفتہ اسلوب کی نشانی ہیں۔'' (۶)

ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''یہ کتاب اس قابل ہے کہ مشرق کا کوئی گھر اس سے خالی نہ رہے۔ اور ہمارا کوئی نوجوان اس کے مطالعہ سے محروم نہ رہے''۔ (۷)

وہ کتاب جس میں فکری و تاریخی حقائق اور جمالیاتی ادب ایک دوسرے سے یوں پیوست ہوں جیسے گلاب میں خوشبو اور شکر میں مٹھاس وہاں کوئی شگفتہ معیاری اور بلیغ زبان کا نمونہ کاٹ کر جدا کرنا بے حد مشکل کام ہے تاہم ایک نمونہ جو تمثیل و تشبیہ کا عمدہ شاہکار ہے پیش کیا جاتا ہے۔ مولانا ''انسانی سعادت کے لئے عربوں کی قربانی'' کی ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''دنیا کی سعادت و کامرانی کی منزل تک پہنچنے کے لئے

ضروری ہے کہ مسلمان نوجوان اپنی قربانیوں سے ایک پل تعمیر کریں، اس پل پر سے گزر کر دنیا بہتر زندگی کی منزل تک پہونچ سکتی ہے۔ زمین کھاد کی محتاج ہوتی ہے لیکن انسانیت کی زمین کی کھاد جس سے اسلام کی کھیتی برگ وبار لاتی ہے وہ وہی انفرادی خواہش وہوس ہے جس کو مسلم نوجوان اسلام کا بول بالا کرنے اور اللہ کی زمین میں امن وسلامتی پھیلانے کے لئے قربان کریں۔ آج انسانیت کی افتادزمین کھاد مانگتی ہے، یہ کھاد آرام وراحت کے مواقع، انفرادی ترقی کے امکانات اور عیش کے اسباب ہیں۔ جن کو مسلمان بالخصوص عرب اقوام قربان کردینے کا ارادہ کرلیں، چند انسانی جانوں کی جدو جہد اور ان کی قربانیوں سے اگر انسانی گلہ آگ کی راہ سے نکل کر جنت کی راہ پر لگ جاتا ہے تو یہ بڑا سستا سودا ہے۔'' (۸)

اوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' ایک ایسا تاریخی، ملی اور ادبی رکارڈ ہے جس میں اسلامی نشأۃ ثانیہ کی انقلابی وجہادی کوششوں اور عظمت رفتہ کی بازیافت کے سارے اسباب ووسائل یکجا کردیئے گئے ہیں۔ مولانا انسانیت کے ہمہ گیر بگاڑ پر جب نظر ڈالتے ہیں تو حقیقت کا ادراک کرلیتے ہیں۔ اسی کتاب کی ابتدا میں فرماتے ہیں:

''اس کو (دنیا کو) محسوس ہو کہ حالات میں کوئی بڑی تبدیلی اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک دنیا کی قیادت، مادہ پرست اور ناخداترس انسانوں کے ہاتھ سے نکل کر خداشناس اور خداترس انسانوں کے ہاتھوں میں نہ پہنچ جائے۔ جو پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور ان کی ہدایات اور تعلیمات سے روشنی اور رہنمائی حاصل

کرتے ہیں۔"(۹)

مولانا نے اس حقیقت کا اظہار اپنی تحریروں اور تقریروں میں بار بار کیا ہے کہ:

"ادب کی طاقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، ادب ایک آلہ ہے تعمیر کا بھی، اور تخریب کا بھی، وہ ذہنوں کو بناتا بھی ہے اور بگاڑتا بھی ہے.... ادب کی بڑی خاصیت وقوت یہ ہے کہ وہ رجحانات اور میلانات اور عمل، طرز فکر، اخلاق اور انقلاب کے محرکات پیدا کرتا ہے... اس لئے اس کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"(۱۰)

اور مولانا نے اس عظیم طاقت کو قطعاً نظر انداز نہیں کیا اور نہ کر سکتے تھے کہ آپ زندگی کا ایک واضح نصب العین رکھتے تھے اور زندگی بھر اس کے احیاء کے لئے کوشاں رہے، ادب اسی اعلیٰ ترین نصب العین کے لئے ہتھیار کا کام کر رہا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ زیر نظر تصنیف میں صاحب تصنیف کی شخصیت کی لطافت موضوع اور ہیئت میں موزونیت، عشق وایمان کا خمیر، اخلاص کی حلاوت اور خود اعتمادی کی طاقت، متین وسنجیدہ اور معروضی وتجزیاتی پیش کش نے "از دل خیزد بر دل ریزد" کی شان پیدا کر دی ہے۔ اس شان وکیفیت میں آبشاروں کی روانی تو ہے مگر موجوں کی طغیانی نہیں، خوشبوؤں کی عطر بیزی تو ہے مگر شعلوں کی لپٹ نہیں، کائنات کا جلال تو ہے مگر برق ورعد کی کڑک نہیں۔ وہ زمین وآسمان کے قلابے ملانا نہیں جانتے۔

تاریخ دعوت وعزیمت

تاریخ وتذکرہ نویسی آپ کے مطالعے اور ذوق ورجحان کی خصوصی جولان گاہیں ہیں۔ تاریخ دعوت وعزیمت کی پانچ جلدیں، پرانے چراغ کے تینوں حصے، تذکرہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی، سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ، سوانح مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ جیسی تصنیفات میں جن اصلاحی اور تجدیدی کارناموں کو

اجاگر کرتے ہوئے قرطاس وقلم سنبھالا گیا ہے۔تو اس حسن انتخاب نے آپ کے احساس وشعور میں سرور وابتہاج اور قلم میں زرو بانکپن پیدا کردی ہے۔ان ممتاز شخصیتوں اور مصلحانہ کارنامہ انجام دینے والوں کا تذکرہ خود مصنف کی دینی اٹھان،ان کے ذوق ورجحان اوران کی چاہت وپسندیدگی کا آئینہ دار ہے۔

ادباء ونقاد کا خیال ہے۔اور صحیح خیال ہے کہ ادب کو زندگی کے تعمیری مقاصد کی تکمیل کرنی چاہئے،اسے زندگی کا نقاد وترجمان ہونا چاہئے،اسے سماجی وتہذیبی بازیافت کا فرض نبھانا چاہئے،اسے ماضی پر روشنی،حال کی ترجمانی اور مستقبل کے لئے صحیح اور راست پیش گوئی کرنی چاہئے۔

پھر شاندار وستھرے ادب کے لئے ضروری ہے کہ مثبت اجتماعی خواہشات کی تکمیل کرے۔اچھے خیالات،صحت مند تصورات پیش کرے۔نیز اقدار ونظریات سے جدا نہ ہونے پائے۔ادبی محاسن کے ضمن میں یہ امر لائق توجہ ہے کہ اس میں زبان کی سلاست ہو، بیان کی خوبی ہو،تشبیہ واستعارے کی آراستگی ہو،حسین پیرایہ اظہار ہو،تخیل کی بلندی ہو، مسرت ولطف کی بازآفرینی ہو۔

سوانح نگاری اور تذکرہ نویسی کے ضمن میں مولانا کا پاکیزہ شعور وگہرے ادراک سے مالا مال قلم جب رواں ہوجاتا ہے تو وہ مصلحین ومجددین یا عظماء کی سیرت ہی بیان نہیں کرتا بلکہ ان کی اضطرابی روح کو زندگی عطا کردیتا ہے۔جس نے ان کو باطل کی آندھیوں کے مقابلے میں اسلام کی شمع کو فروزاں رکھنے پر آمادہ کیا۔اپنے اپنے دور کی جاہلیت کے بگولوں کا خاتمہ کیا۔دین کے حقائق ومعارف،دین کے مزاج ومنہاج پر از سرنو اعتماد بحال کیا۔شہادت حق کا فریضہ نبھایا اور اپنے علم کلام کی طاقت سے جاہلی شہ زوروں کو پسپا کردکھایا۔

تاریخ دعوت وعزیمت پر بصیرت افروز نگاہ ڈالتے ہوئے پروفیسر وصی احمد

صدیقی کہتے ہیں:

''جو کچھ آپ پڑھ رہے ہیں وہ آپ کے ذہن سے اترتا نہیں بلکہ زندہ رہتا ہے۔ صورت اور معنیٰ، ہیئت اور مضمون بحیثیت مجموعی پوری کیفیت کے درمیان ایک توازن اور روحانی ہم آہنگی ہوتی ہے۔ پڑھنے والا عجیب خوشگوار لذت میں مبتلا ہوتا ہے۔

حضرت مولانا کا بیان زندگی اور تاریخ کے ادراک میں کسی نقطۂ انجام کو قبول نہیں کرتا بلکہ مسلسل اپنے دائرہ نظر کو وسیع سے وسیع تر بناتا چلا جاتا ہے۔ ان عظیم شخصیتوں کا بیان اس طرح ہے کہ ان احساسات میں عظمت، جذبات میں نیکی، استدلال میں صداقت اور کارناموں میں حسن نظر آتا ہے۔ یہ وہ مقدس سلسلہ ہے جو عوام کے نفوس کو ان عظیم نفوس کے ساتھ متعلق کرتا ہے جن سے ایک مقناطیس کی طرح لہریں اٹھ اٹھ کر لوگوں کی روحانی زندگیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کرتی ہیں۔ وہ جذبات جو اس کتاب کے مطالعے سے پیدا ہوتے ہیں دل کو ایسی نرمی اور دماغ کو ایسی بالیدگی بخشتے ہیں جو انسان کو پہلے سے زیادہ دیندار اور دانا بنا دیتے ہیں'' (۱۱)

راست اسلوب نگارش

مولانا نے ایک طویل اور بھرپور مقصدی زندگی گزاری۔ آپ نے حقیقت میں مصلحانہ اور مجددانہ کوششوں کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اس لئے زبان و بیان کا بھی ایک نیا اسلوب لے کر آئے تھے۔ یہ اسلوب احیاء اسلام کی خاطر آب و تاب اور ذوق و تپش پیدا کرنے کا ذریعہ بنا، آپ نے اپنے ذوق جمال اور فکر و فن کو دعوت اسلامی کے فروغ میں صرف کیا۔ یوں اردو زبان و ادب کے گیسو سنوارنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اہل ذوق کا ایک وسیع

حلقہ بنایا۔ جن کے اندر آپ کی علمی دینی اور فکری تحریروں سے بالغ نظری پیدا ہوئی۔ ذہن ودماغ میں روشن ضمیری اور بالیدگی آئی۔ فکر اسلامی کے ہمہ گیر تصور نے طائر خیال کو بلندی عطا کی۔ مناظرانہ فکر وخیال کے تنگ دائرے سے قاری کو نکال لائے۔ اور سوچ کی نئی جولان گاہیں بخشیں، دینی جذبات کو مہمیز لگایا۔ حمیت اسلامی کی لہر دوڑا دی۔ بربط دل کو چھیڑا اور اسے نئی رفعتیں عطا کیں۔ فطری جرأت، ایمان ویقین سے لبریز خود اعتمادی اور گرمی گفتار سے قاری کے لہو کو دھیرے دھیرے گرمایا، پھر راست گفتاری مقصدیت کے رچاؤ اور اخلاص وسوز ویقین کی تراوٹ نے برگ گل میں بادسحر گاہی کی نمی پیدا کردی، خطابت میں بسا اوقات ضرب کلیمی کا بانکپن ظاہر ہوا۔ اس پر عوامی مقبولیت اور شخصیت کی عظمت مستزاد کہ زمانہ کی گردش جاتی رہی اور فضائیں ٹھہر کر گوش برآواز ہو جایا کرتی تھیں۔

زور استدلال، اثر انگیزی کی طاقت وحدت موضوع اور ہئیت ومعنی میں اعتدال وتوازن قاری کو خود اعتمادی عطا کرتا ہے۔ اور وہ اس لذت سے سرشار رہتا ہے کہ مولانا اسے ساتھ ساتھ لے کے چلتے ہیں اور کسی مرحلہ میں بھی رفاقت سے محروم نہیں کرتے، عرصہ دراز تک ان کی زبانوں میں بربطِ دل کو چھیڑنے کی صلاحیت وقوت باقی رہے گی۔

حضرت یحیٰ منیریؒ کے علمی وادبی مکتوبات پر ادیبانہ ومبصرانہ تبصرہ کرتے ہوئے حضرت مولانا نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا لفظ لفظ خود صاحب تحریر کی شخصیت کا پرتو اور اظہار خیال حقیقت دل کا ترجمان ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ”بعض اہل دل کے کلام میں جو غیر معمولی حلاوت اور قوت ہے، وہ ان کی روح کی لطافت اور قلب کی پاکیزگی اور اندرونی کیفیت وسرمستی کا نتیجہ ہے۔ اور اس کے لئے وہ کسی خارجی مدد اور مقام اور وقت کے محتاج نہیں ہوتے، ان کی خوشی وسرمستی کا سرچشمہ اور ان کی دولت کا خزانہ ان کے دل میں ہوتا ہے خواجہ میر درد نے

اس پورے گروہ کی ترجمانی اس شعر میں کی ہے ؎

جایئے کس واسطے اے درد میخانہ کے بیچ
کچھ عجب مستی ہے اپنے دل کے پیمانہ کے بیچ

(۱۳)

حواشی

(۱) نقوش اقبال صفحہ ۱۰۱
(۲) تاریخ دعوت وعزیمت حصہ سوم صفحہ ۲۴۲
(۳) میر کارواں پہلا ایڈیشن صفحہ ۱۳۸
(۴) میر کارواں پہلا ایڈیشن صفحہ ۴۶
(۵) میر کارواں پہلا ایڈیشن صفحہ ۴۳
(۶) میر کارواں پہلا ایڈیشن صفحہ ۳۹۳
(۷) میر کارواں پہلا ایڈیشن صفحہ ۳۹۴
(۸) انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر صفحہ ۴۴۸
(۹) انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر صفحہ ۱۵
(۱۰) کاروان ادب جنوری۔جون ۱۹۹۸ء
(۱۱) میر کارواں پہلا ایڈیشن صفحہ ۳۹۹
(۱۲) کاروان ادب جولائی۔ستمبر ۱۸۹۷ء
(۱۳) تاریخ دعوت وعزیمت حصہ اول صفحہ ۲۴۴

پروفیسر وصی احمد صدیقی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

بحیثیت ایک اردو ادیب

اس حقیر مضمون نگار نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں کی تلخیص لکھی، مضامین لکھے مگر نفسِ مضمون میں ہمیشہ ایسا کھویا رہا کہ تحریر کی ادبیب، اس کی سادگی اور پرکاری کو اپنے بیان میں نہیں لا سکا، یہ وحدت الشہود والی بات رہی کہ آفتاب روشنی کے سامنے ستاروں کی روشنی ماند ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے نفسِ مضمون کو میں نے آفتاب اور پیرایہ بیان کو ستاروں سے تشبیہ دی ہے، مگر ستاروں کی آنکھوں کو تراوٹ بخشنے والی ہلکی روشنی بھی اپنا حسن رکھتی ہے۔ یہ مضمون انھیں ستاروں کی جھلمل ہے۔

حضرت مولاناؒ نے زیادہ تر عالمِ اسلام کی اصلاحی اور تجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ لیا ہے۔ نامور مصلحین اور ممتاز اصحابِ دعوت وعزیمت کا مفصل تعارف کرایا ہے۔ ان کے علمی کارناموں کی روداد بیان کی ہے، جو کچھ بھی لکھا ہے وہ ذاتِ محمدیؐ سے عشق اور نبوت محمدیؐ کی پیروی کا بیان ہے۔ کوئی بھی نغمہ ہو لے ہمیشہ حجازی رہی اسی سے محبت کرتے ہیں اور اسی کا بیان کرتے ہیں۔ جن کی صفات حضرت مولاناؒ سے مشترہوں، یعنی دین

کا احیاء اور مسلمانوں کی حفاظت کا کام۔ وہ لوگ جن کا مسلمانوں پر احسان ہے، ان حضرات کی سیرت اور تذکرہ کے سلسلے میں ان کے زمانہ کی علمی اور فکری سطح کو بھی نمایاں کیا ہے اور ان کے علمی کمالات کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ ان کی زندگی کے باطنی پہلو کو بھی اجاگر کیا ہے۔

یہ مضمون اپنی فروگزاشت کی تلافی کے لئے لکھا جارہا ہے لیکن عرض کردوں کہ صوفیا کا قول کہ ''نابودن دیگر ونادیدن دیگر'' میرے حسب حال کی کوشش رہے گی کہ حضرت مولاناؒ کے طرز انشاء کا بیان بھی ہوجائے تاکہ خامہ نخلِ رطب فشاں ہوجائے۔

حضرت مولانا کی تحریر اتنی دلکش کیوں ہوتی ہے اور کیوں لوگوں کے احساسات کو چھوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی تحریر میں مجرد افکار ہوں یا خالص حقیقتوں کا بیان ہو تو گو وہ ایک علمی تحریر ہوگی۔ مگر اثر ڈالنے والی نہ ہوگی۔ مولاناؒ کا بیانِ حقیقت جذبات کی شکل میں دل میں ورود کرتا ہے۔ ان جذبات کا بیان حقیقی اور فطری زبان میں ہوتا ہے اور شاعرانہ زبان کی ملمع سے بالکل محفوظ۔ یقیناً مناسب موقع پر حضرت مولانا پر جوش اور استعارہ آمیز تحریر لکھ جاتے ہیں۔ عبارت آرانہ تکلف سے بالکل دور۔ مولانا کی زبان سالم اور مکمل افکار کی تصوری ہوتی ہے۔ حقیقت اور جمال ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ فکر اور ادراک اور اظہار الگ ہونے کے باوجود ایک وحدت میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ علم لغت کی تصانیف میں کہیں کہیں مل جاتی ہے مگر وہ متن پر حاشیوں سے زائد نہیں۔

مولانا کی زبان کی ہم آہنگی اس درجہ کی ہے کہ اس سے اونچا درجہ تخیل میں نہیں آتا۔

حضرت مولانا حرف ومعنی کے اندرونی رشتہ سے بخوبی واقف ہیں۔ فکر کی گہرائی اور تخیل کی رعنائی ان الفاظ سے ہم آہنگ ہوگا جو مولانا استعمال کرتے ہیں۔ اضطراب اور خلش کا بیان، مردان کار کے کارناموں کا ذکر، اقدار حیات کا تعین سب کے لئے الفاظ سے بنی ہوئی فضا الگ ہوجاتی ہے۔ لیکن آفاقیت اور ہمہ گیری سے کوئی بیان

خالی نہیں ہوتا۔ اور یہ کمال بھی چشم زدن میں اشیا کے باطن کو سامنے کر دیا۔ اس شوق، عشق تپش، اور جذب کے ساتھ جو ان کے بیان کا خاصہ ہے روانی اور بے ساختگی میں کہیں فرق نہیں آتا۔ ان کی مثالیں میں ابھی آپ کے سامنے لاؤں گا۔

حضرت مولاناؒ نے زیادہ تر تاریخ، فلسفہ تاریخ، مذہب، سیرت اور سوانح کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان دائروں میں وسعت کم ہو جاتی ہے مگر حضرت مولاناؒ کے اندر جو تخلیقی فنکار چمکتا ہے وہ چنگاری سے ستارہ ڈھونڈھتا ہے اور ستارہ سے آفتاب۔ عرفان حقیقت کا انحصار ادراک اور جستجو دونوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اولین بات حقیقت ہے پھر خیال، مشاہدے کے احساسیت اور دلکشی اور پڑھنے والے انشراحِ صدر کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ یہ کاشفِ اسرارِ دین ہیں۔ اور ان ضمیر پر نزول کتاب ہوتا ہے۔ حضرت مولانا کی کتابوں میں ایک ربطِ فکر ہوتا ہے۔ موضوعات الگ الگ ہونے کے باوجود سارے مضامین ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کی تشریح کرتے ہیں، اور ایک دوسرے کی معنویت میں اضافہ کرتے ہیں۔ الفاظ کا دروبست ایسا کہ ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے۔

حضرت مولاناؒ نے اپنی تحریروں میں خطیبانہ اثر انگریزی کو جگہ نہیں دی ہے۔ ان کے باطنی تقاضے اور فکری زاویے، کیفیتِ نفسی ان کے سادہ بیان سے قاری تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ زبان محاکاتی اور استدلالی ہوتی ہے نہ کہ قصہ آفریں تحریر کی تشبیہ ایک شفاف شیشے سے دی جا سکتی ہے، جس کے اندر سے لکھنے والے کے جذبات چھلک رہے ہیں۔ اعلیٰ پایہ کی تحریر کے لئے ایسی پرکار سادگی بالکل ایک خوبصورت سہل ممتنع غزل کی طرح طبیعت کو خوشی سے بھر دیتی ہے۔

یہ چھوٹا سا مضمون مولانا کی ساری تصانیف کا احاطہ نہیں کر سکتا بہر حال ان کی چند بہت معروف کتابوں کے اپنے بیان کی وضاحت کے لئے نمونے پیش کرتا ہوں۔

سب سے پہلے میں حضرت مولاناؒ کی پہلی تصنیف ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' کو لیتا ہوں۔اس وقت کے نوجوان علم کے قلم کی روشنائی شہید کے خون کی سرخی سے مل گئی ہے۔

اک خونچکاں کفن پر کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

روانیٔ بیان کا اعجاز دیکھئے :

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک غیر فانی معجزہ یہ ہے کہ آپ کے فیض کا چشمہ کبھی خشک نہیں ہونے پاتا۔آپ کے امت کی ضرورتیں زیادہ دیر تک اٹکی نہیں رہتی۔اور وہ اس طرح کہ آپ کی مشعلِ نور سے براہِ راست مسلسل طریقہ پر سیکڑوں مشعلیں روشن ہوتی رہی ہیں۔آپ کی کامل پیروی سے ہر زمانے میں اور تقریباً ہر جگہ کم وبیش ایسے انسان پیدا ہوتے رہے ہیں جن سے آپ کی یاد تازہ ہوتی تھی۔اور انبیاء کی شان نظر آتی تھی۔ج سے ظاہر ہوتا کہ اللہ کا کام بند نہیں ہوا،اور اللہ کا دین زندہ ہے۔

ان بزرگوں کے کئی طبقے ہیں۔پہلے اور سب سے اونچے طبقے کو صحابہ کرام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت وکمالات،نبوت کی تکمیل کردی۔اسی طرح ان حضرات نے آپ کی کامل پیروی کا حق ادا کردیا۔اس کے بعد سلفِ صالحین اولیائے کاملین،مجاہدین،مرشدین، مصلحین ومجددین ہیں۔یہ سب آپ کے کفن بردار اور آپ کے دین کے خادم ہیں۔اس سے زائد کچھ نہیں۔''

اس تسلسل میں مولانا کا الفاظ پر قابو دیکھئے،تشبیہات اور مثالوں کا ایسا حسن

کہیں اور دیکھنے میں مشکل سے ملے گا۔

''ان لوگوں سے اللہ ہمیشہ کام لیتا رہا ان سے ہزاروں آنکھیں روشن کیں، ہزاروں کے دل کے کنول کھلائے، ہزاروں کو جگایا، ان کا ذکر عبادت ہے۔ ان کی محبت ذخیرہ آخرت ہے۔

یہ لوگ شب بیدار و شہسوار، اللہ کے لئے محبت کرتے تھے، تو اللہ ہی کے لئے دشمنی بھی کرتے تھے۔''

اب اس تشبیب کے بعد گریز دیکھئے :

''پشاور کے فاتح اور تیرہویں صدی کے امیر المؤمنین کی زندگی میں اتباعِ نبوت کی حیثیت بہت نمایاں نظر آئیگی۔ انھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ اسلام عقائد و رسوم کا نام نہیں، وہ زمانے کی فضا، طبیعتِ بشریٰ کا مذاق اور سوادِ اعظم کا رنگ بدلنا چاہتا ہے، یہ اس وقت ہوسکتا ہے کہ اس کو مادی اور سیاسی اقدار حاصل ہو، شرعی حکومت کے بغیر شریعت پر پورا عمل بھی نہیں ہوسکتا، امر و نہی کے لئے سیاسی اقتدار اور مادی قوت کی ضرورت ہے۔

سید صاحب نے ''مسلمان'' نام کی ایک قوم کے غلبہ کے لئے نہیں بلکہ ''اسلام'' نام کا ایک مکمل دین، عقیدہ، عمل اور مسلکِ زندگی کو قائم کرنے کے لئے اپنے خون کا پہلا اور آخری قطرہ بہایا۔

کیفیت ایمانی کے جاں نواز جھونکے تاریخ اسلام میں بارہا چلے ہیں، لیکن ایمان و یقین، خلوص وللّٰہیت کی ایسی باد بہاری ہمارے علم میں کم سے کم ہمارے ملک میں اس سے پہلے نہیں چلی۔ آدم گری اور مردم سازی، اصلاح و انقلاب کے ایسے محیر العقول

واقعات بھی اصلاح وتربیت کی تاریخ میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔

سید صاحب کے رفیقوں کے ذکر پر جب آتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ غار کے رفیقؓ ان کے ذہن میں آجاتے ہیں۔

''صدیق کے لئے ہے خدا کا رسول بس''

مولانا یحیٰ علی عظیم آبادی کا ذکر مختصر ہے مولاناؒ نے دردؔ کی رباعی لکھی ہے جسے وہ پڑھتے تھے کتاب دل کی بڑی سے بڑی تفسیر اس رباعی کے اثر کے برابر نہیں ہوسکتی۔

اتنا پیغام دردؔ کا کہنا ،جب صبا کوئے یار سے گذرے
کون سی رات آپ آئیں گے، دن بہت انتظار میں گذرے

حضرت اسماعیل شہیدؒ کے بیان میں مولانا جذباتی ہوجاتے ہیں، دیکھئے کیسی دل کو پگھلا دینے والی تحریر لکھی ہے:

''سرحد کا قیام اور ہجرت کے بعد کا زمانہ ایک مسلسل جہاد کا زمانہ تھا جس میں یا تو عملاً جنگ تھی یا اس کی تیاری جنگ کی تدابیر اور انتظامات اور جنگی مہموں کی قیادت میں سب سے بڑا حصہ آپ ہی کا تھا۔ اس مدت مس میدانِ جنگ کے نشیب وفراز اور حالات کے سب تغیرات پیش آئے۔ فتوحات بھی ہوئی علمداری بھی قائم ہوئی۔ ایک دینی ریاست کا بھی انتظام کرنا پڑا۔ شکستیں بھی ہوئیں فتح کیا ہوا علاقہ بارہا ہاتھ سے نکل نکل گیا۔ دن رات کے ساتھیوں اور عمر بھر کے رفیقوں کو بارہا اپنے ہاتھ سے قبر میں اتارا، برسوں کی کھیتی دنوں اور گھنٹوں میں لٹ گئی، بالآخر عین میدانِ کارزار میں پانے محبوب مقصد کے لئے اپنے محبوب امام ورفیق کے ساتھ راہ

خدا میں سر دے کر ثابت کر دیا کہ ۔

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے"

یہ تو اس شہید کے کارنامے کا ذکر تھا اب مولاناؒ اس ناقدری کا ذکر کرتے ہیں جو ملت کے ایک حصہ نے ان کے ساتھ روا رکھی، مولانا کا دل خون کے آنسو رو رہا ہے:

"۱۳۶ برس کے طویل عرصہ میں شاید ہی کوئی دن ایسا طلوع ہوا ہو جس کی صبح کو اس شہید اسلام کی تکفیر و تضلیل کا کوئی فتویٰ نہ نکلا ہو، لعنت اور سب و شتم کا کوئی صیغہ نہ استعمال کیا گیا ہو، یہ ان لوگوں نے کہا جن کے جسم نازک میں آج تک اللہ کے لئے ایک پھانس بھی نہیں چبھی، جن کے پیروں میں اللہ کے راستہ میں کبھی کوئی کانٹا نہیں گڑا، جن کو خون چھوڑ کر کہ اس کا ان کے یہاں کیا ذکر اسلام کی صحیح خدمت میں پسینہ کا ایک قطرہ بہانے کی سعادت بھی حاصل نہیں ہوئی۔"

تاریخ دعوت و عزیمت کی تمہید ملاحظہ کیجئے۔

"اسلام اللہ کا آخری پیغام ہے اور کامل و مکمل طور پر دنیا کے سامنے آچکا ہے اور اعلان کیا جا چکا ہے کہ آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور دین کی حیثیت سے اسلام کو تمہارے لئے پسند کر چکا۔

ایک طرف تو اللہ کا دین مکمل ہے دوسری طرف یہ حقیقت ہے کہ زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے اور اس کا شباب ہر وقت قائم ہے۔

جاوداں پیہم دواں ہر دم رواں ہے زندگی"

امام غزالی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''علو ہمت ان کی زندگی کا طغرائے امتیاز ہے انھوں نے علم وعمل کے دائرہ میں اپنے زمانہ کی سطح اور اپنے ہم عصروں کی کسی منزل پر قناعت نہیں کی وہ علم وعمل کے جس ترقی یافتہ مقام پر پہنچے ان کے کانوں میں یہی صدا آئی ۔

مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں ہے''

مولانا روم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''توفیق الٰہی سے جب ان کو معرفت وآگہی کے مقام تک پہنچایا اور قال سے حال، خبر سے نظر الفاظ سے معانی اور اصطلاحات وتعریفات کے لفظی علوم سے ترقی کر کے حقیقت ومعرفت تک پہنچے تو ان کو فلسفہ وعلم کلام کی کمزوریوں اور استدلال اور قیاس کی غلطیوں کا اندازہ ہوا۔

دلوں میں دوبارہ دینی وغیبی حقائق کی وقعت، علوم انبیاء کی عظمت، عالم غیب کی وسعت اور قلب وروح، ایمان ووجدان کی اہمیت کا نقش قائم کر دیا۔''

حضرت خواجہ اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حضرت خواجہ نظام الدین کی سیرت اور زندگی کا مرکزی نقطہ جو ان کے تمام اخلاق واعمال اور احوال کا محور ہے، وہ عشق الٰہی کی نعمتِ خداداد ہے۔

ان کے تمام حالات اور اشتغال، گفتگو اور مجالس، اشعار اور ان کے انتخاب وواقعات اور ان کی تخیل غرض ہر چیز اسی سوزِ باطن

اور اسی حرارت عشق کا اظہار ہوتا ہے۔

شعلہا آخر زہر مویم دمید
از رگِ اندیشہ ام آتش چکید"

پرانے چراغ میں حضرت مولانا نے لکھا ہے کہ ان کو اپنے بیتے ہوئے دن، اپنے برتے ہوئے اشخاص، اپنے بچھڑے ہوئے بزرگ اور گزرے ہوئے حالات سے بہت دلچسپی ہے، اسی دشت کی سیاحی میں ان کی تیسری پشت ہے۔

خوبصورت تراکیب اور بہترین جملے پوری سیر میں بکھرے ہوئے ہیں۔ بیت کے بجائے رب ایست۔ مکان کے بجائے مکیں سے واصل ہوئے، سمندر کو شکایت نہیں رہی کہ وہ اس دولت سے یکسر محروم رہے، جو زمین کو نصیب میں آئی۔

صحف سماوی کا انداز بیان۔ خطیبوں کا جوش اور برجستگی۔ عشاق کی مستی و وارفتگی عقل و جذب کی لطیف آمیزان جملوں کی داد دینے کے لئے خود قاری سخن فہم ہونا چاہئے۔

شیخ حسن البناء مرحوم کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ان کی طاقت اور قوت کا اصل سرچشمہ فطرتِ سلیم، دل کی پاکیزگی، روح کی بالیدگی، اپنی غیرت وحمیت اور اسلام کے لئے اضطراب اور بے چینی ہے۔ ان کی دعوت نے عالم عربی کی نئی نسل میں اسلام کی سدا بہار صلاحیت اور اس کے دائمی ہونے کا اعتماد بحال کیا، اور جدید دلوں میں ایمان کی نئی چنگاری روشن کی۔"

مولوی محمد ثانی مرحوم پر حضرت نے جو مضمون تحریر کیا ہے اس میں قدیم عرب شاعر ابوالحسن التہامی کے دلدوز قصیدہ کا ذکر کیا ہے، جو اس نے اپنے جواں مرگ بیٹے کے مرثیے میں کہا ہے۔

موت کا قانون پوری مخلوق پر جاری وساری ہے حقیقت میں یہ دنیا بقا اور

استقرار کی جگہ نہیں اپنے مرحوم بیٹے سے مخاطب ہوکر کہتا ہے کہ ہم تم دونوں ایک ہی میدان کے راہی تھے تم نے پیش قدمی کی۔ اور منزل پر پہنچ گئے۔ اور تمہارا باپ ابھی سرگرم سفر ہے۔

میرے پیش نظر صرف وہ کتابیں ہیں جو حضرت مولانا نے اردو میں لکھی ہیں، یا خود اردو میں ان کا ترجمہ کیا ہے۔ لوگ بتاتے ہیں کہ عربی میں لکھی ہوئی کتابوں میں حضرت مولانا نے روانی بیان کا دریا بہادیا ہے۔ اردو تحریروں میں جو بہار کی فضا رہتی ہے گو ذکر خزاں کا ہو، اس سے اس گلستاں کے رنگ و بو کا بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔ مجھے انگریزی شاعر کیٹس کی وہ لائن بے حد پسند ہے جو اس نے اپنی شہرۂ آفاق نظم The Grecanurn میں لکھی ہے۔

"سنے ہوئے نغمے میٹھے ہوتے ہیں مگر اَن سنے نغمے اور زیادہ میٹھے ہوتے ہیں۔"

حضرت مولانا کی کتاب "الطریق الی المدینہ" کا ترجمہ "کاروان مدینہ" کے نام سے ہوا ہے۔ اس کتاب نے بڑی شہرت پائی ہے اور اس کے مضامین ایسے ہیں جو از دل خیزد بر دل ریزد کے مصداق ہیں۔ وہی اثرات مرتب ہوتے ہیں جو قدسی و جامی یا سعدی یا خسرو کے نعتوں کو پڑھ کر ہوتے ہیں، تھوڑے دیر کے لئے اس عالمِ آب و گل سے الگ ہوجانا، اور اس خنک شہر میں پہنچ جانا جہاں اپنے سرکار آرام فرما رہے ہیں۔ مصنف کا دل اُمڈ آرہا ہے لیکن میرا یہ مضمون معنی سے زیادہ بیان کے ذکر میں ہے۔ ایک مضمون عالم نوجوار دو میں لکھا ہوا ہے اس کے چند جملے نقل کرتا ہوں۔

"زمانہ کی رت بدل گئی۔ انسان کیا بدلا جہاں بدل گیا۔ زمین و آسمان بدل گئے۔ آدمؑ کی اولاد پر آدم کے کسی فرزند کا اتنا احسان نہیں جیسا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا کے انسانوں پر ہے۔ اگر اس دنیا سے وہ سب لے لیا جائے جو محمد صلی اللہ علیہ

وسلم نے اس کو عطا کیا ہے تو انسانی تہذیب ہزاروں برس پیچھے چلی جائے گی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا دن مبارک کیوں نہ ہو۔ اس دن دنیا کا سب سے مبارک انسان پیدا ہوا جس نے اس دنیا کو نیا ایمان اور نئی زندگی عطا کی۔

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
وہ سب پود انہی کی لگائی ہوئی ہے

یہ دنیا کوئی خودرو جنگل نہیں بلکہ یہ مالی کا لگایا ہوا آراستہ باغ ہے۔ اور انسان اس باغ کا سب سے اعلیٰ پھول ہے۔ یہ پھول جو ہزاروں بہاروں کا سرمایہ ہے۔ انسان کا جوہر انسانیت کی اس خالق کے سوا کوئی قیمت نہیں لگا سکتا ہے۔

جب رات کو پورا شہر میٹھی نیند سوتا ہے اور یہ جیتی جاگتی دنیا ایک وسیع قبرستان ہوتی ہے دفعتاً موت کی اس بستی میں زندگی کا چشمہ اس طرح ابلتا ہے جس طرح رات کی سیاہی میں صبح کی سپیدی نمودار ہو۔ الصلوٰۃ خیر من النوم سے اونگھتی ہوئی انسانیت کو تازگی اور زندگی کا نیا پیغام ملتا ہے، جب کسی طاقت وسلطنت کا کوئی فریب خوردہ انا ربکم الاعلیٰ اور مالکم من الہ غیری کا نعرہ لگاتا ہے، تو ایک غریب مؤذن اسی کی مملکت کی بلندیوں سے اللہ اکبر کہہ کر اس کے دعوائے خدائی کا تمسخر اڑاتا ہے۔ اشھد ان لا الہ الا اللہ کہہ کر حقیقی بادشاہت کا اعلان کرتا ہے۔"

ہماری آپ کی دنیا میں حکماء اور فلاسفہ بھی آئے۔ ادباء اور شعراء بھی، فاتح وکشور کشا بھی، سیاسی قائد اور قومی رہنما بھی مگر کسی کے آنے سے دنیا میں وہ بہار آئی جو پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے آئی۔ کون اپنے ساتھ وہ شادابی، وہ برکتیں، وہ رحمتیں، نوع انسانی کے لئے وہ دولتیں اور انسانیت کے لئے وہ نعمتیں لے کر آیا جو محمدؐ لے کر آئے۔ تیرہ سو برس کی انسانی تاریخ پورے وثوق کے ساتھ آپ کو خطاب کر کے کہتی ہے۔

سرسبز سبزہ ہو جو ترا پائمال ہو

ٹھہرے تو جس شجر کے تلے وہ نہال ہو

حضرت مولانا کے مضمون حضور وسرور سے چند لائنیں:

''نظر اٹھا کر دیکھئے دونوں طرف پہاڑوں کی قطاریں ہیں۔ کیا عجب کہ ناقۂ نبویؐ اس راستہ سے گزرا ہو۔ یہ فضا کی دلکشی، یہ ہوا کی مشک بیزی اسی وجہ سے ہے۔

بھینی بھینی ہوا ہے اور ہلکی ہلکی چاندنی جس قدر طیبہ قریب ہوتا جا رہا ہے ہوا کی خنکی، پانی کی شیرینی اور ٹھنڈک لیکن دل کی گرمی بڑھتی جا رہی ہے۔ سنئے کوئی کہہ رہا ہے:

بادِ نسیم آج بہت مشکبار ہے
شاید ہوا کے رخ پر کھلی زلفِ یار ہے

وہ ایک بار ادھر سے گئے مگر اب تک
ہوائے رحمتِ پروردگار آتی ہے

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبار رہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

داغِ غلامیت کرو رتبہ فرد بلند
میر ولایت شود بندہ کہ سلطان خرید

محمد عربی کابروئے ہر دو سرا است
کے کہ خاک درش نیست خاک بر سر او''

حضرت مولاناؒ علامہ اقبال سے بے حد متاثر ہیں۔ کئی مضامین ان پر لکھے۔ اقبال در دولت پر ان کا بہترین مضمون ہے جسے عربی تقریر سے محمد الحسنیؒ اردو میں لائے

ہیں ایسے ہی ایک کتاب ''روائع اقبال'' کے نام سے عربی میں لکھی جس کا اردو ترجمہ مولانا شمس تبریز خاں صاحب نے کیا ہے۔اور واقعی ترجمہ کا حق ادا کر دیا ہے۔اس حقیر مضمون نگار کو اپنے مضمون کے لئے بہترین مواد اس کتاب سے مل سکتا ہے۔

شاعر اسلام اقبالؔ ان کی شخصیت کے تخلیقی عناصر،ان کا نظریہ علم وفن،ان کا طویل نظموں جیسے مسجد قرطبہ اور ذوق وشوق سب پر حضرت مولانا کی بہترین تحریریں ہیں۔مگر میں نے خود سے عہد کیا تھا کہ صرف ان کتابوں کو سامنے رکھوں گا جو حضرت مولانا نے اردو میں لکھی ہیں یا خود ان کا اردو ترجمہ کیا ہے۔اس لئے اقبال کے موضوع کو چھوڑ رہا ہوں مگر کتاب کے مقدمینسے جو پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے اور ظاہر ہے اردو میں لکھا ہے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں؛

''مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ جس گھرانے کے چشم وچراغ ہیں وہ صدیوں سے اب تک غیر منقطع طور پر مذہب واخلاق رشد وہدایت تصنیف وتالیف اور زبان وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ان حسنات کی جلوہ گری ان کی شخصیت ہی میں نہیں،علمی ادبی اور دینی خدمات میں بھی ملتی ہیں۔عربی زبان وادب نیز تحریر وتقریر میں موصوف کو جو غیر معمولی درک ہے اور عالم اسلام میں جو وزن اور وقعت حاصل ہے وہ ہندوستان کے شاید کسی عالم دین کے حصہ میں آئی ہو،اس بناء پر سید صاحبؒ کو ملت کا سفیر کبیر بننے کا حق پہنچتا ہے۔

سید صاحب کے ایک متبحر اور روشن خیال عالم دین اور شعر وادب کے مبصر ہونے کی حیثیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔موصوف نے اقبالؔ کی تائید اور ترجمانی جس خوبی سے کی ہے اس سے میرے ایک دیرینہ خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ اقبال کا کلام ہمارے لئے اس صدی کا علم کلام ہے۔

حضرت والا کی تاریخ ادب اردو خاص طور پر اردو شاعری پر بے مثال نگار رکھنے

کا اندازہ مجھے گل رعنا مؤلفہ جناب حکیم عبدالحیؒ صاحب (حضرت کے والد ماجد) پر مضمون لکھنے کے دوران ہوا۔ حضرت کا بے مثال مفسر قرآن اور محدث ہونا، ادبیات عربی کا زبردست واقف کار ہونا تو سب ہی کے علم میں ہے لیکن اس پر حیرت اس لئے نہیں کہ حضرت کی ؎

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

کے مصداق تھے۔ تاریخ اور فلسفہ تاریخ سے ماہرانہ تعلق بھی سمجھ میں آتا ہے۔ اردو اور فارسی کی شاعری سے لطف اندوز ہونا، اور اپنے مضامین ان کا حوالہ دینا بھی اس درجہ کے عالم کے لئے جو انتہائی خوش ذوق بھی ہو کوئی خاص بات نہ تھی، مگر ادبِ اردو کی تاریخ، اردو شاعری کا ارتقاء اس پر ناقدانہ نظر اس کمال کے ساتھ تو ان باکمالوں کے لئے مخصوص تھا، جنھوں نے اپنی طالب علمی سے اس کی ابتداء کی ہو، اور اسی پر انتہا بھی ہو، انتہار سے میری مراد ان کے علم کی پہچان اور قبولیت سے ہے۔

حضرت کو کب وقت ملا کہ وہ تاریخ ادب اردو کا مطالعہ کریں۔ حضرت نے انتہائی کم عمری میں سیرت سید احمد شہید جیسی تاریخی کتاب لکھی، پھر ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین لکھی جو کہ تاریخ مذاہب اور فلسفۂ تاریخ اور مسلمانوں کے عروج وزوال کے منطقی اسباب کے بیان حرفِ آخر ہے۔ اور جس نے لوگوں کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ وہ کتاب جو مولانا کی پہچان بن گئی تھی اور ممالک اسلامیہ میں مولانا کا وزیٹنگ کارڈ کا کام کرنے لگی تھی۔ مقدمہ ابن خلدون نے یورپ کو چونکایا تھا، اور حضرت مولانا کی کتاب نے اسلامی دنیا کے ساتھ ساتھ مغرب کو بھی۔ میں اکثر غور کرتا رہا ہوں کہ حضرت نے زوال مسلمین کے بجائے انحطاطِ مسلمین کیوں لکھا، پھر یہی خیال آیا کہ حضرت مولانا کا حساس دل زوال لفظ کی تاب نہیں لا سکا اور لا تقنطو کا پیغام ہمیشہ ان کے سامنے رہا۔ اس کے بعد تو حضرت کی بے مثال کتابیں آنا شروع ہوئیں۔ تاریخ دعوت وعزیمت کی سیریز، کاروان

زندگی کی سیریز، پرانے چراغ کی سیریز، نبی رحمت، المرتضیٰ اور دوسری کتابیں جو حالات حاضرہ سے متعلق تھیں۔ جیسے مغرب سے صاف صاف باتیں، امریکہ میں صاف صاف باتیں وغیرہ۔ پھر حضرت مولانا کو کب وقت ملا کہ وہ اردو شاعری کی تاریخ اور تنقید کا مطالعہ کریں اور وہ کتابیں جو اس تاریخ سے متعلق تھیں نکات الشعراء، گلشنِ بے خار، وغیرہ پڑھیں۔ حضرت کے پاس کب فرصت تھی۔ اس بات کو لکھنے کی وجہ صرف اپنی حیرت کا اظہار ہے اور میرا یہ فیصلہ کہ گو حضرت مولانا نے استادوں سے پڑھا مگر وہ اصل میں تلمیذ الرحمٰن تھے، اور ؎

''آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں''

کا مصرعہ غالب نے ان ہی کے لئے لکھا ہوگا۔ غالب جیسے بے مثال شاعر کی نگاہ میری میری نگاہ میں وادیوں میں بھٹکنے والی بھی تھی اور جزویست از پیغمبری بھی، جہاں ان کے روز ابر اور شب ماہتاب کے مشغلہ کا خیال آتا ہے وہاں وہ شعر بھی ذہن میں آتا ہے ؎

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتن
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں حضرت مولانا کے مقدمہ گلِ رعنا کی طرف لوٹ کر آتا ہوں۔

مقدمہ کی ابتداء اس نکتہ کی تفصیل سے ہوئی ہے کہ فارسی ادبیات کا اتنا وافر حصہ اور اس کے ایسے دلکش و دل آویز نمونے نصابِ تعلیم میں داخل تھے، جن سے عام طور پر فارسی کا ذوق اور شعر و ادب سے لطف اٹھانے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی۔ اور چونکہ فارسی اور اردو کا گہرا تعلق ہے اس لئے اردو میں اس سے بیش قیمت مدد ملتی تھی۔ ۱۸۵۷ء اور اس کے کچھ عرصہ بعد تک جب ملک میں نیا نظامِ تعلیم رائج اور مقبول نہیں ہوا تھا علمی اور ادبی محفلوں میں اس قدیم نصاب کے ساختہ پرداختہ فضلاء صدر نشین ہوتے اس دور

کے بعد بھی اس طبقہ کے ہاتھوں میں ملک کی ادبی وعلمی قیادت رہی۔ مولوی محمد حسین آزاد خواجہ الطاف حسین حالی ڈپٹی نذیر احمد دہلوی اور علامہ شبلی نعمانی جو زبان وادب کے چار ستون تھے۔ اس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔

شعرائے اردو کے تذکرے فارسی میں تھے اور مولوی محمد حسین آزاد کی آب حیات وہ کتاب ہے جس نے پہلی مرتبہ اردو والوں کو اردو شاعری کی کہانی اردو میں سنائی ان کو خراج عقیدت ان کے سب سے بڑے ناقد مولانا حکیم عبدالحیؒ نے گلِ رعنا میں اور ان کے اس یگانہ کمالی کا جس طرح اعتراف کیا ہے اس پر اضافہ مشکل ہے۔

''سب سے بہتر اور عمدہ تصنیف ان کی آب حیات ہے جو اردو زبان اور ریختہ شعر کی تاریخ میں پہلی کتاب اور اردو انشا پردازی کا بہترین کارنامہ ہے۔ عبارت کی بے ساختگی اور برجستگی، اس میں شاعرانہ تخیل، استعاروں کی دلفریبی کے ساتھ ایسی چیز ہے جس پر غزلوں کے سیکڑوں دیوان قربان کردینے کے قابل ہیں۔''

حضرت مولانا نے گلِ رعنا لکھنے کی ضرورت یہ لکھی ہے کہ کوئی کتاب اپنے فن اور موضوع کی آخری کتاب نہیں قرار دی جاسکتی۔ کسی کے نقش کو نقش دوام اور تحقیق کو حرف آخر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ آب حیات اس سے مستثنا نہیں ہے۔ آزاد کا مزاج ایم ادیب کی طرح تخیل پسند تھا، وہ کمیاں جو مولانا نے آب حیات میں گنائی ہیں ان میں پہلی یہ ہے کہ بہت سے قابل قدر شعراء کو انھوں نے اپنی کتاب میں جگہ نہیں دی اور بہت سے معمولی شعراء ان کی کتاب میں جگہ پائے ہوئے ہیں یہاں حضرت مولانا نے بہت سے نام گنائے ہیں جو اس کی مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ بڑے شعراء میں بھی یہ تفریق روا رکھی۔ مرثیہ گویان اردو کے کام کی دل کھول کر داد دی ہے۔ اور نعت گویوں جیسے محسن کاکوروی کو نظر انداز کیا ہے۔ ان کے فیصلے داخلی (Subjective) تھے۔ دوسری بات یہ کہ آب حیات میں بے حد تاریخی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ نکات الشعراء کے متعلق جو آزاد نے لکھا ہے

اس میں کوئی بات صحیح نہ تھی۔ کئی مثالوں میں سب سے اہم یہ ہے کہ آزاد نے لکھا ہے کہ میر نے دلی دکنی کے متعلق لکھا ہے ''وے شاعریست از شیطان مشہور تر'' واقعہ میں میر نے لکھا ہے ''از کمال شہرت احتیاج نہ دارد'' میر کی بد دماغی کے متعلق جو کچھ لکھا۔ سید انشاء کے آخری زمانہ کا جو حال لکھا وہ سب ان کے دماغ کی تخلیق تھی۔ واقعہ سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ تیسری بات یہ کہ ان کے مذہبی جذبات غیر جانبداری پر بہت اثر ڈالا ہے۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے ساتھ جو بے انصافی انھوں نے کی اور مومن کو انھوں نے جس طرح نظر انداز کیا وہ انتہائی محل نظر ہے۔ اس طرح مصحفی اور انشاء کے تقابل میں بے حد بے انصافی کی۔ مصنف گلِ رعنا نے کیا بہترین بات لکھی ہے سید انشاء کی: نگامہ خیزیاں بزم آرائیاں اور بذلہ سنجیاں ان کے ساتھ گئیں۔ اور ان کے کلام کا بیشتر حصہ بھی اپنے ساتھ لے گئیں، مصحفی کا کلام باقی ہے اور اس کی آب وتاب بڑھتی جارہی ہے۔

غالب کے تذکرے میں انھوں نے ایسے لطیفے لکھے جن سے ان کے اثنا عشری رجحان اور صحابہ کرام پر طنز کا اظہار ہوتا ہے اس کے مقابلے میں استاد ذوق کا مذہب بیان کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔

اسی طرح بہادر شاہ ظفر کے سارے دیوانوں کو استاد ذوق کی جھولی میں ڈال دیا ہے۔ اسی طرح نواب الٰہی بخش معروف کا کلام بھی استاد ذوق کا کارنامہ بتایا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے گلِ رعنا کے متعلق یہ صحیح لکھا ہے:

> ''جو لوگ مولانا مرحوم سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے انھیں ممکن ہے اس کا علم ہو۔ ورنہ عام طور پر لوگ اس سے لاعلم تھے۔ کہ مولانا مرحوم اردو زبان وادب کا ایسا ذوق رکھتے تھے ایسا خیال کچھ بے جا بھی نہ تھا۔ کیونکہ مولوی صاحبان نے عام طور پر اردو زبان کی طرف سے غفلت برتی ہے۔''

معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادبی ذوق مولانا کو اپنے والد ماجد سے ''وراثت'' میں ملا ہے جو اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے اور جن کا حال اور کمال کا نمونہ انھوں نے کتاب کے آخر میں دیا ہے۔

یہ حقیر مضمون نگار اس بات کی تائید کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ ہمارے حضرت مولاناؒ کو یہ ادبی ذوق اپنے والد سے ملا ہے تحقیق اور ریسرچ کا علم پدر تو انھیں ان کی وراثت کا جائز حقدار بناتی ہے۔

اب اس شعر پر اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں ؎

دامانِ نگہ وگلِ حسن تو بسیار
گلچیں بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

بچوں کے ادب میں

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا اسلوب

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ذات گرامی ہندوستان کی اسلامی تاریخ کی جبیں کا نور، اس کے تابناک چہرہ کا ہالہ اور اس کے آسمان کا درخشندہ ستارہ ہے، آپ کی شخصیت ہندوستان کے لئے باعث صد افتخار اور سرمایۂ صد عزو وقار ہے، آپ کی شخصیت کے پہلو اتنے بے شمار اور آپ کے عظیم الشان و متنوع کام اتنے زیادہ ہیں جن کا حیطۂ تحریر میں لانا بے حد دشوار ہے، آپ کو ممتاز عالمی شخصیتوں کے درمیان اپنے وسیع علم و مطالعہ، فکری گہرائی و گیرائی، اصابت رائے، انسان اور کائنات کے بارے میں اپنے عالمگیر نظریہ، اور اسلام کے کامل اور صحیح و متوازن فہم کی وجہ سے صدارت اور قافلہ سالاری کا مقام حاصل ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو حیرت انگریز قبولیت عام اور گہری تاثیر سے نوازا تھا، دین حنیف کے تئیں بے پناہ خلوص اور اسلام کی راہ میں مر مٹنے اور تن، من، دھن اور سب کچھ لٹا دینے کا وافر جذبہ عطا فرمایا تھا۔ آپؒ نے اپنی خداداد ساری صلاحیتیں، دعوت اسلامی کی خدمت، عقیدہ و ایمان کی تقویت، اعلیٰ فکری سلیم کی پختگی اور اسلام کے آفاقی ادبی پیغام، نیز اسے مکمل اطمینان قلب، و شرح صدر کے ساتھ زندگی میں ڈھالنے کی

دعوت دینے میں صرف کیں، ان میں سے ہر میدان میں آپ کی وقیع تالیفات، عظیم الشان کام اور بیش قیمت خدمات ہیں، اس طرح آپ پوری دنیا میں فکر اسلامی اور دعوت اسلامی کے قائد و رہبر تھے، عالمی پیمانہ پر تربیت اسلامی اور ہمہ گیر ثقافت اسلامی کے میر کارواں، ہر جگہ اور ہر مقام میں علم نافع اور ایمان واسع کے داعی اور زبان و قلم دونوں کے ذریعہ جہاد اسلامی کے اس کے افضل و اعلیٰ ترین شکل میں مرد میدان اور غازی تھے۔

آپؒ اسلامی ادب کے قائد و داعی، اور عالمگیر سطح پر اس کے علمبردار تھے، آپؒ ہی کی مخلصانہ رہنمائی میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ جس نے اسلامی ادب کی ''آفاقیت'' کا تصور عام کیا اور عالم اسلام کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کے ہر گوشہ کے تمام ادبی اور علمی حلقوں میں اس کا تعارف کرایا۔ جس کے نتیجہ میں مسلمان ادباء نے اسلامی ادب کی آفاقیت کے اس تصور کو قبول کیا، اور انہیں اپنے ادب، اپنی کاوشوں اور بامقصد تحریروں کے لئے ایک وسیع میدان ملا، اور زندگی کے مختلف میدانوں میں اپنا ادبی پیغام پہنچانے اور زندگی کا تعلق عقیدہ و ایمان کے مرکز سے جوڑنے میں ان کی کوششیں تیز ہو گئیں۔

اس وقت میرا موضوع سخن ہے ''بچوں کے ادب میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا اسلوب''، آپ نے عربی زبان کے اپنے ممتاز و مخصوص اسلوب کے ذریعہ بچوں کے ادب کو مالا مال کیا، اور مسلمان نسل کو قرآن کریم کی روشنی اور مستند اسلامی تاریخ کے آئینہ میں انبیاء کرام کے قصوں اور رسولوں کی حکایات سے صحت بخش غذا بہم پہنچائی۔ آپ نے آسان اور خوبصورت عربی زبان اور پختہ ادبی اسلوب میں انبیاء کرام کے قصوں اور ان کی حکایات کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ جس میں بچوں کی ابتدائی، درمیانی اور اخیر زندگی کے مختلف مراحل میں ان کی ذہنی سطح اور ان کے تقاضوں اور ضروریات کی مکمل رعایت کی، چنانچہ اس سلسلہ کے پہلے جزء میں آپؒ نے ان نوخیز کلیوں کو دعوت دی کہ وہ

ان کے پاس جمع ہوں تا کہ آپؒ کی انھیں ایک پُر لطف اور دلچسپ قصہ سنائیں، گویا آپؒ کہہ رہے ہوں:

"میرے بچو آؤ، میں تمہیں ایک بڑے آدمی کا قصہ سناؤں،
بہت زمانہ پہلے.....

چنانچہ بچے قصہ سننے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے شوق میں آپ کے گرد جمع ہو گئے، اور پھر آپؒ نے مزیدار اور خوبصورت اسلوب میں انھیں قصہ سنانا شروع کیا، جس میں بچوں کے ساتھ آپ کی محبت، ان کے ساتھ شفقت اور انھیں کوئی مفید درس دینے کی خواہش پوری طرح نمایاں ہے، بچے آپ کی طرف پوری طرح متوجہ اور ہمہ تن گوش ہیں، اور پھر آپؒ اپنے دلکش اور جادوئی اسلوب میں قصہ شروع کرتے ہیں:

"بہت دنوں پہلے کی بات ہے، ایک گاؤں میں ایک بہت ہی مشہور آدمی تھا، اس آدمی کا نام آزر تھا، آزر بت فروش تھا، اور اس گاؤں میں ایک گھر تھا، بہت بڑا گھر، اس گھر میں بت تھے، بیشمار بت، لوگ ان بتوں کو سجدہ کرتے تھے، اور آزر بھی ان بتوں کو سجدہ کرتا تھا، اور آزر بتوں کی عبادت کرتا تھا"۔

آپؒ چاہتے ہیں کہ بچوں کو تاریخِ توحید کے مبدأ اور تاریخ کے علمبردار ابوالانبیاء حضرت ابراہیمؑ کی طرف واپس لے جائیں، جنھیں اللہ تعالیٰ نے بت فروش، بت گر، اور بت پرستی کے داعی آزر کے گھر میں پیدا کیا تھا، اور ایک ایسے خاندان میں جو گلے گلے بت پرستی میں غرق تھا، ایسے معاشرہ میں جو بتوں کے علاوہ اور کچھ جانتا ہی نہ تھا، ایک ایسے ماحول میں جو شجر و حجر کے سامنے جھکنے کے علاوہ اور کسی چیز سے واقف نہیں تھا، وہاں ایک معبود و قہار کا سرے سے کوئی تصور ہی نہ تھا، ایسے معاشرہ، ماحول اور شرک و خرابی کی دلدل میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو مبعوث فرمایا تا کہ آپ نئے سرے سے خدا

پرستی کی دعوت دیں، اور انسان کو ان کا عقیدۂ توحید واپس دلائیں، اور یہ آزر کے وہی نیک اور ہدایت یاب فرزند تھے جن کے بارے میں حضرت مولانا فرماتے ہیں:

"اور آزر کا ایک نیک لڑکا تھا، بہت ہی نیک، اس لڑکے کا نام ابراہیم تھا، ابراہیم دیکھتے تھے کہ لوگ بتوں کو سجدہ کرتے ہیں، اور دیکھتے تھے کہ لوگ بتوں کو پوجتے ہیں، اور ابراہیم جانتے تھے کہ بت پتھر ہیں، اور جانتے تھے کہ بت نہ بولتے ہیں اور نہ سنتے ہیں، اور جانتے تھے کہ بت نہ نقصان پہنچاتے ہیں اور نہ نفع پہنچاتے ہیں، اور وہ دیکھتے تھے کہ مکھیاں بتوں پر بیٹھتی ہیں اور وہ انھیں ہنکاتے نہیں، اور دیکھتے تھے کہ چوہا بتوں کا کھانا کھا جاتا ہے اور وہ روکتے نہیں، اور ابراہیم اپنے جی میں کہتے تھے: لوگ بتوں کو سجدہ کیوں کرتے ہیں؟ اور ابراہیم اپنے آپ سے پوچھتے تھے: لوگ بتوں سے کیوں مانگتے ہیں؟"

یہ شوق انگیز اسلوب جسے بچوں کا ذہن ہضم کر لیتا ہے ان کے دلوں میں عقیدۂ توحید کا بیج بوتا ہے، اور ایک خدائے واحد پر جس نے ساری کائنات اور مخلوق پیدا کی، ایمان لانے کا شوق پیدا کرتا ہے، اور خدائے واحد کی عبادت کی جڑیں مضبوط کرنے اور بت پرستی سے دلوں کو متنفر بنانے کے لئے حضرت ابراہیمؑ اپنے باپ آزر سے پوچھتے ہیں کہ:

"جب یہ بت نفع وضرر کے مالک نہیں اور نہ بولنے اور سننے کی قوت رکھتے ہیں تو پھر ان کی اس بت پرستی اور بت گری کا سبب کیا ہے؟"

انھوں نے یہ سارے سوالات اپنے باپ کے سامنے تہذیب وشرافت اور ادب واخلاق کے دائرہ میں رہتے ہوئے اور نہایت مؤدبانہ اسلوب میں رکھے جیسا کہ

ایسے نازک موقع پر کوئی لڑکا اپنے باپ کے ساتھ کرسکتا ہے، لیکن ابراہیمؑ کو باپ کے غصہ اور غضب کا شکار ہونا پڑتا ہے، پھر بھی وہ خاموش رہتے ہیں اور اپنے جی میں یہ ٹھان لیتے ہیں کہ ان بتوں کو توڑ کر رہیں گے، اور انھوں نے یہی کیا، جب لوگوں کو بتوں کے ٹوٹنے کا پتہ چلا تو ان کے پاس گئے اور پوچھا:

> ''ابراہیم! ہمارے معبودوں کے ساتھ کیا تم نے یہ حرکت کی ہے؟ انھوں نے جواب دیا: بلکہ ان کے بڑے نے کی ہے، اگر یہ بولتے ہوں تو انھیں سے پوچھ لو۔''

توحید کی دعوت، اور بت پرستی سے نفرت دلانے والا موضوع عام موضوعات کی طرح نہیں ہے، بلکہ اسے بچوں کے ذہن سے قریب کرنے اور اس بات پر زور دینے کے لئے کہ یہی وہ ٹھوس اور مستحکم بنیاد ہے جس پر زندگی کا عالیشان محل تعمیر ہوتا اور اسلام کی عمارت کھڑی ہوتی ہے، اور کسی انسان کا اسلام اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ اللہ کی وحدانیت پر اس کا ایمان اس کے گوشت اور خون میں پیوست نہ ہوجائے، اس کے لئے ادبی مہارت اور فنی کمال کی ضرورت ہوتی ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بچوں کا ذہن موضوع کا ساتھ اسی وقت دیتا ہے جب قصہ کا اسلوب ایسا ہی آسان اور تکرار والا ہو، ملاحظہ ہو کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بت توڑنے کی پاداش میں ان کی قوم نے آگ میں جلانے کی سزا دی تو حضرت مولاناؒ اس واقعہ کو کس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''لوگ اکٹھا ہوئے اور کہا: ہم کیا کریں؟ ابراہیمؑ نے بت توڑے ہیں اور معبودوں کی توہین کی ہے، اور پھر لوگوں نے پوچھا: ابراہیمؑ کی سزا کیا ہے؟ ابراہیمؑ کا بدلہ کیا ہے؟ جواب تھا: اسے جلادو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو، اور ایسا ہی ہوا، انھوں نے آگ جلائی اور ابراہیمؑ کو اس میں ڈال دیا، لیکن اللہ نے ابراہیمؑ کی مدد فرمائی

اور آگ کو حکم دیا: اے آگ! تو ابراہیمؑ کے حق میں ٹھنڈی اور بے گزند ہو جا، اور پھر ایسا ہی ہوا، آگ ابراہیمؑ کے حق میں ٹھنڈی اور بے گزند ہو گئی، اور لوگوں نے دیکھا کہ ابراہیمؑ کو نقصان نہیں پہنچا رہی ہے، اور لوگوں نے دیکھا کہ ابراہیمؑ خوش ہیں، اور ابراہیم صحیح سالم ہیں، لوگ دہشت زدہ ہو گئے اور حیرت میں پڑ گئے۔"

اور پھر اس مقصد سے ابراہیمؑ کے ذہن میں معبود کے ایک ہونے کا مضمون خوب راسخ ہو جائے اور اور ان کے ذہن میں توحید ہر طرح کے شائبہ اور آمیزش سے پاک ہو جائے اللہ تعالیٰ نے ایک شب انہیں آسمان میں ایک تارہ دکھلایا تا کہ اس موضوع پر ان کا امتحان لے، اور ان کے تصورِ معبود اور ان کی توحیدی عقلیت و ذہنیت کی جانچ کرے، چنانچہ تارہ دیکھ کر ابراہیمؑ بولے کہ یہ میرا رب ہے۔ لیکن جب وہ آسمان کے پردہ سے غائب ہو گیا تو ابراہیمؑ کو اس پر حیرت ہوئی اور پھر اس کی معبودیت کا انکار کرتے ہوئے فرمایا:

"نہیں، یہ میرا رب نہیں ہے، کیونکہ معبود کی شان نہیں کہ وہ غروب ہو یا اس پر زوال آئے۔"

اور اسی طرح انھوں نے چاند دیکھ کر فرمایا:

"یہ میرا رب ہے" لیکن جب وہ بھی ڈوبا تو اس کو بھی رد کر دیا"

اور پھر سورج طلوع ہوا تو فرمایا:

"یہ میرا رب ہے، یہ ان سب سے بڑا ہے" لیکن رات آنے پر جب وہ بھی غروب ہو گیا تو ابراہیمؑ کو یقین ہو گیا کہ یہ بھی رب نہیں ہے۔"

بچوں کے اسلامی ادب کے قافلہ سالار نے اس مضمون کو ایسی پختہ، ایمانی رنگ

کی حامل خوبصورت زبان میں ادا کیا ہے جسے بچے پسند کرتے ہیں اور اس سے معبود کی اولین صفات کا علم حاصل کرتے ہیں، اور یہ معلوم کرتے ہیں کہ معبود کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ وسلامت اور باقی رہے، نہ غائب ہو اور نہ زائل ہو، نہ کمزور ہو نہ سست پڑے، جیسا کہ یہ عقیدہ ابراہیمؑ کے ذہن وفکر میں خوب اچھی طرح بیٹھ گیا تھا اور وہ جان گئے تھے کہ اللہ ہی ان کا رب ہے، کیونکہ اللہ زندہ ہے اسے موت نہیں آئے گی، اور اللہ باقی رہنے والا ہے کبھی غائب نہیں ہوگا، اور اللہ طاقتور ہے کوئی اس پر غالب نہیں آسکتا، اور اللہ تعالیٰ ستاروں، چاند اور سورج کا رب ہے، اور وہی دنیا جہان کا رب ہے۔

حضرت مولاناؒ اسی طرح بچوں سے جو ہمہ تن گوش بنے ہوئے ہیں، توحید کے علمبردار حضرت ابراہیمؑ کی زندگی سے متعلق واقعات بیان کرتے ہیں کہ کس طرح انھوں نے اپنی قوم کو خدائے واحد کی عبادت کی دعوت دی، اور کس طرح عقیدۂ توحید کو ذہنوں سے قریب کیا، اور خدائی کے دعویدار ظالم ومشرک بادشاہ کے ساتھ ان کا واقعہ پیش آیا؟ اور انھوں نے کس طرح ایمان وعقیدہ کی بہادری اور طاقت سے، بغیر کسی سزا اور عتاب کے ڈر کے، اس بادشاہ کا مقابلہ کیا؟ پھر کس طرح اپنے والد کو اللہ کی بندگی کرنے اور بتوں کو چھوڑنے کی دعوت دی، اور اس بات سے ذرا خوف نہیں کیا، کہ اگر ان کے باپ ان کو اپنے گھر اور شہر سے نکال دیں گے تو انجام کیا ہوگا؟ بلکہ انھوں نے خود کو گھر والوں، والد اور وطن وقوم سب کو چھوڑ دینے کے لئے تیار کرلیا، اور وادی غیر ذی زرع مکہ چلے گئے، اللہ تعالیٰ نے ان کو وہاں قیام کرنے کی تاکید فرمائی اور ان کے لئے زمزم کا چشمہ جاری فرمایا اور انھیں کے ہاتھوں خانہ کعبہ کی تعمیر کروائی۔

اسی اسلوب میں بچوں کے سامنے ابراہیمؑ کی ذریت میں اللہ تعالیٰ کے برکت دینے اور انھیں کی آنکھوں کی ٹھنڈک نور نظر لخت جگر اسماعیل نامی بیٹا عطا فرمانے کا قصہ بھی بیان کرتے ہیں جو ان کے لاڈلے اور ان کی زندگی اور امیدوں کا مرکز تھے۔ آپ ان

کی طرف اس طرح دیکھتے جیسے وہ آپ کی آخری اور انتہائی عزیز امیدوں کا مرکز ہوں، ان پر اپنی جان نچھاور کرتے اور ایک لمحہ کے لئے بھی ان کو اپنے سے جدا نہ کرتے، ایسے فرزند دل بند کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ان کا امتحان لیا اور انھیں خواب میں حکم دیا کہ وہ اسماعیل کو ذبح کریں، ابراہیمؑ نے اس خواب کو سچ کر دکھایا اور فرمایا:

> ''بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں تو غور کرو تمہاری کیا رائے ہے؟ انھوں نے عرض کیا: ابا جان! آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے آپ اس کی تعمیل کر گذریئے، انشاء اللہ آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے۔

اس کے ذریعہ حضرت مولاناؒ نے بچوں کے دل میں یہ بات بٹھائی کہ حضرت ابراہیمؑ کوئی معمولی آدمی نہیں تھے۔ عام لوگوں جیسے نہیں تھے۔ بلکہ عام محبین اور اللہ کی راہ میں نفس و مال کی قربانی دینے والے عام لوگوں جیسے بھی نہیں تھے، بلکہ آپؑ اللہ کے بہت ہی اطاعت گذار اور وفا شعار بندہ تھے۔ اس کی مدد پر آپ کو پورا یقین و اعتماد تھا، اور اس کی ذات سے آپ کا گہرا اور والہانہ تعلق تھا، اور آپ عبادت و عاجزی و انکساری اور توحید و محبت خالص میں پوری دنیا کے امام اور ان کے لئے ایک دائمی نمونہ تھے۔

اسی طرح جو بندہ اپنے رب کو پہچان لیتا ہے، اس کی عبادت کرتا ہے اور اس کی محبت میں مرمٹتا ہے تو اس کا رشتہ ذات خداوندی، یکہ و تنہا خدائے وحدہ لاشریک سے استوار ہو جاتا ہے۔ اس کا تعلق اپنے اللہ سے ایک مخلص، سچے اور متواضع بندہ کا تعلق ہوتا ہے، اور بندوں سے اس کا ربط ایک نبی مبعوث جیسا ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت و رہنمائی اور اللہ سے ان کا تعلق قوی کرنے اور ان کی زندگی کی سیدھی ڈگر اور صراط مستقیم پر چلانے کے لئے منتخب کر لیا ہے، جو ان کی سعادت و بخت آوری، عافیت اور امن و سلامتی اور آرام و راحت کے زیر سایہ زندگی گذارنے کا ضامن ہوتا ہے۔

بچوں کے اسلامی ادب کے میر کارواں اور قافلہ سالار نے اپنے بلیغ قلم سے اس مثالی انسان کا نقشہ پیش کیا ہے جس کا مقام بہت اونچا اور اللہ سے اس کا تعلق نہایت قوی اور مستحکم ہوتا ہے، یہ وہ پیارا انسان ہے جو جانتا ہے کہ اسے اپنے رب کے ساتھ کیسے رہنا چاہئے؟ اور لوگوں کے ساتھ اس کے تعلق کی کیا نوعیت ہونی چاہئے؟ اور بحیثیت ایک نبی کے، بحیثیت ایک بندہ کے، بحیثیت ایک باپ اور بیٹے کے اس سے کیا مطلوب ہے؟ حالات خواہ جیسے بھی ہوں وہ زندگی بھر حق کا سودا نہیں کرتا، اور دشواریوں اور رکاوٹوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کے حق سے دستبردار نہیں ہوتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے لئے جان و مال، اہل وعیال اور وطن اور اپنے مستقبل کی قربانی دینا اس کے لئے آسان اور ہیچ ہوتا ہے۔

اس طرح حضرت مولاناؒ نے بچوں کے لئے مرد کامل حضرت ابراہیمؑ کا نقشہ پیش کرتے ہیں جن کی اور جن کے اہل وعیال اور اولاد کی زندگی سے حج کی پوری شریعت اور پورے مناسک حج وابستہ ہیں، آپ کی ذات گرامی وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے لئے منتخب کیا اور اپنی شریعت کے لئے پسند فرمایا، اس طرح آپؑ تمام نوعِ انسانی کے لئے ان کی زندگی اور اللہ کے ساتھ ان کے روحانی اور معنوی تعلق میں ایک نادر مثال تھے۔

حکایتی اسلوب اور بچوں کی زبان میں حضرت ابراہیمؑ کا قصہ پڑھ کر بچوں پر ایسا ایجابی اور مثبت اثر پڑتا ہے جو ان کے دل کی تختی پر آئندہ کے مراحل کے ایسے نقوش مرتسم کرتا ہے جن سے انسان کو زندگی کی تعمیر، سیرت کی تشکیل اور اخلاق کی تکمیل میں گزارنا پڑتا ہے، اور بچہ کے بڑے ہونے پر طاعت و امتثال اور نیکی و خیر خواہی کے جذبات والے یہ اسباق اور مثالیں، اور ایسے صالح انسان کی تشکیل کے یہ ضروری عناصر جس کا تعلق بیک وقت اللہ اور اس کے بندوں دونوں سے ہوتا ہے، اور جو اپنی دنیا و آخرت کی ذمہ داری اسی شعور اور اسی معیار سے ادا کرتا ہے، اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔

ابراہیمؑ کی یہ خصوصیت ان کی ذریت اور اولاد میں بھی منتقل ہوتی ہے جنھیں

اللہ تعالیٰ اپنے دین اور اپنے کلمہ کی سربلندی اور دین دنیا دونوں میں امن وسعادت کا پرچم بلند کرنے کے لئے پسند فرماتا ہے، اور جن کے اندر اللہ تعالیٰ محنت وابتلاء اور جہد ومشقت کی ایسی واضح نشانیاں دکھلاتا ہے جن سے ہر اس شخص کو دوچار ہونا پڑتا ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے دین کے لئے منتخب کرتا ہے۔ حضرت یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام والتسلیم کی مثال ہمارے سامنے ہے جنھیں دشوار گذار گھاٹیوں اور جان لیوا امتحانات وآزمائشوں سے گذرنے کے بعد نبوت ملی، اور ان کی زندگی میں ایسے خارق عادت امور اور ایسے بہت سارے معجزے جمع ہوگئے تھے جو سب کے سب اس بات کی طرف اشارہ کرتے تھے کہ یوسفؑ کی آگے چل کر بڑی شان ہوگی اور انھیں امتیازی حیثیت حاصل ہوگی، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ان کے بھائیوں پر امتیاز بخشا اور انھیں امتحان وآزمائش سے سرخ رو اور کامیاب نکالا، اور ان میں اپنی قدرت کی واضح نشانیاں رکھیں، چنانچہ ان کا قصہ اپنی آخری کتاب میں بیان فرمایا اور ایک پوری سورت کا نام ان کے نام نامی پر رکھا، اور ان کے قصہ کو علی الاطلاق أحسن القصص بتایا۔ یہ قصہ تمام فنی محاسن اور قصصی عناصر سے مملو ہے: نحن نقص عليك أحسن القصص بما أوحينا اليك هذا القرآن وان كنت من قبله لمن الغافلين°

یہ بھی ایک شوق انگیز اور رقت خیز قصہ ہے جو لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالیتا ہے اور جذبات وشعور کو غذا بہم پہنچاتا ہے، اور بچوں کو اپنے پڑھنے کی دعوت دیتا ہے تاکہ وہ اس کے ذریعہ مثبت نتائج تک پہنچ سکیں، اور اپنی زندگی کے لئے ان سے عبرت اور سبق حاصل کریں، بچے ہوں، بھائی ہوں، بیٹے ہوں، چھوٹے اور بڑے، مصیبت کے مارے اور امن وعافیت والے، قائدین وحکام، داعی اور مربی سب کے لئے اس میں سبق موجود ہے، دیکھئے حضرت مولانا کس طرح اس بہترین قصہ کی ابتداء فرماتے ہیں۔

''یوسفؑ ایک چھوٹے بچے تھے، ان کے گیارہ بھائی تھے، اور یوسفؑ ایک خوبصورت بچے تھے، یوسفؑ ایک ذہین بچے تھے، ان کے والد حضرت یعقوبؑ انھیں ان کے تمام بھائیوں سے زیادہ چاہتے تھے، ایک رات یوسفؑ نے ایک عجیب خواب دیکھا، انھوں نے گیارہ ستارے دیکھے، اور سورج اور چاند دیکھا، سب ان کو سجدہ کررہے تھے، ننھے یوسف کو بہت تعجب ہوا، ان کی سمجھ میں یہ خواب نہیں آیا کہ ستارے اور سورج اور چاند کسی آدمی کو کیسے سجدہ کرسکتے ہیں؟ ننھے یوسفؑ اپنے والد یعقوبؑ کے پاس گئے اور ان سے یہ عجیب خواب بیان کیا: عرض کیا: ابا جان! میں نے گیارہ ستارے اور سورج اور چاند کو دیکھا کہ سب مجھے سجدہ کررہے ہیں۔ یعقوبؑ نبی تھے، یعقوبؑ اس خواب سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا: یوسف! اللہ تمھیں برکت دے، تمھاری بڑی اعلیٰ شان ہوگی، یہ خواب علم ونبوت کی بشارت ہے، اور اللہ تعالیٰ تمھارے دادا اسحاقؑ پر یہ انعام کرچکا ہے، اور اللہ تعالیٰ تمھارے پردادا ابراہیمؑ پر بھی یہ انعام کرچکا ہے، اور وہ تم پر بھی یہ انعام کرے گا، اور خاندان یعقوب پر بھی یہ انعام کرے گا، اور یعقوبؑ بوڑھے آدمی تھے، اور لوگوں کی طبائع اور فطرت سے واقف تھے، اور جانتے تھے کہ شیطان کس طرح لوگوں پر غالب آتا ہے؟ اور شیطان کس طرح انسانوں سے کھیلتا ہے؟ چنانچہ انھوں نے فرمایا: میرے بیٹے! تم اپنے بھائیوں میں سے کسی کو یہ خواب مت بتلانا، ورنہ وہ تم سے حسد کرنے لگیں گے اور تمھارے دشمن ہوجائیں گے۔''

حضرت مولاناؒ حضرت یوسفؑ کی زندگی کی ان کے بھائیوں کے حسد کی روشنی میں تشریح کرتے ہیں اور اس کی پوری تفصیل بیان کرتے ہیں۔

اس بڑے حسد نے انھیں یوسفؑ کی زندگی کنویں میں ڈال کر ختم کرنے کی کوشش پر آمادہ کیا، لیکن اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں کے ساتھ مختلف حکمتیں اور الگ الگ معاملات ہیں، چنانچہ وہی یوسفؑ جنھیں کنویں کی گہرائیوں میں ڈال دیا گیا تھا دیکھتے ہی دیکھتے بادشاہ مصر کے دربار میں جا پہنچتے ہیں، اور اس کا اعتماد حاصل کر لیتے ہیں جب کہ پہلے اس کے نزدیک آپ متہم تھے، اور پھر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہوتا ہے کہ آپ مصر کے خزانوں کے محافظ بنیں، اور زمام اقتدار آپ کے ہاتھوں میں آئے، اور پھر تاریخ اپنے کو دہراتی ہے اور برادران یوسف ان کے پاس غلہ اور مدد لینے کے لئے آتے ہیں، اور اپنی ضرورت اور فاقہ کا اظہار ان سے کرتے ہیں، اور تب جا کر ان پر یہ راز فاش ہوتا ہے اور انھیں پتہ چلتا ہے کہ یہ تو وہی یوسف ہیں جن سے وہ حسد کرتے تھے اور جن کو انھوں نے کنویں کی گہرائی میں پھینک دیا تھا، اور پھر اپنی اس حرکت پر نادم ہوئے، اور جان گئے کہ حسد کا انجام ذلت و رسوائی ہے، اور حسد کا نتیجہ حسرت و افسوس، اور اپنی غلطی کے اعتراف اور اس پر ندامت و شرمندگی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، چنانچہ انھوں نے اقرار کیا:

> ”خدا کی قسم اللہ نے تمہیں ہم پر ترجیح دی اور یقیناً ہم ہی خطا کار تھے۔“

اس حسین قصہ میں کئی ایسے پہلو ہیں جو بچوں کے لئے درس اور عبرت کے حامل ہیں، اور ان کے دل میں یہ بات بٹھاتے ہیں کہ انجام کار کامیابی، تقویٰ اور صبر سے ہی ملتی ہے، اور مظلوم کی اللہ کی طرف سے مدد ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں فرماتا ہے، اور یہ سب بچوں کی زبان اور قصہ کے اسٹائل میں بیان کیا گیا ہے، یہ وہ حقیقت ہے جس کو وہی مصنف، قصہ نگار یا ادیب بیان کر سکتا ہے جس کی نظر بچوں کی

ذہنیت، ان کے، مزاج، ذہنی فضا اور عقلی تبدیلیوں پر نہایت گہری اور عمیق ہو، اور جوان عوامل ومحرکات سے واقف ہو جو بچوں کی راہ میں آتے ہیں اور ان کے مستقبل کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں، چنانچہ حضرت مولاؒ "قصص النبیین" جزء اول کے مقدمہ میں مسلمان بچوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میری رائے ہوئی کہ میں تمہارے اور تم جیسے مسلمان بچوں کے لئے نبیوں اور رسولوں کے قصے ایسے آسان اسلوب میں لکھوں جو تمہاری عمر اور ذوق کے مناسب ہو، چنانچہ میں نے لکھا، اور یہ "قصص النبیین للأطفال" کے سلسلہ کی پہلی کتاب ہے جو میں تمہیں ہدیہ کر رہا ہوں، اور اس میں میں نے بچوں کے اسلوب اور ان کے مزاج کی پوری رعایت کی ہے، چنانچہ اس میں کلمات اور جملوں کی تکرار، الفاظ کی سہولت اور قصہ کی تفصیل اور شرح سبھی کچھ ہے۔"

پھر اس دلچسپ کہانی والی کتاب کا دوسرا جزء شائع ہوا، جو حضرت نوح، ہود اور صالح علیہم السلام کے قصوں پر مشتمل ہے، بچوں نے پہلا حصہ پڑھ لیا، اس کے اسلوب کو ہضم کر لیا، کتاب کے معانی سے استفادہ کر لیا، اور اللہ کے برگزیدہ بندوں کی زندگیوں سے واقف ہو گئے، اس طرح پہلا حصہ ختم کرنے کے ساتھ ہی بچوں کا عقلی معیار تھوڑا بلند ہوا، اور وہ اس لائق ہو گئے کہ پہلے سے کچھ بلند اسلوب میں قصہ کو سمجھ سکیں اور نئی معلومات اور نئی تاریخ حاصل کر سکیں، اور یہ جان سکیں کہ شیطان لعین نے کس طرح تدریجاً لوگوں کو بت پرستی اور اللہ کو ناراض کرنے والے اعمال کی طرف لے جاتا ہے، مؤلف رحمۃ اللہ علیہ دوسرے جزء کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں

"اب ہم چھوٹے بچوں اور ان کے بڑے سرپرستوں کو

"قصص النبیّین للأطفال" کے سلسلہ کا دوسرا جزء تحفہ میں پیش کرتے ہیں، جو حضرت نوح، ہود اور صالح علیہم السلام کے قصوں پر مشتمل ہے، اور انھیں قصوں کے ضمن میں بہت سے تفسیری اور تاریخی فوائد اور مخفی سوالوں کے جواب بھی آگئے ہیں، جو دلوں میں پیدا ہوتے ہیں، اور اساتذہ کو چاہئے کہ وہ بچوں سے ان قصوں کو بیان کرنے کا مطالبہ کریں، اور انھیں ان قصوں کو پڑھنے، ان کو مستحضر رکھنے اور انھیں دہرانے کا مکلّف بنائیں، کیونکہ اس میں بہت سے فوائد کا ہم نے خود تجربہ کیا ہے۔"

یہاں ضروری ہے کہ ہم ڈاکٹر شیخ احمد شرباصی کی رائے بھی معلوم کریں جو انھوں نے دوسرے جزء پر اپنے مقدمہ میں لکھا ہے، وہ فرماتے ہیں:

"مجھے ایک بار پھر اس مفید اسلامی سلسلہ کے دوسرے جزء پر مقدمہ لکھنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے بھائی، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو کس عمیق ایمان، مضبوط یقین، سچی دینی غیرت اور لوگوں کو اللہ کی ہدایت اور قرآنی ادب کی طرف واپس لے جانے کی زبردست خواہش سے نوازا ہے۔

اگرچہ انبیاء کے قصوں کا یہ سلسلہ ابتداءً ہندوستانی مسلمان بچوں کے لئے لکھا گیا تھا تاکہ بچپن سے ہی ان کا رشتہ ان کے دین اور ان کے قرآن کی زبان سے قائم ہو جائے، لیکن اسی طرح یہ تمام عرب ممالک میں بھی مسلمان بچوں کے سامنے رکھے جانے کے لائق ہے، تاکہ انھیں ایسی روحانی اور جذباتی غذا فراہم کرے جو ان کے نفوس کو مہذب بنائے، ان کے اخلاق درست کرے، اور انھیں پاکیزہ ترین متاع کا توشہ دے،

اور توشہ حاصل کرو: کیونکہ بہترین توشہ تقویٰ ہے، اور اے عقل والو! مجھ سے ڈرو۔

اسلامی اور عربی ممالک کے ارباب حل وعقد اور اصحاب اقتدار کو چاہئے کہ وہ اس پاک اور خالص کاوش کی قدر کریں اور اس کی حوصلہ افزائی اور اس کی تائید اس طرح کریں کہ اسے اپنے بچوں کے لئے مطالعہ اور تہذیب وثقافت کی کتابوں کے ساتھ رکھیں کیونکہ یہ کتاب مسلمان نوجوانوں کو ایک اسلامی ثقافتی چشمہ پر جمع کرتی ہے، اور ان کے معاشروں اور خواہشات کو ایک دوسرے سے قریب کرتی ہے، اور ان میں اسلامی وحدت کو عملی جامہ پہناتی ہے، وہ وحدت جس کی قرآن نے دعوت دی ہے، اور رحمٰن کے ہاتھوں نے اس میں برکت رکھی ہے: مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اور فرمایا: اللہ کی رسی کو سب مضبوطی سے تھام لو، اور آپس میں پھوٹ مت پیدا کرو، اور اپنے اوپر اللہ کا احسان یاد کرو جب کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اللہ نے تمہارے دلوں میں محبت ڈال دی اور تم اس کے انعام سے بھائی بھائی ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمارے فاضل برادر اور محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو جو خوبیاں اور صلاحیتیں بخشی ہیں، جن پر شرفاء کو رشک اور اشرار کو حسد ہوتا ہے انھیں تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ان کے لیے یہی فخر کافی ہے کہ اللہ نے انھیں ایسی کتابیں لکھنے کی توفیق عطا فرمائی ہے جو اعلیٰ پایہ کی، اور وسیع وعمیق ہیں، اور بڑے قارئین میں مشہور ومتداول ہیں، اور مشرق ومغرب ہر جگہ پہنچی ہوئی ہیں، وہ فکر سلیم سے مزین اور بلند اسلوب اور اعلیٰ معیار کی حامل ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں توفیق مزید اس بات کی بخشی کہ اپنی آسان عبارت اور مؤثر اسلوب بیان میں قرآنی قصوں کے مقاصد کو مسلمان نئی نسل کے ذہنوں سے قریب کریں، اور یہ

فضل خداوندی ہے، اللہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے:۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ"

اس کا تیسرا حصہ فرعون مصر کے ساتھ حضرت موسیٰ کے قصہ پر مشتمل ہے، اور اس تاریخی قصہ میں ایمان باللہ، اس کے وعدہ پر یقین، اور فرعون کے لئے حضرت موسیٰ کے دست حق پرست پر ظاہر ہونے والے.....اور بنو اسرائیل اور قوم فرعون کے ساتھ گزرے ہوئے واقعات، ظلم و جور اور قتل وسفا کی کی شکلیں، اور ان کے برعکس نصر مبین اور مدد الٰہی جو موسیٰ کی زندگی کے ہر لمحہ میں ان کے ساتھ رہی،.....صورتیں، جس کے ذریعہ نہتے لیکن صاحب ایمان موسیٰ زبردست مادی طاقت اور لشکر وسپاہ رکھنے والے اور ہتھیاروں سے لیس فرعون پر غالب آئے، ان سب کی متعدد شاندار مثالیں موجود ہیں۔

یہ قصہ پرسکون، فطری، آسان، دلچسپ اور مؤثر اسلوب میں شروع ہوتا ہے، جس میں مافی الضمیر کی واضح ادائیگی، حسن و جمال اور واقعات وحادثات بیان کرنے میں بچوں کے ذہن کی رعایت سبھی کچھ ہے، اور بلاشبہ یہ اللہ کی طرف سے بچوں کے ذہن کو ایمان ویقین، صبر وتوکل اور قناعت وایثار کا توشہ دینے کے لئے ایک غیبی انتظام ہے، اسی کے ساتھ ساتھ زبان، بیان، تعبیر اور ادب کی تعلیم بھی دی گئی ہے۔

اس حصہ سے متعلق ڈاکٹر احمد شرباصیؒ کے تأثرات بہت تفصیلی تھے، جو کتاب کے ادبی، تاریخی، لغوی اور تعبیری فوائد پر مشتمل تھے، ساتھ میں اس کے مذہبی اور فکری فوائد بھی تھے، مجھے آپ اجازت دیں کہ میں اس حصہ پر ان کی آراء اور تأثرات نقل کروں جو انھوں نے مقدمہ میں بیان کئے ہیں:

"بچوں کو صحیح اور درست تعلیم دینا بڑوں اور جوانوں کو تعلیم دینے سے

زیادہ مشکل اور دقت طلب کام ہے، کیونکہ جس مرحلہ میں بچہ کے اولین سبق کی تعلیم شروع ہوتی ہے وہ مرحلہ اس کی آئندہ پیش آنے والی زندگی میں اس کے ذہن، نشاط اور رجحان پر بہت دوررس اور گہرے اثرات چھوڑتا ہے، اسی لئے ماہرین تعلیم وتربیت کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس مرحلہ پر اپنی پوری توجہ مرکوز کریں، تاکہ اس مرحلہ میں ان کی سرگرمیاں بہتر ہوں، اس سے بھی بڑھ کر کچھ ایسے اسباب وعوامل ہیں جو ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم بچوں کی تعلیم اور انھیں عقلی اور روحانی غذا پہنچانے میں پوری طرح باخبر اور ہوشیار ہوں، ان اسباب وعوامل میں سے بعض یہ ہیں:

(۱)　بچہ اپنے نگرانوں اور سرپرستوں کے بارے میں سچائی، وسیع علم، وسیع معلومات اور وسیع تجربہ کا عقیدہ رکھتا ہے، چنانچہ بغیر کسی لیت ولعل اور بحث وحجت کے ان کی باتیں قبول کرلیتا اور ان کی باتوں کو نقل کرتا ہے۔

(۱)　اس عمر میں بچہ جو پہلا سبق پڑھتا ہے وہ اس کے ذہن میں راسخ ہوجاتا ہے، اور اس کی ذات میں پیوست ہوجاتا ہے، اسی لئے مشہور مقولہ ہے: ''بچپن کا پڑھا ہوا پتھر کی لکیر ہوتا ہے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بچہ کو جو کچھ سکھائیں گے وہ باقی رہے گا اور دیرپا ہوگا، اگر وہ خیر ہوا تو اس کا فائدہ باقی رہے گا اور اس کی منفعت دائمی ہوگی، اور اگر شر ہوا تو اس کی برائی باقی رہے اور اس کی نحوست دائمی ہوگی، اس مرحلہ میں بچہ کا سینہ خالی صندوق کی طرح ہوتا ہے بالکل ریسیور جیسا جس کا باہر سے بھیجے جانے والے پیغام سے گہرا

تعلق ہوتا ہے، جب باہر سے کچھ آتا ہے تو اس میں اچھی طرح پیوست ہو جاتا ہے اور پوری طرح اس میں مستحکم ہو جاتا ہے۔

اور جب صورتحال یہ ہے تو ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم مسلم بچوں کے سامنے اس کی عقلی اور قلبی جو غذا پیش کریں اس میں انتہائی باریک بینی سے کام لیں، اور خاص طور پر اس لئے بھی کہ بچہ معلومات حاصل کرنے اور نئی نئی چیزوں سے واقفیت حاصل کرنے کا انتہائی شوقین اور حریص ہوتا ہے، تو اگر اس مرحلہ میں اس کے سامنے حق و باطل مخلوط ہو کر آئیں گے تو اس کی خواہش اور شوق کے لئے سوچنے اور غور و فکر کرنے اور انتخاب و امتیاز کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑیں گے۔

یہ بھی ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس جرم کی اہمیت اور اس کی وسعت کا اندازہ لگائیں جو وہ لوگ کرتے ہیں جو ان بچوں کے لئے ان کی عقلی غذا نقصان دہ مواد سے بھر کر پیش کرتے ہیں، اور ان شر انگیز قصوں اور کہانیوں اور خرافاتی داستانوں سے ان کے دلوں اور فکروں کو بوجھل بنا دیتے ہیں جو انھیں فکری استقامت اور ذہنی اعتدال سے نکال کر فکری بے راہ روی اور ذوقی سرکشی کی طرف لے جاتے ہیں، شائد بعض لوگ یہ تاویل کریں کہ یہ افسانے اور ناولیں خیال کو جلا بخشتے اور فطرت کو مہمیز لگاتے ہیں، لیکن یہ جو نقصان بچہ کو پہنچاتے ہیں وہ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اس کا اس ادنیٰ سے ادنیٰ کوئی موازنہ ہی نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اس بات کے بہتر اور افضل ہونے میں کوئی شک نہیں کہ ہم

بچہ کے سامنے ایسی عقلی اور ذہنی غذا پیش کریں جو دو خوبیوں یعنی سچائی اور جمال کی جامع ہو، تاکہ اس کی سچائی کا عنصر ثقافت ومعرفت کا ایک عامل بنے، اور اس کے حسن وجمال والا عنصر ذہنی ترقی اور وجدان وشعور کی بلندی کا دروازہ ثابت ہو، اور اس کے لئے قرآن مجید پوری مدد اور عظیم توشہ موجود ہے۔

یہ بالکل سچ ہے کہ قرآنی قصے راہنمائی کرتے ہیں، اور یقینی خبر بہم پہنچاتے ہیں، اس کے ساتھ قرآن میں شاندار، شیریں اور شوق کو مہمیز لگانے والے قصے کے عناصر مکمل طور پر پائے جاتے ہیں، ہمارے لئے قرآنی قصوں کی صداقت، باریک بینی، پند وموعظت اور احکام وبلاغت ہی کافی ہے، اور کیا اللہ تعالیٰ کے قول کے بعد بھی کوئی قول معتبر ہوسکتا ہے؟

چند آیات ملاحظہ ہوں جن میں اللہ تعالیٰ قرآنی قصوں کی اہمیت اور ان کی خصوصیت بیان فرماتے ہیں:

"نحن نقص عليك أحسن القصص، نحن نقص عليك نبأهم بالحق، نقص عليهم بعلم وما كنا غائبين، ان الحكم الا لله، يقص الحق وهو خير الفاصلين، تلك القرى نقص عليك من أنبائها، وكلا نقص عليك من أنباء الرسل مانثبت به فؤادك، كذلك نقص عليك منها قائم وحصيد، ان هذا القرآن يقص على بنى اسرائيل أكثر الذى هم فيه مختلفون، فاقصص القصص لعلهم يتفكرون، ان هذا لهو القصص الحق، لقد كان فى

قصصهم عبرة لأولى الألباب، ما كان حديثاً يفترى ، ولكن تصديق الذى بين يديه ، وتفصيل كل شئى ، وهدى ورحمة لقوم يؤمنون۔

ہمارے برادر محترم فاضل داعی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس حقیقت کا اچھی طرح ادراک رکھتے ہیں، اور ہندوستانی اور غیر ہندوستانی مسلمان بچوں کے لئے ''قصص النبیین'' کا یہ سلسلہ جاری فرماتے ہیں، اور اس طرح اپنے دین کی خدمت کرتے ہیں، کیونکہ وہ ان قصوں کے ذریعہ اپنے بہت سے اصول ومبادی اور تعلیمات پیش کرتے ہیں جن کا تذکرہ قصہ کے ضمن میں مناسب اور موزوں ہوتا ہے، یا جن کی روشنی قصہ کے پس منظر سے پیدا ہوتی ہے، اور اس طرح وہ مسلمان بچوں کی خدمت کرتے ہیں، کیونکہ ان کے سامنے بہترین قصہ، سچی تاریخ، خوبصورت گفتگو اور شاندار واقعات پیش کرتے ہیں، اور معلومات حاصل کرنے کے شوقین بچہ کے دل کی خواہشات پوری کرتے ہیں، اور اس کے ذریعہ اپنے ادبی مقام کی خدمت کرتے ہیں اگرچہ اس کا قصد نہیں کرتے، چنانچہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے جس طرح بڑوں کے لئے "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين" اور "الى الاسلام من جديد" وغیرہ جیسی کتابیں اچھے اور عمدہ اسلوب میں لکھی ہیں اسی طرح انھوں نے سہل اور آسان ودلکش اسلوب میں بچوں کے لئے ''قصص النبیین''، لکھی ہے، اور بچوں کے لئے اچھا لکھنے کے ساتھ ساتھ بڑوں کے لئے بھی اچھا لکھنے کی قدرت ایسا

بلند مقام ہے جہاں تک کمتر مؤلفین اور مصنفین ہی پہنچ سکتے ہیں۔

مثلاً مولانا حضرت موسیٰ اور فرعون کے قصہ میں بہت سی باتیں اور واقعات وحوادث بیان کرتے ہیں، جو سب کے سب بڑے دلچسپ اور مؤثر ہیں، اور سبھی مفید اور نافع ہیں، اور سبھی سچے اور حق ہیں، اپنی آسان اور صاف زبان میں سرکش فرعون کے پیدا کئے ہوئے سخت فتنہ کے دوران حضرت موسیٰؑ کی پیدائش میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں بیان کرتے ہیں، اور اس بلیغ درس کو بیان کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی بے پناہ اور غیر محدود قدرت کے بہت سے پہلو سامنے لاتا ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کی والدہ کو حکم دیا کہ وہ اپنے بچے کو سمندر میں ڈال دیں اور ان پر ذرا بھی خوف نہ کریں اور نہ غمگین ہوں، کیونکہ وہ انھیں کو لوٹا دے گا، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ انھیں رسول بنائے گا، اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو جو فرعون کے سامنے رکھا حالانکہ وہ ان کا دشمن نمبر ایک تھا، لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ ان سب میں اللہ کی بلیغ تدبیر اور اس کی عنایت ومہربانی کا بیان کرتے ہیں، اور بتاتے ہیں کہ کس طرح خدائے قادر مطلق موسیٰ کو ان کی ماں کے پاس لوٹا دیتے ہیں جن کا غم موسیٰؑ کے سوی ہر غم سے خالی تھا، اور قریب تھا وہ اس راز کو فاش کر دیتیں، اگر اللہ نے ان کا دل مضبوط نہ کر دیا ہوتا تا کہ وہ مؤمنین میں سے ہوں۔

اسی طرح موسیٰ کی قوت وطاقت کے بارے میں بھی بتلاتے ہیں کہ کس طرح وہ کنوئیں کا بھاری پتھر تنہا ہٹا دیتے ہیں، اور وہ کس

قدر عفیف تھے کہ حضرت شعیبؑ کی لڑکی کے پیچھے چلنا اس ڈر سے پسند نہیں فرمایا کہ کہیں ہوا سے اس کے کپڑے اڑیں اور اس کا بدن موسیٰ پر نمایاں ہو: ان میں سے ایک نے کہا: اباجان! آپ انھیں مزدور رکھ لیجئے، کیونکہ مزدوروں میں سب سے بہتر طاقتور اور امانت دار مزدور ہوتا ہے۔

اور بیان کرتے ہیں کہ کس طرح موسیٰ اور ہارون علیہما السلام فرعون کے پاس گئے، اور کس طرح فرعون نے دنیا میں تکبر و سرکشی اور ظلم و جور کا بازار گرم کر رکھا تھا، اور کس طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کی مدد فرمائی اور فرعون کو مغلوب و مقہور کیا، اور پھر اس جیسے سب سے بڑے سرکش اور ظالم انسان کو سیال پانی کے ذریعہ ہلاک کر دیا، اور جب آپ کا رب کسی متکبر اور ظالم و سرکش انسان کو پکڑنے پر آتا ہے تو اس کی پکڑ ایسی ہی سخت ہوتی ہے، اس کے علاوہ اور بھی دوسرے بہت سے پہلو بیان کرتے ہیں جو سب کے سب پند و موعظت اور نصیحت و عبرت پر مشتمل ہیں۔"

چوتھا حصہ حضرت شعیب، حضرت داؤد، حضرت ایوب، حضرت یونس اور حضرت زکریا علیہم السلام کے قصے سے شروع ہو کر حضرت عیسیٰؑ کے قصہ پر ختم ہوتا ہے۔ اور یہ سارے قصے خوبصورت، سہل اور دلکش و دلچسپ اسلوب میں بیان ہوئے ہیں، اگرچہ اس حصہ کا معیار سابقہ حصوں سے تھوڑا اونچا ہے، لیکن بچے کتاب کے مضامین سمجھنے اور لغت، تعبیر اور ادب و بیان سے استفادہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں محسوس کرتے، اسی چوتھے حصہ نے بچوں کے لئے خاتم الانبیاء اور سب سے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تک پہنچنے اور آپ کی پاک اور عطر بیز سیرت آسان و سہل اور دلچسپ اسلوب

میں پڑھنے کا راستہ ہموار کیا، اس عظیم الشان کام کی اہمیت اور قصہ کی کتابوں میں جنھیں بچوں کے لئے لکھنے والوں نے اپنے ادیبانہ قلم سے لکھا ہے، اس کی نافعیت اور بچوں کی دینی اور ایمانی غذا بہم پہنچانے میں اس کے مفید ہونے کی گواہی مشہور اسلامی محقق اور عظیم داعی جناب سید قطب شہید نے تیسرے جزء پر اپنے مقدمہ میں دی ہے، کیونکہ یہ کتابیں نبیوں کے قصے اور اسلامی تاریخی حکایات کے میدان میں اعلیٰ مقام کی حامل ہیں، اور ایسی ادبی اور تربیتی خصوصیات میں ممتاز ہیں جو آپ کے علاوہ اور کسی کے یہاں اتنی عمومیت اور ہمہ گیری کے ساتھ نہیں پائی جاتیں، سید قطب شہید لکھتے ہیں:

> ''قصص النبیین للأطفال حجم میں چھوٹا ہونے کے باوجود ایک عظیم الشان کام ہے، جو دعوت اسلامی کے میدان میں سید ابوالحسن علی ندوی اور ان کے فاضل دوستوں کے کام میں اضافہ کرتا ہے، کیونکہ اسلام کا اپنی اصلی اور صاف صورت میں صرف بڑوں تک ہی پہنچنا ضروری نہیں بلکہ بچوں کے قلوب اس غذا کے زیادہ محتاج ہیں، تاکہ جب وہ بڑے ہوں تو ایمان کا مزہ ان کے اندر ہو، اور اس کا نور ان کے قلوب میں ہو، اور اس کی بشاشت ان کی روح میں ہو اور قصے ہی وہ اولین بنیاد ہیں جن کے لئے یہ معصوم اور ننھے قلوب کھلتے ہیں۔

یہ چھوٹی سی کتاب اگرچہ چھوٹوں کے لئے لکھی گئی ہے لیکن میرا عقیدہ ہے کہ بہت سے بڑوں کو بھی اس کے پڑھنے کی ضرورت ہے، کیونکہ بہت سے لوگوں کو ان کی تعلیم نے جس پر استعمار کا غلبہ اور مشینری کا قبضہ ہے، اس بات کا موقع نہیں دیا کہ وہ قرآنی قصوں، ان کے عمیق مقاصد اور مؤثر تہذیبی اور ایمانی فضا کے بارے میں کچھ جانیں، جیسا کہ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔

میں نے کثرت سے وہ کتابیں پڑھی ہیں جو بچوں کے لئے لکھی گئیں اور جن میں انبیاء کرام کی حکایات وقصص بھی شامل ہیں خود ایک سلسلہ کتب کی ترتیب میں میں نے شرکت کی جو ''القصص الدینی للأطفال'' کے نام سے مصر میں مرتب ہوا اور جس کے لئے مواد قرآن مجید سے اخذ کیا گیا تھا لیکن میں تکلف اور خوشامد کے بغیر اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ ''قصص النبیّن للاطفال'' کے مصنف کا کام (جس کا ایک نمونہ حضرت موسیٰ کے قصہ میں نظر آتا ہے) ہمارے وضع کئے ہوئے سلسلہ سے زیادہ کامیاب اور مکمل ہے اس لئے کہ اس میں ایسی لطیف رہنمائیاں، قصے کے مقاصد پر روشنی ڈالنے والی تشریحات اور بین السطور میں ایسے اشارات آگئے ہیں جو بیش قیمت ایمانی حقائق کی نقاب کشائی کرتے ہیں''

اب ہم'' قصص النبیین للأطفال'' کے پانچویں حصہ پر گفتگو کرتے ہیں جو خاص سید الأنبیاء امام المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ہے، اور اسی پر اس زریں سلسلہ کا خاتمہ ہوتا ہے، بچے اس کو پڑھنے کے بعد انبیاء اور رسولوں کی تاریخ کے بارے میں خاصی معلومات حاصل کر لیتے ہیں، اور ان کے سامنے غلط راستوں کے درمیان سے صراط مستقیم ظاہر ہوتا ہے، ان کی ذہنیت پختہ اور معلومات وسیع ہو جاتی ہیں، اور ان کے پاس عربی کلمات کا ایک قیمتی ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے جو ان کے آفاق کو وسیع کرتا اور عربی زبان اور ادبی اسلوب میں اپنے افکار وخیالات بیان کرنے کے لئے ان کی فطرت کو جلا بخشتا ہے، اسی لئے اس پانچویں حصہ کا لغوی اور ادبی معیار ابتدائی حصوں سے اونچا ہے، اور ادیب کی یہی شان ہوتی ہے جو بچوں کی فطرت اور مراہقین کی ذہنیت سے واقف ہو، چنانچہ اس کا اولین پیمانہ کسی حال میں اس سے جدا نہیں ہوتا جس سے وہ بچوں

کی ذہنی سطح کا اندازہ لگاتا ہے، اور نہ اس کے بے شمار تجربات اس کا ساتھ چھوڑتے ہیں جن سے وہ بچوں کی تعلیم وتربیت کے دوران گذرتا ہے۔

اسی بنیاد پر یہ پانچواں حصہ اس سلسلہ کا خاتم اور طفولت کے مرحلہ سے گذر کر مراہقت اور جوانی کے مرحلہ کی طرف منتقل ہونے والے بچوں کو انبیاء اور رسولوں کی تاریخ سے متعلق بیش قیمت معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں عقلی، ادبی، لغوی اور تاریخی غذا فراہم کرنے والا ثابت ہوا، اور پھر یہ نتیجہ کے طور پر ان کے اخلاقی ڈھانچہ کو محبت اور ایمان کے عناصر سے مضبوط کرتا ہے، اور انھیں اپنے لئے اور اپنی امت کے لئے روشن مستقبل کی تعمیر پر آمادہ کرتا ہے، یہ وہ اثرات ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ اپنے پڑھنے والوں اور استفادہ کرنے والوں کے دلوں پر چھوڑتا ہے، خود مؤلف اس حصہ کی ادبی، تاریخی اور تربیتی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کتاب کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

> ”میں نے اس کتاب کی تالیف میں سیرت ابن ہشام کی تلخیص پر اعتماد کیا ہے۔ جو اس وقت موجود سیرت کی مطبوعہ اور متداول کتابوں میں قدیم ترین اور دلوں پر سب سے زیادہ اثر ڈالنے والی کتاب ہے۔ ساتھ میں بعض قدیم مراجع اور صحاح ستہ سے بھی مدد لی گئی ہے، اور مؤلف نے قاری کے لئے صفحہ نمبر اور اڈیشن کی تعیین کے ساتھ ان مراجع کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھی، کیونکہ یہ کتاب نوخیز بچوں کے لئے لکھی گئی ہے نہ کہ تحقیقی کام کرنے والوں اور ریسرچ اسکالروں کے لئے۔ نیز اس میں صرف نصوص اور روایات پر اکتفا کیا گیا ہے۔ علمی تحقیقات، فلسفیانہ موشگافیوں اور اجنبی شہادتوں سے احتراز کیا گیا ہے، کیونکہ اس

سے قاری کے لئے سیرت کی روح اپنے اندر اتارنے اور اس کے جمال سے لطف اندوز ہونے میں خلل پڑے گا، اور اس لئے بھی کہ یہ مباحث سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر بڑی کتاب کا موضوع ہیں، جو وسیع ثقافت والوں اور عقلی و علمی صلاحیت میں فائق لوگوں کے لئے لکھی گئی ہے، جنھیں عصری کلامی سوالات اور تقابلی مطالعہ سے سابقہ پڑ رہا ہے۔

اور میں نے اس کتاب میں بچوں کے اسلوب اور ان کے مزاج کی رعایت، کلمات اور جملوں کی تکرار، آسان الفاظ کا انتخاب اور قصہ کو پھیلا کر بیان کرنے کی پابندی نہیں کی ہے، جس کی پابندی ''قصص النبیین للاطفال'' کے اولین حصوں میں کی ہے کیونکہ اب یہ ننھے منے قاری جوان ہو چکے ہیں اور اپنی لغوی ثقافتی اور عقلی مدراج میں ترقی کر چکے ہیں، اس طرح اس علمی اور عقلی غذا کو ہضم کرنے اور سب سے معزز نبی اور دنیا کے سب سے بڑے انسان کی زندگی سے متعلق اس شاندار قصہ سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت ان کے اندر پیدا ہو چکی ہے۔

اس طرح یہ کتاب اللہ کی توفیق اور تائید سے بڑوں اور چھوٹوں کے لئے لکھی گئی سیرت کی کتابوں کے درمیان بیچ کی کڑی ثابت ہوئی، اب یہ اس لائق ہے کہ اسے مراہقت کی عمر کے چھوٹے بچے بھی اپنے مدرسوں میں اور متوسط صلاحیت کے بڑے حضرات بھی اپنی لائبریریوں اور گھروں میں پڑھ سکتے ہیں، اور اسے غیر مسلم حضرات کی خدمت میں بھی پیش کیا جا سکتا ہے، دوسری

زبانوں میں بھی اسے منتقل کیا جاسکتا ہے، اس میں سیرت کا خلاصہ اور اس کا نچوڑ آگیا ہے، اسی طرح سیرت کے شاندار واقعات وحوادثات، اولین اسلامی دعوت کی تاریخ، اس کی فتوحات اور کامیابیاں، نبوی تربیت کے عجیب وعمدہ نمونے اور معجزے سب اس میں آگئے ہیں، اب یہ کتاب ایک مکمل مدرسہ ہے جس میں طالب علم ایمان وحنان کی فضا میں جیتا اور پروان چڑھتا اور عطر بیز اور سدابہار پھولوں کی خوشبو سے مشام جان کو معطر کرتا ہے، اور اس سے وہ توشہ اور زادراہ حاصل کرتا ہے جو زندگی بھر اس کے ساتھ رہتا ہے اور جس کی روشنی میں چلتا ہے اور وہ ہتھیار حاصل کرتا ہے جس سے اپنا اور اپنے ایمان کا دفاع کرتا ہے، اور وہ پیغام لیتا ہے جسے لے کے دنیا اور اقوام دنیا کے پاس جاتا ہے۔"

اسلامی ادب کے قافلہ سالار کی کاوشیں بچوں کے اس مفید سلسلہ پر ہی آکر ختم نہیں ہوگئیں بلکہ آپ نے اس کے بعد بچوں کی تربیتی ادب اور ایمانی واخلاقی فتوحات وحوصلہ مندی پر ان کی نشونما کرنے میں اور زیادہ اہتمام اور توجہ کا اظہار کیا، اور اگلے مرحلہ کے لئے ان بچوں کے واسطے جواب مراہقت کی عمر میں داخل ہو چکے تھے، دوسرا سلسلہ شروع فرمایا، اور انھیں دوسری مرغن ادبی غذا کی ضرورت بھی تھی، تاکہ ان کے لئے ترقی کرنا اور ادب اسلامی کے مواد اور اس کے پختہ وخوبصورت اسلوب سے اپنے ادبی ذوق کو تسکین دینا ممکن ہو، کیونکہ ایسا اسلوب ان ادبی کاوشوں میں نہیں ملتا تھا جو بعض اسلامی عرب ممالک میں بچوں کی تربیت کے واسطے کی گئی تھیں، اس لئے انھوں نے ان تمام تربیتی اور توجیہی پہلوؤں کا احاطہ نہیں کیا تھا جن کی ایک نوخیز بچہ کو اپنی عائلی، مدرسی، تمدنی اور معاشرتی زندگی میں ضرورت پڑتی ہے، اور جو جاننا چاہتا ہے کہ مذہب نے اس کی

زندگی کے تمام امور میں کیا رہنمائی کی ہے؟

یہ خاص طور سے بچوں کے ادب میں ایک خلا تھا کیونکہ بچہ کی ادبی اور لغوی تربیت میں دین کا حصہ بہت کم تھا، حالانکہ عربی زبان ہی دین کی زبان ہے، لیکن وہ دینی تعلیمات سے الگ تھلگ تھی، اور دنیاوی معاملات اور تمدنی معلومات میں سمٹ کر رہ گئی تھی، اس بدنما عیب اور معیوب نقص کو اس سلسلہ کے مؤلف نے محسوس کیا، چنانچہ انھوں نے اسلامی مدراس میں عربی زبان کی تعلیم کے لئے "القرأة الراشده" کا سلسلہ شروع کیا، اور اس کتاب کے تین حصوں میں اس سلسلہ کو مکمل کیا، اور ہر حصہ اپنے لغوی اور ادبی معیار میں بچوں کی ادبی ترقی اور ان کی مذہبی ثقافت میں وسعت کو دیکھتے ہوئے پہلے سے فائق ہے۔

کتاب کے پہلے حصہ کے مقدمہ میں اس سلسلہ کی تالیف کے اسباب اور اس میں جن نقاط کا لحاظ رکھا گیا ہے، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے مؤلف کتاب فرماتے ہیں:

"اس زمانہ کا اہم ترین فرض یہ تھا کہ علماء اور دینی تعلیم کے ماہرین ایک ایسے حکیمانہ اور صحیح نصاب تعلیم وضع کرنے پر توجہ دیں جو اپنی سہولت و آسانی، وقت کی بچت اور بچوں کے ذہن کی رعایت کرنے میں غیر دینی نصاب ہائے تعلیم سے ممتاز ہو، اور دینی واخلاقی تربیت اور تہذیب نفس میں بھی ان سے ممتاز ہو، نیز طالب علم کو عالمی، تاریخی اور عام معلومات سے متعلق تمام ضروری معلومات فراہم کرتا ہو، اور جو تعلیم کے جدید ترین اصول ومبادی اور انتخاب پر مبنی ہو۔

یہ اہم علمی اور دینی کام جس کی اہمیت مسلمانوں کی زندگی اور دینی تعلیم کے مستقبل میں مسلم ہے۔ اس کا مستحق تھا کہ اس کے لئے علماء، بڑے اساتذہ اور بڑے اداروں کے ذمہ داروں کی کمیٹیاں بنائی جاتیں، اور وہ اس سلسلہ میں اپنے اوقات اور اپنی کوششوں کا بڑا حصہ صرف کرتے، اور اپنی بہت سی تعلیمی اور سیاسی مشغولیات پر اس کو

مقدم رکھتے، کیونکہ یہ اہم اور پیچیدہ کام افراد کے بس کا نہیں ہے، اس کے لئے تو بڑی طاقتور جماعت چاہئے، لیکن افسوس کہ علماء نے اس سنجیدہ کام پر توجہ نہیں دی جو طویل صبر، شدید محنت، وسیع انتخاب اور قوی مدد کا متقاضی ہے، پھر اس میں خطرات زیادہ، نتیجہ کی رفتار بہت سست اور شہرت بہت کم ہے۔

اس کام کی اہمیت اور اس کی عظمت، اور مذہبی تعلیم کے نظام کو محیط خطرات جو مسلمانوں کی دینی زندگی کے لئے خطرہ بنے ہوئے ہیں، اور پھر باصلاحیت لوگوں کی دوسرے کاموں میں مشغولیت جو ان کے نزدیک اس سے بھی زیادہ اہم ہیں، ان سب نے مل کر ان کتابوں کے مؤلف کو آمادہ کیا کہ وہ اس جہاد کے راستہ کا ایک جانباز سپاہی بنے، اور دینی تعلیم کی مشینری کا ایک چھوٹا سا پرزہ ثابت ہو، اور وہ اس محبوب زبان اور جن اساتذہ نے اس زبان کی محبت اس کے اندر پیدا کی اور اس کے لئے اس زبان کو آسان بنایا، ان کے کچھ حقوق ادا کرے، اور اپنی صحت کی کمزوری، افکار وخیالات کے ہجوم، مشغولیات اور اسفار کی کثرت کے باوجود اس عظیم کام کا کوئی جزء اللہ کی توفیق واعانت سے پورا کر سکے۔''

اس سلسلہ میں مؤلف نے سب سے پہلے مختارات کا مجموعہ تیار کیا، جو اسلامی عربی ادب کے نمونے اپنے تمام مظاہر اور پہلے اسلامی دور سے لے کر چودھویں صدی ہجری تک مختلف ادبی، تاریخی، اور تہذیبی شکلوں میں پیش کرتا ہے، اس میں عربی ادب کے مختلف رنگ وآہنگ بھی ہیں، آسمانی وحی اور نبوی بلاغت کے شاہکار بھی ہیں، عربی کے سب سے ترقی یافتہ دور کے مشاہیر عرب خطباء کے خطبات کے نمونے بھی ہیں، روایات قصص اور رسائل بھی ہیں، کتابیں، مناقشے، محاورات، اسفار اور عام گھریلو باتیں بھی ہیں، متانت سنجیدگی، حکمت ودانائی بھی، اور مزاحیہ ادب کے نمونے اور تفریحی چیزیں بھی ہیں، اس مجموعہ کو بعض علمی حلقوں اور اداروں نے - تاخیر سے سہی - لیکن قبول کیا اور اپنے یہاں

کے نصاب تعلیم میں داخل کیا۔

پھر مؤلف نے دیکھا کہ یہ سب قرأت کے سلسلہ کی تمام ضروریات پوری نہیں کرتے جو لغوی اور ادبی مواد پر مشتمل ہیں، اور ہندوستانی مسلمان بچوں کے ذوق سے خصوصاً اور اسلامی ممالک کے بچوں کے ذوق سے عموماً ہم آہنگ تدریجی اسلوب میں متنوع ہیں، چنانچہ مؤلف نے انھیں کئی اجزاء میں تقسیم کردیا، اور اس بات کی کوشش کی کہ:

(۱) زبان دینی اور ادبی ہو، اور اس پر کتاب وسنت کے ادبی جمال کی چھاپ ہو۔

(۲) عصری موضوعات کے لئے جدید کلمات کا استعمال ہو جن کی اصل عربی اور صحیح اشتقاق موجود ہو، اس سلسلہ میں مؤلف نے اکثر وبیشتر فوائد اول اکیڈمی برائے عربی زبان کی تجاویز اور قراردادوں پر اعتماد کیا ہے، تاکہ طالب علم عجمی یا دخیل کلمات استعمال کرنے پر مجبور نہ ہو، یا عصری تقریبات کے مواقع پر اس کی زبان گنگ نہ ہو۔

(۳) عربی مفردات کی تکرار تاکہ طالب علم کو ان کی مشق ہو جائے۔

(۴) موضوعات اور مواد کا تنوع تاکہ طالب علم کی دلچسپی برقرار رہے اور علمی فائدے سے دلچسپ اور مزیدار گفتگو کی طرف، اور علمی درس سے تاریخی حکایت کی طرف اور نثر سے شاعری یا ترانہ کی طرف منتقل ہوتا رہے۔

(۵) حدیث شریف میں وارد حکایات کو بامقصد قصوں کے اسلوب میں آسان زبان میں تعلیم دیں۔

(۶) تہذیبی، اخلاقی اسباق جو زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلامی اخلاق کی تعلیم دیں۔

(۷) اسباق میں مأثور ادعیہ اور دینی آداب کی ایسی آمیزش کہ طالب علم یہ نہ محسوس کرے کہ یہ چیز اوپر سے لادی جارہی ہے، بلکہ وہ ان دعاؤں کو سبق اور قصوں کے ضمن میں ہی ازخود یاد کرلے۔

(۸) پوری کتاب میں جاری وساری دینی روح کہ اس کو کتاب سے الگ کرنا ناممکن نہ ہو، اور یہ روح اسباق اور کائناتی طبعی، حیوانی، نباتاتی اور جدید اختراعات سے متعلق سبھی اسباق میں عام ہو۔

مزید براں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اولین اسلامی تاریخ کی روشنی میں بہت سے دینی قصے بھی لکھے ہیں، چنانچہ آپؒ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں ایسے قصے لکھے ہیں جن کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے قوی تعلق والی ان کی ایمانی زندگی، اللہ کے وعدہ، اس کی مدد ونصرت اور عظیم وبے پناہ قدرت پر مکمل اعتماد سے ہے، اور یہ سب شیریں وآسان زبان اور خوبصورت قصصی اسلوب میں ہے، جو بچوں کو ایمان اور محبت کے گہرے سبق سکھاتا ہے، اور دین کامل سے انھیں قریب کرتا ہے، ان کے اندر زبان اور تعبیر کی مشق ومہارت پیدا کرتا ہے، اور ان سب کے بہت سے ادبی، دینی، ایمانی اور تربیتی فوائد ہیں جو جاننے والے پر مخفی نہیں ہیں۔

یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر احمد شرباصیؒ کے اعتراف کا ایک چھوٹا سا اقتباس نقل کروں جس میں انھوں نے اس اسلوب کی پیروی اور تقلید کرنے اور ادب وقلم کا خراج ادا کرنے کی دعوت دی ہے:

''اس سلسلہ پر جو بات صادق آتی ہے وہ یہ کہ یہ ایسے نوادرات ہیں جو مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ مسلمان بچوں کو تحفتاً پیش کررہے ہیں، وہ ان میں عقلوں کی غذا اور دلوں کی روشنی پاتے ہیں اور بڑوں پر اس سلسلہ کا یہ حق ہے کہ وہ بھی انھیں پڑھیں، اور خاص طور سے وہ لوگ جن کو قرآنی قصوں سے کوئی واسطہ نہیں پڑا ہے، یہ قصے انھیں تاریخی واقعات اور انبیاء کرام کے حالات سے متعلق روشن، صاف واضح اور مؤثر نمونے عطا کریں گے، اور اس سلسلہ کا حق یہ ہے کہ یہاں وہاں تمام اسلامی ممالک کے ماہرین تعلیم وتربیت اس میں غور وفکر کریں، اس میں انھیں ایسی چیزیں ملیں گی جنھیں وہ ان بچوں

کے سامنے پیش کر سکتے ہیں جو اپنی بنیادی تعلیم میں ایسے قصصی ادبی توشہ پر اعتماد کرتے ہیں جس میں عموماً اسلامی رنگ نہیں ملتا، اور فکری اور بیانی ماہرین پر اس سلسلہ کا مزید حق یہ ہے کہ ان کے اندر اقتداء اور تقلید کی روح بیدار ہو، اور وہ بھی مسلمان بچوں کے لئے مختلف رنگ کے شوق انگیز، سچے ایمانی قصے لکھیں، حضرت مولاناؒ نے ان کے لئے راستہ کھول دیا ہے، انھیں اس کا اور اس پر عمل کرنے والوں کا اجر ملے گا، اور ہر عمل کرنے والے کو اس کا حصہ الگ پورا پورا اجر وثواب ملے گا، اس میں ذرا بھی کمی نہیں ہوگی۔ اِن اللہ لا یضیع أجر من أحسن عملاً۔

میرے خیال میں اب وہ وقت آ گیا ہے کہ دعوت وفکر اسلامی اور ادب وبیان کی فوجیں اسلام کا وہ ٹیکس ادا کریں جو ان کی گردن اور صلاحیتوں پر قرض ہے، اور فرزندان ملت اسلامیہ کے لئے مختلف رنگ کے دلکش دینی اور صحیح ادب تخلیق کریں، اور مؤمن قصے، مؤمن ادب اور مؤمن فن کے ذریعہ بچوں اور جوانوں کے سینوں میں مؤمنانہ ثقافت کے چشمے جاری کریں، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انھیں یہ ٹیکس ادا کرنے کی بغیر اس کے کہ ان کے اور جمال فنی کی مختلف شکلوں کے درمیان کوئی چیز حائل ہو، قدرت حاصل ہے، کیونکہ جن چیزوں سے برے لطف اندوز ہوتے ہیں ان سے اچھے لوگ بھی متمتع ہو سکتے ہیں، مزید براں اللہ کی رضا بھی حاصل ہو سکتی ہے۔

گوئے توفیق وسعادت درمیاں افگندہ اند
کس بہ میداں در نمی آید سواراں راچہ شد

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی ندوی

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی سیرت نگاری ادب اطفال کے تناظر میں

تمہید: مختصرات سیرت

سیرت نگاری کی ایک روایت قدیم زمانہ سے یہ چلی آرہی ہے کہ وہ قارئین کی مختلف ذہنی اور علمی سطح کے مطابق معرضِ وجود میں لائی جائے۔ کم استعداد افراد وطبقات کے لئے ''مختصرات سیرت'' لکھے جاتے تھے۔ اختصار کی بھی دو سطحیں ملتی ہیں۔ ایک یہ کہ انتہائی مختصر ہوتے تھے اور پانچ دس یا زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس اوراق میں سیرت نبویؐ کے اہم ترین واقعات سمو دیئے جاتے تھے۔ دوسرے اوسط حجم کی کتب سیرت ہوتی تھیں۔ جن میں معلومات کچھ زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کی جاتی تھیں۔ یہ دونوں کم استعداد افراد وطبقات بالخصوص طلبہ کے لئے تیار کئے جاتے تھے۔

جدید عہد میں بچوں کی تعلیم وتربیت کے لئے تقریباً ہر زبان میں سیرت نبویؐ پر مشتمل کتابیں لکھی گئیں۔ اردو اور عربی میں ان کی تعداد غالباً دوسری زبانوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کے مختلف اسباب وعوامل اور محرکات ہیں۔ لیکن ان میں مشترکہ جذبہ

خیر پایا جاتا ہے کہ نونہالان قوم کو ان کے سب سے بڑے محسن و مربی صلی اللہ علیہ وسلم کے کارناموں سے متعارف و روشناس کرایا جائے۔ اسلامی طریقہ تعلیم کی یہ ایک ضرورت بھی ہے اور ملتِ بیضاء کے بچوں کی ایک حاجت بھی۔

قصص النبیین کے آفاقی تناظر

ہمارے معاصر زمانے میں مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ (۱۹۱۴ء-۱۹۹۹ء) نے اس ملی ضرورت اور تعلیمی تقاضے کا ادراک اپنے علمی اور تصنیفی سفر کے بالکل آغاز میں ہی کرلیا تھا۔ انھوں نے اس سیرت نگاری کو ایک وسیع عالمی آفاقی جہت عطا فرمائی اور رسالت کے نقطۂ آغاز سے اس کا سلسلہ شروع کیا۔ انبیائے کرام کی سیرت نگاری ''قصص النبیین'' کے مبارک سلسلہ کے حوالہ سے کی اور اختتام خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر کیا۔ اگرچہ انبیائے سابقین صلوات اللہ علیہم کے قصص اور پیغمبر آخر الزماں علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی سیرتِ طیبہ کی نگارش میں کافی بعد زمانی پایا جاتا ہے جیسا کہ مؤلف رحمہ اللہ نے اپنی ''سیرت خاتم النبیین'' کے دیباچہ میں اعتراف و اظہار کیا ہے۔

(مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء، ۴-۳)

سیرت النبی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے متعلق مولانا علی میاںؒ کی چھوٹی بڑی چار پانچ تالیفات ہیں۔ ان میں سے صرف عربی تالیف ''سیرۃ خاتم النبیین'' ادب الاطفال کے زمرے میں آتی ہے۔ اور وہ بھی بقول مؤلفِ علام ان نونہالان ملت کیلئے جو عنفوان شباب کی دہلیز پر دستک دے رہے ہیں اور بچپن کی حدود سے دور عقل و شعور سے ہمکنار ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا معیارِ زبان و ادب، عیارِ علم و دانش اور سطح فہم و ادراک ''قصص النبیین'' کی اولین جلدوں سے کہیں زیادہ بلند و بالا و برتر ہے۔ (دیباچہ ۵-۴)

مولانائے موصوف و مغفور کی دو مزید مختصر کتبِ سیرت ''نبی خاتم'' اور ''سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم'' اصلاً ''اطفال'' یا نونہالوں کے لئے نہیں لکھی گئیں۔ اول

الذکر" قادیانیت" کے پس منظر میں حضرت محمد بن عبداللہ ہاشمی صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے مسئلے وعقیدے سے عالمانہ بحث کرنے والی کتاب بلکہ تقریری خطبہ ہے۔ ("نبی خاتم ودین کامل"، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ ۱۹۸۷ء، پیش لفظ مولانا محمد رابع حسنی ندوی ۴-۳ نیز تقریر کا متن) جبکہ ثانی الذکر"..... تبلیغی مراکز کے ہفتہ واری اجتماع میں پڑھنے کے لئے سیرت طیبہ...ایک مستقل کتاب کی شکل میں ترتیب دی تھی.."

(سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، سید احمد شہید اکیڈمی، رائے بریلی ۱۹۹۸ء، مقدمہ مولانا محمد رابع حسنی ندوی، ۱۴)

لہٰذا اس مختصر تجزیاتی مطالعہ میں ہماری بحث ومباحثہ، تحلیل وتنقیح اور تنقید وتبصرہ کا سارا دارومدار مؤلف گرامی قدر کی سیرت "سیرت خاتم النبیین" (عربی) تک محدود رہے گا کہ وہی حضرت موصوف کی سیرت برائے اطفال ہے۔

"سیرۃ خاتم النبیّین:" مقصدِ تالیف

حضرت مؤلف نے بالکل بجا طور پر فرمایا ہے کہ یہ کتاب سیرت نوجوان لڑکوں کے لئے لکھی گئی نہ کہ محققین وعلماء کرام کے لئے۔ (قد ألف للصغار الناهضين لا للباحثين والمحققين...) لہٰذا وہ صرف "روایات ونصوص" پر مشتمل ہے اور اسی بنا پر اس میں علمی بحثیں اور فلسفیانہ توجیہات اور غیر ملکی شہادات شامل نہیں کی گئیں۔ کیونکہ وہ سب قاری کو روحِ سیرت اور اس کے جمال سے لطف اندوزی سے محروم کر دیتی ہے۔ (۵-۴) ان کا یہ اعتراف بھی بڑا قیمتی ہے کہ سیرتِ خاتم النبیّین صرف ابن ہشام کی سیرتِ نبویؐ کی تلخیص ہے کہ وہی اس کا مصدر کلی اور ماخذِ جوہری ہے۔ (۴) اگرچہ اس میں "بعض قدیم مراجع اور کتب صحاح" سے بھی اضافے کئے گئے ہیں تاہم ان کے حوالے دینے کی ضرورت بوجوہ محسوس نہیں کی گئی۔ (وقد اعتمدت في تاليف هذا الكتاب على تلخيص السيرة النبوية لابن هشام.... مستنداً في ذلك الى بعض المراجع القديمة وكتب الصحاح، ولم ير المؤلف ضرورة احاطة

القاری الی هذه المراجع بقید الصفحات و الطبعات...٤)

موضوعات سیرۃ کا جائزہ

نونہالوں اور نوخیز جوانوں کی ذہنی اور علمی سطح کے مطابق مؤلف علام نے سیرتِ نبوی کا بیانیہ استوار کیا ہے اور صرف واقعاتِ سیرت کو ان کی زمانی اور تاریخی ترتیب کے مطابق پیش کیا ہے۔ ابواب وفصول کی تعین سے اگرچہ احتراز کیا گیا ہے۔ تاہم سیرت اور متعلقات سیرت کے تمام مباحث کو مختلف جامع عناوین اور حاوی سرخیوں کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔: مثلاً عہد جاہلی کے عنوان بزرگ کے تحت حضرت عیسیٰ بن مریم کے بعد ے فترہ اور اس کی جاہلیت کو اجاگر کیا ہے۔ پھر قدیم مذاہب (الدیانات القدیمة) میں مسیحیت، یہودیت، مجوسیت، البوذیت، برہمیت اور عرب وثنیت کا بیان ہے۔ جزیرہ عرب کے عنوان کے حوالے سے عربوں کی اخلاقی خرابیوں کا ذکر ہے اور ''بر و بحر میں فساد کے ظہور'' کی سرخی کے تحت پوری انسانیت کے اخلاقی زوال کا ذکر ہے۔ آخری عنوان کے تحت کہ ''جزیرۃ العرب ہی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کیوں ہوئی؟'' حضرتِ مؤلف نے ان عرب خصائص کو بیان کیا ہے جو دعوت حق قبول کرنے میں معاون ہوئے تھے۔ (۱۴-۷)

''قبل البعثة'' کی طویل تر بحث میں حضرت مولانا نے جن اہم نکات سیرت ومتعلقاتِ سیرت سے تعرض کیا ہے ان میں مکہ وقریش کے عنوان کے تحت حضرت ابراہیمؑ کی مکہ مکرمہ میں فرزند گرامی حضرت اسماعیلؑ اور زوجہ مطہرہ حضرت ہاجرہؓ کے ساتھ بود و باش، تعمیر کعبہ، عطیۂ زمزم، قربانیٔ اسماعیل، اولادِ اسماعیل کی کثرت، قریش کی منزلت وغیرہ کا ذکر ہے۔ پھر مختلف عناوین کے تحت مکہ وقریش میں بت پرستی کے ظہور، واقعہ فیل، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین ماجدین، ولادتِ نبویؐ، رضاعتِ نبویؐ، وفات آمنہ وعبد المطلب، تربیتِ الٰہی، کفالتِ ابوطالب، حضرت

خدیجہ سے شادی اور اولادِ نبویؐ، تعمیر کعبہ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن کردار اور حلف الفضول کا ذکر ہے۔ آخر میں آپ کی ''امیت'' کی بحث ہے۔ (۴۰-۱۵)

اس سے طویل تر بحث ''بعد البعثة'' کے مرکزی عنوان کے تحت کی گئی ہے جس کے ذیلی عناوین وموضوعات حسب ذیل ہیں:-

صبح نبوت کے تباشیر، غار حراء میں تحنث اور بعثت کا آغاز، حضرت خدیجہ کے گھر میں، حضرت ورقہ بن نوفل کی جناب میں، حضرت خدیجہ کا قبول اسلام، حضرت علی بن ابی طالب وزید بن حارثہ کا قبول اسلام، حضرت ابوبکر بن ابی قحافہ کا اسلام اور اسلامی دعوت وتبلیغ، اشرافِ قریش کا مشرف بہ اسلام ہونا، کوہ صفا پر اعلانِ دعوت، قوم کی مخالفتِ اسلام اور ابوطالب کی مدافعت، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ابوطالب سے مکالمہ، مسلمانوں کی قریش کے ہاتھوں تعذیب، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم وستم، حضرت ابوبکر سے قریش کا سلوک، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام دھرنے میں قریشی تحیر، ایذاءِ نبوی میں قریشی شقاوت، اسلام حمزہ بن عبدالمطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عتبہ کے درمیان گفتگو، مسلمانوں کی ہجرتِ حبشہ، قریشی تعاقب، دربارِ نجاشی میں تقریرِ جعفر بن ابی طالب، وفد قریش کی ناکامی، اسلامِ عمر بن خطاب، قریشی مقاطعہ اور شعب ابی طالب میں مسلمانوں کی محصوری، مقاطعہ کا خاتمہ، ابوطالب وخدیجہ کی وفات، قلوبِ سلیمہ میں قرآن کریم کی اثر انگیزی، سفرِ طائف اور ایذاء، اسراء ومعراج اور نمازوں کی فرضیت، قبائل پر عرض اور اسلامِ انصار کا آغاز، بیعتِ عقبہ اولیٰ، مدینہ میں اسلام کی اشاعت، بیعت عقبۂ ثانیہ، ہجرتِ مدینہ کی اجازت، قریش کی آخری مشاورت اور اس کی ناکامی، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ، غار ثور کا قیام، حضرت ابوبکر کو نبوی تسلی، تعاقب سراقہ اور اس کا واقعہ، امّ معبد کا واقعہ (۴۱-۱۱۸)

مدنی دورِ حیات مبارکہ کے واقعات کو مختلف عناوین اور سرخیوں کے تحت بیان

کیا ہے۔ آغاز ''فی المدینہ'' کی بزرگ تر سرخی سے ہوتا ہے جو متعدد عناوین پر مشتمل ہے۔ جیسے مدینہ میں استقبال نبویؐ، مسجد قباء کی تعمیر اور اولین نمازِ جمعہ کا قیام، حضرت ابوایوب انصاری کی مہمان داری، مسجد و مکاناتِ نبویؐ کی تعمیر، مہاجرین و انصار کی مواخاۃ و معاہدہ، یہود مدینہ سے معاہدہ، آغاز اذان، مدینہ میں منافقین کا ظہور، تحویلِ قبلہ، مدنی مسلمانوں کے خلاف مکائد، جہاد کا اذنِ الٰہی، سرایا اور غزوہ ابواء، صیام رمضان کی فرضیت (۳۳-۱۱۹)

غزواتِ نبوی کا باب اگرچہ نہیں باندھا ہے تاہم اس کے بعد ان کا بیان غزوہ بہ غزوہ کیا ہے اور تفصیل سے کیا ہے۔ ہر ایک غزوہ کے تحت بیانیہ متعدد ذیلی عناوین میں تقسیم کیا گیا ہے۔ غزوۂ بدر (۵۲-۱۳۴)، غزوۂ احد (۷۶-۱۵۳) واقعہ رَجیع ''جان سے زیادہ عزیز جان'' کے تحت آیا ہے۔ جب کہ بئر معونہ اپنے عنوان سے ہے۔ (۸۰-۱۷۶) بنو النضیر کی جلاوطنی اسی ذیلی سرخی کے تحت آئی ہے۔ (۸۲-۱۸۰) جبکہ بنوقینقاع کی جلاوطنی کو بلاعنوان معرکہ بدر کے بعد بیان کیا گیا ہے۔ (۱۵۲) اور اسی طرح غزوۂ ذات الرقاع تسلسلِ عنوان کے تحت ہے۔ (۸۳-۱۸۲) غزوۂ خندق (احزاب) (۲۰۱-۱۸۴)، غزوۂ بنی قریظہ (۷-۲۰۲) اپنے اپنے عناوین کے تحت بیان ہوا ہے۔ اور واقعہ حضرت ثمامہ بن اثال حنفی موخرالذکر کے بعد ایک ذیلی عنوان سے۔ (۱۰-۲۰۷) صلحِ حدیبیہ (۲۶-۲۱۱) میں غزوہ کے واقعات کا خاتمہ بعض قریشی اکابر کے اسلام اور عام اشاعت دین پر ہوتا ہے، ملوک دارا، دعوت اسلام (۳۲-۲۲۷)، غزوۂ خیبر (۴۹-۲۳۳) مع متعلقات و عمرۃ القضاء، غزوۂ موتہ (۵۶-۲۴۹)، فتح مکہ (۸۱-۲۵۷) مع سرایا، غزوہ حنین (۸۷-۲۸۲)، غزوۂ طائف (۹۸-۲۸۸) جس کے بعد تقسیم غنائم، حنین کا واقعہ بھی ہے۔ اور وفد طائف کی آمد کا بھی۔ غزوہ تبوک (۳۰۸-۲۹۹) کا بزرگ تر عنوان کے تحت اول حجِ اسلامی کا بھی ذکر ہے۔ عام الوفود (۱۲-۳۰۹) مع فرضیتِ زکوٰۃ و صدقات، حجۃ الوداع (۲۴-۳۱۳) کے بعد ''الوفاۃ'' کی عظیم سرخی کے تحت تمام متعلقہ واقعات کا ذکر ہے اور ازواج و اولاد کا مختصر حوالہ بھی۔

آخری عنوانِ حیات ''اخلاق وشمائل'' ہے جو مختصر ہے۔(۵۰-۳۲۴اور ۵۵-۳۵۱) اسی پر کتاب'' سیرۃ خاتم النبیّین '' تمام ہوتی ہے۔

تحلیل وتجزیہ

تصنیف وتالیف کا اولین مرحلہ مصادر وماٰخذ سے روایات کی جمع وتدوین کا آتا ہے۔''سیرۃ خاتم النبیّین'' میں مؤلف گرامی اس مرحلہ عشق وکوہکنی سے بہت آسانی سے گذرے ہیں کہ ان کی اپنی تصریح کے مطابق کتابِ مستطاب ابن ہشام کی سیرت نبویؐ سے ماخوذ اور اسی پر مبنی ہے البتہ جہاں تہاں اس میں دوسری قدیم کتب اور حدیث کے ماٰخذ سے پشتہ لگادیا ہے۔نوخیز نوجوانوں اور بچوں کے لئے لکھی جانے والی کتابِ سیرت میں ظاہر ہے کہ متعدد مصادر وماٰخذ سے اخذ وقبولِ روایات کی ضرورت نہیں پڑتی جیسا کہ مؤلفِ علام نے وضاحت بھی کی ہے۔اور بجا طور سے کتب ومراجع کے حوالوں کی بھی ضرورت نہیں پائی جاتی۔

آیاتِ قرآنی سے استناد

حضرتِ مؤلف نے اگرچہ اس امر واقعی اور حسنِ مصدر کی طرف اشارہ نہیں کیا تاہم بیانیہ سیرت میں ان کا ایک عظیم کارنامہ قرآن مجید کی آیاتِ کریمہ سے استفادہ کا ہے۔ صرف ''قصص النبیّین'' ہی کا یہ وصف امتیازی نہیں بلکہ حضرت مولانا کی تمام تحریروں اور تقریروں کا ناگزیر اور حسین ترین طرۂ امتیاز رہا ہے کہ وہ موقعہ ومحل کے اعتبار سے اور بیانیہ کے سیاق وسباق میں موزوں ترین آیاتِ قرآنی کو سجاتے چلے جاتے ہیں۔ان کا انتخاب واستعمال بیان کو مستند بناتا تو ہے ہی، قاری کو قرآن مجید سے کچی عمر اور اٹھتی جوانی میں ایسا روشناس کرتا ہے کہ وہ اس کے دل ودماغ کے نہاں خانوں میں خون کی طرح رچ بس جاتا ہے۔وہ صرف ان آیات کریمہ کے معانی ومفاہیم سے ہی آگاہ نہیں ہوتا بلکہ حیاتِ

طیبہ میں ان کی رنگ سازی اور عام حیاتِ انسانی میں ان کی کارفرمائی وکارگزاری سے شعوری یا غیر شعوری طور پر واقف ہوتا جاتا ہے۔

مثالوں سے بات طویل ہوتی ہے لیکن یہ ایک ایسا نکتۂ حق آگاہ ہے جس سے بالعموم سیرت نگار اور ادب الاطفال کے مؤلفین بالخصوص پہلو تہی کرتے ہیں۔ اس لئے چند اشارے کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، پھر یہ ایک حسین ترین وصفِ کتابی بھی تو ہے۔ عہد جاہلیت یا عالمِ فترت میں مولانا گرامی نے عالمِ انسانیت کی اخلاقی، دینی اور دنیاوی زبوں حالی کا نقشہ کھینچتے ہوئے" ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت أیدی الناس ، لیذیقهم بعض الذی عملوا لعلهم یرجعون" (الروم-۴۱) کا معنی خیز ربطِ قرآنی پیدا کیا ہے۔

براہیمی تعمیر کعبہ کے بیان کا حسن خاتمہ آل عمران پر خوب کیا ہے:

ان أول بیت وضع للناس للذی ببکة مبارکاً"..

اور دعوت ودعاء براہیمی کو سورۂ بقرہ کی تین آیات ۲۹-۱۲۶ سے سجایا ہے :

و اذیرفع ابراهیم القواعد من البیت و اسماعیل ، ربنا تقبل منا..... ربنا وابعث فیهم رسولا منهم .... انك انت العزیز الحکیم (۱۴،ص۱۷)

واقعہ ابرہہ الاشرم کے تعلق سے پوری سورہ فیل نقل ہے۔ (ص۲۶-۲۵)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم" امی محض ہونے کی حکمتِ الٰہی کو سورہ عنکبوت ۱۸ اور سورۂ اعراف ۱۵۷ سے مستند کیا ہے۔:

وماکنت تتلو من قبله من کتاب ، ولا تخطه بیمینك اذا لارتاب المبطلون .. الذین یتبعون الرسول النبي الامی الذی یجدونه مکتوباً عندهم فی التوراة والانجیل (۴۰)

ایسے مقاماتِ کتاب اور مراحلِ سیرت بہت ہیں جہاں برجستہ آیاتِ قرآنی نگینہ کی طرح جڑ دی گئی ہیں۔ان کی تفصیل ایک الگ مقالہ کا تقاضا کرتی ہے۔سرِ دست ان کی ایک مختصر فہرست مع حوالوں کے درج ذیل ہے۔

اولین تنزیلِ قرآنی سے متعلق پانچ اولین آیاتِ سورۂ اقراء (۴۴)۔ علانیہ دعوت وتبلیغ کے بیان میں سورہ حجر (۹۴)،سورہ شعراء (۱۵-۲۱۴)،اور سورہ حجر (۸۹-۵۲) کوہِ فا پر اولین خطبہ نبوی میں سورۂ سبا (۴۶) انذار سے متعلق (۵۴) تکذیب قریش کے بعد عزلت نشینیٔ نبوی کے لئے سورہ مدثر کی اولین دو آیاتِ کریمہ (۶۴)، اسراء ومعراجِ نبوی کے بیان میں سورہ نجم ۱۸-۱۷، ہجرتِ نبوی برائے مدینہ منورہ کے تعلق سے سورہ یٰسین کی ابتدائی نو آیات میں سے آخری (۱۱۰)، غارِ ثور میں کبوتروں کے معجزات کے ضمن میں سورۂ فتح ۴ یا ۷ (۱۱۳) اور حضرت ابوبکر کے غم ویاس کے دفعیہ کے لئے سورہ توبہ ۴۰ (۱۱۴)، تحویلِ قبلہ کے بارے میں سورۂ بقرہ ۴۳ (۳۰-۱۲۹)، مدنی مسلمانوں کے خلاف اشتعالِ قریش کے حوالہ سے سورۂ نساء ۷۷ (۱۳۱)، اور جہاد کے اذن الٰہی کے لئے سورہ حج ۳۹ (۱۳۱) فرضیتِ صیام رمضان کے لئے سورہ بقرہ ۱۸۵-۱۸۳ (۳۲-۱۳۲)، غزوہ بدر کے بیان میں سورہ مائدہ ۲۴ (۱۳۸)، سورہ انفال ۱۱، (۲-۱۴۱) قریشی ومسلم مبارزت کے لئے سورہ حج ۱۹ بطور سرخی (۱۴۴)، نصرتِ الٰہی سورہ آل عمران ۱۲۳ (۱۴۹)، غزوۂ احد کے باب میں سورۂ آل عمران ۱۵۲ (۱۶۳)، غزوۂ خندق / احزاب کے بیان میں سورۂ احزاب ۱۱ (۱۸۴) اور اس آیت کے اولین حصہ کا بطور سرخی استعمال (۱۹۰)، نیز سورہ فتح کی سرخی (۱۹۶)، منافقین کی حیلہ جوئی کے لئے سورۂ احزاب ۱۳ (۱۹۶) فتحِ ربانی ونصرت الٰہی کے لئے سورۂ احزاب ۹ اور ۲۵ (۲۰۱-۲۰۰) نیز (۲۰۴)، غزوۂ حدیبیہ میں بیعتِ رضوان کے لئے سورۂ فتح ۱۸ (۲۱۵) اور فتح مبین کے لئے اولین تین آیات سورہ فتح (۲۲۲)، اور اس کی حکمت کے بیان میں سورۂ بقرہ ۲۱۶ بطور سرخی (۲۲۳) نیز پیوستہ بیان (۲۵-۲۲۴) یا غزوۂ خیبر بطور

انعام الٰہی سورہ فتح ۱۹-۱۸ (۲۳۳)، عمرۃ القضاء کے حوالے سے سورہ فتح ۲۷ (۲۴۶-۴۷)، فتح مکہ میں قریش کے لئے عام عفو نبوی پر سورۂ یوسف ۹۲ (۲۶۳-۶۴)، اصنام کعبہ کی بربادی کے لئے سورہ اسرء ۸۱ اور سورۂ سبا ۴۹ (۲۷۲) خطبہ نبوی میں تلاوت حجرات ۱۳ (۲۷۵)، فتح مکہ کے اثرات کے اظہار کے لئے سورہ نصر کی اولین دو آیات (۲۸۱)، غزوۂ حنین کے اولین وحلہ ہزیمت اور آخری فتح کے لئے سورۂ توبہ ۲۶-۲۵ (۲۸۷)، غزوہ تبوک میں رویۂ منافقین کے لئے سورۂ توبہ ۸۱ (۳۰۱)، حضرت کعب اور ان کے دو رفیقوں کی توبہ کی قبولیت کے لئے سورہ توبہ ۱۸-۱۱۷ (۳۰۶، اولین حجِ اسلام کے لئے سورہ براءۃ کے نزول (۳۰۸)، حجۃ الوداع کے موقعہ پر تکمیل دین کے بیان میں سورہ مائدہ ۳ (۳۱۹)، اور اسی آیت کریمہ کا حوالہ وذکر بطور تمہید وفات نبوی (۳۴۲)، نیز سورہ نصر کے حوالہ وذکر (۳۲۵)، مرض الوفاۃ میں مسلمانوں کے لئے دعاءِ نبوی سے متعلق سورۂ قصص ۸۳ اور سورۂ زمر ۶۰ (۹-۳۲۸)، وصف الٰہی کے لئے سورہ توبہ ۱۲۸ (۳۴۰)۔

بعض مقامات ومراحل سے متعلق آیاتِ کریمہ تو نقل نہیں کیں لیکن ان کا حوالہ ضرور دیا ہے جیسے عتبہ بن ربیعہ سے مکالمہ نبوی کے ضمن میں سورہ ''فصلت'' کی آیات کا (۷۲)، دربار نجاشی میں حضرت جعفر بن ابی طالب کی تقریر میں اولین آیات سورہ مریم کا (۷۹) یا حضرت عمر کے قبول اسلام کے تعلق سے سورہ طٰہٰ کے آغاز کا (۸۵)، تلاش وجستجو سے ایسے مقامات کی تعداد بڑھ جائے گی۔ البتہ بعض ایسے مضامین ومحلات بھی ہیں جہاں مؤلف گرامی نے آیاتِ قرآنی نقل نہیں کی ہیں یا ان کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ حالانکہ وہ سامنے کی چیز تھی جیسے ابولہب کی مخالفتِ اسلام کے حوالہ سے سورہ لہب کا یا غزوۂ ذات الرقاع میں صلوٰۃ الخوف کی آیات۔

احادیث نبوی کا امتزاج

صاحبِ ذوق سیرت نگار شعوری طور پر الفاظ وتراکیب اور عبارات حدیث کو

اپنی عبارتوں میں سموتے چلے جاتے ہیں کیونکہ وہ اپنی فصاحت و بلاغت اور ادبیت کے سبب نگارشِ مؤلف میں چار چاند لگاتی ہیں، ایسا غیر شعوری طور پر بھی ہوتا ہے کہ پیکر و روحِ حدیث ان کے مذاق علمی اور اسلوبِ فنی میں رچ بس جاتا ہے۔ اور وہ بوقتِ اظہار خود بخود چھلک جاتا ہے۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ''سیرۃ خاتم النبیین'' میں اسلوبِ حدیث کی جلوہ آرائیاں جابجا ملتی ہیں۔ طلبہ و طالبات اور نوخیز جوانوں کو حضرتِ مؤلف بلا بتائے اسلوبِ نبوت سے بھی روشناس و بہرہ مند کرتے جاتے ہیں۔ اور ان کو دوسرے الٰہی سرچشمہ سے مستفید کرتے ہیں۔ اگرچہ آیاتِ قرآنی کی مانند روایاتِ حدیث کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے تاہم ان کا پتہ چلا لینا چنداں دشوار نہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعتِ حلیمہ اور اس سے متعلق برکات اور شق صدر کی عبارت اسلوب و زبانِ حدیث سے متاثر و مستفاد ہے۔ (۳۱-۳۰) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیتِ الٰہی کے تحت آپ کے خصائلِ محمودہ کا بیان الفاظ حدیث پر مبنی ہے: فكان أفضل قومه مروءة، وأحسنهم خلقا، وأشدهم حياء، وأصدقهم حديثا... (۳۳) اسی طرح حلف الفضول کی تعریف و توصیف میں ایک پوری حدیثِ نبوی نقل کر دی ہے۔ (۴۰-۳۹) خلوت نشینیٔ نبوی بھی الفاظِ حدیث کا پرتو رکھتی ہے۔ اس نوع کے دوسرے مقامات ہیں:

رویائے صالحہ (سچے خوابوں) کے دیکھنے سے متعلق پورا پیرا حدیثِ عائشہؓ سے ماخوذ ہے (۲-۴۱) غار حراء میں اولین تنزیلِ قرآنی کا بیان مؤلف گرامی (۴۲) پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشری وحشت پر حضرت خدیجہ کی تسلی اور حضرت ورقہ بن نوفل کی تصدیقی گفتگو اور پیش گوئی (۴۷-۴۶)، کوہ صفا کا خطبۂ نبوی (۵۴-۵۳) دربار نجاشی میں حضرت جعفر طیار کی تقریر (۷۹-۷۷)، سفر طائف کے بعد مکہ مکرمہ کی طرف مراجعت کے وقت دعائے نبوی (۹۷-۹۶) اور مابعد واقعہ

اسراء ومعراج بالخصوص نماز پنجگانہ کی فرضیت وثواب (۹۹-۹۸) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ آمد اور حضرت انس بن مالکؓ کی اولین رویتِ نبوی اور تصویر کشی (۱۲۱)، یہود سے معاہدہ نبوی (۱۲۶)، غزوہ بدر کے دوران نبوی دعائیں (۱۴۳-۱۴۲) دوسرے غزوات میں بھی اسی طرح عبارت حدیث کا استعمال یا پرتو نظر آتا ہے جیسے غزوۂ خندق میں خندق کھودنے کے مشورۂ حضرت سلمان فارسی کا سرنامہ باندھا ہے۔"الحکمة ضالّة المؤمن" (۱۸۶)، معجزات وبرکاتِ غزوۂ احزاب (۱۹۰-۱۸۹) حضرت سعد بن معاذؓ کی چھوٹی زرہ کے باب میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کا تبصرہ اور شہادتِ معاذ کا خدشہ (۱۹۵) معاہدۂ صلح حدیبیہ (۲۰-۲۱۸)، غزوۂ موتہ کے تینوں امراء مسلمین کی شہادت کی قبل از وقوع خبرِ نبوی (۱۵۵۰) فتح مکہ میں خطبہ نبوی (۲۸۰-۲۷۴) وغیرہ غزوہ طائف کے بعد مراجعت نبوی کے وقت دعا (۲۹۶) غزوۂ تبوک میں ابتلائے حضرت کعب بن مالک وغیرہ (۶-۳۰۵) حجۃ الوداع میں خطابت نبوی (۱۷-۳۱۶، ۹-۳۱۸، ۳۲۱، ۳۲۳)، وفات نبوی کے اولین واقعات (۳۲۶، ۳۲۸، ۳۳۲، ومابعد۔ اور اخلاق وشمائل پر پوری حدیثِ حضرت علیؓ نقل کردی ہے۔ (۵۵-۳۵۱)

سیرت ابن ہشام کے اثرات

خود مؤلفِ گرامی نے اپنے دیباچہ میں اعتراف وتصریح سے کام لیا ہے کہ ان کی کتاب سیرت ابن ہشام کی بنیادی طور پر تلخیص ہے۔ ظاہر ہے کہ ابن ہشام کی زبان وطرزِ ادا، اسلوب وبیان اور الفاظ وتراکیب کا پورا پورا اثر اس کتاب مستفاد پر نظر آتا ہے۔ بلکہ بلا تکلف کہا جاسکتا ہے کہ حضرت مؤلف نے ابن ہشام کی "السیرة النبویة" کی پوری پوری عبارتیں لے لی ہیں یا ان کی تلخیص انھیں کے الفاظ وعبارات میں کی ہے۔

زبان واسلوب

''سیرۃ خاتم النبین'' کی زبان وطرزِ ادا میں دولسانی لہریں ایک دوسرے کے ساتھ گتھی ہوئی ملتی ہیں۔ایک میں انتہائی سلاست وسادگی ہے اور دوسری میں ادبیت کی شان وشوکت۔ سلیس وسادہ زبان سہل ممتنع کا درجہ رکھتی ہے تو ادبی زبان وطرز بلند آہنگ، مرصع ومقفیٰ اور مجسع اسلوب ومعیار۔ سادگی وسلاست کی پرکاری یہ ہے کہ وہ نگاہوں سے اتر کر یا کانوں سے گزر کر دل کے دروازے پر فوراً دستک دیتی ہے اور اپنے معانی ومفاہیم کو بلا تکلف وتردد دل ودماغ کے سفینے پر ثبت کر دیتی ہے۔ ادبیت وفصاحت وبلاغت سے پر زبان اپنے الفاظ وتراکیب اور کبھی کبھی پورے پورے جملوں کی تفہیم وافہام اور ترسیل وابلاغ کے لئے لغات کا سہارا ڈھونڈتی ہے اور اس کی تاثیر اثر انگیزی دماغ وذہن کے دریچوں سے گذر کر دل کے نہاں خانوں میں اترتی ہے۔

مولانا علی میاںؒ کی اپنی زبان واسلوب سادہ وسلیس ہے۔ وہ شعوری طور سے ایسے الفاظ وتراکیب وعبارات لکھتے ہیں جو قارئین کی ذہنی، علمی، فنی اور نفسیاتی تقاضوں کے مطابق ہوتے ہیں کہ دل سے نکلیں اور دل پر برسیں۔ ان کے جملے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ لیکن ایک دوسرے سے پیوست ووابستہ۔ اگلا جملہ پچھلے کے مفہوم کو آگے بڑھاتا ہے۔ ضرورت کے مطابق معروف سے مجہول یا اس کے برعکس ہوتا ہے۔ یہی صورت ماضی، حال کی ہوتی ہے۔ اور مثبت ومنفی کی۔ چند جملوں کے ایک پیراگراف میں پورا مفہوم واقعہ سمیٹ لیا جاتا ہے۔ اور دو تین یا چار پانچ مختصر پیرے ذیلی عنوان کے تحت بیان کردہ واقعہ کو قارئین کی آنکھوں کے سامنے تصویر بنا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔

زبان واسلوب مؤلف گرامی پر ادبیت اور مقفیٰ ومسجع عبارت کا اثر وہاں پایا جاتا ہے جہاں مراجع ومصادر کی زبان وطرزِ ادا کا رنگ غالب آجاتا ہے۔ الفاظ قدرے مشکل تراکیب غریب، عبارات بوجھل ہوجاتی ہے۔ ابن ہشام اور کتب احادیث کے فقرے،

جملے اور عبارتیں جہاں جہاں آگئی ہیں یا جہاں ان کا اثر زیادہ پڑ گیا ہے الفاظ وعبارات مشکل ہوگئی ہیں۔ ایسے ہی مقامات ومراحل میں لغات سے مدد لی گئی ہے۔ جس کے نشانات زیر یا حواشی میں دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی کبھی خطیبانہ اسلوب بھی اس کو مشکل بنا جاتا ہے۔

موضوعاتی تجزیہ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی کتاب ''سیرۃ خاتم النبیین'' سیرت ابن ہشام، کتب حدیث اور قدیم مراجع پر مبنی ہونے کے باوجود بعض روایات، موضوع اخبار، غلط بیانات اور کمزور استدلالات رکھتی ہے۔ ان میں سے کچھ شعوری طور سے ناہمواریاں ہوسکتی ہیں اور کچھ غیر شعوری طور سے۔ کتابِ سیرت میں صحیح روایات ونتائج اور کامل معلومات کا التزام کرنا شانِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا تقاضا بھی ہے۔ اسلام ودین کا مطالبہ بھی اور قارئین کی طرف مؤلف کا فریضہ بھی۔

اگرچہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک کے مختلف مراحل کے ذریعہ اور بعض عربی انگریزی تاریخوں کے ذریعہ واقعات سیرت کی توقیت کی گئی ہے، تاہم پورے بیانیہ میں ان کی تعداد ناکافی ہے۔ متعدد واقعات کے نقطۂ زمان کا پتہ اس سے نہیں چلتا۔ مثلاً ہجرتِ حبشہ، اسلامِ حمزہؓ، اسلامِ عمرؓ اسراء ومعراج، بیعتِ عقبہ اولی وثانیہ اور بعض دوسرے واقعات کی کوئی تاریخ نہیں دی گئی ہے۔

بعض بیانات تصحیح کے محتاج ہیں۔ حبشہ کے اولین مہاجرین کے امیر حضرت عثمان ابن عفان اموی تھے، کتاب میں ابن مظعون جمحی ہے۔ صحیح بخاری میں قباء میں قیامِ نبوی کی مدت چودہ دن ہے، کتاب میں چار دن ہے۔ رضاعت نبوی میں ثویبہ کا ذکر ہی نہیں۔ حلف الفضول کے اولین محرک زبیر بن عبدالمطلب ہاشمی تھے نہ ان کا ذکر ہے اور ان کا رشتہ وکفالت کا، بعثت وتنزیلِ قرآن کو ایک ہی واقعہ شمار کیا گیا ہے۔ آغاز

اذان میں صحابی جلیل کے واسطہ کو فعلِ مجہول کے ذریعہ نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ حضرت ابوسفیان اموی کی مخالفتِ اسلام کو ذاتی عداوت بنا دیا گیا ہے۔ اور ان کے لئے بعض الفاظ بھی مناسب نہیں استعمال کئے گئے۔ غزوۂ بنوقینقاع کی ذیلی سرخی بعض اور واقعات کی مانند نہیں۔

ان سے کہیں زیادہ خطرناک اور دوررس نتائج کی حامل وہ روایات غیر صحیحہ ہیں جن کا صحیح روایات کے ساتھ امتزاج کیا گیا ہے۔ اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔ ان میں مثلاً ہجرت کے سفرِ نبوی کے دوران کے بعض معجزات شامل ہیں جیسے ام معبد کا واقعہ یا غارِ ثور کے دہانے پر عنکبوت کے جالا بننے اور کبوتروں کے گھونسلہ بنانے کا حادثہ وغیرہ۔ محدثین کرام اور محققین اہل سیر کے نزدیک یہ کمزور ہی نہیں موضوع اور من گھڑت روایات ہیں۔ سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ ان کو غلط ثابت کرتے ہیں اور ان کے شاگرد رشید ان کو صحیح بتاتے ہیں۔ نوخیز ذہن، انجان قاری اور صاحب علم حیران و پریشان ہے کہ کس کو صحیح مانے؟ سیرت نگاری کا فریضہ ان مشتبہ، مخدوش اور مجروح روایات کے بغیر بھی انجام دیا جا سکتا ہے۔

تمام مسامحات اور خطا کاریوں کے باوجود حضرت مولانا ندویؒ کی ''سیرۃ خاتم النبیین'' مسلم نوخیز طلبہ اور عام قاری کے لئے ایک تحفۂ سعادت سے کم نہیں۔ وہ اپنے سلیس و عظیم اسلوب، سادہ و پرکار زبان، قرآنی آیات سے تزئین، احادیثِ نبوی سے آراستگی، سیرت ابن ہشام سے وابستگی، حسین و جمیل اعجاز اور کامل و جامع ایجاز اور نگاہ سے دل میں اتر جانے والی کیفیت اور جذباتی و روحانی سرشاری جیسے اوصاف کی بنا پر ایک مدت تک یادگار کتابِ دل رہے گی۔

نظامِ تعلیم کی بنیاد

"آج حال یہ ہے کہ جتنا پڑھا لکھا انسان ہے اتنا ہی وہ ڈرنے کے قابل ہے آج پوری دنیا میں پڑھے لکھے بھیڑیوں کا راج ہے۔ ایسے بھیڑیوں کا جو دوسرے کے جسموں سے کپڑے اتار لیتے ہیں تاکہ اپنی دیوار کو پہنائیں جو دوسروں کے بچوں اور یتیموں کے بچوں کے آگے سے کھانا اس لئے چھین لیتے ہیں کہ ان کے کتوں کا پیٹ بھر سکے۔ بددیانتی، خودغرضی، مطلب پرستی، نفس پرستی پر آج کے پورے نظامِ تعلیم کی بنیاد ہے"

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

ڈاکٹر محمد اقبال حسین ندوی

حضرت مولانا علی میاںؒ
اور
ادب اطفال

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی ہمہ گیر اور جامع شخصیت نے دین حق کا پیغام عام کرنے اور انسان کو انسانیت کی راہ دکھانے کے لئے جو غیر معمولی خدمت انجام دی ہے، تاریخ انسانی اور تاریخ اسلام کا ایک عظیم کارنامہ ہے، دین اور ایمان کے ساتھ دعوت کا جو معنی و مفہوم ہے وہ بہت وسیع ہے، امت محمدیہ کا دیگر اقوام و ملل کو دعوت الی اللہ، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اور امت محمدیہ کے افراد کا ایک دوسرے کو خیر کی طرف دعوت، امور دینیہ اور اسرار شریعت سے واقف کاروں کا امت کے افراد کو فلاح کی راہ دکھانا اور دین حق کو اس کی حقیقی روح کے ساتھ حقیقی شکل میں پیش کرنا دعوت میں شامل ہے، اس کے علاوہ دعوت الی الخیر کا جو بھی وسیع مفہوم ہو سکتا ہے، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی دعوت و پیغام میں موجود ہے، انہوں نے اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے زندگی کے ہر ایک گوشہ کو دعوت میں شامل کیا، دنیا و آخرت کے معاملات، فرد، سماج، معاشرہ اور قوم و ملت کی زندگی کی دینی اخلاقی، تہذیبی، ثقافتی، تمدنی، وسماجی، معاشرتی، تعلیمی، علمی اور سیاسی باتوں کو دینی اعتبار سے دعوت کا موضوع بنایا، تفصیلی طور پر ان کی

دعوت کا تجزیہ کریں تو بخوبی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان کے ہر ایک لفظ اور ہر ایک عمل میں دعوت الی الخیر کا پہلو موجود ہے اور ان کی دعوت وعزیمت کے کسی ایک میدان تک محدود نہیں ہے۔

وہ حالات کے نبض شناس، قوموں کے عروج وزوال کے اسباب وعلل کے رمز شناس، گردش لیل ونہار کے تیور سے واقف، سربراہان اقوام کی دسیسہ کاریوں اور اقوام کی بیداری اور خواب غفلت کے اسباب سے پوری طرح آگاہ، علم وفن کے میدان میں دانشوروں کی کج روی اور تیشہ گری پر باریک بینی کے ساتھ نظر رکھنے والے، ملت اسلامیہ کی زبوں حالی پر آنسو بہانے والے اور ان کے درد کا درماں تلاش کرنے والے، اسلام اور انسانیت کی بقا کے لئے سوز دروں رکھنے والے اور ہر ایک عمر اور ہر ایک سطح کے انسان اور اقوام کے لئے خیر کی راہ بتانے والے تھے۔

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی دوررس نگاہ فرد ومعاشرہ اور اقوام کے تمام شعبۂ حیات پر حاوی تھی، انہوں نے اس دنیا کی زندگی اور اس کے خیر وشر کے تمام پہلو کا بغور مطالعہ اور مشاہدہ کیا تھا، ان کے علم ودانش نے بہت جلد ان میں بالغ نظری پیدا کردی تھی، اس کی وجہ سے ان کی فکر ونظر نے قبل از وقت اقدار حیات کی کشمکش کو محسوس کیا، اور اسلامی افکار ونظریات جو زندگی کی خیر کا بنیادی فلسفہ ہے، کی روشنی میں ہر ایک معاملہ کا حل تلاش کیا، ان کی عقابی نگاہ اور فہم وفراست کی سرعت نے مسائل زندگی کا بروقت تجزیہ اور مداوا پیش کیا۔

تعلیم جو بنیادی طور پر خیر کا سرچشمہ ہے اس سے اس دنیا میں شرانگیزی کا کام بھی لیا جاتا ہے، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ جو علم کی حقیقت سے بہرور تھے، علم ہی جن کی زندگی تھی، اور جن کو علم ہی سے دنیا وآخرت کی معرفت حاصل ہوئی تھی، علم کی قدر وقیمت جس قدر ان کے نزدیک تھی، اور جس طرح انہوں نے اس کی خدمت کی اور

انھوں نے علم کے خیر کے پہلو کو جس طرح روشن کیا، وہ مرتبہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا۔

انھوں نے اس دینا کی علمی تاریخ، مختلف اقوام و مذاہب کے تعلیمی افکار و نظریات کی تاریخ کا وسیع مطالعہ کیا تھا۔ موجودہ دور میں بیسویں صدی میں تعلیم کے میدان میں جو انقلابات آئے اور آرہے تھے، اس کے بنیادی فلسفہ، مقاصد اور زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات سے بخوبی واقف تھے، اور اس کے اثرات کا مسلمانوں کے افکار و نظریات اور زندگی پر جس طرح مرتب ہو رہے تھے، علم دین سے جس کی شخصیت کی تعمیر ہوئی ہو ان کے لئے بے چین کر دینے والی بات تھی، اس لئے انہوں نے تعلیم، نصاب تعلیم، مناہج تعلیم اور طریقۂ تعلیم کو بھی دین کی دعوت کے طور پر اپنایا، اور اس کے ذریعہ مسلم معاشرہ اور قوم میں فلاح اور خیر کی زندگی کو عام کرنے کی بھرپور کوشش کی اور گرانقدر خدمت انجام دی۔ چونکہ تعلیم و تربیت کے میدان میں زبان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، عربی زبان کی تعلیم ابتداء ہی سے بچے میں علم و معرفت سے واقفیت کا ذریعہ بنتی ہے، مطالعہ، گفتگو، تحریر و تقریر میں اس کی بنیادی ضرورت ہوتی ہے، زبان کے بغیر زندگی اور علم و عرفان کا کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا ہے، اسلئے زبان کو بہتر افکار و خیالات کے ساتھ بہتر طریقہ پر حاصل کرنا ضروری ہے، اور تعلیم کے مختلف مراحل میں تدریجی طور پر زبان کی تعلیم جاری رکھنا لازمی ہے، زبان ایک ایسا ذریعہ ہے جو طالب علم کے لئے عقلی و فکری نشاط اور عملی طور پر سوچنے کا کام انجام دیتا ہے، معاشرہ سے باہمی ربط کے لئے طالب علم زبان کا استعمال کرتا ہے، اس کے علاوہ دوسروں سے استفادہ اور ضروریات کی تکمیل کے لئے کام میں لاتا ہے، اور آگے چل کر اس زبان کو علمی زندگی کے ساتھ دین کی دعوت اور پیغام جن کے لئے استعمال کرتا ہے مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے پہلی بار بیسویں صدی میں زبان کی تعلیم کے ساتھ دعوت دین کی فکر کو پیش کیا، جو نصاب تعلیم زبان کی تعلیم کے لئے ہندوستان اور عرب ممالک میں رائج تھا، یکسر دینی روح سے خالی تھا،

کتاب اللہ اور سنت نبوی کی تعلیمات سے خالی تھا خاص طور سے عربی زبان جس کا سرچشمہ کتاب وسنت ہے اس کا نصاب دین کے بنیادی فکر سے عاری تھا، خاص طور سے زبان کی ابتدائی تعلیم جو فرد کی زندگی میں پتھر کی لکیر ثابت ہوتی ہے اور عربی زبان کی تعلیم جو مسلم معاشرہ میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے، اس کے نصاب تعلیم پر القرأۃ الراشدہ الجزء الاول کے مقدمہ میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اور انہوں نے تحریر کیا کہ جو نصاب تعلیم عام طور پر رائج ہے اس میں اسلامی ثقافت وتہذیب اور سلف صالحین کی کوئی مثال نہیں ملتی بلکہ غلط تصویر کشی ہے اور بچوں کے ذہن ودماغ کے ساتھ ایک مذاق ہے (ص،۷) اور مولانا نے اسی مقدمہ میں اظہار خیال کیا کہ عربی زبان کی ابتدائی اور ادبی سطح تک تعلیم کے لئے ایسا نصاب ہونا چاہئے جس میں کتاب وسنت کا بھرپور عکس ہو، اور دینی روح سے وابستہ ہو، سیرت نبوی، تاریخ اسلام، سلف صالحین کی زندگی کا ایسا نمونہ اس نصاب میں پیش کیا جائے کہ طالب علم اس سے متاثر ہو کر اپنی زندگی کو ان کے نقش قدم پر چلانے پر آمادہ ہو اور ان کی زندگی کتاب وسنت پر عمل پیرا ہو۔ (مقدمہ ص ۸،۹)

دینی تعلیم اور دینی افکار وخیالات کے اثر سے فرد کی زندگی اور معاشرتی زندگی میں بہتر اثرات مرتب ہوتے ہیں، افراد میں تہذیب وثقافت، حسن معاملت اور حسن معاشرت پیدا ہوتے ہیں، اگر دینی افکار کی تعلیم نہ ہو تو مادیت، سرکشی، فساد، الحاد، بے دینی بے راہ روی اور دوسری تمام خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، اس لئے انسان کی تربیت کے لئے پہلے دن سے ایسی تعلیم دی جائے جس میں دین کا عنصر شامل ہو، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے جب القرأۃ الراشدہ کو مرتب کیا، زبان کے اصول تعلیم اور طریقہ تعلیم کو پیش نظر رکھ کر زبان وبیان کے ساتھ زندگی کی عکاسی کی رعایت کرتے ہوئے مضامین کے تنوع کا لحاظ کرتے ہوئے اس میں دینی روح کو اس طرح شامل کیا ہے کہ وہ دین کی دعوت کا اہم وسیلہ بن گیا، اس لئے کہ کسی منہج کا مقصد اس کو پڑھنا یا یاد کرنا مقصود نہیں ہوتا

ہے، بلکہ زندگی میں برتنے و کمالات پیدا کرنے کے علاوہ فرد کے اخلاق و عادات کا معاشرہ کو متأثر کرنا اور منظم زندگی گذارنا مقصود ہوتا ہے۔

کسی بھی معاشرہ کی تشکیل میں فرد کی بڑی اہمیت ہے، فرد کے اجتماع سے ہی معاشرہ وجود میں آتا ہے، جس طرح کے افراد کسی بھی معاشرہ میں پائے جائیں گے، وہ معاشرہ بھی اسی طرح کا ہوگا، اس لئے کہ انسان کے ذاتی اور انفرادی افکار و خیالات اور زندگی کے اعمال کا اثر معاشرہ اور سوسائٹی پر پڑتا ہے، فرد کی تربیت سے معاشرہ کی تربیت ہوتی ہے اور فرد جب اپنے لیے فلاح و خیر کی ذمہ داری کو محسوس کرتا ہے تو معاشرہ کے لئے بھی فلاح و خیر کی ذمہ داری محسوس کرتا ہے، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے معاشرہ کی اصلاح کے لئے فرد کی اصلاح کو ضروری سمجھا اور دین کی دعوت کا بہترین ذریعہ قرار دیا، مختلف نصاب تعلیم اور نظام تعلیم کے ذریعہ معاشرہ میں جو گمراہی پھیلائی جارہی تھی، انسانی اخلاق و کردار کو بگاڑا جارہا تھا، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے اس بات کی طرف توجہ کی کہ کم عمر بچے اور نوجوان نسل میں دین الٰہی سے گہری عقیدت پیدا ہو اور وہ ایمان کی محبت سے سرشار ہو، بڑوں کو دین کی دعوت دینے کا کام ہو رہا تھا، لیکن کم عمر بچے اور نوجوان نسل جن کی عقل و فکر خام ہوتی ہے، ان کو جس سانچے میں چاہیں ڈھالا جاسکتا ہے اور کم عمری میں عقل و فکر کی تعمیر جس طرح کے افکار و خیالات سے کی جاتی ہے زندگی اسی روشنی پر چلنے لگتی ہے، اس لئے مولانا نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے خاص توجہ دی، انھوں نے اس بات کو پیش نظر رکھا کہ کم عمر بچوں کی تربیت اس انداز سے کی جائے اور ان کے سامنے دینی افکار و خیالات کو ان کی عمر اور ذہن و دماغ کے اعتبار سے اس طرح پیش کیا جائے کہ ان کا مستقبل روشن، خوشگوار اور زندگی پر مسرت ہو، تربیت سے ان کے دل و دماغ میں پاکیزہ افکار و خیالات کی آبیاری ہو جس سے ان میں اخلاق حمیدہ، نیک اوصاف اور نیک اعمال کی عادت پیدا ہو، اور ان کی زندگی ان باتوں کے ساتھ پروان

چڑھے، تربیت سے ان میں غلط افکار کی طرف میلان نہ ہو اور اس کے بچنے کی صلاحیت پیدا ہو، خالق حقیقی اور معبود حقیقی کو پہچانے، اعمال خیر وشر میں تمیز کر سکے، دین کی بنیادی باتوں سے واقف ہوتا کہ ایسے افراد کے وجود سے بہتر خاندان، معاشرہ اور وطن وجود میں آسکے۔ مولانا نے بچوں کی ذہنی ودماغی تربیت کے لئے "قصص الاطفال" اور "القراءۃ الراشدۃ" جیسی کتابیں تصنیف کیں، اور بچوں کی نفسیات کا پورا لحاظ کرتے ہوئے ان کتابوں کو مرتب کیا، "القراءۃ الراشدۃ الجزء الاول" کے مقدمہ میں ہندوستانی مدارس کے طلبہ کے ذہن ودماغ، ماحول، انداز تربیت، مواد، طریقہ تعلیم اور دینی اغراض کے حصول کے لئے جن اہم نکات کو بیان کیا گیا ہے ان پر غور کریں تو بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ زبان کی تعلیم کے لئے جن باتوں کو پیش نظر رکھنا چاہئے اس کی طرف توجہ دی گئی ہے اور مواد میں خالص دینی نقطۂ نظر کا لحاظ رکھا گیا ہے مولانا نے آخری تین نکات اس طرح بیان کئے ہیں کہ "القراءۃ الراشدۃ" کے اسباق میں اب اخلاقی تہذیبی اسباق شامل ہیں۔ جن سے زندگی کے مختلف میدانوں کے اسلامی ثقافت وتہذیب کی تعلیم حاصل ہوتی ہے، ۲- ماثور دعائیں اور دینی اخلاق وآداب کو اس طرح اسباق میں شامل کیا گیا ہے کہ طلبہ غیر شعوری طور پر ان اسباق اور کہانیوں کو پڑھتے ہوئے یاد کرلیں اور طلبہ یہ نہ سمجھیں کی خاص طور پر ان ہی باتوں کی تعلیم دی جارہی ہے ۳- پوری کتاب میں دینی روح موجود ہے کتاب کا کوئی حصہ یا سبق اس سے خالی نہیں ہے، دنیا کے متعلق معلومات، سائنسی معلومات، حیوانات، طبعیات، نباتات اور نئی ایجادات وہ تمام موضوعات جو کتاب میں شامل ہیں دینی افکار اور دینی تعلیم سے آراستہ ہیں، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولاناؒ نے کم عمر بچے اور نوجوان نسل کی تعلیم کے لئے کس طرح کی نفسیات کا لحاظ رکھا ہے اس میں بہت سے ایسے اسباق ہیں جن میں مولاناؒ کی پاکیزہ زندگی کی تصویر موجود ہے، پاکیزہ تربیت نے مولاناؒ کو زندگی کے کس اعلی مقام پر فائز کیا وہ روز روشن کی

طرح عیاں ہے، مولاناؒ نے کہانیوں اور واقعات کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ طالب علم غیر شعوری طور پر اس پاکیزہ زندگی کا عادی ہو جائے اور زندگی کے وہ بلند مقاصد حاصل ہو جائیں جو مولاناؒ کو حاصل ہوئے۔

ایک کم عمر بچہ کا شب و روز اور اس عمر میں زندگی میں پیش آنے والے واقعات کیسے ہوتے ہیں، مولانا نے بالکل فطری انداز میں ان کو پیش کیا ہے اور اخلاق حمیدہ، نیک اوصاف سے متصف اور دینی شعار سے آراستہ ایک بچہ کی زندگی کیسی ہوتی ہے اس کی مکمل تصویر کشی القراءۃ الراشدۃ کے اسباق میں کی گئی ہے، "کیف أقضی یومی" "لمابلغت السابعه من عمری" "فی السوق" "سفر القطار" "مسابقة" "الفطور" اور "الصید" جیسے اسباق زندگی کا تنوع اور اسلامی اقدار کی ترجمانی کی زندہ مثالیں موجود ہیں اور "ماذا تحب أن تکون" جیسے اسباق بچہ کے ذہن کی ایسی تعمیر کرتا ہے کہ بچہ کی زندگی کا نصب العین متعین ہو جاتا ہے، اور ایک کامیاب زندگی کی راہ سامنے آجاتی ہے۔

نصابی مواد اور نصابی تعلیم کا زندگی کی ثقافت و تہذیب سے گہرا رشتہ ہے، اجتماعی دینی اور سیاسی زندگی اور نظم و ضبط جس کا معاشرتی زندگی سے باہمی ربط ہے اس بات کا بھی "القراءۃ الراشدہ" کے اسباق میں پورا لحاظ رکھا ہے۔ "القراءۃ الراشدہ جزء دوم میں تاریخ اسلام کے واقعات، اہم اسلامی شخصیات، اشیاء کی اہمیت اور زندگی سے متعلق ثقافتی اور روزانہ کی باتوں، حیوانات و نباتات اور جدید اختراعات سے متعلق تفصیلات پر مبنی اسباق کو دینی اقدار حیات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، جو وسعت معلومات کے ساتھ دینی تربیت کا بھی سبب ہیں، القراءۃ الراشدہ تیسرا جزء بھی اسی انداز پر ترتیب دیا گیا ہے، لیکن اس میں فکر کی وسعت معلومات اور عمر کے اعتبار سے زیادہ ہے اور احساس و شعور کو قدرے عقلی انداز سے متاثر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

نصابی مواد یا منہج کا نظریات اور نفسیاتی اصولوں سے گہرا تعلق ہے، اس سے فکری نشاط کے بہتر نتائج برآمد ہوتے ہیں، یہ بنیادی فکر مولاناؒ کی تالیفات کی روح ہے، مولانا نے مناہج دراسیہ میں دین اسلام کے پیغام اور دعوت کو بنیادی فکر کے طور پر پیش کیا ہے، اور ان کے پیش نظر یہ بات رہی ہے کہ دینی افکار سے فرد کی عقل وفکر میں بلندی پید اہوتی ہے اور قدرت الٰہی کے نظام کائنات سے آگہی حاصل ہوتی ہے۔ دینی تعلیم سے آخرت کا تصور ابھرتا ہے، آخرت پر ایمان اور اس کے تصور سے دنیا کی زندگی کے اعمال درست ہوتے ہیں اور اسلامی تعلیمات کی خوبیاں فرد اور معاشرہ میں پیدا ہوتی ہیں، مولانا نے نفسیاتی پہلو کا اس معاملہ میں خاص خیال رکھا ہے۔

بچے کی نفسیات کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ بچے کی ابتدائی تعلیم کے وقت اس میں سوچنے کی بہت کم صلاحیت ہوتی ہے، زندگی کے تجربات اور معلومات اسے بہت کم ہوتے ہیں محسوسات کی دنیا سے جو کچھ اپنی عقل وادراک کی صلاحیت سے سیکھ سکتے ہیں اس سے متاثر ہوتے ہیں، زندگی کے وسیع مفہوم اور فکری یا معنوی معاملات کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، نظریاتی اور عقلی دلائل اور دین کے عقائد کے مسائل ان کی سمجھ سے باہر ہوتے ہیں، لیکن مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے بڑی خوش اسلوبی سے سادہ الفاظ میں عقیدہ توحید، ایمان، دنیا وآخرت کی باتوں کو بچوں کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے، اور غیر شعوری طور پر ان باتوں کو ان کے ذہن ودماغ کو قبول کرنے پر آمادہ کیا ہے، قصص النبیین جن میں انبیاء کے قصے قرآن کریم کے الفاظ اور تفسیرات میں پوری دلکشی ورعنائی کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں، غیر محسوس طریقہ پر عقیدہ وایمان توحید، دنیا وآخرت کی باتوں کو منطقی استدلال کے ساتھ طالب علم کے سامنے آجاتی ہے اور طالب علم کے ذہن ودماغ پر اثر انداز ہوجاتی ہے، اور بقول ڈاکٹر احمد الشرباصی کے کہ طالب علم کو روحانی اور عقلی غذا مل جاتی ہے اور اس سے احساسات وجذبات متاثر

ہوتے ہیں، اور اخلاق، طبائع اور نفسیات میں تہذیب وشائستگی پیدا کرتے ہیں، اور ساتھ ہی عربی زبان کے قواعد پر قدرت حاصل ہوجاتی ہے۔ قرآن کریم، احادیث نبویہ اور تاریخ اسلامی کی زبان سے گہرا تعلق پیدا ہوجاتا ہے۔ (قصص النبیین الجزء الاول ص ۳) قصص النبیین کے پہلے حصے میں پہلا سبق "من کسر الا صنام" میں عقیدہ توحید کی جو تعلیم دی گئی ہے، اس قدر آسان اور دلنشیں انداز میں استدلال کے ساتھ وحدانیت کے تصور کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے اور اس سے دلکش اور سہل انداز بیان ممکن نہیں ہے، اور حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں انسانی نفسیات اور پاکیزہ زندگی اور اخلاق حمیدہ کی جو تعلیم دی گئی ہے بچہ کی نفسیات کے اعتبار سے اس سے بہتر پیرایہ میں تعلیم نہیں دی جاسکتی ہے۔

مولانا نے اس نفسیات کا بھی لحاظ رکھا ہے کہ بچے جلد تاثر قبول کرتے ہیں وہ جذباتی ہوتے ہیں ان کے جذبات بہت تیز ہوتے ہیں تو بچوں کی اس صلاحیت سے فائدہ اٹھا کر ان کو کسی رجحان کی طرف موڑا جاسکتا ہے، اور عقلی طور پر ان کے جذبات کو متاثر کر کے ان میں زندگی کے خاص پہلو اور رجحان کو پیدا کیا جاسکتا ہے۔ قصص النبیین اور القراءۃ الراشدہ کے اسباق اور عبارتوں کا مطالعہ کریں تو یہ بات بخوبی محسوس کی جاسکتی ہے، قصص النبیین کے تیسرے حصہ میں حضرت موسیٰ اور فرعون کے قصہ میں جن انسانی احساسات وجذبات کی عکاسی کی گئی ہے یقیناً وہ جذبات اور احساسات کو متاثر کرنے کی بات ہے۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر احمد الشرباصی نے کہا: "فیرضی المیول المختلفه فی نفس الطفل الهائم باستطلاع" (قصص النبیین الجزء الثالث ص ٦)

اس کے علاوہ بچوں کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ ان میں نقل کرنے اور تقلید کی خوبی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے، اور بڑوں کے طور طریقے کو بخوبی اپنا لیتے ہیں، اور اپنی زندگی کو ان کی زندگی کے نمونہ پر ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں، بڑے جو کچھ کہتے ہیں اور کرتے

ہیں بچے اس کی نقل کرنے میں آگے رہتے ہیں۔ بچوں کی جو عمر ہوتی ہے اس عمر میں ان کی اپنی خاص دنیا ہوتی ہے ان کی اس دنیا کی اپنی ضروریات ہوتی ہیں، اس کے ساتھ ہی اسی اعتبار سے ان کی خواہشات اور رجحانات ہوتے ہیں، مولانا نے بچوں کی اس نفسیاتی پہلو کو بھی ملحوظ رکھا ہے، اسباق میں ایسی عبارتیں اور ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے جس سے بچوں میں خالص اسلامی اقدار اور سچے محبّ وطن کے اقدار پیدا ہوں اور اسلامی زندگی کو دوسری زندگی پر ترجیح دے القراءۃ الراشدہ کے دوسرے اور تیسرے حصے میں تاریخ اسلام کی نامور شخصیات اور ان کی زندگی کے واقعات کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے اور زندگی کے دوسرے واقعات کی اس طریقہ سے تصویر کشی کی گئی ہے کہ طالب علم اس کو اپنے لئے قابل تقلید سمجھے اور اس کے نقش قدم پر چل کر ایک سچے مسلمان اور کامیاب انسان کی زندگی گزار سکے۔

بچوں کی نفسیات میں یہ بات شامل ہے کہ وہ سکون واطمینان کی زندگی چاہتا ہے اور اس غرض کی تکمیل کے لئے معاشرہ میں دوسروں پر منحصر ہوتا ہے اور اس کی دینی تربیت نہ کی جائے تو نفسیاتی طور پر اس کا انحصار ہمیشہ اس دنیا کے مخلوق پر ہوتا ہے حالانکہ سچے اور بہتر اعتماد کی بات یہ ہے کہ خالق کائنات پر اعتماد کیا جائے، اس بات کی تعلیم قصص النبیین کے ہر ایک قصے میں دی گئی ہے اور القراءۃ الراشدہ کے قصے ''الامانۃ'' اور ''بر الوالدین'' اور دوسرے واقعات میں بھی اس کی تعلیم دی گئی ہے اور پر اعتماد اور پاکیزہ زندگی کی اچھی مثال پیش کی گئی ہے۔

بچے عام طور پر خیر، عدل، حق اور جمال کی طرف مائل ہوتے ہیں، نیک اعمال کرنا چاہتے ہیں ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنا چاہتے ہیں، تفاؤل اور اخلاص کی طرف ان کا رجحان عام ہوتا ہے، اور جمال سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں، مولاناؒ نے تدبر وحکمت کے ساتھ ان باتوں کی تعلیم کہانیوں کے ذریعہ دی ہے، مثال کے طور پر

القراءۃ الراشدۃ کے دوسرے حصہ میں ''کن أحد السبعة اور ''عیادة المریض''
اور دوسرے اسباق میں یہ باتیں بخوبی محسوس کی جاسکتی ہیں۔

مولانا نے ہندوستان کے مدارس میں تعلیم پانے والے طلبہ کو مدنظر رکھ کر بچوں کے لئے کتابیں تصنیف کی ہیں، ہندوستان کے طلبہ عربی زبان عام طور پر نو دس سال کی عمر سے پڑھنا شروع کرتے ہیں جو بچپن اور مراہق کے درمیان کی عمر ہوتی ہے، مولانا نے عمر کے لحاظ سے نفسیات کا پورا پورا خیال کیا ہے اور بچوں کے ذہنی استعداد کی رعایت کرتے ہوئے مضامین، مواد اور طرز ادا کو اپنایا ہے بچے بچپن کے دور سے نکل کر مراہق کے دور میں داخل ہوجاتے ہیں، اس دور میں عقل وادراک سے کام لینے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے اور تفکیر کی بنیاد پر دینی باتوں کو سمجھنے اور ان میں تعامل کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس لئے اس مرحلہ میں دینی افکار وخیالات اور انسانی افکار وخیالات میں کشمکش ہوتی ہے وہ مرحلہ میں قدرے آگے کا مرحلہ ہوتا ہے، مولانا نے قصص النبیین رابع اور خامس میں عمر، عقل اور فکر کی خاص رعایت رکھی ہے، اس مرحلہ میں مشاعر اور انفعالات پیدا ہوتے ہیں، دینی شعور میں ایک قسم کی تفکیر ہوتی ہے، مولاناؒ نے ترتیب قائم رکھنے میں ایک اہل نظر، دانشور اور ماہر فن ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے اور منہج کی تربیت میں کن باتوں کو پیش نظر رکھنا چاہئے موجود ہے نصابی مواد کی تیاری میں تعلیم وتربیت کے بنیادی عناصر اس کے مزاج، نصاب کو مرتب کرنے کے طریقے اور اس کے اصول وضوابط کی پوری رعایت کی گئی ہے اس موضوع پر مزید تفصیل کی گنجائش موجود ہے لیکن..... مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ جیسی علم وفن کے نابغہ روزگار شخصیت اور یکتائے زمانہ نے بچوں کے نصابی مواد میں جس دقت نظر کے ساتھ دینی دعوت وپیغام کے عنصر کو شامل کیا، اس سے قبل کسی نے ایسی پیش قدمی نہیں کی، دعوت وعظیمت کی تاریخ میں یہ ایسا مثالی کارنامہ ہے کہ شخصیت کے ساتھ کارنامہ بھی نقش دوام اور لازوال ہے۔

مولانا سراج الدین ندوی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

قصصی ادب کے تناظر میں

پوری دنیا جانتی ہے کہ حضرت مولانا علیہ الرحمۃ کی ذات گرامی ایک ہمہ جہت اور جامع شخصیت کی مالک تھی دعوت وتبلیغ، اصلاح وارشاد، تعلیم وتربیت، تالیف وتصنیف تحقیق وتنقید، ادب وصحافت، وعظ وخطابت، قیادت وسیادت وغیرہ جملہ میادینِ حیات وشعبہائے زندگی میں کارہائے نمایاں انجام دیئے اور اپنے عہد کی تاریخ پر انمٹ نقوش ثبت کئے ہیں۔

ادبی دنیا میں آپ ایک صالح انقلاب کے نہ صرف داعی تھے بلکہ آپ نے اپنی تصنیفی کاوشوں سے اردو اور عربی زبان میں بیش قیمت، صالح، پاکیزہ اور تعمیری ادبی سرمایہ کا اضافہ کیا۔ آپ نے سماج کے مختلف طبقوں کے لئے لکھا اور کسی کو نظر انداز نہ کیا۔ بچے بھی سماج کا ایک عنصر بلکہ اہم عنصر ہیں۔ بچے کسی قوم اور ملک کے قسمت اور مستقبل ہوا کرتے ہیں۔ ان کے ناتواں کاندھوں اور کمزور کلائیوں پر ملک وملت کے مستقبل کا بھاری اور ذمہ دارنہ بوجھ ہوتا ہے اس لئے صحیح نہج پر ان کی تعلیم اور فکری وذہنی تربیت نہایت ضروری واہم

ہے۔ حضرت مولاناؒ کی نظر سے یہ نکتہ کیسے اوجھل رہ سکتا تھا اور وہ اپنی خداداد صلاحیتوں سے بچوں کو کیونکر محروم رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ادب اطفال پر نظر ڈالی اور اس نقطۂ تحقیق پر پہنچے کہ بچوں کا ادب یا تو بہت کم ہے یا وہ صالح مقاصد کی تکمیل نہیں کرتا حتیٰ کہ ندوۃ العلماء کے نصاب میں بھی کامل کیلانی کی وہ کتابیں داخل تھیں جن کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنے کرب و بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے آپ کو لکھا تھا:

> ''حال میں ندوہ کی ایک ابتدائی درسی کتاب پر محض اتفاق سے نظر پڑ گئی، بڑا ہی دل دکھا تصویر کی وہ بھرمار کہ شاید عبارت بھی اتنی نہ ہو، سرورق سے لے آخر تک جاندار مخلوق کی تصاویر رنگین، اللہ و رسول کا شروع سے آخر تک نام نہیں، لغو قصے، قدیم جن و پری کے طرز کے، حیرت ہوئی کہ یہ کتاب اور سید صاحب کے اور ڈاکٹر صاحب کے زمانہ میں؟ خط دونوں صاحبوں کو لکھا ہے۔ چوں کفر از کعبہ برخیزد'' کفر کعبہ ہی سے کیوں اٹھتا ہے'' مصری کتابیں تعلیمی نقطۂ نظر سے بھی ہرگز ندوی طلبہ کے لئے مفید نہیں ہو سکتی''

(کاروان زندگی ج/۱ ص/۲۱۶)

چنانچہ حضرت مولاناؒ سید ابوالحسن علی ندویؒ نے فیصلہ کیا کہ وہ عربی میں کہانیوں کی بچوں کے لئے ایسی کتاب ترتیب دیں گے جو قصہ گوئی کی تمام خوبیوں کے ساتھ بچوں کے ذہنی و فکری تربیت میں اہم رول ادا کر سکے۔ چنانچہ آپ نے تین بنیادی نکات کو سامنے رکھتے ہوئے کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور بچوں کے لئے قصہ نگاری کا ایک معیاری نمونہ پیش کیا۔ مولانا مسعود عالم ندویؒ نے جب یہ کتاب دیکھی تو فرمایا:

> ''اس کتاب میں زبان اور دین کو اس طرح پیوست کر دیا ہے جیسے گوشت اور خون''

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

''اس کتاب کے ذریعہ بچوں کا علمِ کلام تیار ہوگیا ہے''

سید قطب شہید نے اس کتاب پر مقدمہ لکھتے ہوئے تحریر فرمایا تھا:

میں نے کثرت سے وہ کتابیں پڑھی ہیں جو بچوں کے لئے لکھی گئیں اور جن میں انبیاء کرام کی حکایات وقصص بھی شامل ہیں خود ایک سلسلہ کتب کی ترتیب میں میں نے شرکت کی جو ''القصص الدینی للأطفال'' کے نام سے مصر میں مرتب ہوا اور جس کے لئے مواد قرآن مجید سے اخذ کیا گیا تھا لیکن میں تکلف اور خوشامد کے بغیر اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ ''قصص النبیّن للاطفال'' کے مصنف کا کام (جس کا ایک نمونہ حضرت موسیٰ کے قصہ میں نظر آتا ہے) ہمارے وضع کئے ہوئے سلسلہ سے زیادہ کامیاب اور مکمل ہے اس لئے کہ اس میں ایسی لطیف رہنمائیاں، قصے کے مقاصد پر روشنی ڈالنے والی تشریحات اور بین السطور میں ایسے اشارات آگئے ہیں جو بیش قیمت ایمانی حقائق کی نقاب کشائی کرتے ہیں''

(کاروان زندگی ج ۱ رص/۲۱۸)

کہانی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا پلاٹ اتنا زوردار ہو کہ کسی مرحلہ میں بھی کہانی پن ختم نہ ہونے پائے۔ قارئین جب کہانی شروع کریں تو آگے اور آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہو۔ جیسے جیسے کہانی آگے بڑھے اس کے پڑھنے کا ذوق بھی بڑھتا جائے اور قارئین شروع سے آخر تک کہانی میں کھوئے رہیں۔ مولانا کی لکھی ہوئی کہانیاں قصص النبیین اس نقطہ نظر سے کمال درجہ کی حامل ہیں۔ جب بچے یہ کہانیاں شروع کرتے ہیں تو اول تا آخر ان کی دلچسپی نہ صرف برقرار رہتی ہے بلکہ اس میں اضافہ ہوتا رہتا

ہے۔ کہانی پن کسی وقت بھی گم نہیں ہوتا اور نہ ہی کہانی میں الجھاؤ یا فکری ژولیدگی محسوس ہوتی ہے۔

کہانی کا فن اور تکنیک زبان و بیان سے گہرا تعلق رکھتا ہے، زبان کی سلاست وروانی شگفتگی و برجستگی، اظہارِ بیان کی بے ساختگی و بے تکلفی، حسنِ کلام وحسنِ تاثیر کو دوبالا کرتی ہے۔ مولاناؒ زبان و بیان میں بچوں کی نفسیات، ان کی ذہنی اور علمی استعداد کا بھرپور خیال رکھتے ہیں۔ وہ الفاظ وفقرات کی تکرار سے نہ صرف یہ کہ کلام میں حسن ونغمگی پیدا کرتے ہیں بلکہ بچوں کو الفاظ ومعانی کی حفاظت وصیانت کا وافر موقع فراہم کرتے ہیں۔

آپ ایسے دلچسپ عنوانات جماتے ہیں جو بچوں کے تحریک وتشویق اور جذب وکشش کا باعث بن کر انھیں پڑھنے کے لئے آمادہ کرتے ہیں۔ قصص النبیین کے عنوانات میرے اس دعوے کی بین دلیل ہیں۔

ایک اچھی کہانی کی علامت یہ ہے کہ اس میں کردار کم سے کم ہوں تاکہ بچوں کا سادہ ذہن کرداروں کی کثرت سے الجھاؤ محسوس نہ کرے۔ مولانا نے جو کہانیاں لکھیں ہیں ان میں کردار گنے چنے ہیں۔ ہر قصہ کا بنیادی کردار جیسے موجودہ اصطلاح میں کہانی کا ہیرو کہا جاتا ہے بار بار بچوں کے پردۂ ذہن پر نمودار ہوتا ہے اور کسی مرحلہ پر بھی بچے کے کرداروں کے سلسلہ میں کسی الجھاؤ یا پیچیدگی کو محسوس نہیں کرتے۔

کرداروں کے مکالمات بالکل فطری اور حسب حال ہیں۔ کرداروں کی شخصیت ان کی نفسیات، مقام، وقت، ماحول کے مطابق کامیاب مکالمہ نگاری کی گئی ہے۔ بادشاہ شاہی لب ولہجہ میں گفتگو کرتا ہے، وزیر افسرانہ اندازِ تکلم اختیار کرتے ہیں، رعایا عوامی زبان بولتی ہے، باغی وسرکش تمرد ونخوت کے انداز میں بات کرتے ہیں۔ نیک نفوس کے مکالمات سے شرافت نفس ٹپکتی ہے، پیغمبر پیغمبرانہ شان سے کلام کرتا ہے۔

کامیاب کہانی کی ایک علامت یہ ہے کہ کہانی کار جو تاثر قائم کرنا چاہتا ہے

اور جو فضا اپنی کہانی میں سمونا چاہتا ہے وہ تأثر اور فضا ہر مرحلہ پر قائم ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا علی میاںؒ اپنی کہانی سے جو تأثر دینا چاہتے ہیں اس تاثر کو آپ کہیں مجروح نہیں ہونے دیتے۔ ایک ایک عنوان، ایک ایک پیرایہ، بلکہ ایک ایک سطر سے وحدتِ تأثر کی فضا بندھتی ہے۔

آپ کی کہانیوں میں جگہ جگہ منظر نگاری، واقعات کے تانوں بانوں کو نہایت ہم آہنگ اور خوبصورت بنا دیتی ہے، کہیں کہیں کہانی کے گرد و پیش، مقام، وقت، اور ساز و سامان کی مصور کشی، پلاٹ اور کرداروں کے درمیان سنہری کڑی کا کام کرتی ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ کہانی کار کا اسلوب اور تکنیک ابلاغ کے سلسلہ میں سب سے زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ جیسا کہ صدیق الرحمٰن قدوائی اپنے ایک مقالہ میں تحریر فرماتے ہیں:

> ”کہانی میں تکنیک کا معاملہ بھی قابل غور ہے۔ تکنیک کے سارے انداز اگر احساس کی کسی نئی کروٹ کو راس نہ آئیں تو کہانی خود اپنے ساتھ کوئی نئی تکنیک لے کر آتی ہے جو نئی بھی ہو سکتی ہے پرانی بھی اور نئے اور پرانے کے درمیان کوئی اختراع بھی۔“

حضرت مولاناؒ نے قصص النبیّین کے لئے جو اسلوب اور تکنیک اپنائی ہے وہ بچوں کے نفسیات، ان کی افتادِ طبع اور ان کی ذہنی و علمی استعداد کے عین مطابق ہے۔ آپ نے کہانی کے ذریعہ عربی الفاظ و تراکیب کا استعمال بھی سکھایا اور طلبہ میں پیغمبرانہ فکر پیدا کرنے کی بھی کوشش کی۔

کسی ادبی تخلیق کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا ابلاغ مکمل ہو۔ یعنی مصنّف اس کے ذریعہ اپنے قارئین کو جو پیغام دینا چاہتا ہے وہ پیغام مکمل طور پر ان تک پہنچ جائے بقول جوش ؎ کہ وہ کیا کہہ سکا اور کیا رہ گیا - ابلاغ کے نقطہ نظر سے قصص النبیّین ایک کامیاب ترین کوشش ہے۔

ایک اچھی کہانی کا بنیادی وصف یہ بھی ہے کہ وہ فلسفیانہ گتھیوں، فکری بھول بھلیوں گنجلک تصورات، پیچیدہ انداز بیان اور ژولیدہ خیالات سے پاک ہو بقول ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی:

> ''جہاں تک عام قاری کا سوال ہے وہ کہانی کو لائٹ لٹریچر اور ہلکا پھلکا ادب تصور کرتا ہے، اور اپنے اردگرد کے ماحول کے حوالہ سے زندگی کو دیکھنا اور سمجھنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لئے وہ کہانی کے ساتھ طویل اور پرخار وادیوں کا سفر کرنے کے لئے بھی تیار رہتا ہے لیکن اس کا محدود وقت اور فرصت کے چند لمحات خشک فلسفیانہ گتھیوں، وجود اور عدم وجود کی بحث، لاشعور کی بھول بھلیوں، گنجلک خوابوں اور ژولیدہ بیانوں کا متحمل نہیں ہوتا۔''

حضرت مولانا علیہ الرحمۃ کی قصہ نگاری میں یہ بنیادی وصف بدرجہ اتم موجود ہے۔ نہایت سادہ وبسیط جملے، سلجھی ہوئی عبارتیں، مفہوم ومدعا کو واضح کرنے والے فقرے، بچوں کے دل ودماغ میں اترنے والے پیراگراف، آپ کی کہانیوں کا بنیادی وصف ہے۔

مولاناؒ نے جس دور میں قصص النبیین کی تالیف شروع کی اس وقت ہر زبان وادب کے قصہ نگار مغربی فکشن سے متاثر ہو رہے تھے۔ آپ مغربی افکار ونظریات پر گہری نظر رکھتے تھے مگر آپ کی قصہ نگاری پر مغربی فکشن کی کوئی چھاپ نظر نہیں آتی۔ مشرقی روایات اور کلاسیکی خصوصیات آپ کی کہانیوں میں خون کی طرح دوڑتی نظر آتی ہیں۔ آپ نے اپنی کہانیوں کے لئے قرآنی ونبوی اسلوب اختیار کیا جس سے بہتر اور مؤثر کوئی دوسرا اسلوب ہو ہی نہیں سکتا۔

آپ قصہ برائے قصہ یا کہانی برائے کہانی کے قائل نہ تھے بلکہ بلند مقاصد

کے لئے آپ نے یہ کہانیاں لکھیں ہیں۔توحید ورسالت اور آخرت پر کامل یقین، کفر وشرک کی گمراہی اوران کی ناکامی وخسران کوآپ نے اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا اوران حقائق کوانبیائی کہانیوں کے ذریعہ بچوں کے ذہن ودماغ میں ایسا پیوست کردیا کہ تادم آخران کے عقائد میں کوئی تزلزل پیدا نہ ہوسکے،اور بچے اس اباحیت پسند دور میں بھی اسلامی تعلیمات کوسینہ سے لگائے رہیں۔

تارہ، چاند، اور سورج کے طلوع وغروب کے جس واقعہ کوقرآن نے اشارۃً بیان کرکے توحید کا ثبوت پیش کیا ہے،اس واقعہ کو جب آپ بچوں کے لئے لکھتے ہیں تو اس واقعہ کی منظرکشی اس طرح فرماتے ہیں کہ بچوں میں شروع ہی سے راست غوروفکر، تدبروتفکر اوراخذ نتائج کی صلاحیت وقابلیت پیدا ہوسکے بلکہ ان کے اندر پیغمبرانہ فکروسوچ پرورش پاسکے۔

ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ آپ بچوں کی اسلامی نہج پر تربیت کے لئے قرآنی قصوں کا انتخاب کرتے ہیں اور قرآنی اسلوب وتکنیک کا سہارا لے کر ایک ایسا بدیع اسلوب اختیار فرماتے ہیں جو بچوں کی فطرت کے عین مطابق ہے۔

مختصر یہ ہے کہ حضرت علی میاں نوراللہ مرقدہٗ نے بچوں کی سطح پر اتر کران کی نفسیات ذہنی استعداد کے پیش نظر فنی ترتیب، کرداروں کی سچی نمائندگی، جاندار مکالمہ نگاری، موحول ومناظر کی دلچسپ تصویرکشی، وحدتِ تاثیر کی فضا اوراپنے ابلاغ کے اعتبار سے ایسی نبوی کہانیاں لکھیں ہیں جو عربی ادبِ اطفال میں زندہ وجاوید رہیں گی۔

مولانا عقیل احمد قاسمی

بچوں کا ادب

اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نور اللہ مرقدہ

ہمارے بچے ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی قیمتی امانت اور ہماری زندگی کا عظیم سرمایہ ہیں، اس لئے مذہب اسلام نے والدین اور مربیوں پر ان کی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں بڑی اہم ذمہ داریاں ڈالی ہیں، اور قرآن وحدیث میں اسلام کی ذمہ داری کو پورا کرنے کی بڑی تاکید آئی ہے۔

قرآن وحدیث میں بچوں کے سلسلہ میں مربیوں اور اساتذہ کے اوپر ان ذمہ داریوں کی طرف اشارے کئے گئے ہیں، ان میں اہم ذمہ داریاں، ایمانی تربیت کی ذمہ داری، اخلاقی تربیت کی ذمہ داری، ذہنی اور عقلی تربیت کی ذمہ داری، تعلیمی وادبی ذمہ داری، ذہنی اور عقلی تربیت کی ذمہ داری، نفسیاتی تربیت کی ذمہ داری، اجتماعی ومعاشرتی تربیت کی ذمہ داری اور جنسی تربیت کی ذمہ داری ہے، اسلام نے مسلمانوں سے ان تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا مطالبہ کیا ہے اور اس کو اولاد کے لئے سب سے قیمتی تحفہ قرار دیا گیا ہے۔

لیکن مذکورہ ذمہ داریوں میں سب سے اہم ذمہ داری یہ ہے کہ بچوں کی تعلیمی

وادبی تربیت اوران کی فکری ذہن سازی اس طرح کی جائے کہ بچپن ہی سے دین وحکمت کے اعتبار سے اسلام سے ان کا تعلق ہوجائے، اور نظام وقانون کے اعتبار سے قرآن عظیم کے ساتھ ان کی وابستگی ہوجائے، اور اسلامی تاریخ کی عظمت ان کے قلوب میں پیوست ہوجائے، اور اسلامی تہذیب وتمدن اور اسلام کا دیا ہوا طرز زندگی ان کا مقصود اصلی بن جائے۔

ہمیں یہاں پر یہ بات بھی یاد رکھنی ہے کہ بچوں کی تعلیم وتربیت اوران کی ذہن سازی کا مسئلہ انتہائی نازک اور دشوار ہے اوران کی اس لاشعوری کی عمر میں ان کو صحیح اوراس کے قابل بنانا اوران میں خیر وصلاح کا رجحان پیدا کرنا بہت مشکل کام ہے، اس لئے اس اہم کام کے لئے ضروری ہے کہ ایسے اساتذہ اور معلمین کا انتخاب کیا جائے جو علم وادب کے لحاظ سے بلند وارفع ہوں، اور اسلامی زندگی کے تمام مراحل پر نظر عمیق رکھتے ہوں تاکہ وہ صحیح عقائد اور اچھے اخلاق سے بچوں کو آراستہ کرکے اس فریضہ کو بحسن وخوبی انجام دے سکیں، اوراس کام کے لئے ایسا نصاب تیار کیا جائے جس میں بچوں کے فطری احساسات وجذبات، ان کی محدود قوت وفہم کا خیال رکھا جائے اوران کے ذہن وقلب میں کسی بات کو اتارنے کے لئے ان کی صلاحیت اور استعداد کی رعایت کی جائے۔

چونکہ بچہ اپنے والدین اپنے اساتذہ اور مربیوں کی ہر بات کو سچ مانتا ہے اوران کے تمام افکار وخیالات اور احوال وعادات کی تصویر کشی کرتا ہے، اوران کے قول وفعل اور کردار پر مکمل اعتماد اور یقین کرتا ہے، اوراس کو جو عقلی اور روحانی غذا دی جاتی ہے ہضم کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور زندگی کے اس مرحلہ میں اس کو جو سبق پڑھایا جاتا ہے وہ اس کو اپنے ذہن ودماغ میں راسخ کرکے زندگی کے آخری ایام تک یاد رکھتا ہے، اس لئے اس کی تربیت اور ذہنی نشو ونما کے لئے ایسے نصاب کی ضرورت

ہے جس میں ان تمام باتوں کا خیال رکھ کر بچوں کی زندگی کا صحیح رخ متعین کیا گیا ہو اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے آسان زبان اختیار کی گئی ہو، اور اس کو ایسی شخصیات اور ماہرین تعلیم نے مرتب کیا ہو جن کے اخلاق، کردار، اور صلاح کا لوگوں پر اثر ہو، اور اس میدان میں ان کے تجربات مفید ثابت ہوئے ہوں۔

یہ بھی حقیقت ہے ادب اطفال اور بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی ذہن سازی اور زبان سکھانے کے لئے مسلم علماء اور مفکرین اور ماہرین تعلیم نے ہر دور میں اور ہر زبان میں کوششیں کی ہیں اور اس سلسلہ میں متعدد نصاب تیار کئے گئے ہیں، جو اپنی اپنی جگہ پر اہم اور نہایت مفید ثابت ہوئے ہیں، اور ان کو پڑھ کر بچوں نے زبان دانی کے ساتھ حسن ادب، حسن تعلیم کے جوہر کو اپنا کر اخلاقی جواہر پاروں سے اپنی ذاتوں کو آراستہ کیا ہے، اور دین وعقیدہ کی پختگی سے اپنے دلوں کو منور کیا ہے، ان نصابوں سے دو چیزیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔

(ا) ایک نصاب تو وہ ہے جس میں بچوں کو آسان الفاظ اور سہل تعبیرات کے ذریعہ زبان کی تعلیم دی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ براہ راست دین اور عقیدہ کی تعلیم سے اسلامی طرز زندگی اور اسلامی تعلیمات سے بچوں کو جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دوسرے وہ نصاب ہے جس میں لسانی تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کے سامنے اسلامی تاریخ کو پیش کیا گیا ہے، انتہائی سادہ زبان میں ان کے ملک اور ان کے آباء واجداد کی تاریخ اور کارناموں کو سامنے لاکر وہ پہلو اجاگر کئے ہیں جن سے ان کے ذہنوں پر دینی شخصیات اور آباء واجداد کے کارناموں کی چھاپ پڑ سکے اور وہ اسلامی قالب میں ڈھل کر اپنے مذہب کی تاریخ، آباء واجداد کی قربانی اور اپنی نسلی خصوصیات کو سامنے رکھ کر اپنی زندگی کا نقشہ مرتب کریں۔ اور ان پر عمل پیرا ہونے کی

کوشش کریں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نوراللہ مرقدہ کو اللہ تعالی نے ان گنت خوبیوں سے نوازا تھا، اور آپ کی شخصیت علمی، عملی، ادبی، اور اخلاقی آلات سے متصف تھی، آپ کی تاریخ ساز شخصیت نے مکمل ایک صدی اسلام اور مسلمانوں کی ہر شعبۂ زندگی میں رہنمائی فرمائی اور سسکتی ہوئی انسانیت کو حیات نو بخشی آپ نے جہاں اہم موضوعات پر کتابیں لکھ کر امت مسلمہ کی رہنمائی فرمائی وہیں ادب کے ساتھ اسلامی لفظ بڑھا کر اپنی متعدد تصانیف میں قرآن واحادیث کی روشنی میں اسلامی ادب کو پیش کر کے پورے عالم اسلام کو چونکا دیا، اور اپنی تبحر علمی کا پوری علمی دنیا سے لوہا منوایا، اور رابطۂ ادب اسلامی کا قیام فرما کر ادب اور اسلام کے درمیان تعلق پیدا کر کے فطرتِ سلیمہ کے مطابق زندگی گذارنے کا سلیقہ سکھایا۔

جہاں آپ نے بڑوں کے لئے متعدد تصانیف تحریر فرمائیں بچے بھی آپ کے ادبی ذوق اور علمی وعملی کمالات سے محروم نہ رہے، ادب اطفال اور ان کی دینی واسلامی تربیت نیز ان کی ذہنی نشو ونما اور ان کو دین وعقیدہ سے وابستہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو گردوپیش سے باخبر رکھنے کے لئے ایسا نصاب تجویز فرمایا جس کی زبان وطرز ادا اور جذبات ومحرکات کو ابھارنے اور صحیح افکار وتصورات کا بیج بونے اور قلب میں انفعال وتاثر پیدا کرنے کی عالم اسلام کے بڑے بڑے مفکرین، ماہرین تعلیم، ادباء وعلماء اور مؤرخین اسلام نے تعریف ہی نہیں کی بلکہ آپ نصاب کو ادب اطفال کے لئے سب سے بہتر قرار دیا ہے اور اس کو بڑے بڑے مدارس اور جامعات کے نصاب میں داخل کیا گیا، اور آج آپ کا وہ نصاب عالم اسلام اور ہندوپاک کے علماء کے لئے مرکز توجہ بنا ہوا ہے۔

عربی زبان وادب کے ساتھ بچوں کو براہ راست دین وعقیدہ کی تعلیم اور ان

کی فکری وذہنی نشونماء کے لئے آپ نے قصص النبیین کا سلسلہ جاری کیا اور حضرات انبیاء کی تاریخ ان کے عظیم الشان کارناموں اور دعوت الی اللہ کے راستہ میں ان کی تکالیف کو جس عجیب وغریب طرز بیان اور نادر عناوین کے ساتھ بیان فرمایا ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے، بچوں کے دل ودماغ میں اللہ تبارک وتعالی کی عظمت اور اس کی وحدانیت نیز اللہ تعالی کی قدرت کاملہ اور حکمت الہیہ کی کارہ گری کو راسخ کرنے کے لئے اگر قصص النبیین کے تیسرے حصے کو مثال کے طور پر پیش کیا جائے تو شاید اس سے بہتر کوئی دوسری کتاب نظر نہ آئے۔

آپ نے اس حصے میں اولوالعزم پیغمبر سیدنا حضرت موسی علیہ السلام کے واقعہ کو قرآن واحادیث کی روشنی میں بدیع اسلوب اور آسان زبان میں بیان فرمایا ہے اس سے جہاں عربی الفاظ ومحاورات اور نئی نئی تعبیروں سے لطف اندوزی کے مواقع ملتے ہیں، اسی کے ساتھ بچوں کے سامنے عظمت خداوندی، تقدیر پر مکمل یقین وحکمت اللہ اور تدبیر الہی کا فائق ہونا، حق کی دعوت میں جرأت کا مظاہرہ، اور ظالم کی شکست اور بربادی جیسے بنیادی عقائد کی تصویر سامنے آجاتی ہے، اور یہ تمام چیزیں، بچوں کی دینی تربیت اور ان کی فکری وعملی زندگی کا رخ متعین کرنے کا سبب بن جاتی ہیں۔

آپ نے بچوں کو تاریخ اسلامی سے واقف کرانے اور اپنے عظیم الشان تاریخی ورثہ کی عظمت اور حفاظت کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے قصص من التاریخ الاسلامی تصنیف فرمائی اور انوکھے عنوانات کے تحت تاریخ اسلام اور مجاہدین کے وہ عظیم الشان کارنامے بیان فرمائے جن سے بچوں کے اندر جذبۂ ایثار قربانی اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے ہر طرح کی قربانی دینے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اس کے لئے المضیف الجائع، شهامة اليتيم، مسابقة بين شقيقين جیسے عنوانات کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ آپ نے بچوں کو اپنے ملک اور اپنے آباء واجداد کے کارناموں

اوران کے خاندانی ونسلی افکاروتصورات سے متعارف کرانے اورگردوپیش کے ماحول کوسامنے رکھ کراپنے مستقبل کا خاکہ مرتب کرنے کے لئے القرأۃ الراشدہ کے کئی حصے تصنیف فرمائے،جس کے ایک عنوان (المنارۃ تحدث) قطب منار بولتا ہے کومثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے،آپ نے اس میں قطب منار کی زبانی بچوں کوقطب منار کی تاریخ،ہندوستان میں سلاطین مغلیہ کی آمد،اوران کی حکومتوں کی تاریخ،ان کے عظیم کارنامے اورہندوستان میں ان کی عدیم المثال عمارتوں کے انمٹ نقوش اوران کی داستان ایسے عجیب وغریب انداز سے سنائی ہے جس سے بچوں میں خوداعتمادی، احساس برتری پیدا ہوتا ہے،اپنے وطن اوراپنے آباءواجداد کے آثار سے محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

آپ نے القرأۃ الراشدہ میں بچوں کو یہ سمجھایا ہے کہ اس ملک کوآزاد کرانے میں ہمارے اسلاف واکابرین نے اہم کردارادا کیا ہے،اور غیرمعمولی قربانیاں دی ہیں اورمسلمان اس ملک کی تعمیروترقی اوراس کواچھا بنانے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے ہیں آپ نے ندوۃ العلماء،دارالعلوم دیوبند،مظاہرعلوم سہارنپور،عنوانات کے تحت بچوں کواسلامی تعلیمات کی نشرواشاعت اوراس کواس ملک میں باقی رکھنے کے سلسلہ میں اسلاف واکابرین کی بےمثال قربانیوں کویاددلایا ہے،تاکہ ان کے دلوں میں ان اداروں کی عظمت باقی رہےاوریہ بھی اس طرح کی مخلصانہ دینی جدوجہد کے لئے اپنے آپ کوتیار کرلیں۔

آپ کی ادب اطفال کے لئے مخلصانہ خدمات اورعظیم الشان کارناموں کااس مختصرتحریر میں احاطہ کرنا بہت مشکل ہے،آخرمیں یہ ہی کہنا مناسب ہے کہ جس طرح آپ نے اپنی عظیم الشان تصانیف کے ذریعہ امت مسلمہ کے ہرطبقہ کی رہنمائی فرمائی ہےاوران کوہرخطرہ سے آگاہ کیا ہے،اسی طرح آپ نے فرزندانِ اسلام اورمسلمانوں کے بچوں کی

دینی، اخلاقی، تعلیمی، اور ذہنی و عقلی تربیت کرنے کے لئے ایسا نصاب تیار کیا ہے جس میں بچوں کے لئے ہر قسم کی غذا موجود ہے، اور جس کو پورے عالم اسلام میں بہ نظر تحسین دیکھا گیا ہے۔

مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی

حضرت مولانا علی میاںؒ کا مذاق شعر وسخن

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ شاعر نہیں تھے لیکن ان کا دماغی سانچہ ادب آفرینی وادب آموزی اور ادب پروری کا خزینہ تھا۔ ان کے والد حضرت مولانا سید عبدالحی حسنی علیہ الرحمۃ عربی کی طرح اردو کے بھی بڑے مصنف تھے، ان کی کتاب ''گل رعنا'' مولوی محمد حسین آزاد کی ''آب حیات'' کی طرح مرصع نثر نگاری کا نمونہ تو نہیں ہے مگر ادباء کو صحیح مقام دینے اور شعراء کے مراتب کا تعین کرنے میں ان کی کتاب ممتاز ہے وہ ''گل بے خار'' کے بعد کسی اردو تاریخ ادب کی کتاب سے پیچھے نہیں ہے۔ حضرت مولانا کی والدہ ماجدہ کا چھپا ہوا دیوان موجود ہے۔ دعا اور ابتہالات، آہ صبح گاہی اور مناجات نیم شبی کا بہترین نمونہ ہے۔ آپ کی ایک بڑی ہمشیرہ اپنی والدہ کے رنگ میں ڈوب کر کہنے والی منظوم دعاؤں کی شاعرہ تھیں، اور آپ کا پورا خاندان ادب اور شعر وشاعری سے نہ صرف آشنا بلکہ اس کا اعلیٰ مذاق رکھتا تھا، حضرت مولانا کو بھی نوعمری میں کچھ اشعار موزوں کرنے کا شوق ہوا مگر آپ کے برادر بزرگ ومربی مولانا سید عبدالعلی حسنی نے منع کر دیا۔ اور وہ وہبی صلاحیت جو ادب اور شعر وشاعری کی طرف مائل ہو سکتی تھی نثر کی طرف مائل ہو گئی اور نثر بھی قدیم طرز کے ضلع جگت اور محاورات وامثال کے نگینوں سے سجی ہوئی نہیں بلکہ سادہ اور رواں، دل افروز اور دلنشیں نثر آپ کے حصہ میں آئی۔ جس پر اخلاص وصداقت نے

مہر لگادی اور ایک وجدانی کیفیت لفظ لفظ سے نمایاں ہونے لگی۔ آپ کی تصنیفات میں جو کتابیں براہ راست اردو میں لکھی گئیں ان کے اندر جامعیت سنجیدگی، خطابت اور اعلیٰ درجہ کی من موہنی صلاحیت ہے۔ سیرت سید احمد شہیدؒ سے لے کر ''پرانے چراغ'' تک اور ان کے درمیان جو کتابیں براہ راست حضرت مولانا نے اردو میں لکھی ہیں ان کے اندر ایک عالمانہ ٹھیراؤ، پروقار لہجہ، متانت اور اعتدال کا نمونہ ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کو شعری ذوق میں حصہ کم ملا ہو، بلکہ اچھے شعر کی پسند اور اچھے شعر پر طبیعت کے اندر جوش کا پیدا ہونا اور اس سے مناسبت وقت میں کام لینا آپ کے یہاں عام تھا۔ نالۂ نیم شبی، یا یوں کہئے لمحات ذکر کے دوران کبھی کبھی بڑے درد کے ساتھ، بھرائی ہوئی آواز میں اپنی والدہ کی کہی ہوئی مناجات پڑھا کرتے تھے۔

ترا شیوہ کرم ہے اور مری عادت گدائی کی
نہ ٹوٹے آس اے مولی ترے در کے فقیروں کی
گھٹا رحمت کی آئے اور جم جم کے یوں برسے
ہری ہوں کھیتیاں کچھ ہم غریبوں بدنصیبوں کی

حرم کی حاضری کے موقع پر جب آپ ملتزم پر تشریف لے جاتے تو یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔ اور اس وقت آواز میں جو تھرتھراہٹ اور لہجہ میں کانپنے کا انداز پیدا ہو جاتا، اس کو الفاظ میں کہنا مشکل ہے۔

بردرت آمدہ بیگریختہ
آبروئے خود زعصیاں ریختہ

اور یہ قطعہ ؎

مفلسا نیم آمدہ درکوئے تو　　شیأ للہ از جمال روئے تو
دست بکشا جانب زنبیل ما　　آفرین بردست و بر بازوئے تو

اس سلسلہ کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے کہ حضرت شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مکی اپنے آخری ایام حیات میں مدینہ منورہ میں قیام فرماتے تھے۔ان سے حضرت مولانا علی میاں قدس سرہ نے اپنے ایک خط میں اس خواہش کا اظہار کیا کہ میری طرف سے در کعبہ پر کوئی شعر پڑھ دے۔حضرت شیخ کی شفقت اور طالب کی محبت کا یہ منظر دیکھنے میں آیا کہ حضرت شیخ نے اپنے چھوٹے چھوٹے مہین کاغذ کے پرچوں پر یہ دونوں شعر لکھوا کر نہ جانے کتنے خدام اور نیاز مندوں کو عطا فرمایا کہ جا کر علی میاں کی طرف سے یہ شعر پڑھ دینا۔صوفی اقبال ہوشیار پوری مرحوم کو تو ایسا وجد آیا کہ صرف اسی کو پڑھنے کے لئے حرم کعبہ میں حاضری (عمرہ) کا احرام باندھ لیا۔بھائی سعدی مرحوم (شیخ محمد سعید بن حکیم محمد نعیم برادر مولانا صاحبؒ) نے میرے نام کا یہ پرچہ عطا فرمایا جواب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔

علامہ اقبال کے اشعار سے حضرت مولانا کو بے حد مناسبت تھی اور اس مناسبت کا سبب یہ تھا کہ اقبال کے اشعار میں مسلمانوں کو جس طرح لوگوں نے پست اور ذلیل سمجھ رکھا ہے اور یورپ نے سائنس اور ٹکنالوجی میں ترقی کی بناء پر دنیا پر اپنا قبضہ جما رکھا ہے جس کی وجہ سے خود مسلمانوں کے اندر احساس کمتری پیدا ہو گیا ہے اور وہ لوگ جو مغربی علوم سے متاثر ہیں یا مغربی اقوام کے ٹھاٹ باٹ، عیش و کامرانی کو دیکھتے ہیں وہ اپنے آپ کو پست اور پست ماندہ سمجھتے ہیں اور یہ کہ

دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشانی نظری کا

حضرت سید احمد شہیدؒ کو مولانا نے اپنا آئیڈیل قرار دیا۔ان کی سوانح لکھی، اقبال کے اشعار میں بھی جھلک ان کو اس عزم و یقین کی ملی جو سید صاحب فرماتے کہ سید صاحب اسلام کی برتری پر وہ یقین رکھتے تھے جس کے لئے ایک بڑی جماعت کے

ساتھ شہید ہوئے غالباً اسی لئے وہ علامہ اقبال سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ اپنی شہرۂ آفاق تألیف ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' اس میں ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کا بیشتر حصہ نقل کیا ہے۔ نیز ''روائع اقبال'' مولانا کی مقبول ترین تصانیف میں سے ہے۔ ڈاکٹر احمد عبدالرحمان القصاب جو سعودی ریڈیو میں لبنانی اناؤنسر تھے۔ وہ اس کتاب کو ہر ہفتہ بالاقساط پیش کرتے تھے۔ ایک مرتبہ پڑھتے ہوئے جذبات کی فراوانی میں رو پڑے اور یہ بھول گئے کہ وہ میکروفون کے سامنے بیٹھے براڈ کاسٹ کر رہے ہیں۔ علامہ اقبال کے اشعار کو ڈاکٹر عبدالوہاب عظیم..... سفیر برائے پاکستان اور سابق پروفیسر فارسی قاہرہ یونیورسٹی نے نظم میں ترجمہ کیا ہے اور کئی دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن نظم میں ہونے کی وجہ سے اور فارسی پس منظر اور تصوف کی اصطلاحوں کے نہ جاننے کی بناء پر لوگ ان کے ترجموں سے علامہ اقبال کو نہیں سمجھ سکے، لیکن مولانا نے اپنے قاہرہ کی تقریروں میں جن کا مجموعہ ''روائع اقبال'' ہے اقبال کو اس طریقہ سے پیش کیا کہ پڑھنے والوں کی سمجھ میں ان اشعار کی روح آ گئی۔ اس کا اعتراف علامہ اقبال کے صاحبزادہ ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی کیا ہے اور عراق کے شاعر سلطان نجفی نے بھی کیا ہے جنہوں نے اقبال کے ترانہ (چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا) کا ترجمہ کیا ہے اور اس کی دھن بھی بنائی ہے۔ (الصین لنا والعرب لنا والهند والكل لنا　أضحى الاسلام لنا دينا وجميع الكون لنا وطنا)

انہوں نے بھی مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی نثری ترجمانی کو سراہا اور یہ لکھا کہ اقبال کو اس کتاب کے پڑھنے کے بعد میں شاعر اسلام سمجھتا ہوں۔ علامہ اقبال کے بہت سے اشعار جابجا مختلف اردو کتابوں میں آئے ہیں ابھی کئی سال ہوئے اردو اکیڈمی کے ایک سمینار میں جو حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی کے اوپر ہوا تھا مولانا نے پورے جوش اور امنگ کے ساتھ یہ اشعار پڑھے تھے:

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن

جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا
جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

نقوش اقبال: ص۔۹۸

مولانا جب قاہرہ تشریف لے گئے ہیں اور وہاں جو آپ نے پہلی تقریر کی ہے اس کا عنوان اقبال کا یہ مصرعہ تھا، محمد عربی سے ہے عالم عربی۔ اور اس کا عربی ترجمہ "محمد روح العالم العربی" ہے اس کو اتنی طاقت سے پیش یا جس میں کہ اپنے لکھنے اور بولنے کی جتنی بھی صلاحیت اللہ نے دی تھی وہ صرف کردی، اتنی طاقت کے ساتھ جو وحی الہام کے بعد حوصلہ بشری اور قوت بشری سے توقع کی جاسکتی ہے اور یہی وہ مصرعہ ہے جو زندگی کے آخری ایام میں جب عالم اسلام کی بڑی شخصیت کا ایوارڈ لینے کے لئے دبئی تشریف لے گئے تھے اس میں بار بار اسی شعر کو پڑھا:

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا　　محمد عربی سے ہے عالم عربی

یہ سچ ہے کہ مولانا کے دل و دماغ کو اقبال کے کلام نے بہت متاثر کیا اور مولانا نے اپنے خیالات کو ادا کرنے کا ذریعہ اقبال کے اشعار میں پایا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اقبال کے علاوہ آپ نے دوسرے شعراء کا کلام نہ پڑھا ہو یا ان سے واقفیت نہ ہو۔

مولانا کے والد کی کتاب ''گل رعنا'' بعض ترقی پسند ناقدین کو بری لگی' کیونکہ مصنف نے اس واقعہ کا اظہار کر دیا کہ یہ کتاب ایک ایسے وقت لکھی گئی جب سامنے کوئی بڑا علمی کام نہیں تھا اس پر بعض ناقدین نے تنقید کا سخت لہجہ استعمال کیا ہے۔

حضرت مولانا نے ''گل رعنا'' کے نئے ایڈیشن کا ایک مقدمہ لکھا جس میں مصنف کی انصاف پسندی اور آب حیات کے مصنف کی ناانصافی اور ان کے فرقہ وارانہ تعصب کو واضح کیا اور اس سلسلہ میں آب حیات میں جو کوتاہیاں تھیں ان کی نشاندہی کی اور بیسیوں شعراء کا نام ان کے زمانے کے تعین کے ساتھ ان کے رتبے و درجے کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی نظر اردو ادبیات پر کچھ کم نہیں تھی۔ جگر مرادابادی مرحوم کے اشعار بعض جگہ آپ نے نقل کئے ہیں اور دل سے داد دی ہے مثلاً:

واعظ کا ہر ارشاد بجا ، تقریر بہت دلچسپ مگر
آنکھوں میں سرور عشق نہیں ، چہرہ پہ یقیں کا نور نہیں

اسی طرح میرؔ کے ایک آدھ شعر یا مصرعہ آپ نقل کرتے رہے ہیں، اچھے اشعار کو آپ پسند فرماتے تھے مثلاً آسی غازیپوریؒ کا یہ شعر ؎

صبا ادب سے یہ کہیو میرے سلام کے بعد
کہ تیرے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

ایک مجلس میں اس شعر کو پڑھ کر یہ واقعہ سنایا کہ حضرت آسیؔ کا جب آخری وقت ہوا اور حافظہ کی طاقت کم ہو چکی تھی کسی نے ان کو یہ شعر سنایا انھوں نے پوچھا یہ شعر کس کا ہے لوگوں نے کہا حضرت! یہ شعر آپ ہی کا ہے۔ اس پر حضرت آسیؔ نے کہا تو پھر تم اس شعر کو اس طرح پڑھو:

صبا ادب سے یہ کہیو میرے سلام کے ساتھ
کہ تیرے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے ساتھ

ایک مجلس میں وحشت کلکتوی کا ایک شعر راقم نے کسی مناسبت سے سنایا اور مجھے یاد ہے کہ آپ کی آنکھیں بھر آئی تھیں داد و تحسین کا یہ ایک خاص انداز ہے بہر حال شعر یہ تھا۔

لاکھ ناداں سہی پر اتنے بھی تو ہم کور نہیں
کہ چمن دیکھ کے ذکر چمن آرا نہ کریں

بہر حال شعر فہمی، شعر خوانی اور شعر سے لطف اندوز ہونے کا وقت آپ کی زندگی میں بہت کم تھا جہاں معرکے کے اجتماعات ہوں، عالم اسلام کے چوٹی کے افراد سے خطاب کرنا ہو، زندگی ایک دھن میں ایک کام کے گرد گذر رہی ہو وہاں شاعری اور شعر خوانی کے لئے فرصت کہاں لیکن کچھ لمحات زندگی کے ایسے مل جاتے ہیں جس میں یہ ذوق نکھر کر سامنے آتا ہے، حضرت مولانا کے وہ خدام اور نیاز مند اور اہل خانہ اور قرابت مند اس طرح کے مواقع سے مستفید ہوئے ہیں جب آپ پر ایک نغماتی کیفیت طاری ہوئی۔ چند اشعار فارسی کے بھی آپ کی زبان پر تھے۔ آپ نے اپنے شیخ شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کی سوانح لکھی تو اس کی ہر فصل ایک دو فارسی کے اشعار سے شروع کی یہ بھی ایک انداز کلام تھا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اگر آپ نوعمری ہی میں شاعری سے روک نہ دیئے جاتے تو کلام کس درجہ آبدار اور ادب کے لئے تحفہ ہوتا۔

مولانا فیصل احمد بھٹکلی ندوی

حضرت مولانا علی میاںؒ کا ذوق شاعری

ایک عالم اور داعی کے لئے جو اپنی دعوت کو کارگر اور اپنی جدوجہد کو بارآور دیکھنا چاہتا ہو ضروری ہے کہ اس کو زبان وادب سے تعلق اور شعر وشاعری سے مناسبت ہو اسی سے اس کی تحریروں میں شستگی اور تقریروں میں برجستگی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے افکار میں تازگی اور خیالات میں نیرنگی نظر آتی ہے۔ اس سے اس کی شخصیت قدآور اور طاقتور بنتی ہے اور اس کی باتیں اثر انگیز اور دلآویز ثابت ہوتی ہیں اور انجام کار اس کی محنت رنگ لاتی ہے۔ تقدیر کی کرم فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولاناؒ کے لئے اس کے سارے مواقع فراہم کئے حضرت مولانا خود اس کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ

> یہ میری بڑی خوش نصیبی تھی کہ ابتدائے عمر اور عربی تعلیم کے آغاز ہی کے زمانے میں میں نے اردو زبان وادب کی معیاری کتابیں پڑھ لیں۔ دین کے جن داعیوں اور علماء کو آغاز عمر میں اپنے ملک کی زبان وادب کے مطالعہ اور اس کا ذوق پیدا کرنے کا موقع نہیں ملتا یا بڑی عمر میں وہ ان کا مطالعہ کرتے ہیں ان کو دین کی موثر دعوت دینے اور دینی حقائق کی تفہیم وتعلیم میں نیز جدید تعلیم یافتہ طبقے میں دینی مقاصد کو دل نشیں کرنے میں دقت پیش آتی ہے

اوران کی انشاء وتحریر میں وہ طاقت اور دلآویزی نہیں ہوتی جس کی اس عہد میں ضرورت ہے۔ (کاروان زندگی حصہ اول، ص ۹۳۔۹۴)

آپ کے والد ماجد حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی اردو کے صرف ادیب اور مؤرخ ہی نہیں بلکہ شعر وشاعری کے بھی بڑے نقاد تھے جس کی شاہد ان کی تصنیف ''گل رعنا'' ہے اور دادا مولانا حکیم سید فخر الدین خیالی فارسی کے بڑے ادیب وانشاء پرداز ہونے کے ساتھ اردو کے بھی قادر الکلام شاعر تھے۔ یہی نہیں بلکہ والدہ مرحومہ بھی ایک صاحب سوز وگداز شاعرہ تھیں اور ہمشیرہ مرحومہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ بھی محفل شعر وسخن کی ایک خوبصورت دلہن تھیں تو شعر وشاعری کی گود میں آپ نے پرورش پائی جس کو عربی تعبیر میں ''رضع بلبان الشعر والادب'' کہنا چاہیے۔

اولین اشعار جن سے مولانا کے کان موزوں کلام سے آشنا ہوئے وہ یہ سیدھی سادی نظم ہے جس میں دائی حلیمہ کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔

ایک عاشق تھی حلیمہ دائی　　جس نے گھر بیٹھے یہ دولت پائی
وہ کچھ اس رمز سے آگاہ نہ تھی　　اس کی قسمت میں یہ دولت تھی لکھی
نوراللہ کو لائی گھر میں　　یعنی اس شاہ کو لائی گھر میں
واہ کیا طالع بیدار ملے　　جس کو کونین کے سردار ملے

یہ وہ اشعار ہیں جن سے مولانا کے کشت زار قلب میں حب رسول کا بیج پڑا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ جو چیز کسی تاثر کا ذریعہ بنتی ہے آدمی کا دل طبعاً خود اس کی طرف مائل اور اس سے مانوس ہونے لگتا ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان اشعار سے مولانا کے موزوں کلام سے انس کا آغاز ہوتا ہے۔

کچھ اور شعور پیدا ہوا تو ''صمصام الاسلام'' کی مجلسوں میں شرکت کرنے اور اس کے اشعار سے لطف لینے لگے۔ یہ واقدی کی ''فتوح الشام'' کا منظوم ترجمہ ہے

جسے حضرت مولاناؒ کے ایک خاندانی بزرگ منشی سید عبدالرزاق کلامی ٹونکی (م ۱۹۱۶ء) نے پچیس ہزار شعروں میں اردو میں نظم کیا ہے مولانا کے خاندان میں دستور تھا کہ تقریباً روزانہ گھر کی خواتین ایک جگہ جمع ہو جاتیں اور یہ کتاب پڑھی جاتی۔ حضرت مولاناؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

> عموماً عصر بعد مجلس ہوتی بچے بھی کبھی اپنی ماؤں کے پاس کھیلتے کھیلتے یا کسی پیغام کے لئے آجاتے اور بے ارادہ کچھ دیر ٹھہر کر سنتے کبھی باارادہ بیٹھ جاتے اور کبھی مائیں اپنے پاس بٹھا کر سننے کا موقع دیتیں پھر جب اس میں لطف آنے لگتا تو کھیل چھوڑ کر اس مجلس میں شریک ہوتے۔
>
> میری خالہ مرحومہ جب سادہ و بے تکلف لیکن پر اثر لہجہ میں یہ اشعار پڑھتیں تو جہاد کا ایک سماں بندھ جاتا، دل امنڈ آتے، حضرت خالدؓ حضرت ضرارؓ اور ان کی بہن حضرت خولہ بنت الازورؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ اور مجاہدین شام کی جاں بازی اور شجاعت کا ذکر آتا تو مجلس پر ایک کیف و سرور اور نشہ سا طاری ہو جاتا کسی سخت معرکہ میں مسلمانوں کے گھر جانے اور کسی بہادر کے شہید ہونے کا تذکرہ ہوتا تو آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتیں۔ آنسوؤں کے یہ طوفان اٹھتے اور برستے تو ان کا چھینٹا ہمارے معصوم دلوں پر بھی پڑ جاتا اور نرم مٹی کو تر کر جاتا۔
>
> (مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، ص ۱۵۷۔۱۵۸)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسی عمر میں مولانا کے اندر سخن فہمی کی صلاحیت کافی حد تک پیدا ہو گئی تھی اس کتاب کی تاثیر کو ایک دوسرے موقع پر اس طرح بیان کیا ہے۔

''معلوم ہوتا ہے کہ معرکہ جہاد برپا ہے تلواریں چمک رہی ہیں مجاہدین ہتھیلی پر سر رکھے ہوئے لڑ رہے ہیں۔ اور راہ خدا میں جان دے اور لے رہے ہیں، کتاب کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ پڑھنے والے کی آواز گلوگیر اور آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ اور سننے والوں کو سر و پا کا ہوش نہیں رہتا۔ (پرانے چراغ دوم، ص ۳۴۹)

اسی کے ساتھ آپ کے گھر میں ''مسدس حالی'' کا بھی بڑا چلن تھا۔ بقول خود اس زمانہ میں شرفاء اور پڑھے لکھے لوگوں کا کوئی بھی گھر اس کتاب کے مطالعہ اور نغمہ خوانی سے خالی نہ تھا۔ (پرانے چراغ دوم، ص ۳۴۷)

دوسری جگہ مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

اس وقت شرفاء کے خاندانوں میں مسدس حالی کا عام رواج تھا۔ اس کے اشعار لوگوں کے نوکِ زباں تھے۔ تقریروں اور مواعظ میں جابجا اس کے اشعار سے کام لیا جاتا مضامین میں نقل کئے جاتے۔ میں نے بھی مسدس کو بڑے جوش و لطف سے بار بار پڑھا۔ اس کے اشعار اپنی تقریروں میں جو بچوں کے جلسوں میں کی جاتیں اور انعامی مضامین میں جو مقابلہ کے لئے لکھے جاتے بار بار نقل کئے۔ اس کا بہت سا حصہ زبانی یاد تھا۔

(مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، ص ۱۵۹)

اس پر مستزاد وہ زمانہ ہی ایسا تھا کہ اودھ کا چپہ چپہ شعر و شاعری سے گونج رہا تھا۔ حضرت مولانا لکھتے ہیں:

یہ وہ دور تھا جب قصبہ قصبہ اور گاؤں گاؤں مشاعرے ہوتے تھے، شعر کہنا زندہ دلی اور پڑھے لکھے ہونے کی علامت تھی خاندان

میں بھی کئی شاعر تھے اور سخن فہم اور شعر و سخن فہم کے قدرداں تو سبھی تھے۔　　(پرانے چراغ دوم ۳۲۳)

اس کم سنی کے زمانے میں مولوی اسماعیل میرٹھی کی مشہور و مفید نصابی کتاب ''سفینۂ اردو'' پڑھنے کا موقعہ ملا حضرت مولانا رقمطراز ہیں:

اسی چھوٹی عمر میں اس کتاب کے منتخب مضامین اور نظموں نے جو اردو کے بہترین انشاء پردازوں اور شاعروں کے قلم سے تھے ہمارے دل و دماغ پر بڑا اثر ڈالا خاص طور پر مولانا ظفر علی خاں کی نظم ''راجہ دسرتھ کی کہانی ان کی زبانی'' جس میں انہوں نے راجہ دسرتھ کے ہاتھ سے ایک رشی کے لڑکے (جو اپنے بوڑھے باپ کے لئے پانی لینے صبح تڑکے دریا پر گیا تھا اور ان کے تیر سے گھائل ہو گیا تھا) کی دلدوز کہانی سنائی ہے اس میں ان کی شاعری کا جوہر اور پر اثر مناظر و جذبات کی تصویر کشی کا کمال اپنے پورے عروج پر ہے۔ ہم دونوں بھائی بہنوں (ہمشیرہ محترمہ مرحومہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ مراد ہیں) نے مزے لے لے کر یہ کہانی بار بار پڑھی اور عجب نہیں کہ اس کے بعض حصوں پر ہمارا دل امنڈ آتا اور آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہوں۔ اس نظم کا مطلع تھا:

ابر تھا چھایا ہوا اور فصل تھی برسات کی
تھی زمیں پہنے ہوئے وردی ہری بانات کی

آگے لکھتے ہیں:۔

اس مجموعہ کے مضامین نظم و نثر کے بار بار پڑھنے سے ہم لوگوں کے اندر اچھی عبارت اور اچھے شعر کا لطف لینے کی صلاحیت

پیدا ہوئی۔ (پرانے چراغ دوم، ص ۳۴۷۔۳۴۸)

مولانا ظفر علی خاں کی نظموں نے حضرت مولانا کے دل و دماغ کو بہت متاثر کیا تھا۔ اور ان کی شخصیت سے تاثر کا یہ عالم تھا کہ بتعبیر خود مولانا ان کے نہ صرف معتقد بلکہ ان کی شاعری اور ذہانت سے مسحور تھے اسی وجہ سے ابتدائے عمر میں شاید کسی شخصیت سے اتنا متاثر نہیں ہوئے تھے جتنا اس بلبل خوشنوا اور شاعر سحر بیاں سے اور اس میں اس ادبی ذوق کو بھی دخل تھا جو خاندانی ورثہ کے طور پر ملا تھا۔ (پرانے چراغ سوم، ص ۲۳۵۔۲۳۶)

اور اسی کا نتیجہ تھا کہ نوعمری ہی میں اپنے ہم عمر لڑکوں سے بحث کرتے اور مولانا ظفر علی خاں کو سب پر بھاری قرار دینے کی کوشش کرتے۔ (ملاحظہ ہو پرانے چراغ سوم، ص ۲۳۵)

پھر ''آبِ حیات'' اور ''گل رعنا'' کے بار بار مطالعہ نے بہت سے منتخب اشعار ذہن و دماغ میں محفوظ کر دیئے۔ اور شعر فہمی کی نعمت سے بہرہ مند کیا۔ تفصیل حضرت مولانا کی زبانی سنئے:

> عم محترم مولانا سید طلحہ صاحب کی صحبت اور مجلسوں میں آب حیات سے تعارف ہوا۔ سنی اور بار بار پڑھی یہاں تک کہ اس کے بہت سے مضامین مستحضر ہو گئے۔ اشخاص، شعراء اور ان کا کلام دماغ پر اس طرح نقش ہو گئے جس طرح بچپن کی دیکھی ہوئی چیزیں اور سنی ہوئی باتیں ذہن پر مرتسم ہو جاتی ہیں اور ان کا دماغ پر کوئی بار نہیں ہوتا۔
>
> ''گل رعنا'' گھر کی کتاب تھی اس کو اتنی بار پڑھا کہ اردو شاعری کی تاریخ اور شعراء کے متعلق اتنے معلومات ہو گئے کہ اس موضوع پر مجلس میں گفتگو کرنے اور گفتگو میں حصہ لینے کی استعداد

پیدا ہوگئی۔

سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے آگے لکھتے ہیں:

''میرے ماموں زاد بھائی حافظ سید حبیب الرحمٰن جامعہ ملیہ میں پڑھتے تھے ان کو اردو شعر وشاعری کا بڑا شوق تھا ان کا ایک خاص ذوق یہ تھا کہ بچوں سے اساتذہ کے اشعار کا مطلب پوچھتے اور اردو میں تقریر وتحریر کے مقابلہ کرواتے۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر مومنؔ، غالبؔ، ذوقؔ اور لکھنؤ کے شعراء میں آتشؔ اور امیرؔ مینائی کے کلام سے ان کو خاص ذوق تھا۔ چنانچہ ان کے اشعار سننے اور ان کا مطلب بیان کرنے کے سلسلہ میں دماغ پر زور ڈالنے اور مشکل اشعار کے سمجھنے کی عادت پڑی۔ شعر فہمی اور ذوق آفرینی میں ان کے بڑے بھائی مولوی سید ابوالخیر برقؔ صاحب کا بھی حصہ ہے جو لکھنؤ کی زبان کی عاشق، محاورات اور الفاظ کی تذکیر وتانیث میں سند اور استاد کا درجہ رکھتے تھے خود بھی شعر کہتے تھے اور اچھے کہتے تھے۔ (کاروان زندگی اول، ص ۹۴، ۹۵)

اردو زبان وادب اور شعر وشاعری سے اس حد تک واقفیت، لگاؤ اور تذوق کے ساتھ عربی زبان وادب کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا اور اس طرح کے بقول خود ''وہی اوڑھنا بچھونا، وہی مقصد حیات اور وہی ذوق طبع'' تھا۔

(ملاحظہ ہو مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، ص ۱۶۵)

عربی زبان وادب کی تعلیم شیخ خلیل عرب صاحب یمانی کی رہین منت ہے حضرت مولانا نے ان سے نظم میں دیوان الحماسہ، قصیدہ بانت سعاد، لامیۃ العربی للشنفری

ابوالعلاء المعری کا دیوان ''سقط الزند'' اور متنبی اور بحتری کے کلام کا کچھ حصہ پڑھا۔

شیخ خلیل عرب صاحب کو حضرت مولانا ہی کی تعبیر میں عربی زبان کا ذوق نہیں ''ذائقہ'' تھا۔ مولانا نے ان کے اس ذوق صحیح کی اس طرح تصویر کھینچی ہے۔

جس شعر پر مصنف کو سرور آتا ان کو بھی وجد آجاتا اور وہ جھوم جھوم کر اس کو پڑھتے اور دیر تک اس کا مزہ لیتے رہتے۔ شعراء میں بحتری کی عربیت شعر کی موسیقیت اور ترکیب کی چستی کے بڑے قائل تھے۔ متنبی کی مضمون آفرینی اور نازک خیالی کے مداح تھے۔ ان کو سینکڑوں شعر یاد تھے خود بھی آبدار شعر کہتے تھے اور بعض اساتذہ کے رنگ سے رنگ ملا دیتے، حماسہ کے اشعار یا بحتری کے بعض قصائد پڑھتے تو سوق عکاظ کا نقشہ نظر کے سامنے پھر جاتا اور شعر عربوں کے ذوق اور اعصاب پر جو ساحرانہ اثر رکھتا تھا اور جس طرح وہ قبائل کی قسمتوں عزت اور ذلت کے معیار کو بدل دیتا اور ایک صحیح المذاق عرب کو وارفتہ اور از خود رفتہ کر دیتا اس کی تصدیق ہو جاتی تھی وہ شعر پڑھتے وقت ہمہ تن تصویر بن جاتے اور ان کے روئیں روئیں سے شعر اور نغمہ ابلتا نظر آتا۔

(پرانے چراغ حصہ اول، ص ۲۱۸)

یہی نہیں بلکہ ''اپنے ذوق ونظر کو اپنے طلبہ تک منتقل کر دینے اور ان کے رگ وریشہ میں اتار دینے کی عجیب وغریب قابلیت، زیر درس کتاب میں جان ڈال دینے، فن کا صحیح ذوق پیدا کر دینے، اور مصنف کا ہم زبان اور ہم مذاق بنا دینے کی ان میں وہ بے نظیر قدرت تھی جو ہزاروں میں سے کہیں کسی ایک استاد اور ماہر فن

میں ہوتی ہے۔ یہ قابلیت کسبی نہیں بلکہ وہبی ہے۔

(پرانے چراغ حصہ اول، ص ۲۱۳)

تو اس کیفیت کے حامل استاد کا پروردہ ادب کا چشیدہ اور وہ بھی حضرت مولانا جیسا ذہین محنتی اور محبوب شاگرد اس کے اعصاب پر اس کا کتنا اثر پڑا ہوگا اور وہ کس حد تک اس کے قالب میں ڈھل گیا ہوگا۔ اس کا اندازہ کچھ زیادہ مشکل نہیں۔

دور طالب علمی ختم کر کے وادیٔ تدریس میں قدم رکھا تو اس وقت تک سخن فہمی کی پوری صلاحیت پیدا ہوگئی تھی، تدریسی مشاغل دواوین شعر کے مطالعہ میں حارج نہیں بنے۔ آغاز تدریس ہی میں اقبال کو تفصیل سے پڑھا بلکہ کہنا چاہئے کہ ان کے اردو فارسی دواوین کو چاٹ ڈالا۔ پھر مولانا مسعود عالم ندوی کی صحبت وہم مذاقی نے اس کو اور مہمیز کیا اوقات تفریح میں دونوں ساتھ ٹہلتے اور اس دوران اشعار گنگناتے رہتے۔

حضرت مولانا اس معمول کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> عصر کے بعد ساتھ ہی تفریح کو جانا ہوتا۔ رات کے کھانے کے بعد کچھ وقت چہل قدمی میں صرف ہوتا۔ اس دوران میں اکثر عربی اردو شعراء اساتذہ فن کے اشعار زبان پر ہوتے۔

(پرانے چراغ حصہ اول، ص ۳۳۲)

حضرت مولانا کی بعض تقریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو آخری درجہ میں شعری ذوق تھا، ایسا ذوق جو اساتذہ کے کلام کے درمیان ان کے شعری محاسن کی روشنی میں فرق کر سکے اور شعر سنتے ہی اس کا ذوق یہ فیصلہ کر دے کہ شعر کس کا ہے۔ بہت پہلے دارالعلوم میں ایک دفعہ تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:

> ذوق کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کے سامنے کوئی شعر پڑھا جائے تو آپ اپنے ادبی ذوق سے بتلا دیں کہ یہ فلاں کا شعر ہے۔

ایسا نہ ہو کہ آپ کے سامنے انیسؔ و دبیرؔ کے اشعار پڑھے جا رہے ہوں اور ان کو آپ غالبؔ و ذوقؔ کی طرف منسوب کریں۔ یا مومنؔ کا شعر ہو اور آپ اس کو کسی اور کا سمجھ رہے ہوں۔

(پاجا سراغ زندگی، ص ۶۹)

آپ عموماً برجستہ، شاعر کی تعیین کے ساتھ شعر کا ذکر کرتے ہیں جو اعلیٰ ذوق کی دلیل ہے۔

حضرت مولانا کی تقریروں اور تحریروں میں جو ادبی چاشنی ہے نگینہ کی طرح جڑے ہوئے شعر اس کا حسن دوبالا اور اس کا مزہ دوچند کر دیتے ہیں۔ اور ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی دوسرے شاعر کا کلام نہیں بلکہ خود آپ ہی اس کے مصنف اور تخلیق کار ہیں اور وہ موقع و محل کی مناسبت سے بے ساختہ آپ کی زبان ذوق آشنا اور ذوق آفریں سے یہ شعر ڈھل گیا ہے جس سے سننے والا چٹخارہ لینے لگتا ہے بلکہ لوٹ لوٹ جاتا ہے۔

۱۹۶۳ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں آپ کے جو محاضرات ہوئے اس سلسلہ کے آغاز میں یہ شعر پڑھ کر آپ نے خود کہنے والے سے داد طلب کی تھی ع

ولما نزلنا منزلاً طله الندی　　أنیقاً و بستاناً من النور حالیا
أجد لنا طیب المکان و حسنه　　مُنیً ،فتمنینا فکنت الأمانیا

"اور جب ہم ایک شبنم سے زیادہ شاداب اور خوش منظر مقام اور کلیوں سے آراستہ باغ میں اترے تو مقام کے حسن و پاکیزگی نے ہمارے دل میں کچھ تمنائیں پیدا کر دیں ہماری ان تمناؤں کی جان تمہیں تھیں۔"

(ملاحظہ ہو منصب نبوت اور اس کے بلند مقام حاملین، ص ۱۴)

۱۳۶۹ھ (مطابق ۱۹۵۰ء) کے سفر حج میں (جو حضرت رائے پوری کی معیت میں ہوا تھا) کلید بردار کعبہ شیبی کی طرف سے از خود حضرت مولانا کو بیت اللہ شریف

میں داخلہ کی دعوت دی گئی۔اور نہ صرف آپ کو بلکہ جن کے لئے اشارہ کریں ان کو بھی اجازت دی گئی۔اس کو آپ حضرت رائپوری کی برکت اور کرامت قرار دیتے ہیں۔اس موقع پر جو شعر آپ کی زبان قلم سے نکلا ہے اس کا کوئی بدل نہیں، معلوم ہوتا ہے جیسے شاعر نے اسی موقع لئے کہا ہو۔

مور مسکین ہوسے داشت کہ درکعبہ رسد
دست برپائے کبوتر زد وناگاہ رسید

(کاروان زندگی اول، ص ۳۵۷)

۱۹۷۹ء میں قطر کی سیرت کانفرنس میں ماضی وحال کو سامنے رکھتے ہوئے عربوں کو ان کا اصل مقام ومنصب یاد دلانے غیرت ایمانی اور حمیت دینی کو بیدار کرنے کے لئے ان کی عزت وناموس کا سرچشمہ نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیتے ہوئے آپ نے اقبال کے جس شعر کا انتخاب کیا تھا اس کو سن کر سامعین کے دل بے قرار اور آنکھیں اشکبار ہوگئیں ع

ازدمِ سیرابِ آں امی لقب
لالہ رست ازریگ صحرائے عرب

(کاروان زندگی دوم، ص ۲۹۱)

اور اسی کے مثل عالم عربی کے آخری سفر میں یہ شعر پڑھ کر آپ نے پورے مجمع کو وارفتہ کردیا تھا۔ ع

نہیں وجود حدود وثغور سے اس کا
محمد عربی سے ہے عالم عربی

اپنے شیخ ومرشد حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری سے آپ کو والہانہ تعلق تھا اسی عقیدت نے آپ سے اتنی مفصل اور موثر سوانح حیات لکھوائی، مگر پھر بھی جی نہیں بھرا

اور تشنگی کا احساس ہنوز باقی رہا اسی لئے خاتمہ پر یہ شعر لکھ کر قلم توڑ دیا ہے ع

قلم بشکن، سیاہی ریز، کاغذ سوز، دم درکش
حسن ایں قصہ عشقست درد فترنمی گنجد

ترکی میں ایک جلسہ کے دوران جب حضرت مولانا کے ایک طرف ممتاز ترک ادیب وصاحب قلم تھے اور دوسری طرف مشہور عرب مفکر وعالم اور بیچ میں حضرت مولانا رونق افروز تھے۔ حضرت مولانا بیان فرماتے ہیں کہ اس موقع پر انہوں نے یہ شعر پڑھا

عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی ذہن ہندی نطق اعرابی

اور شکوہ ترکمانی کہتے ہوئے کہ ترک ادیب کی طرف اور نطق اعرابی کہتے ہوئے عرب مفکر وعالم کی طرف اشارہ کیا اور ذہن ہندی کہتے ہوئے اپنی طرف اشارہ کیا مگر وضاحت کی کہ میں خود نہیں لیکن اس قوم کا نمائندہ ہوں جن کو اللہ نے خاص ذہن سے نوازا اور اس سے اس نے اسلام کی خدمت کا کام لیا۔

یہ شعر جب حضرت مولانا نے اس انداز سے پیش کیا ہوگا تو سننے والوں نے کتنا لطف اٹھایا ہوگا اور حضرت مولانا کے ذوق سلیم اور ذہانت پر کیسی داد دی ہوگی۔ اس کے لطف میں اس وقت اور اضافہ ہوجاتا ہے کہ جب ہم مصرعہ کی ترتیب پر غور کرتے ہیں یہاں بھی ذہن ہندی بیچ میں ہے اور ڈائس پر بھی، جو اپنی ذہانت وفطانت کا دیا ہاتھ میں لئے ہر سمت بڑھتا ہے اور راہنمائی کے لئے آگے آگے چلتا ہے۔

حضرت مولانا ایک عالم دانشور مفکر اور داعی کی حیثیت سے پورے عالم میں معروف ہوچکے تھے۔ قدیم حلقہ مدارس میں پوری طرح فٹ اور اس کے لئے مفید سے مفید تر ثابت ہوسکتے تھے مگر اس کے باوصف (اور بالفاظ خود ''باوجود قدیم وقومی ملکی دینی وعلمی رشتوں اور متعدد مابہ الاشتراک حقیقتوں کے'') آپ کی شخصیت ابھی تک ان اہل

مدارس کے حلق میں نہیں اتری تھی اور آپ کو وہاں کوئی نہیں ملا تھا حالانکہ جدید حلقوں میں آپ کو بڑی پذیرائی حاصل ہو چکی تھی اور انہوں نے عالی ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے بار بار آپ کو دعوت دی تھی اور لکچرز اور خطابات کا انتظام کیا تھا۔ پھر بھی مدارس کی طرف سے ایسی کوئی تحریک نہیں ہوئی تھی اور ہنوز وہاں ایک سکوت اور خاموشی طاری تھی اس کا حضرت مولانا کو بڑا قلق تھا کہ دفعۃً ۱۹۵۴ء میں ام المدارس دارالعلوم دیوبند سے پہلی مرتبہ دعوت آئی اس پس منظر میں شیفتہؔ کا یہ شعر جو حضرت مولانا نے اس موقع پر لکھا ہے۔ بڑی معنویت رکھتا ہے ۔ع

جو راز مے کدے میں ہے اک اک زبان پر
افسوس مدرسہ میں ہے بالکل نہاں ہنوز

(ملاحظہ ہو کاروان زندگی اول، ص ۴۰۱)

رئیس التبلیغ حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی کی قدآور شخصیت ان کی جامعیت وعبقریت اور تبلیغ ودعوت کے لئے ان کی ضرورت واہمیت کے پیش نظر ان کی رحلت ہر شخص کو قبل از وقت معلوم ہوئی جب وہ پینتالیس سال کے جوان تھے۔ پوری طاقت اور قوت ان میں موجود تھی۔ وہ پوری رعنائی وبرنائی اور پورے جوش وخروش کے ساتھ دعوت الی اللہ میں منہمک اور اس میں ڈوبے ہوئے تھے۔ حضرت مولانا نے ان کی وفات پر جو شعر لکھا ہے شاید اس کے لئے اس سے بہتر موقع فی الحقیقت کبھی آیا ہو۔

کام تھے عشق میں بہت پر میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

(مقدمہ سوانح مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی، ص ۲۸)

۱۹۸۵ء میں ''جامعہ ہدایت'' جے پور کے ریگ زار میں ایک تقریر کا افتتاح اس شعر سے کیا جو پوری طرح اس پر منطبق ہوتا تھا۔

عزم راسخ ہے نشانِ قیس وشانِ کوہکن
عشق نے آباد کرڈالے ہیں دشت وکوہسار

(پرانے چراغ سوم، ص ۲۵۰)

۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کی شہادت کے بعد ملک بھر میں ہولناک فسادات رونما ہوئے جن میں مسلمانوں کو انتہا درجہ کے ظلم وسفا کی اور آخری حد تک قساوت اور سنگدلی کا نشانہ بنایا گیا اس کے سدباب کے لئے لکھنؤ کے دردمند مسلمانوں نے بارہ دری (قیصر باغ) میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا جس میں مختلف سیاسی پارٹیوں کے زعماء وقائدین، متعدد مذہبی پیشوا اور مختلف قومیتوں کے نمائندے اور شہر کے خواص وعوام بڑی تعداد میں شریک تھے۔ اس موقع پر حضرت مولانا نے ایک بڑی مؤثر تقریر کی تھی جس کا آغاز وقت اور محل کے لحاظ سے اس شعر سے کیا تھا اس پس منظر میں یہ شعر کیا ہی لطف لئے ہوئے ہے۔ ع

امیرؔ جمع ہیں احباب درد دل کہہ لے
پھر التفات دل دوستاں رہے رہے نہ رہے

(ملاحظہ ہو مطبوعہ تقریر بعنوان ظلم وسفا کی، ص ۷)

حضرت مولانا نے ۱۹۶۶ء میں مجلس مشاورت کے ایک موقر وفد کے ساتھ ریاست میسور (موجودہ ریاست کرناٹک) کا دورہ کیا تھا۔ پھر آپ نے اس دورہ کی روداد مرتب کی اس کا آغاز جس شعر سے آپ نے کیا اس کی تعریف نہیں ہوسکتی۔

چلی بھی جاجرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا

(ملاحظہ ہو بارہ دن ریاست میسور میں، ص ۱۰)

مشہور ادیب اور ناقد رشید احمد صدیقی نے اس پر بڑی داد دی، حضرت مولانا

کے نام اپنے ایک خط میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"وفد کا خیر مقدم جس خلوص اور گرمجوشی سے کیا گیا وہ غیر متوقع نہ تھا۔ لیکن مجھے تو مصحفی کا وہ شعر یاد آرہا ہے (کہیں تو قافلہ نو بہار ٹھہرے گا) جو آپ نے اس سلسلہ میں لکھا تھا جس مہم اور مقصد کے پیش نظر یہ شعر آپ کے ذہن میں آیا اس سے معلوم نہیں کتنا اضافہ اس لطف وعقیدت میں ہوا جو آپ کی طرف سے میرے دل میں ہے۔ سیاست اور معلوم نہیں کتنے اور مسائل مہمہ سے دوچار رہ کر زادسفر کی ایسی شگوفہ زائی کتنی دلآویز معلوم ہوئی۔ شعر وادب کی اس شگفتگی کو تو میں آدمی کی شرافت شجاعت اور شائستگی پر محمول کرتا ہوں اچھا اور بڑا آدمی بجائے خود اچھا شعر ہوتا ہے۔

پھر آگے لکھتے ہیں۔

مصحفی کا یہ شعر خوب ہے لیکن آپ نے جس سیاق وسباق میں اس کو پیش کیا ہے اس سے یہ شعر آپ کا ہو گیا۔

(پرانے چراغ حصہ دوم، ص ۱۷۹۔۱۸۰)

۱۹۷۸ء میں سفر پاکستان کے موقع پر دارالعلوم کورنگی کراچی میں اساتذہ اور طلبہ کے مجمع میں تقریر کے دوران زمانہ کے شکوہ کی لغویت بیان کرتے ہوئے بیک وقت برجستہ عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں کے جو اشعار پیش کئے تھے وہ برجستگی، ذوق کی پختگی استحضار اور حاضر دماغی کی ایک نادر مثال ہے۔

(ملاحظہ ہو حدیث پاکستان، ص ۱۵۹۔۱۶۰ یا جدید ایڈیشن بنام دعوت وفکر وعمل، ص ۱۹۸، ۱۹۹)

حضرت مولانا کی تقریروں اور تحریروں میں اس کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں

مشتے نمونہ از خروارے یہ چند مثالیں ذکر کی ہیں کمال ذوق کا اندازہ کرنے کے لئے تو آخری مثال بھی کافی تھی۔

اب مضمون کے دوسرے پہلو کی طرف رخ کرتا ہوں جس سے حضرت مولانا کے ذوق سخن کی بلندی آسمان کو چھوتے نظر آئے گی۔ آپ نے سخن سنجی کی خداداد صلاحیت سے بیشتر موقعوں پر اشعار میں جزوی ترمیم کی ہے، کہیں تو بہت خوب مضمون بندھا ہے اور اس اُپج نے معنی کا رخ کہیں سے کہیں پھیر دیا ہے۔ اگر خود کہنے والا بھی زندہ ہوتا تو آپ کے سامنے سر تسلیم خم کرتا۔ دو چار مثالیں اس کی بھی ملاحظہ ہوں۔

۱۹۵۱ء میں حضرت مولانا نے اردن کا سفر کیا اور شاہ اردن ملک عبداللہ سے ملاقات کی وہ حسنی سادات میں تھے (موجودہ والی اردن ان کے پوتے ہیں) تعارف کے بعد حضرت مولانا نے نسبی اتحاد اور موجودہ حیثیتوں کے فرق کی طرف لطیف اشارہ کرتے ہوئے سید شریف رضی کے وہ شعر پڑھے جو انہوں نے عباسی خلیفہ کو مخاطب کر کے کہے تھے مگر بتقضائے حال اس میں ذرا سا تصرف کیا۔

رفقا أمیر المؤمنین فاننا　　فی دوحة العلیاء لانتفرق
مابیننا یوم الفخار تفاوت　　ابداً کلانا فی المعالی معرق
الا الامارة میزتك فاننی　　انا عاطل منها وأنت مطوق

''یعنی عزت شرف کے معاملہ میں ہم دونوں میں کوئی وجہ امتیاز نہیں ہم آپ بلندی اور سرفرازی میں برابر ہیں، مگر ہاں آپ امارت و سلطنت کا بار گراں اٹھائے ہوئے ہیں اور میں اس سے تہی دست ہوں''

اصل شعر میں ''الا الخلافة'' تھا حضرت مولانا نے موقع کی مناسبت سے اس کو ''الا امارة'' سے بدل دیا۔ حضرت مولانا فرماتے تھے کہ ملِک اس سے بہت محظوظ ہوئے اور خود آگے کے اشعار پڑھنے لگے۔

کئی دفعہ حضرت مولانا نے مجلس میں یہ واقعہ سنایا اور اپنے سفرنامہ میں بھی تقریباً اسی طرح اس کو ذکر کیا ہے　(ملاحظہ ہو شرق اوسط کی ڈائری ص ۴۱۵-۴۱۶)

حضرت مولانا کی زبانی یہ بھی سنا کہ اندلس کے سفر (جو ۱۹۶۳ء میں پیش آیا تھا) کے بعد ہم نے ایک تاثراتی مضمون میں یہ شعر لکھا تھا۔

صدع الليالي اذ رمين ديارہ

صدع الزجاجة مالذاك تدانى

''زمانہ کے حوادث نے جب اندلس کو اپنی گرفت میں لے لیا تو اس کو شیشہ کی طرح اس طرح چور چور کر دیا کہ جڑاؤ کی کوئی امید نہیں''

یہ شعر اصلاً اس طرح ہے

صدع الغواني اذ رمين فؤاده

صدع الزجاجة مالذاك تدانى

ملاحظہ ہو مجلہ "المسلمون، المجلد الثامن، العدد الرابع، شعبان ۱۳۸۳ھ یناير ۱۹٦٤م

''یعنی محبوبہ نے جب اس کے دل پر حملہ کیا تو اس کو شیشہ کی طرح چکنا چور کر دیا۔ اب وہ کسی طرح جڑ نہیں سکتا''

آپ فرماتے تھے کہ یہ شعر غزل کا تھا ہم نے اس کو بدل کر تاریخی شعر کر دیا۔

ایک سے زائد موقع پر دیکھنے میں آیا، حضرت مولانا رات کے کھانے سے فارغ ہوئے ابھی منہ ہاتھ دھو رہے ہیں اور دانت ہاتھ میں لئے صاف کر رہے ہیں اتنے میں طلبہ مجلس میں قریب جگہ حاصل کرنے کے شوق میں مہمان خانہ میں در آئے اور حضرت مولانا کی طرف دیکھنے لگے حضرت نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

ان الثمانين وبلغتها

قد أحوجت فمي الى أسنان

(میری عمر اسی سال کی ہو چکی ہے خدا تمہیں بھی یہ طویل عمر نصیب
کرے میرے دانت کر گئے ہیں مجھے اب مصنوعی دانتوں کی
ضرورت پڑ گئی ہے)

دراصل یہ شعر ایک قدیم شاعر کا ہے جس نے اپنی قوت سماعت کی کمی کا شکوہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

ان الثمّانین و بلغتها
قد أحوجت سمعی الی ترجمان

(میں اسی سال کا ہو گیا ہوں تمہیں بھی اس عمر تک پہنچنا نصیب ہو
میری قوت سماعت کی کمی کی وجہ سے مجھے اب ترجمان کی
ضرورت پڑ گئی ہے۔)

حضرت مولانا دوسرے مصرعہ میں ترمیم کر کے اپنے حال پر منطبق کرتے۔

حضرت مولانا کے والد بزرگوار مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی کے اجداد مادری میں ایک قوی نسبت عالی مرتبت شیخ طریقت اور مربی روحانی گزرے ہیں۔ جن کا نام حضرت شیخ سید شمس الدین خواجگی عریضی ملتانی (م ۸۹۸ھ) ہے۔ حضرت خواجگی کے نام سے مشہور ہیں کڑا مانک پور میں مدفون ہیں تواضع اور فنائیت کے غلبہ کی وجہ سے انہوں نے وصیت فرمائی تھی کہ ان کی قبر پر یہ دو شعر لکھ دیئے جائیں ؎

برائے خدا اے عزیزانِ من
نویسید برگور من این سخن
کہ چوں خواجگی درتہہ خاک شد
نکوشد کہ خس کم جہاں پاک شد

چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی حضرت مولانا نے کڑا کے سفر میں جب ان کی قبر کی

زیارت کی تو ان کے مقام و مرتبہ کے مناسب برجستہ دوسرے سفر میں تھوڑا سا تصرف کر کے اس طرح پڑھا۔

کہ چوں خواجگی درتہہ خاک شد
نکوشد کہ منزل بہ افلاک شد

(ملاحظہ ہو کاروان زندگی حصہ چہارم ص ۳۲۸و۳۳۵)

۱۹۷۳ء میں آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس منعقدہ لکھنؤ میں خطاب کرتے ہوئے ایک مصرعہ میں صرف ایک حرف کی تبدیلی سے وہ روح پیدا کی تھی کہ سننے والے پھڑک اٹھے فارسی کا ایک غزلیہ شعر ہے شاعر اپنی محبوبہ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

زیر قدمت ہزار جان ست
آہستہ خرام بلکہ مخرام

(یعنی تمہارے قدموں کے نیچے ہزار جانیں ہیں آہستہ چلو بلکہ بالکل ہی قدم نہ اٹھاؤ)

حضرت مولانا نے صحافیوں کو مخاطت کرتے ہوئے پہلا مصرعہ صرف ایک حرف کی تبدیلی کے ساتھ اس طرح پیش کیا۔

زیر قلمت ہزار جان ست

(ملاحظہ ہو پرانے چراغ دوم ص ۴۲۳)

یعنی تمہارے قلم کے نیچے ہزار جانیں ہیں قوموں کا عروج وزوال اسی سے وابستہ ہے جس کو چاہے آسمان پر پہنچا سکتے ہو جس کو چاہے تحت الثریٰ میں گرا سکتے ہو واقعہ کو جو چاہے رخ دے سکتے ہو اس لئے اس کو سنبھال کر رکھو یہ صحافت کی شرط اولین ہے۔ مصرعہ کی ایک حرفی تبدیلی سے یہ ساری باتیں دبے لفظوں میں کہہ دیں۔

علامہ اقبال کا ایک شعر ہے۔

بایں پیری رہ یثرب گرفتم　نواخواں از سرور عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ در صحرا سر شام　کشاید پر بفکر آشیانہ

حضرت مولانا نے ۱۹۹۶ء میں لندن سے حجاز کے سفر کے وقت اس طویل فاصلہ کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے پہلے مصرعہ میں ایک لفظ کا تغیر کر کے شعر اس طرح کر دیا۔

بایں دوری رہ یثرب گرفتم
نواخواں از سرور عاشقانہ

حضرت مولانا کے برادر زادہ گرامی قدر مولانا محمد الحسنی (محمد میاں) جو حضرت مولانا کو سب سے زیادہ عزیز اور فخر خاندان ہی نہیں فخر قوم وملت تھے۔ آپ کی عربی تصنیفات کے بہترین مترجم اور بڑی حد تک آپ کے نمائندے اور قلمی ترجمان تھے جن کی تحریروں میں سب سے زیادہ حضرت مولانا کا رنگ اور آہنگ نظر آتا ہے۔ جن کے عربی نوشتوں کی تاثیر کا یہ عالم کہ خود عرب بھی حیرت زدہ اور آب دیدہ ہو جاتے تھے اور جن کی اردو نگارشات کا وہ انداز کہ ہر طرف سے "ھل من مزید" کی صدائے مسلسل سنائی دیتی تھی۔ چوالیس (۴۴) سال کے عین اٹھان کے زمانہ میں ان کا سانحہ ارتحال ایک بڑا خسارہ اور بظاہر ایک ناقابل تلافی نقصان تھا عرب سے عجم تک ہر واقف کار کو جس نے متاثر کیا۔ اسی طرح مولانا اسحاق جلیس ندوی حضرت مولانا کے بڑے معتمد علیہ اور تحریک پیام انسانیت میں ان کے حقیقی ترجمان تھے اور جو بقول حضرت مولانا "موقعہ ومحل کے مناسب بات کرنے اور مخاطبین کے ہر حلقہ کو متاثر کرنے کی وہبی صلاحیت رکھتے تھے اور جہاں جاتے تھے لوگ ان کے گرویدہ اور فریفتہ ہو جاتے تھے" ان کا انتقال بھی مولانا محمد میاں کے ارتحال کے چند روز بعد اس وقت ہوا جب وہ پورے شباب پر تھے اس لئے ہر شخص کو قبل از وقت معلوم ہوا۔ حضرت مولانا نے دونوں کی روح کو مخاطب کر کے ایک لفظ کی ترخیم کے ساتھ جو شعر پیش کیا ہے وہ حقیقت کی پوری عکاسی کرتا ہے۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
تمہیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

جہاں تک حضرت مولانا کے شعر کہنے کا سوال ہے تو اس کی کہانی دراصل بچپن سے تعلق رکھتی ہے۔ بچپن ہی میں ماحول سے متاثر ہو کر دیکھا دیکھی آپ نے تک بندی شروع کی تھی مگر اللہ کی مصلحت کہ یہ مشغلہ جاری نہ رہ سکا حضرت مولانا اس کی حقیقت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس زمانہ میں مشاعروں کا بڑا زور تھا، ہمارے چھوٹے گاؤں میں کئی مشاعرے ہوئے۔ دیکھا دیکھی میں نے بھی کچھ موزوں کرنے کی کوشش کی، مگر اللہ تعالیٰ بڑے بھائی صاحب کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے بہت سختی سے روک دیا اور یہ شغل بے حاصل جاری نہ رہ سکا۔ (کاروان زندگی اول، ص ۹۵)

پھر آپ کو اس کا کبھی افسوس نہ رہا، نہ قافیہ بندی کی کبھی کوشش کی صاف فرماتے ہیں شعر گوئی کی صلاحیت سے قطعاً محروم ہوں اور کبھی فرماتے مجھ سے شعر موزوں نہیں ہوتے اور اس پر بجائے تاسف کے اللہ کا شکر ادا کرتے ایک مجلس میں فرمایا تھا کہ ہماری طبیعت کبھی شعر کہنے کی طرف مائل نہیں ہوئی اور یہ اللہ کا بڑا فضل ہوا کہ ہم نے اس میدان میں قدم نہیں رکھا۔

ہمارے علم میں صرف ایک موقع پر آپ نے باقاعدہ کچھ شعر موزوں کرنے کی کوشش کی اس کا واقعہ حضرت مولانا خود سناتے تھے کہ مکہ مکرمہ کے زمانہ قیام میں وہاں کے ایک بڑے عالم سید علوی مالکی نے ایک دفعہ ہمیں کھانے پر مدعو کیا۔ انہوں نے جو دعوت دی تو کچھ اشعار لکھ کر بھیجے۔

پھر حضرت مولانا یہ دو تین شعر پڑھتے

مولانا ابا الحسن المفدیٰ　　ازف الیك ایات الثناء

..... لتحظیٰ بالضیاء و باللقاء

ومولانا سراج الحق معکم　　بتشریف غداً عند الغداء

یہ مولانا سراج الحق مچھلی شہری (م ۱۹۷۷ء) حضرت مولانا فرماتے تھے کہ ان کا حرم شریف میں درس ہوتا تھا۔

حضرت مولانا اس پر فرماتے تھے ہم نے کہا کہ اس کا جواب بھی شعر میں ہونا چاہئے اب ہم نے رات بھر سوچا اور اسی قافیہ وردیف میں چند اشعار لکھ کر بھیج دیئے۔ وہ بہت محظوظ ہوئے اور فوراً نوٹ کرنے کے لئے کہا حضرت مولانا کو اپنے یہ اشعار یاد نہیں رہے ممکن ہے کہ سید علوی مالکی کی اولاد کے پاس ان کے ذخیرہ میں مل جائے۔

اسی طرح اردو میں بھی آپ کا ایک مسدس ہے اتفاق سے وہ بھی مکہ ہی میں کہا ہے۔ آپ نے ۲۰/۱۲/۱۷ھ کی مجلس میں فرمایا تھا۔

ہم نے اردو عربی میں جتنے اشعار کہے ہیں اتفاقاً سب مکہ مکرمہ میں کہے ہیں۔ موٹر پر کہیں جا رہے تھے کہ یہ قافیہ بندھا

عاشقوں کو شباب نے مارا　　فاسقوں کو شراب نے مارا
عالموں کو کتاب نے مارا　　منشیوں کو حساب نے مارا

ہم جواب تک بچے رہے سب سے
ہم کو روٹی کباب نے مارا

یہ حضرت مولانا کے ذوق شاعری کے مختلف پہلوؤں کا سرسری جائزہ ہے ورنہ اس سلسلہ میں اور بھی نظیریں پیش کی جاسکتی ہیں۔

پروفیسر ابوالکلام قاسمی

نقوشِ اقبال ـــــ ایک مطالعہ

علامہ اقبال کو اردو شاعری کی پوری تاریخ میں امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے ایک فلسفی شاعر ہونے کے باوجود شاعری اور فن کے ان تمام تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی جن کے باعث فکر کو محسوس فکر سے اور فلسفیانہ تصورات کو فنی اسالیب اور شاعرانہ تدبیر سے ہم آہنگ ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اقبال کے کلام میں مرزا غالب یا بعض دوسرے اور فارسی اور اردو شاعروں کی طرح جستہ جستہ فلسفیانہ تصورات اور رویے نہیں ملتے، بلکہ ان کے طفیل اردو شاعری میں پہلی بار مربوط اور منضبط فکر و فلسفہ کو شعری قالب میں ڈھلنا نصیب ہوا ہے۔ اس اعتبار سے اقبال دو طرح کے تجربے سے گزرے ہوں گے۔ پہلا تو یہ کہ انھوں نے عالمی سطح پر رونما ہونے والے فکر و فلسفہ کو کچھ اس انداز سے مرتب کرنے کی کوشش کی کہ خود اقبال کے مذہبی سرچشمے ان کے فلسفے میں نمایاں طور پر کارفرما دکھائی دیتے ہیں۔ دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ فلسفہ کو انسانی جذبہ اور احساس سے کیوں کر اس طرح ہم آہنگ اور مربوط کیا جا سکتا ہے کہ شاعری محض تعقل اور غور و فکر کا منظوم اظہار بن کر نہ رہ جائے۔ یہ ایک ایسا مرحلہ ہے جس میں شاعر کی سانس پھولنے لگتی ہے اور اس کے لئے مفکرانہ موضوعات کو شعری جمالیات میں ڈھال کر پیش کر دینا آسان نہیں رہتا۔

اس فکر اور شعری طریقۂ کار کی آمیزش ہمیں عالمی سطح پر گوئٹے کی فاؤسٹ میں، دانتے کی طربیہ خداوندی میں اور جلال الدین رومی کی مثنوی معنوی میں تو ضرور ملتی ہے، تاہم اردو شاعری کا دامن اقبال سے پہلے تقریباً خالی نظر آتا ہے۔ مذاہب عالم نے انسانی تہذیب اور اقدار کے لیے ایسی بنیادیں فراہم کی ہیں جن کا نعم البدل انسانی سماج اور مجرد فکر میں تلاش کرنا آسان نہیں۔ اردو میں جن اصنافِ شاعری کو فروغ ملا ان میں ہر چند کہ مذہبی اور اخلاقی فکر کے عوامل جگہ جگہ کارفرما دکھائی دیتے ہیں مثلاً غزل میں انسان کی محبت سے لے کر محبوب حقیقی تک براہِ راست ربط و تعلق کی نوعیت اور مدارج پر غور کرنے کا رجحان شروع سے دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح قصائد اور مثنویوں میں کہیں تشبیہ اور تمہید کی سطح پر اور کہیں عقائد کی روح کے کارفرما ہونے کے باعث متعدد مقامات پر قابل توجہ حد تک مذہبی رجحانات اور ان کے محرکات نمایاں معلوم ہوتے ہیں۔ تاہم حمد و نعت اور منقبت کو اقدار اور اخلاقیات کی سطح پر لا کر پیش کرنے کا رجحان بہت واضح نہیں، اس لیے مذہبی وجدان کی شاعری کو میلاد خوانوں کی بیانیہ اور غیر شاعرانہ سطح سے بلند کر کے شاعرانہ جمالیات کا ارتفاع بخش دینے کی مثالیں ہمارے یہاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ علامہ اقبالؔ نے اس نقطۂ نظر سے اپنے مفکرانہ اور شاعرانہ دونوں منصب اور ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کا ایسا ثبوت پیش کیا ہے جس کی تحسین اور ترجمانی کی خاطر کسی ایسے ہی متبحر اور دانشور شعریت کے اسرار و رموز سے واقف کار مرد دانا اور متعدد زبانوں کے شعری سرمایے سے باخبر اور بیدار مغز عالم کی ضرورت تھی۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی میں چونکہ ایک ساتھ قدرت سے فلسفہ و شعر کی تفہیم و تحسین کا ملکہ ودیعت ہوا تھا اس لیے انھوں نے کئی سطحوں پر اپنی اسی ذمہ داری سے عہدہ بر آ ہونے کا کامل ثبوت روائع اقبال، اس کے اردو ترجمے، نقوش اقبال کے ذریعہ فراہم کرنے کی کوشش کی۔ مولانا علی میاں نے نقوش اقبال کا مقدمہ لکھتے ہوئے کلام اقبال

سے اپنی دلچسپی اوران کی شاعری سے حسی اور جذباتی سطح پر مغلوب ہونے کا حال کچھ اس انداز سے بیان کیا ہے گویا وہ اپنی یادداشت اور جمالیاتی تجربے کی بازآفرینی کے عمل سے گزر رہے ہیں۔

''اقبال کو پسند کرنے کے اسباب بہت سے ہو سکتے ہیں، اور ہر شخص اپنی پسند کے مختلف وجوہ بیان کر سکتا ہے۔ انسان کی پسند کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ کسی فن پارے کو اپنے خوابوں کا ترجمان اور اپنے دل کی زبان پانے لگتا ہے۔ انسان بہت خود بیں اور خود پسند واقع ہوا ہے۔ اس کی محبت اور فطرت تمناؤں اور دلچسپیوں کا مرکز ومحور بڑی حد تک اس کی ذات ہی ہوتی ہے۔ اس لیے' سے ہر وہ چیز اپیل کرتی ہے جو اس کی آرزوؤں کا ساتھ دے سکے۔ اور اس کے احساسات سے ہم آہنگ ہو جائے۔ میں بھی اپنے کو اس کلیے سے الگ نہیں کرتا۔ میں نے کلام اقبال کو عام طور پر اسی لیے پسند کیا ہے کہ وہ میری پسند کے معیار پر پورا اترتا ہے اور میرے جذبات ومحسوسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ میرے فکر وعقیدہ ہی کے ساتھ ہم آہنگ نہیں بلکہ اکثر میرے شعور اور احساس کا بھی ہم نوا بن جاتا ہے۔''

یہ پس منظر محض علی میاں کی علامہ اقبال سے والہانہ دلچسپی کو نہیں پیش کرتا بلکہ اس سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ مذہبی تصورات انسان کی کردار سازی ضرور کرتے ہیں مگر اس کو ذہنی اور فکری غذا کے طور پر جس جمالیاتی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے، مجرد فکر یا پیغام سے اس کی تسکین نہیں ہو پاتی۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حسی اور جذباتی سطح پر عرفان حقیقت کو ہم محض صوفیوں کے لئے چھوڑ دیتے ہیں اور ہمارے پاس خشک اور یبوست زدہ پیغام کے سوا کچھ اور باقی نہیں رہ جاتا۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم میں زبان کے استعمال کے جتنے غیر معمولی فنی اسالیب سے ہمارا واسطہ ہوتا ہے اس کی تفہیم کے بغیر محض اوامر ونواہی کی تعلیم وتبلیغ کو مکمل قرآن فہمی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو عبدالقاہر

جرجانی کی کتابیں اسرار البلاغہ اور دلائل الاعجاز کے علاوہ بعض مفسرین کی وہ تعبیریں اور تفسیریں قرآن فہمی کا ایک مخصوص لہجہ اور سطح متعین نہیں کرتیں، جن کی مدد سے قرآن کریم کی بلاغت اور اعجاز کا پورا خاکہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔ اس پس منظر میں اگر ہم برصغیر ہندو پاک میں مسلمانوں کی دانشورانہ اور عالمانہ سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہم نے علم، دانش، ادب، تہذیب، مذہب اور شاعری کے مطالعے اور ان پر غور وخوض کے الگ الگ دائرے بنا رکھے ہیں۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ تہذیبی زندگی کے عوامل اور مظاہر کی حیثیت سے ان تمام دانش ورانہ، علمی، مذہبی اور فنی یا ادبی اقدار کا مطالعہ ایک بڑے دائرہ کار کے طور پر کیا جائے۔ شاید یہی وجہ رہی ہے کہ ہم نے علوم وفنون کو انسانی وجود اور کائنات کے رشتوں کے محور پر مرتکز عناصر کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش بہت کم کی ہے۔ رشید احمد صدیقی نے نقوش اقبال کے ابتدائی کلمات کے طور پر اس صورت حال کو بڑی خوبی کے ساتھ نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

میرا خیال ہے کہ مولانا پہلے عالم دین ہیں جس نے موجودہ صدی کی اردو شاعری کے سب سے بڑے نمائندہ اور عظیم شاعر اقبال کی شاعری اور شخصیت کا مطالعہ غیر معمولی شوق اور بصیرت کے ساتھ کیا ہے ورنہ بیش تر علماء ہر جدید کو بالعموم مشتبہ ورنہ بڑی احتیاط سے دیکھنے کی طرف مائل رہے ہیں۔ علمائے کرام کو اقبال کے سمجھنے کی کوشش کرنا خود ان کے لئے نہایت ضروری اور نیک فال ہے۔ اس لئے کہ اب مذہب اور زندگی کی تفہیم اسی طرح اور اسی سیاق وسباق میں کی جائے گی جو ہم کو اقبال کے یہاں ملتی ہے۔ سید صاحب کا ذہن جدید ذہن کے تقاضوں سے آشنا ہے اور اس کا لحاظ رکھتا اور احترام کرتا ہے۔ یہی انداز ندوہ کے ایک دوسرے مایۂ ناز فرزند سید سلیمان ندوی مرحوم ومغفور کا تھا..... دوسری طرف مذہب واخلاق سے دلچسپی رکھنے والے ایسے بھی کافی تعداد میں مل جائیں گے جو جدید ذہن اور اپنی ذہنیت میں فرق نہیں دیکھ پاتے۔

سید سلیمان ندوی اور علامہ اقبال کی خط و کتابت جن لوگوں کی نگاہ سے گزر چکی ہے ان کو بخوبی اندازہ ہوگا کہ اقبال نے محض مذہبی اور اصولی معاملات میں ہی نہیں بلکہ اپنی شاعری اور تخلیقی عمر کے مختلف مراحل میں بھی سید سلیمان ندوی کو شریک رکھا اور (مذہب اور شاعری) دونوں معاملات میں افہام و تفہیم کا دوطرفہ عمل دونوں دانش وروں کے مابین جاری رہا۔ اسی ضمن میں سب سے نمایاں مثال اقبال کی نظم ''خضر راہ'' کے مختلف مسودوں پر سید سلیمان ندوی سے مراسلت میں ملتی ہے۔

مولانا علی میاں نے اقبال کے سلسلے میں اس روایت کو محض قائم رکھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اقبال کو کسب فیض کا وسیلہ بنایا اور عربی اور اردو میں اقبال کی شاعری کی ناقدانہ تحسین و ترجمانی کر کے عرب دنیا میں اقبال فہمی کی داغ بیل ڈالی اور مذہب کے حوالے سے اقبال کی اہمیت کو ان کی شاعرانہ قدر و قیمت کے ساتھ ہم آہنگ کر کے دو چند کر دیا۔ علی میاں کی پوری کتاب عالمانہ افہام و تفہیم کے ساتھ تاثراتی تنقید بلکہ تحسین کی بہترین مثال ہے۔ زیر بحث کتاب میں اقبال کو ان کے پورے سیاق و سباق میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ علی میاں نے اقبال فہمی کے لئے صرف ان کی شاعری کو اپنا وسیلہ نہیں بنایا بلکہ اقبال کی نثری کاوشیں مذہبی فکر کی تشکیل جدید اور فارسی میں مابعد الطبیعیات کا ارتقاء جیسی اہم فلسفیانہ کتب بھی ان کے پیش نظر رہیں۔ مزید برآں یہ کہ اقبال کے اردو کلام کے ساتھ ان کے فارسی کلام کے پورے ذخیرے کو کھنگالنے کے بعد شاعر اور فلسفی کی حیثیت سے اقبال کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی۔

زیر بحث کتاب میں اقبال فہمی کو دو حصوں میں منقسم کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ ان ابواب پر مشتمل ہے جو اقبال کی شخصیت کے تشکیلی عناصر کے علاوہ فکر اقبال کے متعدد پہلوؤں سے ہماری آشنائی کراتے ہیں۔ علی میاں نے اقبال کی مزاج فہمی کے طور پر شخصیت کے تخلیقی عناصر کی حیثیت سے ایمان و یقین، قرآن کریم، عرفان نفس اور

پیر رومی کی تعلیمات کارفرمائی دکھلائی ہے۔ اور بعض اشعار کی مدد سے تخلیقی محرکات کو نشان زد کیا ہے۔ علی میاں اقبال کے ان اشعار کی گرہ کشائی کرتے ہوئے ان کے مزاج میں شاعر مشرق اور اسلامی اقدار کا ذکر تو ضرور کرتے ہیں مگر موضوع سے والہانہ لگاؤ کے باعث فنی تہہ داری اور شاعرانہ رموز اور طریق کار سے بسا اوقات رواداری میں گزر جاتے ہیں۔ مثلاً یہ شعر کہ:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خواب مدینہ و نجف

اور

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیلؑ

اس نوع کے غیر معمولی فنی طور پر مرصع اشعار کا حوالہ موضوع اور مواد کی سطح پر تو ضرور آتا ہے مگر مشرق اور مغرب کی تہذیب یا مغرب کی عیسائی فکر سے اپنی نبرد آزمائی کے عمل میں اقبال کے عقیدے کا رسوخ اور یقین جس طرح انھیں مزاحمت کی قوت فراہم کرتا ہے اس کی شاعرانہ تہہ داری اور جامعیت سے ہم پوری طرح باخبر نہیں ہو پاتے۔ اگر اقبال کو جلوۂ دانش فرنگ خیرہ نہ کر سکا تو اس کی وجہ صرف سیرت نبوی سے وابستگی نہیں بلکہ وہ اس پورے عمل کو ایک مخصوص شاعرانہ پیکر تراشی میں تبدیل کرتے ہیں اور خاک مدینہ و نجف کو چونکہ اپنی آنکھ کا سرمہ قرار دیتے ہیں اور خاک مدینہ و نجف کی گرد راہ کو اپنی بصارت و بصیرت اور صلابت رائے کا نعم البدل بنا کر پیش کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے شعر میں جس طرح اقبال نے دانش حاضر کو ایک نوع کا عذاب الٰہی قرار دیا ہے اس کے برعکس وہ تلمیحی طور پر ابراہیم خلیل اللہ کی روایت سے استفادہ کرتے ہیں اور عذاب دانش حاضر کا شکار ہونے کے باوجود اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کی

طرح محفوظ و مامون پاتے ہیں، اوران دو اشعار پر ہی کیا منحصر ہے، نقوش اقبال میں ایسے ان گنت اشعار زیر بحث نہیں لا پائے۔ اقبال کی شاعری کے حوالے اوراس نوع کی نکات کی اہمیت اس لئے زیادہ قابل توجہ اور مزید ارتکاز کی متقاضی معلوم ہوتی ہے کہ اقبال کے مطالعے کی ایک سطح تو یہ ہوسکتی ہے کہ فلسفہ اور فکر کی بنیاد پر اقبال کی عظمت اور اہمیت کو سمجھا جائے جو بجا طور پر علی میاں کے طریق مطالعہ میں شامل ہے، مگر شاعر فلسفی کی بڑائی بڑی حد تک اس طریق کار میں مضمر ہے جس کی مدد سے اس کے زمانہ اور جغرافیائی حالات اور فکری طور پر اتفاق یا عدم اتفاق کے باوجود ہمہ گیر ہے اس نوع کی شاعری کے تخلیقی عقیدے ہر زمانے میں نت نئے معنوی امکانات اور سری تجربے کی عقدہ کشائی کا تقاضا کرتے اوراس میں موجودہ فکر کو تازگی اور حظ وانبساط کا وسیلہ بنائے رکھتے ہیں۔ علی میاں نے اقبال کے مطالعہ کا جو انداز اختیار کیا ہے اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتی کہ زیر بحث کتاب میں شامل تحریروں کو عرب دنیا میں متعارف کرنے کے فریضے کے طور پر لکھا گیا تھا، اور لسانی بُعد چونکہ ایک زبان کے لسانی اور فنی رموز ونکات سے زیادہ فکر و خیال کو منتقل کرنے کی طرف توجہ مرکوز رکھتا ہے، اس لئے فنی یا شاعرانہ صنعت گری اور تدبیر کاری کما حقہ زیر بحث نہیں آپاتی، ورنہ ظاہر ہے کہ شعری ہنرمندی کی عقدہ کشائی کا کام علی میاں سے بہتر اور کون شخص انجام دے سکتا تھا؟

مولانا علی میاں ندوی نے اقبال کی فکر سے بحث کرتے ہوئے جس باب میں اقبال اور مغربی تہذیب کو موضوع گفتگو بنایا ہے، اس میں نہایت بصیرت کے ساتھ ایسے نکات جمع کردیئے ہیں جن کی بنیاد پر اقبال کو شاعر مشرق اور شاعر اسلام قرار دینے کا جواز موجود ہے۔ علامہ اقبال نے Development of Metaphysic in Persia میں جس طرح ایران سے لے کر ہندوستان تک کے مسلمانوں کے انفعالی انداز اور عدم تحریک کے اسباب وعلل کی تلاش کی ہے۔ اور ہندوستان کی بھگتی تحریک کے زیر اثر دنیا کو فریب

اور مایا جال قرار دینے اور وحدۃ الوجودی فکر کے باعث انسان اور کائنات کو مجازی وجود یا لباس سمجھے جانے کو دنیا کو "مزرعۃ الآخرہ" قرار دیئے جانے کے اسلامی تصور کے منافی بتایا ہے اور اس دریافت کے ردعمل کے طور پر حرکت وعمل اور خودی یا عشق کا بالکل منفرد تصور پیش کیا ہے، وہ بالآخر وحدۃ الشہود کے نقطۂ نظر کی توثیق اور حضرت مجدد الف ثانی کے مکتب فکر سے اتفاق کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ اقبال کی فکر کی اس نہایت نامکمل اور مجمل تلخیص سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تہذیبی اور مذہبی سطح پر اقبال کا زاویۂ نظر کیوں کر آفاقی سیاق وسباق حاصل کرتا ہے، اور یہ طرز فکر بجائے خود انفس وآفاق کی کن گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ علی میاں نے درحقیقت اس پورے فکری پس منظر کو اپنے سامنے رکھا ہے اور اس پس منظر میں اقبال کے حوالے سے مغربی تہذیب کو تجزیاتی اور تحلیلی طریق کار سے گزارا ہے۔ اقبال نے اپنے خطبات، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں مشرقی اور مغربی تہذیب کا جو موازنہ پیش کیا ہے، مولانا علی میاں بجا طور پر ان سے رجوع کرتے ہیں اور اقبال کے ان خیالات کو تہذیبی کشمکش کی تفہیم کی کلید قرار دیتے ہیں۔ اقبال کے الفاظ ہیں کہ:-

> "عصر حاضر کی ذہنی سرگرمیوں سے جو نتائج مرتب ہوئے ان کے زیر اثر انسان کی روح مردہ ہو چکی ہے۔ خیالات وتصورات کی جہت سے دیکھئے تو اس کا وجود خود اپنی ذات سے متصادم ہے، سیاسی اعتبار سے نظر ڈالئے تو افراد افراد سے دست وگریبان ہیں اس میں اتنی سکت نہیں کہ اپنی بے رحم انانیت اور ناقابل تسکین جوع زر پر قابو حاصل کر سکے۔ لہٰذا اس کا تعلق اپنے اعماق وجود سے منقطع ہو چکا ہے۔"

عصر حاضر کی لادینی اشتراکیت کا مطمح نظر بیشک نسبتاً زیادہ

وسیع ہے اور اس کے جوش و سرگرمی کا بھی وہی عالم ہے جو کسی نئے مذہب کا۔ لیکن اس کی اساس چونکہ ہیگل کے مخالف نظر متبعین پر ہے، لہٰذا وہ اس چیز ہی سے برسر پیکار ہے جو اس کے لئے زندگی اور طاقت کا سرچشمہ بن سکتی تھی۔ جب تک انسان کو اپنے آغاز و انجام کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی وہ کبھی اس معاشرے پر غالب نہیں آسکتا، جس میں باہمدگر مقابلے اور مسابقت نے ایک بڑی غیر انسانی شکل اختیار کر رکھی ہے، یہ اس تہذیب و تمدن پر جس کی روحانی وحدت اس کی مذہبی اور سیاسی قدروں کے اندرونی تصادم سے پارہ پارہ ہو چکی ہے۔"

علامہ اقبال نے اپنے گردوپیش سے جس حد تک سروکار رکھا اور جس طرح ہر تہذیبی، سیاسی، فلسفیانہ اور سماجی یلغار پر اپنے ردعمل کا ہر دور میں اظہار کیا اس کی کوئی دوسری مثال برصغیر کے مسلم دانشوروں میں مشکل سے تلاش کی جاسکتی ہے۔ علی میاں کا خیال ہے کہ اقبال جہاں جہاں عصری نظام تعلیم پر تنقید کرتے ہیں اس سے ان کی مراد جدید مغربی تعلیم کے علاوہ اور کچھ نہیں، علی میاں فرماتے ہیں:-

"وہ جہاں مدرسہ اور طالب علم کے جرم کا ذکر کرتے ہیں وہاں اس سے مراد مغربی مدارس اور اس کے طلبہ ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس نظام دانش نے نئی نسل کے حق میں سب سے بڑا جرم کیا ہے۔"

اس میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں کہ مغرب کے نظام تعلیم کے کھوکھلے پن کو اقبال یقیناً بے نقاب کرتے ہیں مگر ہمیں اس حقیقت سے بھی چشم پوشی نہیں کرنی چاہئے کہ ان کے نزدیک ملا کی اذان اور مجاہد کی اذان میں جو فرق ہے یا اقبال کے ان اشعار

میں جس انداز کی درسگاہوں کو ہدف بنایا گیا ہے، اس کے سلسلے میں ہمیں خود احتسابی کے عمل سے بھی گزرنا چاہئے اور اپنے مخصوص قدیم نظام تعلیم اور اس کے زائیدہ حضرات کو بھی زیر بحث لانا چاہئے۔

واعظ اندر مسجد و فرزند او در مدرسہ
او بہ پیری کود کے ایں پیر در عہد شباب
قلندر جز دو حرف لاالہٰ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

اقبال کے ایسے اشعار سے جن میں تہذیب کو اقدار کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے، ان کی اس بالغ نظری کا اندازہ ہوتا ہے جس کے باعث ان کی نگاہ تہذیب اور کلچر کے ظاہر کے بجائے اس کی روح پر پڑتی ہے، اور وہ پیچیدہ تہذیبی صورت حال یا تہذیب و ثقافت کی متصادم قوتوں کا نہایت وضاحت سے دوٹوک انداز میں بیان کر جاتے ہیں۔

مولانا علی میاں نے اقبال کی شاعری میں انسان کامل کے تصور پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اقبال کی نثر و نظم میں بکھرے ہوئے ان عناصر کو مجتمع کرنے پر توجہ صرف کی ہے جن کی مدد سے انسان کامل کے تصور کی تشکیل کی جاسکتی ہے۔ اقبال کے کلام میں مرد مومن، مرد کامل، مرد خدا یا انسان کامل جیسے تمام مرکبات اس مثالی انسان کے لئے استعمال کئے گئے ہیں جو عرفان ذات کی صفت سے متصف ہو، عشق کے جذبے سے سرشار ہو خودی کی حقیقت سے آشنا ہو اور جس کی ذات جلال و جمال کے متوازن امتزاج و اشتراک کا بہترین نمونہ ہو۔ یوں تو اقبال کی غزلوں اور نظموں میں متفرق اور منتشر انداز میں مرد مومن کے تشکیلی عناصر کا جگہ جگہ ذکر آیا ہے مگر ان کی نظم مسجد قرطبہ، میں اس تصور کو زیادہ منضبط اور مربوط انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ علی میاں نے بجا طور پر اس نظم کا جائزہ لیتے ہوئے مسجد قرطبہ کے بانیوں اور اسپین کے فاتحین کو انسان کامل اور مرد مومن کی

حیثیت سے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کی پوری شاعری میں عشق رسولؐ کا جو دریا موجزن ہے اور جس طرح انھوں نے رسول کریمؐ کی ذات کو واحد مثالی شخصیت کے طور پر تقریباً انھیں صفات کے ساتھ پیش کیا ہے جو مرد مومن کے تشکیلی عناصر بن جاتے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کا آئیڈیل اور مرد مومن کے تصور کی کلید انھیں رسول عربی کی ذات ہی میں ملتی ہے۔ اقبال کی نظم مسجد قرطبہ اس اعتبار سے ان کی نمائندہ ترین نظم کہی جاسکتی ہے کہ اس نظم کے حوالے سے تصور وقت کے سلسلے میں انھیں اپنا زاویۂ نظر پیش کرنے کا موقع بھی ملا، اور مسجد کے وسیلے سے انھوں نے ایک ایسے معروض کو پیش کرنے کی سبیل پیدا کرلی جو وقت کی دست برد اور ہلاکت ریزی سے بڑی حد تک محفوظ ہے اور وقت کی چیرہ دستیاں بالآخر ان کو فنا کے گھاٹ اتار تو دیں گی مگر چونکہ اس مسجد میں اس کے بنانے والوں کی مومنانہ صفات موجود ہیں اس لئے ان صفات کے عکس نے مسجد کو بھی غیر معمولی مزاحمت کی قوت سے مالا مال کردیا ہے۔ علی میاں نے اس نظم کے جائزے کی تمہید کے طور پر جو فقرے لکھے ہیں وہ نظم کے مالہ و ماعلیہ کو بخوبی اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔

اقبال نے اس (نظم) میں فن و زندگی کے بہت سے نظریات واقدار سے پردے ہٹائے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ زوال پذیر دنیا فانی ہے..... لیکن اس اسم عام سے وہ آثار اور تعمیرات مستثنیٰ ہوتی ہیں جنھیں کسی بندۂ باخدا اور مرد مومن کا دست مسیحا اور پنجۂ اعجاز نما چھو جاتا ہے۔ اور وہ اپنے ایمان و زندگی، اپنے مومنانہ جذبات اور اپنی بقائے دوام کے اثر سے ان میں جان ڈال دیتا اور لافانی بنا دیتا ہے، اپنے عشق و محبت کی قوت و تاثیر سے انھیں زندگی جاوداں عطا کرتا ہے۔

علی میاں نے چند فقروں میں جس طرح مسجد قرطبہ کی روح کو سمیٹ لیا ہے وہ یقیناً قابل تحسین ہے، مگر غور طلب بات یہ ہے کہ کیا محض یہ مرکزی تصور ہی اس نظم کی

عظمت کی ضامن ہے؟ تو اس سلسلے میں دوسرے تصورات کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ ہمیں اقبال کے تصور وقت سے رجوع کرنا ہوگا جو زیر بحث نظم کی بنیاد اور کلید ہے۔ سلسلۂ روز وشب کی ترکیب میں اقبال نے جورات اور دن، اجالے اور اندھیرے، طلوع وغروب اور زمانی تسلسل کو قید کر دیا ہے وہی دراصل اس نظم کا مرکزی حوالہ ہے۔ اس حوالے کے پس منظر میں لا تسبوا الدھر والی حدیث قدسی اور وقت کا اسلامی تصور کار فرما ہے۔ نظم کے ابتدائی دو بند میں ذات اور صفات کے رشتے کو جس طرح الوھی منبع تخلیق اور تخلیق کے عمل کے لامتناہی تسلسل کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے، اور اس فلسفیانہ تناظر کو مستحکم کرنے کے بعد فنا اور بقا کے مسئلے کا احاطہ کیا گیا ہے اور اس پہلو پر خاص توجہ کی ضرورت تھی۔ تاہم اس نظم کے فکری جائزے میں مصنف نے عشق، خودی، جلال، جمال اور فنون لطیفہ میں خون جگر کی نمود جیسے مسائل نہایت بالغ نظری کے ساتھ اس طرح ایک تسلسل اور تخلیقی نمو کے پس منظر پیش میں کر دیئے ہیں کہ مسجد قرطبہ جیسی غیر معمولی اور مکمل نظم کی تحسین کے ساتھ تعبیر وتجزیہ کا بھی حق ہو گیا ہے۔

علامہ اقبال کے فلسفے کو اگر محض ان کی اردو اور فارسی شاعری کے موضوعات اور نقطۂ نظر سے مرتب کرنے کی کوشش کی جائے تو اس فکر وفلسفہ کے بیش تر عناصر کو مجتمع کرنا قدرے دشوار تو ہے مگر ممکن ہے۔ اسی لئے اقبال کو ان کی کلیت میں سمجھنے کے لئے ان کے خطبات تحقیقی مقالہ اور مکتوبات کو پس منظر کے طور پر استعمال کرنا زیادہ کارآمد اور صحیح طریقہ ہے۔ علی میاں نے اسی باعث اقبال پر مضامین لکھتے ہوئے تمام مآخذ ومصادر سے رجوع کیا اور خاصے ردوقبول کے عمل سے گزرنے کے بعد ایک مخصوص رائے قائم کی ہے۔ ایسا بالکل نہیں ہے کہ علی میاں نے غیر مشروط طور پر اقبال کو قابل تقلید مان لیا ہو۔ اس کا ثبوت ان کے ان جملوں سے واضح انداز میں ملتا ہے کہ:

''اقبال ان معدودے چند خوش نصیب افراد میں سے ہیں

جو مغربی تعلیم کے سمندر میں غوطہ لگا کر ابھر آئے۔ اور نہ صرف یہ کہ صحیح سلامت ساحل تک پہنچے، بلکہ اپنے ساتھ بہت سے موتی بھی تہہ سے نکال کر لائے۔ اور ان کی خود اعتمادی اسلام کی ابدیت اور اس کے وسیع مضمرات پر ان کا یقین اور زیادہ مستحکم ہو گیا۔ اگر چہ یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے مغربی تعلیم اور فلسفہ کا مطلق اثر نہیں قبول کیا اور ان کی دینی فہم کتاب وسنت اور سلف امت کے بالکل مطابق ہے۔"

اپنے آخری جملے کی وضاحت علی میاں نے حاشیہ میں اس طرح کی ہے:

"جس میں کہیں کہیں حقائق غیبی کی فلسفیانہ تعبیر و تاویل کا شدید رنگ جھلکتا ہے"۔

ان معروضات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علی میاں نے اپنے موقف اور مطمح نظر کا پورا احترام کرتے ہوئے اقبال کی فلسفیانہ اور شاعرانہ عظمت کو مدلل انداز میں سمجھنے کی کوشش کی ہے اور افہام و تفہیم کا یہ عمل جہاں اقبال اور اقبالیات کے ذخیرے میں ایک اضافہ بن گیا ہے وہیں علی میاں کی تصانیف میں روائع اقبال کو صحیح اور مناسب ترین سیاق وسباق میں متعارف کرانے اور تعبیرات سے گزارنے کے ناقدانہ کارنامہ کی حیثیت بھی حاصل ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر محمد نعمان خاں

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی

نقوش اقبال کی روشنی میں

بیت اللہ شریف کی کلید برداری کی سعادت، کشمیر یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی سند المملکۃ العربیۃ السعودیۃ کا شاہ فیصل ایوارڈ نیز ادارۂ جائزہ قرآن دبئی کے بین الاقوامی اعزاز یافتہ، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ہمہ جہت شخصیت اور ہمہ گیر علمی، دینی، ادبی، تدریسی اور اصلاحی خدمات محتاج تعارف نہیں، وہ محض داعی، مبلغ، مصلح، صوفی، خطیب، دانشور، قائد اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم اعلیٰ ہی نہ تھے بلکہ نابغہ عصر مصنف، مورخ، ناقد محقق، سیرت نگار، سفرنامہ نویس اور صاحبِ طرز ادیب بھی تھے ان کے خریطہ جواہر میں ہر قسم کے گوہر ملتے ہیں۔ مختلف النوع موضوعات پر متعدد عربی مقالات، اور کتب کے ساتھ تقریباً ایک سو آٹھ اردو کتب اور بے شمار ادبی و دینی مقالات، اُن کی کاوش قلم کا نتیجہ ہیں، جو مخصوص دینی، ادبی اور تہذیبی ماحول انھیں ورثے میں ملا، اسے ان کے ذوق مطالعہ اور ذہانت طبعی نے جلا بخشی اور صحبتِ اہل صفا نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا، انھوں نے جن صحبتِ بااہلِ دل کے علمی اور روحانی فیوض سے اکتساب کیا، اُن میں، والد محترم حکیم سید عبدالحئی مرحوم کے ساتھ مولانا اشرف علی

تھانویؒ، مولانا محمد الیاسؒ، مولانا عبدالقادر رائے پوری مرحوم، مولانا محمد ذکریاؒ اور بھوپال کے شاہ محمد یعقوب مجددیؒ عرف پیر ننھے میاں صاحب کے اسمائے گرامی بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ وہ علامہ شبلی نعمانیؒ کی تاریخ نویسی، مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرت نگاری، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی عقلیت پسندی اور شاعر مشرق علامہ اقبال کے سوز وگداز سے بے حد متاثر تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اُنھیں اُس زندہ تمنا سے بہرہ ور فرمایا تھا، جو روحِ مومن میں تڑپ اور قلبِ مومن میں سوز وگداز پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے اور جہاں بینی کی فطرت کا حامل ہونے کے باوجود کسی جمشید کا ساغر نہیں بننے دیتی۔ اُن کی ذات گرامی، اقبالؔ کے اس مردِ مومن کی زندہ مثال تھی، جس کے لیے انھوں نے فرمایا تھا:

نگہ بلند سخن دل نواز جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے

-:یا:-

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مزاج کی حق گوئی اور بے باکی کے سبب، مسلم پرسنل لا میں مداخلت، وندے ماترم یا اسی نوع کے دیگر ملی مسائل کے تئیں وہ ہمیشہ آواز احتجاج بلند کرتے رہے اور اربابِ حل وعقد کو ان کی بات تسلیم کرنے پر مجبور ہونا پڑا انھیں اوصاف حمیدہ کے سبب پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ:

''سید صاحب کو ملت کے سفیرِ کبیر بننے کا حق پہنچتا ہے''

(ماخوذ' مقدمہ نقوش اقبال)

اقبالؔ، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مرحوم کے پسندیدہ شاعر تھے۔ دونوں

کے مابین اتحادِ فکر کی بنیاد، اسلام کا وہ وسیع تر تصور تھا جو کلام اقبال کے ایک بڑے حصے پر محیط ہے، مولانا علی میاں، اقبال کے بعض نظریات سے اختلاف رائے کے باوجود، انھیں ملت کا سچا ہمدرد اور غم گسار سمجھتے تھے، اقبال سے اُن کی مناسبت خاص کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سولہ برس کی عمر میں ہی اُنھوں نے اقبال کی نظم ''چاند'' کا نہ صرف عربی ترجمہ کیا بلکہ علامہ اقبال سے اس کی داد بھی وصول کی۔ ہر دو حضرات کے مابین فکری مماثلت اور ذہنی ہم آہنگی کا بڑا سبب عظمتِ انسانیت کا حامی نیز عاشق رسولؐ ہونا بھی تھا، چنانچہ دونوں حضرات، تمام عمر اتحاد و اتفاق نیز علم و عمل کی تلقین کرتے رہے، افرادِ ملت کو عزت نفس کے ساتھ جینے کا پیغام دیا۔ تصوف کو کتاب و سنت کی روشنی میں پیش کر کے اُسے تہذیبِ نفس اور روحانی کمالات کے اکتساب کا الہامی طریقہ بتانے کی سعی کی۔ عالم اسلام اور دینی مسائل پر اُن کی گہری نظر تھی۔ دونوں حضرات دشمنانِ اسلام کی سازشوں سے باخبر بھی رہے اور اُن کے سدِّ باب کے لیے کوشاں اور متفکر بھی!

دونوں مفکرین اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ دینِ مبین کی ترقی کا انحصار نئی نسل پر ہے اور اس کی تعلیم و تربیت نیز کردار سازی کے لیے مذہبی علوم اور اسلاف کے شاندار کارناموں سے واقفیت کے ساتھ جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا نہایت ضروری ہے۔ اقبال کا کلام اُنھیں اس وجہ سے پسند تھا کہ اس کی بنیاد قرآن حکیم پر استوار ہے۔ ایمان و ایقان، عرفانِ نفس، آہ سحر گاہی، ماضی کی شاندار تاریخ سے دلچسپی، اُمت کی فلاح کا خیال، ایسے موضوعات ہیں جن کی وجہ سے وہ خود کو علامہ اقبال کا ہمنوا اور ہم خیال سمجھتے تھے۔ مزاج و فکر نیز عقائد و نظریات کی یکسانیت نے حضرت علی میاں کو اقبال کا شیدائی اور فدائی بنا دیا تھا، اس کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ:

> ''میں نے کلام اقبال کو عام طور پر اسی لیے پسند کیا ہے کہ وہ میری پسند کے معیار پر پورا اُترتا اور میرے جذبات و محسوسات کی

ترجمانی کرتا ہے، وہ میرے فکر وعقیدے ہی کے ساتھ ہم آہنگ نہیں بلکہ اکثر میرے شعور اور احساسات کا بھی ہم نوا بن جاتا ہے .....میں ہر اس ادب اور پیغام کی طرف بے اختیارانہ بڑھتا ہوں جو بلند نظری، عالی حوصلگی اور احیائے اسلام کی دعوت دیتا اور تسخیر کائنات اور تعمیر انفس وآفاق کے لیے اُبھارتا ہے، جو مہر ووفا کے جذبات کو غذا دیتا اور ایمانی شعور کو بیدار کرتا ہے، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور اُن کے پیغام کی آفاقیت وابدیت پر ایمان لاتا ہے۔

میری پسند اور توجہ کا مرکز وہ اسی لیے ہیں کہ وہ بلند نظری، محبت اور ایمان کے شاعر ہیں، ایک عقیدہ، دعوت اور پیغام رکھتے ہیں اور مغرب کی مادی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور باغی ہیں۔ وہ اسلام کی عظمت رفتہ اور مسلمانوں کے اقبالِ گذشتہ کے لیے سب سے زیادہ فکرمند، تنگ نظر قومیت اور وطنیت کے سب سے بڑے مخالف اور انسانیت اور اسلامیت کے عظیم داعی ہیں''۔

(نقوش اقبال صفحہ-۲۳)

مبنی برحقیقت اقتباس بالا باوجود مولانا محترم کا یہ اعتراف بھی قابلِ غور ہے کہ:

''.....میں اقبالؔ کو کوئی معصوم اور مقدس ہستی اور کوئی دینی پیشوا اور امام مجتہد نہیں سمجھتا اور نہ میں ان کے کلام سے استناد اور مدح سرائی میں حدِ افراط کو پہنچا ہوا ہوں.....اقبال کے یہاں اسلامی عقیدہ اور فلسفہ کی ایسی تعبیریں بھی ملتی ہیں، جن سے اتفاق کرنا مشکل ہے.....اپنے بارے میں میری گواہی یہ ہے کہ

جب جب بھی اُن کا کلام پڑھا تو دل جوش سے امنڈ نے لگا
اور لطیف جذبات نے انگڑائیاں لینا شروع کر دیں.....اور رگوں
میں شجاعت اسلامی کی رَو دوڑنے لگی میری نظر میں یہی اُن کے
شعر کی اصل قدر و قیمت ہے"۔ (نقوش اقبال صفحہ-۴۰)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مرحوم اصلاً داعی الی اللہ تھے، عربی اور اردو زبانوں پر اظہار کی یکساں قدرت حاصل ہونے اور کثیر التصانیف ہونے کے باعث ان کا شمار صاحبِ طرز ادیبوں میں ہوتا ہے۔ وہ شعر و ادب کی اہمیت کے قائل تھے، چنانچہ موضوع کے مؤثر اظہار کے لیے ادبی سخن پذیری، شگفتہ انداز بیان اور کمال انشاء پردازی کو وہ اس لیے بھی لازمی سمجھتے تھے تا کہ:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کے مصداق، دل سے نکلی ہوئی بات دل میں اُتر جائے، یہ عنصر ان کے نزدیک کس قدر اہم تھا، اس کا اندازہ اُن کے درج ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

"دین کے جن داعیوں اور علماء کو آغاز عمری میں اپنے ملک
کی زبان و ادب کا مطالعہ اور اس کا ذوق پیدا کرنے کا موقع نہیں
ملتا یا بڑی عمر میں وہ ان کا مطالعہ کرتے ہیں، اُن کو دین کی مؤثر
دعوت دینے اور دینی حقائق کی تفہیم و تعلیم میں نیز جدید تعلیم یافتہ
طبقے میں دینی مقاصد کو دلنشین کرنے میں دقّت پیش آتی ہے اور
اُن کی انشاء تحریر میں وہ طاقت اور دلآویزی نہیں ہوتی جس کی اس
عہد میں ضرورت ہے۔" (کاروان خیال صفحہ-۹۳)

موضوع خواہ ادبی ہو یا مذہبی اُن کی ہر تحریر و تقریر میں ادب و انشاء کی شان نمایاں نظر آتی ہے لیکن اُن کی معرکۃ الآراء تصنیف ''روائع اقبال'' یعنی ''نقوش اقبال'' میں یہ عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔

نقوش اقبال

دراصل عربی کتاب ''روائع اقبال'' کا اردو ترجمہ ہے جس کے مترجم مولوی شمس تبریز صاحب ہیں۔ دورانِ مسافرت لکھی گئی اس کتاب کا مقصد عرب نوجوانوں کو کلام و پیام اقبال سے متعارف کرانا تھا۔

فکر و فن اقبال کے ہر ہر پہلو پر بے شمار تحقیقی، تنقیدی، تشریحی اور وضاحتی کتب شائع ہو چکی ہیں، لیکن ایسی کتب بہت کم ہیں جن میں ''نقوش اقبال'' کی طرح اقبال کی فکر و فن کا مطالعہ، اصل تناظر اور پس منظر میں کیا گیا ہو، اس کتاب کے متعلق فرزند اقبال، جاوید اقبال کی یہ رائے حرف بہ حرف صحیح ہے کہ:

> ''وہ آپ نے فکر اقبال کے مختلف پہلوؤں کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے، جیسے اغلباً اقبال محسوس کرتے یا چاہتے تھے''۔

ماہر القادری مرحوم کا یہ خیال بھی مذکورہ بالا رائے کی تائید کرتا ہے کہ:

> ''.....اقبالؔ پر بڑی اچھی کتابیں آئی ہیں مگر یہ کتاب اُس مجاہد عالم کی لکھی ہوئی ہے جو اقبال کے مردِ مومن کا مصداق ہے، اس لیے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ''نقوش اقبال'' میں خود اقبال کی فکر اور روح اس طرح گھل مل گئی ہے جیسے پھول میں خوشبو اور ستاروں میں روشنی''۔ (نقوش اقبال چوتھا ایڈیشن)

علامہ اقبالؔ کی شخصیت اور فکر و فن سے متعلق ''فکر اقبالؔ''، ''روحِ اقبالؔ'' اور ''اقبال کامل'' اہم ترین کتب شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہیں لیکن ان کتابوں میں

ایک اہم موضوع یعنی اقبال کے نظریۂ تعلیم پر خاطر خواہ اظہارِ خیال نہیں کیا جا سکا ہے، جبکہ ''نقوش اقبال'' میں علامہ کی حیات شخصیت، مزاج و ماحول، پیغام، اہم تخلیقی عناصر اور بعض خاص نظموں کے تجزیے کے ساتھ اُن کے نظریۂ تعلیم پر بالتفصیل اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یہی وہ امتیازی خصوصیات ہیں جن کے سبب ''نقوش اقبال'' کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کا پہلا ایڈیشن سال بھر کے اندر ہی ختم ہو گیا اور تا حال یکے بعد دیگرے اس کے چھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ دوسرے ایڈیشن میں دو نئے مضامین بعنوان ''اقبال اور وطنیت'' اور ''عورت اقبال کے کلام میں'' کے اضافے کے ساتھ پروفیسر رشید احمد صدیقی کا معرکۃ الآرا مقدمہ نیز چوتھے ایڈیشن میں ''کلام اقبال میں تاریخی حقائق و اشارات'' کی شمولیت سے کتاب کی اہمیت اور قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

یہ سچ ہے کہ علامہ اقبال کی فکر و فن پر ہر مکتب فکر کے حامل مصنفین نے قلم اٹھایا ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اور آئندہ بھی جاری رہے گا لیکن اقبال کے بنیادی پیغام اور اُس کی روح تک پہنچنے کے لیے جس جید عالم، مرد مومن، اور صاحب طرز ادیب کی ضرورت تھی اس کے لیے حضرت سید ابوالحسن علی ندویؒ سے بہتر اور مناسب نام بھلا اور کس کا ہو سکتا تھا؟

حقیقتاً مولانا مرحوم نے اقبال سے محبت اور اقبال شناسی کا حق ادا کرتے ہوئے دعوتی طرزِ فکر کے ساتھ ''روائع اقبال'' کے ذریعہ اہلِ عرب، ''نقوش اقبال'' کے ذریعے اہلِ اردو اور ''GLORY OF IQBAL'' کے ذریعہ اہلِ مغرب سے صحیح طور پر متعارف کرانے کا جو اہم فریضہ انجام دیا ہے اس کے سبب یہ کتاب اقبال شناسی میں نہ صرف ایک منارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ حلقۂ اقبالیین اور اقبالیات میں اسے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہے گا۔

ڈاکٹر نعیم الحسن اثری

کاروان مدینہ

(ایک مطالعہ)

نابغہ عصر فضیلۃ الشیخ مولانا ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ باری تعالیٰ نے آپ کو جو قوت گویائی اور آپ کے قلم کو جو طاقت پرواز عطا کی تھی وہ کسی اور کو نصیب نہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ عربی و اردو ثقافت و ادب کو جو گراں مایہ سرمایہ آپ نے اپنی تخلیقی کاوشوں سے عطا کیا ہے وہ امت مسلمہ کے لیے ایک لازوال نعمت ہے جس کا جس قدر بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ آپ کی کسی بھی تصنیف پر کسی طرح کا کوئی بھی تبصرہ کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ مگر اپنی کم مائیگی کے باوجود یہ چند سطریں آپ کی معرکۃ الآراء کتاب ''کاروان مدینہ'' پر بطور تبصرہ نہیں بلکہ نذرانہ عقیدت کے طور پر پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں اور باری تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ مجھے حق بات لکھنے کی توفیق بخشے۔ و باللہ التوفیق (آمین)

''کاروان مدینہ'' مولانا علیہ الرحمہ کی ان چند علمی و ادبی شاہکاروں میں سے ایک ہے جس کی ضیاء پاش کرنوں نے سماج و معاشرے کی تاریکیوں کو ختم کرنے میں کلیدی رول ادا کیا ہے اور ہمیشہ مردہ دلوں میں روح پھونک کر انھیں نئی زندگی عطا کی

ہے۔ یہ کتاب مولانا کی مختلف تقریروں اور سیرت کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں موقع ومحل کے اعتبار سے چنداں اختلاف بھی پایا جاتا ہے مگر ان سب کا ارتکاز ایک ہی ذات گرامی ہے یعنی ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ؐ کی سیرت پاک۔ ان تقاریر ومضامین کا بیشتر حصہ پہلے عربی میں لکھا گیا تھا پھر انھیں مصنف نے خود یا ان کے بعض عزیز ورفیق نے اردو میں منتقل کیا جو بعد میں مختلف مؤقر رسائل وجرائد میں شائع ہوئے۔

یوں تو سیرت نبوی پر آغاز اسلام سے لے کر اب تک دنیا کی ہر زبان میں ہزاروں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور ہر کتاب کچھ نہ کچھ منفرد خصوصیات کی حامل رہی ہے۔ ہر مصنف نے سیرت نبوی کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں کو اپنے اپنے انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے مگر سیدنا فضیلۃ الشیخ علیہ الرحمۃ کی کتاب کاروانِ مدینہ یا 'الطریق الی المدینہ'' گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے اپنی الگ ہی ایک پہچان رکھتی ہے۔

کاروانِ مدینہ (الطریق الی المدینہ) گلہائے رنگ رنگ کا ایک ایسا چمن ہے جس میں ہر رنگ، ہر خوشبو اور ہر موسم کے کھلنے والے پھول موجود ہیں جن کی عطر بیزیوں سے دلوں کے خفتہ شعور بیدار ہوتے ہیں، قلب وروح میں جان پڑتی ہے اور احساسات وجذبات کی دنیا معمور ہو جاتی ہے۔

سیرت نبوی پر لکھی جانے والی یہ منفرد کتاب ہے جس میں سیرت کے مروجہ اسلوب سے ہٹ کر ایک نئے طرز کی طرح ڈالی گئی ہے۔ مصنف علیہ الرحمہ نے اس کتاب کی تصنیف سے قبل بارہا اس سرزمین کے چپے چپے کی زیارت کی جسے فخر دوعالم سرور کائنات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے پیدائش اور مرکزِ نبوت ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ آپ نے اس خطۂ مبارکہ کے ایک ایک واقعہ اور ان کے مقامات کو بڑی باریکی سے دیکھا پرکھا اور ان کا جائزہ لیا ہے اور واقعات کو تعبیرات کا جامہ پہنانے کے لیے تشبیہات واستعارات کی زبان اختیار کی ہے اور بطور شواہد قرآنی آیات، احادیث

اور عربی و فارسی کے اشعار استعمال کیے ہیں۔

یہ کتاب سیرت سے متعلق پندرہ مضامین پر مشتمل ہے جس میں ہر مضمون جامعیت کا ایک حسین مرقع ہے، جس میں سیرت نویسی کے قدیم طرز تحریر سے الگ ہٹ کر ایک نیا اور اچھوتا اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے۔ ہر مضمون اپنی نوعیت کے اعتبار سے دوسرے سے مختلف ہے، مگر سیرت کے کسی نہ کسی پہلو کو پیش کرنے میں سبھی ایک دوسرے سے مربوط و منسلک نظر آتے ہیں۔ سیرت نبوی کے ساتھ ساتھ امت مسلمہ کا بڑی گہرائی سے جائزہ لیا گیا ہے اور قرون وسطی اور ابتدائے اسلام کے حالات سے ان کا موازنہ کر کے مسلمانوں کی زبوں حالی کی طرف نہ صرف اشارہ کیا گیا ہے بلکہ اسلامی معاشرے میں پائے جانے والے مختلف روحانی امراض کے سدباب کے لیے مناسب طریقہ بھی تجویز کیا گیا ہے۔ فرد و جماعت دونوں کو اپنی کوتاہیوں اور ذمہ داریوں کا احساس دلا کر اصلاح معاشرے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ مضامین کے اس حسین مرقع کو پڑھتے وقت قاری اپنے وجود کو اپنے خارجی و داخلی عوامل کو بھول کر سوئے حرم رواں دواں ہو جاتا ہے، جہاں ہدایت و رہنمائی کا ابلتا ہوا چشمہ اس کی راہ میں منتظر ہے اور اس کی پیاس بجھانے کے لیے سراپا متمنی و مشتاق۔

کتاب کی غرض و غایت کو بیان کرتے ہوئے مصنف علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ:

> ”.....کچھ عرصہ سے یہ احساس کھٹک رہا تھا اور دل میں چٹکیاں لیتا تھا کہ ممالکِ عربیہ کے تعلیم یافتہ طبقہ کے بہت سے افراد کا تعلق (خصوصاً وہ جو عرب قوم پرستی سے متأثر ہیں اور جن پر اس سحر سامری کا جادو چل گیا ہے جس کو کچھ عرصہ سے مصر میں جگایا گیا ہے) اس ذات گرامی سے جو ان کی ہر طرح کی سعادت کا سرچشمہ اور سررشتہ ہے اور جس سے ان کو دین و دنیا کی دولت و عزت ملی، اب مضمحل اور کمزور پڑ گیا ہے۔..... اس صورت حال سے

متأثر ہو کر میں نے یہ مناسب سمجھا کہ اپنی ان عربی تقریروں اور مضامین کو جو اپنے اپنے وقت پر مفید ثابت ہوئے تھے اور عرب ادیبوں اور اہل ذوق نے ان سے اپنے گہرے تاثر کا اظہار کیا تھا یکجا جمع کر کے شائع کر دوں، شاید وہ کسی افسردہ اور سرد دل میں محبت کی نئی حرارت پیدا کرنے اور قوم پرستی کے اثر کو کم کرنے میں کوئی خدمت انجام دے سکے۔"

آگے لکھتے ہیں:

"مغربی علوم، مادی فلسفوں، جدید تعلیم اور قوم پرستی کی رہنمائی میں جو غنیم فوجیں عجم کو چھوڑ کر اب خود عرب میں اور دور دراز کے اسلامی ملکوں سے قطع نظر اب اندرون حرم داخل ہو گئی ہیں، ان کا مقابلہ کرنے اور ان کے اثرات کو زائل کرنے کی یہی صورت سمجھ میں آئی کہ اقلیم محبت اور ولائت عشق کی طرف سے ایک نئی سپاہ تیار کی جائے جو مادیت کے ان لشکروں کے مقابلہ میں صف آرا ہوں، خام عقل اور سطحی علم کا کامیابی کے ساتھ ہمیشہ محبت نے ہی مقابلہ کیا ہے۔"

آپ نے اقبالؔ کا یہ شعر بھی برمحل کوٹ کیا ہے

سپاہ تازہ سر انگیز از ولائت عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوت فرداست

چنانچہ مصنف علیہ الرحمہ نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ مختلف طریقوں سے نبوت کا پیغام امت محمدیہ تک پہنچایا جائے تا کہ بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سے سوئے حرم لے جانے کا عمل پایۂ تکمیل تک پہنچ سکے، بہتر ہوگا کہ اہم ترین مضامین کا ایک طائرانہ

جائزہ پیش کیا جائے۔

وہ کتاب جس کا احسان میں بھول نہیں سکتا

اس عنوان کے تحت مصنف نے مطالعہ سیرت سے متعلق سیرت کی اس کتاب کا تذکرہ کیا ہے جس کے اثرات ونقوش مصنف کے دل و دماغ پر تادم حیات چھائے رہے اور جس کی برکت نے نہ صرف مصنف کے اندر مطالعہ سیرت کا شوق پیدا کیا بلکہ ان کی پوری کائنات ہی بدل ڈالی، اس کے ایک ایک واقعہ نے مصنف کی ذات کو متاثر کیا ہے اور انھیں کمسنی اور نوعمری کے باوجود سیرت نبوی کا شائق و دیوانہ بنا دیا تھا۔

یہاں اس واقعہ کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مصنف نے اپنی کم مائیگی اور تنگ دستی کے باوجود مولانا قاضی منصور پوری کی کتاب ''رحمۃ للعالمین'' شائع ہونے کی خبر سنی تو اسے منگوانے کا آرڈر بھجوایا۔ مگر ڈاکیہ کتاب لے کر آیا تو ان کے یا اہل خانہ کے پاس اتنی وسعت نہ تھی کہ کتاب لی جاتی، لکھتے ہیں:

> ''ایک روز ڈاکیہ ہمارے چھوٹے گاؤں (دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی) میں ڈاک لے کر آیا۔ اس کے پاس کتاب کا ایک پیکٹ بھی تھا۔ میں نے دیکھا میرے پاس اس کتاب کو خریدنے کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ میری والدہ صاحبہ (متوفیہ ۶ جمادی الآخر ۱۳۸۸ھ) جن کو اپنے یتیم بچے کی خاطر عزیز تھی، نے یہ رقم دینے سے معذرت کر دی، اس لیے کہ اس وقت ان کے پاس کچھ رقم نہ تھی، میں نے دیکھا کہ اس وقت میرا کوئی مددگار اور سفارشی نہیں ہے، سوائے اس سفارش کے جس سے اکثر بچوں نے کام لیا ہے اور ان کو اس کا تجربہ رہا کہ اس کی سفارش کبھی رد نہیں کی جاتی۔ یہ وہ سفارش ہے جس کی مدد سیدنا عمیر بن ابی وقاص نے لی تھی اور رسول

اللہؐ نے اس کی سفارش قبول فرمائی تھی اور ان کو غزوہ بدر میں شرکت کی اجازت دے دی تھی۔ یہ آنسوؤں اور معصوم گریہ و بکا کی سفارش ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے نیک بندوں کے یہاں اب بھی بہت وقیع ہے اور ضرور سنی جاتی ہے..... چنانچہ یہی ہوا، میری شفیق والدہ کا دل قدرتی طور پر نرم پڑ گیا۔ انھوں نے کہیں سے کوشش کر کے یہ رقم میرے حوالے کی اور میں نے یہ کتاب حاصل کر لی۔''

یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ اس وقت مولانا کی عمر کے بچے آج کل ویڈیو گیم اور فلموں کے لیے اس سے موٹی رقم تو خرچ کر دیتے ہیں مگر سیرت جیسی کتاب تو کیا کوئی معمولی سی کتاب بھی خریدنا ان کے وہم وگمان کے باہر ہے۔ شاید اس کتاب کی برکت نے مولانا کو بام عروج تک پہنچایا اور ان کے قلم میں وہ تمام تر خوبیاں سمو دیں جو ایک عاشق رسول کے لیے زیبا ہو سکتی ہیں۔ اسے بیان کرتے ہوئے تو کبھی ابوایوب انصاری جیسی فرط مسرت کہ ناقہ نبوی جیسے ان کے دروازہ پر کھڑی ہو اور وہ ضیافت کے لیے سرتاپا تیار، کبھی احد کے میدان میں اخلاص و وفا، قربانی و ایثار ایمان و یقین اور شرافت و حوصلہ مندی کا پیکر بن کر ابودجانہ کی جگہ اپنے آپ کو محسوس کر کے سرور و مستی سے جھوم جھوم اٹھتے ہیں۔ مولانا نے اس کتاب کے تئیں ان الفاظ میں اپنے تاثر پیش کئے ہیں:

اس کتاب کا اور صاحب کتاب کا میں دل سے شکر گزار ہوں کہ اس نے میری محبت کے پرسکون ساز کو چھیڑ دیا اور اس بات کا بھی شکر گزار ہوں کہ اس نے اس ابھرتی ہوئی متحرک اور زندہ و بیدار محبت کا رخ اس شخصیت کی طرف پھیر دیا جس سے زیادہ صورت و سیرت اور کمال ظاہر و باطن کا دلکش انسانی نمونہ خالق و مالک نے اور قادر مطلق نے کوئی اور نہیں بنایا (صلی اللہ علیہ وسلم)

عالم نو

عالم نو کے عنوان سے مولانا نے اپنی اصل کتاب کا آغاز کیا ہے، اس مضمون میں مصنف نے چھٹی صدی عیسوی کے حالات اور بعثت رسولؐ سے قبل عرب اور دنیا کے حالات سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ بعثت رسولؐ کے وقت انسانیت کی کیا کیفیت تھی اس کو تحریر کرتے ہوئے مولانا رقم طراز ہیں:

> ''چھٹی صدی عیسوی میں انسانیت کی گاڑی ایک ڈھلوان راستے پر پڑ گئی تھی، اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ راستے کا نشیب بڑھتا جا رہا تھا اور رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اس گاڑی پر انسانیت کا پورا قافلہ اور آدم کا پورا کنبہ سوار تھا۔ ہزاروں برس کی تہذیب اور لاکھوں انسانوں کی محنتیں تھیں۔ گاڑی کے سوار میٹھی نیند سو رہے تھے ..... مگر نہ کوئی یہ دیکھتا تھا کہ گاڑی کس غار کی طرف جا رہی ہے اور اب وہ کتنا قریب رہ گیا ہے.....''

مولانا نے بڑے حسین پیرایوں میں انسانیت کی ڈوبتی کشتی کی تصویر کشی کی ہے اور رہبران قوم کی بے بسی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''فلسفی اور حکیم، شاعر اور ادیب کوئی اس میدان کا مرد نہ نکلا سب اس وباء کے شکار تھے۔ مریض، مریض کا علاج کس طرح کرے؟ جو خود یقین سے خالی ہو وہ دوسروں کو کس طرح یقین سے بھر دے؟ جو خود پیاسا ہو دوسروں کی پیاس کس طرح بجھائے؟ انسانیت کی قسمت پر بھاری قفل پڑا تھا اور کنجی گم تھی، زندگی کی ڈور الجھ گئی تھی اور سرا نہ ملتا تھا۔''

اس مضمون کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں انسانیت کی خامیوں کی نشاندہی

کرتے ہوئے بعثت اور اس کی تجلیات کا ذکر نہایت حسین پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ نیز اس میں نبوی تعلیمات کے اثرات کا ذکر کیا گیا ہے لکھتے ہیں:

"تیئس برس میں دنیا کا رخ پلٹ گیا، دنیا کا ضمیر جاگ گیا..... زمانے کی رت بدل گئی۔ انسان کیا بدلا زمین اور آسمان بدل گئے۔ یہ سارا انقلاب اسی پیغمبر کی کوشش اور تعلیم کا نتیجہ ہے۔ آدم کی اولاد پر آدم کے کسی فرزند کا اتنا احسان نہیں جیسا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا کے انسانوں پر ہے۔ اگر اس دنیا سے وہ سب لے لیا جائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو عطا کیا ہے تو انسانی تہذیب ہزاروں برس پیچھے چلی جائے گی۔"

غار حرا کی روشنی میں

یہ اس تقریر کا ترجمہ ہے جو ربیع الاول ۱۳۵۰ھ میں سعودی ریڈیو اسٹیشن (جدہ) سے نشر کی گئی تھی۔ ترجمہ مولوی عتیق الرحمٰن سنبھلی نے کیا اور "الفرقان" ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ میں شائع ہوا۔

اس مضمون کے اندر مولانا موصوف نے غار حرا کے فیوض و برکات اور اس سے پھوٹنے والی علم و آگہی کی روشنی کا ذکر بڑے پرشکوہ الفاظ میں کیا ہے۔ نبی نوع انسان کے دلوں پر پڑے شرک و بدعات اور کفر و الحاد کے نوع بنوع قفلوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اس محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کا تعارف کرایا ہے جس کے پاس دنیا کے ہر قفل کی کنجی موجود تھی۔ جس کے دم سے دنیا کا وہ عقدہ لاینحل حل ہوا جو نہ بڑی بڑی حکومتوں کی راجدھانیوں میں حل ہو سکا اور نہ عظیم الشان درسگاہوں میں اور نہ علم و ادب کے پرشکوہ ایوانوں میں حل ہو سکا۔ گویا صدیوں کی گم شدہ کنجی پھر سے انسانیت کو مل گئی۔

مصنف اس مضمون میں افراد کی کارکردگی کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

ان کا ماننا ہے کہ سماج و معاشرہ کا وجود و بقاء افراد پر منحصر ہے۔ اگر سماج میں اچھے افراد ہوں گے تو سماج کی تعمیر مثبت ہوگی اور اگر اچھے افراد نہ ہوں تو سماج تباہ و برباد ہوسکتا ہے۔ نبوت کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ اس نے سماج کے ہر ہر فرد کی اصلاح کی اور اسے معاشرہ کا ایک عنصر کامل بننے کی ترغیب دلائی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''آج بھی اصل مسئلہ فرد کا مسئلہ ہے جو سارے دوسرے مسائل کا سرا ہے اور یہی ہمیشہ انسانی زندگی کا اصل مسئلہ رہا ہے کیونکہ فرد وہ اینٹ ہے جس سے سوسائٹی اور حکومت بنتی ہے۔ اور اس کا یہ حال ہوگیا ہے کہ مادہ اور قوت کے سوا کسی چیز کو ماننے کو تیار نہیں ہے۔ اپنی ذات اور خواہشات کے ماسوا اسے کسی چیز سے مطلب نہیں ہے..... بس یہی فرد کا بگاڑ ہے۔''

چنانچہ مصنف نے افراد اور معاشرہ کی کامیابی کی ضمانت اللہ، اس کے رسول اور یوم آخرت پر ایمان کو قرار دیا ہے جس نے ایک صالح معاشرہ کی تشکیل میں کارہائے نمایاں انجام دیا ہے۔

نبوت کا کارنامہ

اس عنوان کے تحت بھی مصنف نے عصر جدید کی تمام تر ترقیوں کے باوجود تشکیل معاشرہ میں اس کی ناکامیوں اور انسانی دنیا پر اسلامی تعلیمات اور ارشادات نبوی کے واضح اثرات کو واقعات کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ جدید تہذیب اور ماڈرن سوسائٹی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہماری جدید تہذیب اور موجودہ فکری قیادت، معاشرہ انسانی کی ذمہ داریاں سنبھالنے والے افراد تیار کرنے اور انسان کی سیرت سازی میں بری طرح ناکام رہی ہیں۔ وہ سورج کی

شعاعوں کو گرفتار کر سکتی ہے، وہ خلاؤں میں سفر کرنے والے محفوظ اور سریع السیر آلات تیار کر سکتی ہے، وہ انسان کو چاند اور سیاروں پر پہنچا سکتی ہے، وہ ذراتی طاقتوں سے بڑے بڑے کام لے سکتی ہے وہ ملک سے غریبی دور کر سکتی ہے، وہ علم و ہنر کو آخری عروج پر پہنچا سکتی ہے، وہ پوری کی پوری قوم اور ایک ملک کی آبادی کو خواندہ و تعلیم یافتہ بنا سکتی ہے، اس کی ان کامیابیوں اور فتوحات سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں، لیکن وہ صالح اور صاحب یقین افراد پیدا کرنے سے بالکل عاجز ہے، اور یہی اس کی سب سے بڑی ناکامی اور بدقسمتی ہے..... فاسد افراد نے معصوم اور صالح وسائل و ذرائع کو بھی فاسد بلکہ آلہ فساد و تخریب بنا دیا ہے.....'' (ص ۶۱)

آگے نبوت کے کارناموں کا یوں ذکر کیا ہے:

''اس دنیا میں صالح ترین افراد اور صالح ترین معاشرہ صرف نبوت نے تیار کیا ہے اور اسکے پاس قلب کو بدلنے اور گرمانے، نفس کو جھکانے اور جمانے، نیکی و پاکبازی کی محبت اور گناہ و بدی سے نفرت پیدا کرنے، مال و زر، ملک و سلطنت، عزت و وجاہت اور ریاست و تفوق کی سحر انگیز ترغیبات کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا کرنے کی صلاحیت ہے اور وہی افراد جو ان صلاحیتوں کے مالک ہوں دنیا کو ہلاکت سے اور تہذیب جدید کو تباہی سے بچا سکتے ہیں۔'' (ص ۲۶)

سیرت محمدیؐ کا پیغام بیسویں صدی کے نام

یہ مضمون مجلس سیرت پشاور کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۹۴۴ء میں پڑھنے کے

لیے اس کے سکریٹری حاجی عبدالرشید ارشد صاحب مرحوم کی دعوت پر لکھا گیا اور ادارہ تعلیمات اسلامی لکھنؤ کی طرف سے ایک رسالہ کی شکل میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں سیرت نبوی کے ایک نئے پرتو کو پیش کیا گیا ہے۔ مولانا موصوف علیہ الرحمہ نے مغربی تہذیب وتمدن کا جائزہ لے کر اسے زمانہ جاہلیت کے مساوی قرار دیا ہے اور جدید ٹکنالوجی اور ماڈرن تعلیمی واقتصادی ترقی کو مادیت پرستی کی بنیاد قرار دیا ہے، اور اس بات کو پوری طرح واضح کر دیا ہے کہ نئی تہذیب اپنی تمام تر تابناکیوں کے باوجود اسی قدر تاریک تر ہے جتنا کہ اپنے Dark-age میں یا پھر زمانہ جاہلیت میں کیونکہ ان ترقیوں نے انسان کو مادیت کا غلام بنا دیا ہے اور اسے اس کے حقیقی خالق و مالک سے الگ کیا ہے۔ مولانا موصوف لکھتے ہیں:

> ''مغربی انسان نے ایک خدا کا دامن چھوڑ کر دوسرے سیکڑوں خداؤں کا دامن پکڑ لیا ہے۔ ایک حقیقی آستانہ سے سر اٹھا کر جہاں سر جھکا کر وہ تمام آستانوں سے بے نیاز ہو سکتا تھا ہر سنگ آستانہ پر وہ اپنی پیشانی رگڑ رہا ہے۔ ایک خدا کو چھوڑ دینے کی سزا خدا کی طرف سے یہی ملی ہے۔ یہ ارباب بڑی تعداد میں مغرب پر مسلط ہیں اور ساری مغربی دنیا ان کے پنجۂ غضب میں گرفتار ہے۔ یہ کہیں سیاسی سردار ہیں کہیں اقتصادی دیوتا۔ کہیں اپنے تراشے ہوئے معیار زندگی..... ان بتان نو میں خاک وطن کا بھی ایک بڑا بت ہے جو ہمیشہ خون کا نذرانہ اور انسانی جانوں کی بھینٹ چاہتا رہتا ہے۔ انھیں میں ایک بڑا بت پیٹ ہے جس کی بندگی میں بیسویں صدی کا انسان رات دن لگا رہتا ہے لیکن پھر بھی وہ اس سے راضی نہیں۔'' (ص ۹۶۔۹۷)

آپ نے اس مضمون میں آخرت کے تصور کو بڑے مفکرانہ انداز میں پیش کیا ہے اور مغربی تہذیب پر بڑے اچھے انداز میں قدغن لگائی ہے کہ آخرت کا انکار انسان کو خدافراموشی اور خودفراموشی پر آمادہ کرتا ہے لکھتے ہیں:

''انکار آخرت کا پہلا اور طبعی اثر یہ ہے کہ دنیاوی زندگی اور دنیا کی چیزوں سے لذت وتمتع کا ایک جنون اور بحران پیدا ہوگیا ہے۔ تمتع ہی مقصد حیات قرار پا گیا ہے۔ آج مغرب کے ہر گوشہ سے صدائے ناؤ ونوش اور نعرہ عیش کوش بلند ہو رہا ہے اور اس کی ساری زندگی اس کے ذرائع کے حصول کی مسابقت میں صرف ہو رہی ہے۔ مسابقت نے زندگی کو ایک ایسا ریس کا میدان بنا دیا ہے جس کا کوئی منتہا نہیں۔'' (ص ۹۹)

آپ نے ایمان بالرسالت کے مسائل کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور مغرب کے رویہ کا ذکر کیا ہے، کیونکہ مغرب ایمان بالرسالہ کا کھوکھلا دعوے تو کرتا ہے لیکن عملاً اس کی زندگی تمام تر مادی ہونے کی وجہ سے انبیاء کی دعوت و پیغامات سے یکسر دور ہو چکی ہے۔ مغرب آج اس قدر روشن ہے کہ اس کی رات بھی دن ہے لیکن اس قدر تاریک ہے کہ دن بھی رات ہے۔ روشنی اور ترقی کے دور میں آج وہ سب کچھ پیش آ رہا ہے جو وحشت و بربریت کے دور کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔

پھر آپ نے نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اس کے فیوض و برکات اور تجلیات کا ذکر کیا ہے۔ نہایت پر مغز جامع کلمات کے ساتھ ۲۳ سالہ دور نبوت اور اس کے حتمی اثرات کا ذکر کیا ہے اور آخر میں اس پیغام کا ماحصل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سیرت محمدی کا اصل پیغام اس بیسویں صدی کی دنیا کے نام جس کی قیادت مغرب کے ہاتھ میں ہے، یہ ہے کہ اے اللہ

سے بھاگنے والو، اللہ کی طرف بھاگو اور اس کے سوا کسی کو الٰہ نہ بناؤ۔" (ص ۱۱۶)

"محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد افراد اور قوموں، اہل مشرق و اہل مغرب، اولین و آخرین، سب کے لیے اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ سعادت و فلاح انھیں کے دامن سے وابستہ ہے۔ ان سے علیحدہ ہو کر شقاوت و ہلاکت اور محرومی و نامرادی کے سوا کچھ نہیں۔" (ص ۱۱۷)

اس طرح دین و دنیا کا ایک ملا جلا تصور اس مضمون میں پیش کیا گیا ہے لیکن دنیا کی کامیابی و کامرانی کا سارا دار و مدار آخرت کو قرار دیا گیا ہے جو دار البقاء ہے اور اس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں۔

سیرت کا پیغام موجودہ دور کے نام

مولانا نے اس عنوان کے تحت امت مسلمہ کو اپنے فرائض منصبی کے تئیں حساس و متفکر ہونے اور اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے اور انھیں پوری طرح نبھانے اور پایۂ تکمیل تک پہنچانے پر ابھارا ہے اور انھیں خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے بگل بجائی ہے تاکہ ہر خوابیدہ کو سوئے منزل رواں دواں کیا جا سکے، آپ نے امت مسلمہ کو غیرت دلائی ہے کہ اگر نبوت کی تمام تر تجلیات کے باوجود ان کا وجود بے معنی و لایعنی ہو کر رہ گیا ہے اور وہ غیروں کی طرح مادی زندگی میں پوری طرح منہمک ہو چکے ہیں تو پھر نبوت کا کیا حاصل رہا اور ان تمام جدو جہد اور کوشش سے کیا ملا جن کے لیے ہمارے اسلاف نے اپنے وجود کو مٹا دیا۔ لکھتے ہیں:

"پھر اگر مسلمان کو اس سطح پر آ جانا تھا جن پر زمانہ بعثت کی تمام کافر قومیں تھیں اور اس وقت بھی تمام غیر مسلم آبادی ہے۔ اور

زندگی کے انھیں مشاغل میں منہمک اور سرتاپا غرق ہو جاتا تھا جس میں اہل عرب اور رومی وایرانی ڈوبے ہوئے تھے اور انھیں کامیابیوں کو اپنا منتہائے زندگی بنالینا تھا جن کو ان کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے بہترین موقع پر رد کر چکے تھے تو یہ اسلام کی ابتدائی تاریخ پر پانی پھیر دینے کے مرادف ہے اور اس بات کا اعلان ہے کہ انسانوں کا وہ بیش قیمت خون جو بدر وحنین واحزاب اور قادسیہ ویرموک میں بہایا گیا بے ضرورت بہایا گیا۔'' (ص ۱۲۰)

اقبال در دولت پر

''اقبال در دولت پر'' یہ اس عربی تقریر کا ترجمہ ہے جو ''اقبال فی مدینۃ الرسول'' کے عنوان سے ۱۹۵۶ء میں دمشق ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی گئی تھی۔ ترجمہ مولانا محمد الحسنی مدیر البعث الاسلامی کے قلم سے ہے۔

اس عنوان کے تحت موصوف نے علامہ کی دیرینہ خواہش زیارت مدینہ کی کیا خوب تصویر کشی کی ہے، اقبال علیہ الرحمہ کے مجموعہ کلام ''ارمغان حجاز'' کے مضامین کو نہایت ہی سلیس، سہل اور رواں تعبیرات کا جامہ پہنا کر فارسی اشعار کی اس طرح تشریح کی گئی ہے کہ قاری مشکل ترین اشعار کو پڑھتے ہوئے لذت وسرور محسوس کرتا ہے اور اپنے آپ کو اس قافلہ کا ایک فرد تصور کرتا ہے جس کی رہبری علامہ کر رہے ہیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ شاعر مشرق دربار نبوی میں حاضری کا کس قدر متمنی اور مشتاق ہے اور اپنی ضعیف العمری کے باوجود جب اسے اس روحانی سفر کا پروانہ ملتا ہے تو ۶۰ سالہ عمر کے باوجود کس طرح سرور وشوق اور انبساط کے ساتھ اپنا یہ سفر طے کرتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اب یہ کاروان مدینہ درود وسلام کی سوغات لیے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ اس پر کیف فضا میں علامہ اقبال تمنا

کرتے ہیں کہ کاش ان کو اس گرم ریت میں ایک ایسا سجدہ میسر ہو جو ان کی پیشانی کے لیے نقش دوام بن جائے۔ وہ اپنے دوستوں کو بھی اس سجدۂ شوق کا مشورہ دیتے ہیں:

چہ خوش صحرا کہ دردے کاروانہا　　درودے خواند و محمل براند
بہ ریگ گرم او آدر سجودے　　جبیں راسوز تاداغ بماند

علامہ اقبال کی روحانی زیارت بڑی مؤثر اور سحر انگیز ثابت ہوتی ہے اور دوران زیارت سرور و مستی اور ذوق وشوق میں نہ تو وہ امت مسلمہ اور ملت اسلامی ہند کو فراموش کرتے ہیں اور نہ مغربی تہذیب اور مسلم معاشرہ پر اس کے بڑھتے ہوئے سائے کو بھلا پاتے ہیں۔ مصنف نے ارمغان حجاز سے علامہ کی دیرینہ خواہشات اور عصر حاضر پر ان کے تنقید و تجزیہ کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اقبال کی پوری زندگی کشمکش میں گزری، انھوں نے مغربی تہذیب اور مادی فلسفہ کا نہ صرف انکار کیا بلکہ اس پر آگے بڑھ کر سخت تنقید کی، اس کو چیلنج کیا اور بڑی جرأت، روشن ضمیری اور گہرائی کے ساتھ اس کو کھوٹا ثابت کیا اور اس پردۂ فریب کو چاک کیا جس نے اس کے اصلی اور مکروہ شکل کو نگاہوں سے چھپا رکھا تھا۔ وہ حقیقت میں نئی نسل کے مربی، یقین وخود اعتمادی نیز اپنی اور اسلامی شخصیت کے مکمل شعور کے حامل اور مادی بنیادوں اور مادی فکر کے زبردست مفکر تھے اور ان کو یہ کہنے کا حق حاصل تھا:

طلسم علم حاضر راشکستم　　ربودم دانہ و دامش گسستم
خدا داند کہ مانند براہیم　　بہ نار اوچہ بے پروا نشستم

مولانا موصوف نے اقبالیات کا پورا تجزیہ اپنے اس مختصر مضمون میں پیش کر دیا ہے گویا سمندر کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہو، علامہ کے ایک ایک مضمون اور معانی

پر نہایت عمدہ اور جامع اسلوب میں تبصرہ کیا گیا ہے، اور گاہے گاہے فارسی اشعار سے مثالیں پیش کی گئی ہیں اور ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس طرح کہ علامہ اقبال در دولت پر عالم اسلام کے نمائندہ سفیر نظر آتے ہیں۔

حضور و سرور

قربان جایئے مصنف کے اس انداز بیان پر جس میں زیارت روضۃ النبیؐ اور مدینہ و اہل مدینہ کے حالات کی تصویر کشی اس طرح کی گئی ہے کہ ہر جگہ، ہر مقام، ہر وادی، ہر چشمہ، ہر مسجد اور ہر ایک مقبرہ کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہے، کیا اسلوب تحریر ہے اور کیا طرز نگارش۔ آیئے خود ہی دیکھ لیجئے۔ فرماتے ہیں:

> ".....وہ گنبد خضراء نظر آیا، دل کو سنبھالیے اور قدم اٹھایئے، یہ لیجئے مدینہ میں داخل ہوئے، مسجد نبوی کی دیوار کے نیچے نیچے باب مجیدی سے گزرتے ہوئے، باب جبریل پر جا کر رکے، حاضری کے شکرانہ میں کچھ صدقہ کیا اور اندر داخل ہوئے، پہلے محراب نبوی میں جا کر دوگانہ ادا کیا، گنہگار آنکھوں کے پانی سے غسل صحت دیا، وضو کرایا پھر بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے۔"

الفاظ ہیں کہ سیدھے دل میں اترتے ہیں اور قلب و جگر میں اپنا مقام بنا لیتے ہیں، شگفتہ بیانی اور جوالانی قلم کا تو جواب نہیں۔ ایک ایک ادا ہے کہ دل کو لبھائے جا رہی ہے۔ ملاحظہ ہو:

> "اب آپ ہیں اور مسجد نبوی، دل کا کوئی ارمان باقی نہ رہ جائے، درود شریف پڑھنے کا اس سے بہتر زمانہ اور اس سے بہتر مقام کون ہو سکتا ہے، اب بھی شہود و حضور نہ ہو تو کب ہوگا، جنت کی کیاری "روضۃ من ریاض الجنۃ" میں نمازیں پڑھئے، مگر دیکھئے کسی

کو تکلیف نہ دیجئے، مزاحمت، جگہ کو اپنے لیے محفوظ کرنا، مسجد میں دوڑنا سب جگہ برا ہے مگر جہاں سے یہ احکام نکلے اور دنیا میں پھیلے وہاں ان کی خلاف ورزی بہت ہی مکروہ ہے.....ان میں جتنی مرتبہ جی چاہے حاضری دیجئے اور سلام عرض کیجئے، آپ کے نصیب کھل گئے، اب کیوں کمی کیجئے، مگر ہر بار عظمت وادب اور اشتیاق و محبت کے ساتھ، دل کی ایک حالت نہیں رہتی، وہ بھی سوتا ہے اور جاگتا ہے، جاگے تو سمجھئے کہ نصیب جاگے، حاضری دیجئے، اور عرض کیجئے۔ ع

زچشمم آستیں برداد گوہر را تماشا کن''

آپ نے نہایت ہی عمدہ طریقے سے مدینہ کی گلی، کوچوں، روضۂ نبوی، مساجد اور اجل صحابہ کرام کے مقابر کی سیر کرائی ہے۔ پورے مضمون میں حسب عادت جگہ جگہ عربی عبارتوں اور فارسی واردو کے اشعار کو اس طرح استعمال کیا گیا ہے جیسے سونے کی انگوٹھی میں ہیرے کا نگینہ جڑ دیا گیا ہو۔

حدیث مدینہ

''حدیث مدینہ'' مصنف کی اس عربی تقریر کا ترجمہ ہے جو ۱۹۵۱ء میں حجاز ومصر وشام کی واپسی پر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ''فی مہد الرسول'' کے عنوان سے نشر کی گئی تھی۔ ان تقریروں کا ترجمہ ''شرق اوسط میں کیا دیکھا'' کے نام سے مشیر الحق صاحب بحری آبادی کے قلم سے ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا، یہ مضمون خفیف ترمیم کے ساتھ اسی مجموعہ سے ماخوذ ہے۔

مکہ مکرمہ کے بارے میں اپنے تجربات کو یوں پیش کرتے ہیں:

''لیکن اگر مکہ نہ ہوتا تو انسانیت ان معانی وحقائق، اخلاق

وعقائد اور علوم وفضائل سے تہی دست ہوتی جو اس کا سب سے قیمتی سرمایہ اور اس کا سب سے بڑا حسن ہے، اسی کی بدولت دنیا نے ایمان کی اس لازوال دولت کو پھر سے پایا جسے لوگ ضائع کر چکے تھے۔ عالم نے اس صحیح علم کو پایا جو ظن وتخمین کے پردوں پر چھپ چکا تھا۔ وہ عزت دنیا کو دوبارہ ملی جو سرکشوں اور ظالموں کے ہاتھوں پامال ہو چکی تھی..... سچ تو یہ ہے کہ یہاں انسانیت نے نیا جنم لیا اور تاریخ نئے سرے سے ڈھل کر نکلی۔" (ص ۱۵۱)

مکہ مکرمہ کے بعد مدینہ منورہ پہنچتے ہیں اور مسجد نبوی میں حاضری اور روضہ مبارک پر درود وسلام کے بعد جنت البقیع کی زیارت کو جاتے ہیں اور پھر احد کے میدان میں جیسے ان کا اسپند قلم ٹھہر سا گیا ہے۔ رقم طراز ہیں:

"..... احد وپاک اور دلکش سرزمین ہے جہاں محبت ووفاداری کا سب سے دلکش منظر پیش آیا۔ اس میدان میں انسانی تاریخ نے ایمان ویقین کے جیتے جاگتے کرداروں کی شکل میں دیکھا، یہیں سے بہادری اور شجاعت کے الفاظ لغت کو میسر ہوئے۔ اس خطہ نے پاک محبت اور نادر دوستی کا نمونہ دنیا کو دکھایا یہاں پہنچ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے انس بن نضر رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے سن رہا ہوں..... "مجھے اور پہاڑ کے اسی طرف سے جنت کی خوشبو آرہی ہے"..... وغیرہ اور بالآخر یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ:

"اے کاش! احد دنیا والوں کو اپنے اس محبت کے خزانہ سے کچھ دے دیتا۔ کاش آج دنیا کو اس پچھلے ایمان اور یقین کا کوئی ذرہ بھی نصیب ہو جاتا، اگر ایسا ہو جائے تو اس دنیا کی قسمت بدل

جائے اور یہ دنیا جنت بن جائے۔''

اس طرح موصوف نے مکہ و مدینہ کی زیارت کی مکمل روداد پیش کی ہے اور قارئین کو تصور کی دنیا میں دررسولؐ پر حاضر ہونے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔

اس مختصر جائزہ سے یہ بات عیاں ہو چکی ہے کہ ''کاروان مدینہ'' سیرت نبوی کے ساتھ عشق کا نمونہ بھی ہے اور اصلاح قلب کے لیے ایک بہترین نسخۂ کیمیا ہے۔

ڈاکٹر محمد نفیس حسن

پرانے چراغ ـــــ ایک مطالعہ

ایک ایسی شخصیت جس کا دائرہ وسیع تر علمی، ادبی تاریخی، تہذیبی، سوانحی اور ملکی وقومی خدمات پر محیط ہو اس کے کسی جزو کو موضوع بنانے اور اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہ ممکن نہیں کہ جزء کل سے الگ رہے۔ جزوی اظہار میں بھی کسی نہ کسی قدر اس شخصیت کی مجموعی حیثیت در آتی ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے خاندانی علمی وراثت کے ساتھ ساتھ اپنے علم ومطالعہ، صاف وشفاف سیرت، بے داغ کردار اور بلند تر اخلاق وانسانیت پر مرکوز اپنی شخصیت کی بدولت جو عظمت، قدر ومنزلت اور شہرت ومقبولیت حاصل کی، اس کی نوعیت بین الاقوامی ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ آپکی بلند قامت شخصیت اور بیش قیمت خدمات کی ترجمان عالمی سیاحت بھی ہے اور تصنیف وتالیف بھی۔ آپ کی بیشتر تصانیف کے متعدد ایڈیشن مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر مختلف ممالک سے شائع ہو چکے ہیں۔ علم ومطالعہ کی موروثی وراثت اور طبعی ذوق کے نتیجہ میں مولانا کے تصنیفی سفر کا آغاز ہی تذکرہ نویسی سے ہوتا ہے۔ ۱۶ برس کی نوخیز عمر میں پہلا نقش ''السید الامام احمد بن عرفان الشہیدؒ'' سے متعلق (عربی زبان میں) رونما ہوتا ہے اور اسی تذکرہ پر مشتمل پہلی تصنیف سیرت سید احمد

شہیدؒ (دو جلدیں) ۲۵ برس کی جواں سال نشو ونما کا ثمرہ ہے۔ پھر تاریخ دعوت وعزیمت اسی سلسلہ کی اولین کڑی بنتی ہے۔ 'حیات عبدالحی'، سوانح حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری، تذکرہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی، مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت وغیرہ اہم تصانیف کی روشنی میں اس موضوع سے آپ کی فکری مناسبت اور قلبی وابستگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

'پرانے چراغ' تین جلدوں پر مشتمل ایک ایسی تصنیف ہے جس میں مولانا علی میاں علیہ الرحمۃ نے اپنے عہد کے مختلف النوع باکمال و نامور معاصرین کی مرقع کشی کی ہے۔ 'پرانے چراغ' کی پہلی لو ۱۹۷۵ء میں روشن ہوئی اور دوسری ۱۹۸۰ء میں اور تیسری ۱۹۹۴ء میں۔ تینوں جلدوں میں مختلف شخصیات کو الگ الگ زمروں میں بہ اعتبار زماں ترتیب دیا گیا ہے۔ پہلی جلد میں کل ۱۸ شخصیات ہیں یہاں پہلا زمرہ 'چند بلند پایہ عالم ورہنما' حضرات کا ہے، جن میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا سید حسین احمد مدنی کا ذکر خیر ہے۔ دوسرے زمرہ میں 'چند مشائخ کبار و مصلحین' میں مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا احمد علی صاحب لاہوری، مولانا وصی اللہ فتح پوری کی عطر بیزی ہے۔ چند اساتذہ کرام' مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی، مولانا خلیل عرب، مولانا سید طلحہ حسنی کے مرقعے ہیں۔ 'چند ہستیاں..... بلند مقام لیکن گمنام' کے عنوان سے مولانا شاہ حلیم عطا سلونی، مولانا حکیم سید حسن مثنیٰ ندوی امروہی، سید صدیق حسن آئی سی ایس، سید محمد خلیل نہٹوری کا ذکر ہے۔ 'چند ہستیاں..... کچھ دوست کچھ بزرگ' حضرات میں مولانا مسعود عالم ندوی، جگر مرادآبادی، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر محمد عبدالجلیل فریدی اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے نام نامی ہیں۔

پرانے چراغ' حصہ دوم میں ۲۴ شخصیات ۵ زمروں میں منقسم ہیں۔ 'ہندوستان کے چند اہلِ کمال و مشاہیر رجال' میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی

مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین کا تذکرہ ہے۔ 'چند بزرگ شخصیتیں' عنوان کے ذیل میں الحاج مفتی امین الحسینی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا محمد سلیم مکی کے تذکرے ہیں۔ 'نامور ادیب و انشاء پرداز شخصیات' میں مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، چودھری غلام رسول مہر، مولانا ماہرالقادری مذکور ہیں۔ چند علمائے کبار' میں مولانا عبدالشکور فاروقی، علامہ بہجۃ البیطار، مولانا عبدالعزیز میمن، مولانا محمد اویس ندوی مرقوم ہیں۔ چند محترم احباب و معاصر' میں صوفی عبدالرب صاحب، مولانا سید ابوبکر غزنوی، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اسمائے گرامی ہیں۔ 'سینے کے داغ.....' (چند عزیز اور محبوب شخصیتیں جنھوں نے داغِ رفاقت دیا) میں مولانا سید ابوالخیر برق، امۃ اللہ تسنیم صاحبہ مرحومہ، محمد الحسنی عرف محمد میاں مرحوم اور مولوی اسحاق جلیس ندوی کے نقوش ثبت ہیں۔

'پرانے چراغ' کا تیسرا حصہ ایک طویل عرصہ کے بعد ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔ اس حصہ میں مذکور ۲۵ شخصیات کو چھ زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا زمرہ 'عالم عربی کے چند نامور معاصر اور دینی احباب' کا ہے۔ اس میں شیخ حسن البنا، سید قطب شہید، معالی الشیخ محمد صالح قزاز اور شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری کا تذکرہ ہے۔ 'ممتاز دینی داعی و روحانی مربی حضرات، میں مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی اور حضرت مولانا محمد احمد صاحب پھولپوری ہیں۔ 'چند نامور معاصرین و قائدین ملت' میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا سید منت اللہ رحمانی اور جنرل ضیاء الحق شہید مذکور ہیں۔ 'چند جلیل القدر علماء و خادمین دین' میں قاری محمد طیب، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا نسیم احمد فریدی کا ذکر ہے۔ 'چند خادمانِ دین، کارکنان ملت، احباب و رفقاء، میں سید محمد جلیل صاحب، حاجی عبدالرشید ارشد، مولانا عبیداللہ بلیاوی، ڈاکٹر محمد آصف قدوائی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا حافظ محمد عمران خاں ندوی، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی،

حکیم عبدالقوی دریا آبادی، مولانا محبّ اللہ لاری ندوی، مولانا شاہ عبدالرحیم مجددی جے پوری کے خاکے ہیں۔ 'چند خورد سال لیکن باکمال رفیق وعزیز شخصیات میں سید احمد الحسنی، مولانا ابوالعرفان ندوی، عزیز مولوی محمد ثانی، مولوی عبدالنور (نور عظیم) ندوی کے تذکروں سے پرانے چراغ کے تیسرے اور آخری حصہ وزمرہ کو مزین کیا گیا ہے

کسی تصنیف کا عنوان اس کے تعارف کا اولین نقش ہوتا ہے اس کتاب کا نام 'پرانے چراغ' کیوں رکھا گیا۔ مولانا نے حصہ اول میں بڑے دلچسپ انداز میں 'الٰہ دین کے چراغ' کے مشہور قصہ کی روشنی میں اس کی صراحت کی ہے کہ وہ اپنے گم شدہ چراغ کی تلاش میں گھر گھر پہنچ کر صدا لگاتا، "پرانے چراغ دو اور نئے چراغ لو" چنانچہ مولانا نے اس ضمن میں لکھا ہے کہ "مصنف بھی اسی سوداگر کا بھیس بدل کر نئے چراغ بیچتا اور پرانے چراغ خریدتا ہے اور اس بات پر یقین کرتا ہے کہ وہ اس سودے میں ہرگز نقصان میں نہیں رہے گا اسی لیے اس کتاب کا نام 'پرانے چراغ' رکھا گیا۔" (ص-۱۵)

کتاب کے عنوان 'پرانے چراغ' سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں صرف ان شخصیات کو ہی موضوع بنایا گیا ہے جن کی حیاتِ مستعار کا چراغ تو گل ہو چکا لیکن ان کی شخصیت اور علم وکمال کی تجلی نے قلب ونظر کو کسی نہ کسی طور پر منور کیا ہے۔ مولانا نے صرف انھیں چراغوں سے بزم آرائی کی ہے جن سے قریبی ربط وتعلق رہا، ان کے علم ومرتبہ اور کمالات کی ضوفشانی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور مراسلت کا سلسلہ بھی رہا۔ ان رنگارنگ چراغوں کی روشنی میں یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا نے ہر مکتب خیال سے اپنے اس نگار خانہ کو آراستہ کیا ہے۔ عمیق فکر ونظر، وسیع علم ومطالعہ اور گہرے مشاہدہ (جو مشرق ومغرب دونوں پر محیط ہے) کے پیش نظر اقبال کی زبانی آپ کو

یہ کہنے کا استحقاق ہے کہ ''بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے''۔

سیرت و سوانح اور تذکرہ نویسی مولانا علی میاں کا موروثی سرمایہ ہے۔ آپ کے والد محترم مولانا حکیم عبدالحی حسنیؒ نے اپنی گرانقدر تصنیف 'نزہۃ الخواطر' (آٹھ جلدیں) میں تقریباً پانچ ہزار اہل علم و کمال اور مشاہیر کو موضوع بنایا ہے۔ اس علمی وراثت اور طبعی مناسبت کے سبب بچپن ہی سے سیرت و سوانح اور تذکروں کا مطالعہ مولانا علی میاں کی خصوصی دلچسپی کا موضوع اور پسندیدہ ذوق بھی رہا۔ اردو کے نامور ادیبوں نے اپنی معاصر شخصیتوں کے جو ادبی نقوش پیش کیے وہ بچپن ہی سے مولانا کے مطالعہ میں رہے، ان میں 'چند ہم عصر' (مولوی عبدالحق)، 'نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی' (مرزا فرحت اللہ بیگ) ''گنجہائے گرانمایہ'' ہم نفسانِ رفتہ' (رشید احمد صدیقی) ''محمد علی، ذاتی ڈائری'' حکیم الامت نقوش و تأثرات'' (عبدالماجد دریابادی) اور شورش کاشمیری کے سوانحی خاکے وغیرہ مولانا کے مطالعے کا جزء رہے۔ اردو ادب کے ان شہ پاروں میں سے متعدد کے متعلق مولانا کا خیال ہے کہ وہ ''نہ صرف اردو ادب و انشاء میں بلکہ معاصر ادب اور عالمی لٹریچر کے بہترین نمونوں میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔''

(پرانے چراغ، حصہ اول۔ ص ۱۴)

شخصیات پر مشتمل 'پرانے چراغ' کا مطالعہ یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ان قلمی تصاویر کو ادبی صنف میں شمار کیا جائے۔ مولانا نے اگرچہ انھیں مضامین کہا ہے اور ابتدائیہ میں یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ یہ ان کی شخصیات کی مرقع کشی نہیں، محض نقوش و تأثر کا مجموعہ

ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرقع نگار کے یہ نقوش خاکہ نگاری اور تذکرہ نویسی کا دلکش آمیزہ اور اعلیٰ شاہکار ہیں۔ سیرت نگاری، تذکرہ نویسی اور شخصیات کی مرقع کشی میں مولانا کا قلم مشرقی تہذیب و اقدار کا حامل ہے۔ یوں تو آپ کی شخصیت علوم وفنون دونوں سے عبارت ہے لیکن بنیادی طور پر آپ کی حیثیت ایک فنکار کی نہیں عالم اور مفکر کی ہے۔ فنکاری مقصود بالذات نہیں محض ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ یہاں ایجابی رجحان زیادہ کارفرما ہے، سلبی رجحان سے گریز ہے۔ مولانا کا اسلوب منفی سے زیادہ مثبت رجحان سے عبارت ہے۔

خاکہ نگاری کے فن اور اس کی نمایاں خصوصیت میں اگرچہ بالعموم یہی تسلیم کیا گیا ہے کہ یہ قلمی تصویر کیمرہ کی مانند ہونی چاہئے۔ خاکہ شخصیت کی عکاسی ہے جو ہر رنگ کو بجنسہ پیش کر دیتا ہے، لیکن فی الواقع دیکھا یہی گیا ہے کہ خاکہ کو معروضی شکل دینے میں خوب وزشت کے زاویے بالعموم افراط وتفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ خاکہ نگار غیر جانبدار ہوتے ہوئے بھی کسی ہلکے نقش کو گہرا اور گہرے نقش کو ہلکا کرنے کی بھی شعوری یا لاشعوری کوشش کرتا ہے۔ کبھی تو وہ کسی داغ کو بے داغ کرنے کا سامان کرتا نظر آتا ہے اور کبھی بلا وجہ بھی داغ ڈھونڈنے کی سعی کی جاتی ہے۔ معروضیت کے اس مفروضہ کو نبھانے میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ موئے قلم قلب ونظر کا ترجمان نہیں رہتا اور نقادیہ کہنے میں حق بجانب ہوتا ہے کہ 'مہر ذروں کو کیا، قطرہ کو دریا کر دیا' یا 'جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے'۔ قلمی تصویر ہزار معروضیت کے باوجود خاکہ نگار کے اپنے نگار خانۂ فکر سے بھی متاثر ہوتی ہے۔ خاکہ نگار کا اپنا نقطۂ نظر اور داخلی شخصیت بھی کہیں نہ کہیں اس کی قلم کاری کا جزو بن جاتی ہے۔ مرقع کشی میں احساس وتاثر یا عقیدت وتعلق کے اظہار میں قلم کا دامن کبھی دراز ہوتا ہے اور ردوقبول میں کبھی تنگ، موضوع سے متعلق حالات وواقعات کی مرقع کشی میں حقیقت نگاری کا نقش دھندلا جاتا ہے، خاکہ نگاری کے اس میزان پر جب ہم

'پرانے چراغ' کی شخصیات کو رکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہاں گہرا تاثر تو ضرور ہے لیکن واقعیت، جامعیت اور حقیقت نگاری کے ساتھ، وقائع نگاری حقیقت نگاری کا آئینہ نظر آتی ہے۔ ہر تذکرہ میں اس شخصیت کے اوصاف وکمال، علم وفضل اور متعدد اہم خصوصیات وحسنات کی جلوہ گری تو ہوتی ہی ہے۔ ان کے جلو میں دیگر شخصیات اور بعض اہم معلومات بھی قاری کی توجہ کا مرکز بنتی ہیں، کہیں کہیں غیر متعلقات بھی در آتے ہیں لیکن ایک خاص ربط کے ساتھ جو گراں نہیں گزرتے بلکہ اس شخصیت کو سمجھنے میں اہم کڑی ثابت ہوتے ہیں، طوالت کے باوجود قاری کا انہماک، تسلسل خیال اور دلچسپی برقرار رہتی ہے۔

یہ تحریریں معمولی کو غیر معمولی بنانے کے ہنر سے خالی ہیں، جسے بعض ناقدین نے خاکہ نگاری کا اہم وصف قرار دیا ہے۔ یہاں ذرہ کو آفتاب یا قطرہ کو دریا کرنے کی نہ کوشش ہے نہ خواہش۔ ان خاکوں میں 'پا کی داماں کی حکایت بھی ہے اور 'بند قبا' کی گرہ کشائی بھی۔ یہ خاکے رطب ویابس سے پاک، اعتدال وتوازن کا آئینہ، سلیقۂ اظہار، تہذیب وشائستگی اور محتاط اسلوب نگارش سے مرصع ہیں۔ صاف گوئی میں بھی غیر معمولی شائستگی اور تہذیب واخلاق کارفرما ہے۔ تلاشِ بسیار کے باوجود ایک نقش بھی ایسا نہیں ملتا، جہاں شدت جذبات یا کرب واضطراب میں لب ولہجہ کی تندی اور اسلوب بیان کی تلخی نمایاں ہو۔ فکر ونظر کے اختلاف کے باوجود معرضِ اظہار شخصیت کے مثبت ولائقِ تحسین پہلو نظر انداز نہیں ہوتے۔ اس فراخدلانہ اعتراف میں ہدفِ تنقید آڑے نہیں آتا۔ مولانا کے اسلوب کی یہ شائستگی کسی خوشامدانہ رویہ یا تقرب پسندی کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ آپ کی طبیعت کا خاصہ اور تہذیبی ورثہ ہے۔

'پرانے چراغ' کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر کہیں کسی ایسے پہلو کی نشاندہی مطلوب ہے جو حسن قبول کا نہیں ردّ قبول کا حصہ ہے تو اس نازک موقع پر محسوس ہوتا ہے کہ مولانا کے یہاں صرف زبان وبیان پر ہی قدرت نہیں لب ولہجہ پر بھی خوب

قابو ہے۔ جو کہیں تو لطف و مزاح کے پیکر میں ڈھل جاتا ہے، کہیں اشارہ و کنایہ کی نذر ہو جاتا ہے اور کہیں خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین سے متعلق تذکرہ میں مولانا نے اگر چہ ایک اہم مسئلہ کو موضوع نہیں بنایا جس کا تعلق اردو زبان سے ہے۔ ایک زمانہ میں ذاکر صاحب صدر جمہوریہ (راجندر پرساد صاحب) کے حضور لاکھوں اردو بولنے والوں کے دستخط لے کر گئے تھے، لیکن نتیجہ معلوم! پھر جب وہ خود اس بلند ترین منصب صدارت پر فائز ہوئے تو بھی اس سلسلہ میں کچھ نہ کر سکے۔ مولانا نے ذاکر صاحب سے متعلق اپنے تذکرہ میں اس اہم مسئلہ کو نہیں اٹھایا۔ صرف ان کے جامعہ سے علی گڑھ رخ کرنے، پھر گورنر بہار کی حیثیت سے مسند نشیں ہونے اور پھر نائب صدر و صدر جمہوریہ کے بلند ترین منصب پر فائز ہونے کی پوری روداد کو دلکش و مؤثر اور محتاط پیرایہ میں پیش کر دیا ہے۔ اس ضمن میں مولانا کا اسلوب عالمانہ شان اور حسنِ احتیاط کا نمونہ اور ان کے قلب حزیں کا ترجمان ہے۔ یہاں صرف چند جملے ملاحظہ ہوں۔

> ”نومبر ۱۹۴۸ء میں جامعہ کی ذمہ داری اپنے رفیق کار پروفیسر محمد مجیب کے سپرد کر کے علی گڑھ کی راہ اختیار کی۔ ان کے بہت سے قدردانوں اور نیازمندوں کو یہ بات بہت کھلی۔ میں ہوتا تو میں بھی عرض کرتا کہ آپ کی کوششوں اور صلاحیتوں اور توانائیوں کا اصل میدان جامعہ ہی ہے لیکن انسانی فیصلوں کے اندرونی محرکات اور انسان کی مجبوریوں کا اندازہ ہر ایک نہیں لگا سکتا۔ بہر حال جامعہ کو بڑا دھکا لگا اور وہ اس وقت سے اپنے راستہ سے ہٹتی چلی گئی جس پر مولانا محمد علی نے اس کو قائم و استوار کیا تھا اور افسوس ہے کہ مسلم یونیورسٹی کو بھی ان کی ذات سے وہ فائدہ نہیں پہنچا جس کی توقع تھی اور جو ان کی شخصیت، سابقہ زندگی اور روایات کی ہر

طرح شایانِ شان تھا بلکہ بعض فیصلے اور اقدامات ان سے ایسے منسوب اوران کی ذات سے وابستہ ہو گئے کہ جنھوں نے خود مسلم یونیورسٹی کواس کے قدیم راستہ سے ہٹادیا جس پر وہ عرصہ سے چلی آرہی تھی..... پھر وہ وقت آیا کہ ڈاکٹر صاحب کی اسی خوبی یا کمزوری سے فائدہ اٹھا کر کہ وہ اپنے دوستوں کی کسی بات کوسختی سے ٹال نہیں سکے، جواہر لال صاحب نے ان کو بہار کی گورنری پر آمادہ کرلیا..... بہر حال! ان کے شاگردوں اوران کے نیازمندوں کے لیے یہ ایک حادثہ تھا اوران کے مرتبہ شناسوں کے لیے ایک ذہنی صدمہ۔ کسی ملک و معاشرہ کے باضمیر نوجوانوں کی استقامت، ایثار وقربانی کی روایات کے تسلسل، علم ونوع انسانی کی بے لوث خدمت کے دوام کے لیے جہاں اور بہت سی باتوں کی ضرورت ہے، وہاں اس کی بھی ضرورت ہے کہ معاشرہ میں کچھ لوگ ایسے ہوں جو کسی حال اور کسی قیمت پر اس میدان کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوں جوانھوں نے شروع میں اپنی خدمت واپنی صلاحیتوں کے استعمال کے لیے انتخاب کیا تھا۔ اگر ایک ایک کر کے یہ سب ستون منہدم ہو جائیں اور سب عنقا صفت اور شاہین وشہباز ہو جائیں تو نوجوانوں کی ہمت بڑھانے والی اوران کو ایثار وقربانی کے جادہ دشوار ونازک پر قائم رکھنے والی کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب کی جائے قیام اب مئی ۱۹۵۷ء سے مئی ۱۹۶۲ء تک اپنے منصب وعہدہ کی بنیاد پر (جوان کے لیے اتنا باعث زینت نہ تھا جتنا وہ اس کے لیے باعثِ زینت تھے) شیخ الجامعہ کی قیام گاہ

کے بجائے پٹنہ گورنمنٹ ہاؤس تھا..... آخر وہ وقت بھی آ گیا کہ وہ صدر جمہوریہ منتخب ہوئے..... یہ حکومت ہند کے اعزاز و اکرام اور وثوق و اعتماد کے ترکش کا آخری تیر تھا۔ اس کے بعد جو واقعات پیش آئے جن پر ان کے نیازمندوں کو کبھی تعجب اور کبھی افسوس ہوا، وہ سب اس راستے کی منزلیں تھیں۔ اور اس منصب کے تقاضے ..... بہر حال ان سے خلوص رکھنے والے ان لوگوں کو جن کے سامنے ان کی سابقہ ایثار پیشہ زندگی اور شاندار تاریخ تھی اور جو ڈاکٹر صاحب کو ان باتوں سے بلند سمجھتے تھے، ایک دھکا لگا..... لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس منصب کے لیے کوئی آدمی ڈاکٹر صاحب سے زیادہ سجا نہیں، ان کی خوش قسمتی ہو نہ ہو لیکن ہندوستان کی خوش قسمتی تھی کہ اس کو ایک ایسا سجنے والا صدر جمہوریہ ملا جو علمی، دماغی، بیانی اور جسمانی ہر لحاظ سے اس کے لیے نہ صرف موزوں بلکہ اس کا وقار بڑھانے والا تھا''۔ (ص ۷۷، ۷۹، ۸۴، ۸۵)

اسی طرح مولانا مودودیؒ سے متعلق اپنی فکری و عملی رفاقت اور پھر مفارقت کے تذکرہ میں مولانا کا اسلوب یہ شکل اختیار کرتا ہے:

''ان کی خداداد ذہانت اور واقعات سے فائدہ اٹھانے کی فطری صلاحیت سے اس کی پوری امید تھی کہ اگر ان کو مہلت ملتی اور ان کی زندگی اور صحت ساتھ دیتی اور جماعت کی زمام قیادت ان کے ہاتھ میں ہوتی تو وہ جماعت کے فکر و نظام میں بڑی مؤثر، اہم اور دور رس تبدیلیاں کرتے اور افراد جماعت کی اصلاح و تربیت میں بعض مؤثر قدم اٹھاتے اور 'اسلامی حکومت' کے بجائے

'اسلامی معاشرہ' کے قیام پر اپنی توجہ کا بڑا حصہ مرکوز کر دیتے .....میں اپنے براہِ راست دینی مطالعہ اور ان متقدمین اور بعض متأخرین کی کتابوں سے استفادہ کرنے کی بناء پر جو کتاب وسنت کا وسیع وعمیق علم رکھتے تھے اور ان کے یہاں مجتہدانہ فکر ونظر اور نمایاں گہرائی ملتی ہے، مولانا کو ایسا یگانۂ روزگار مفکر اسلام سمجھنے سے قاصر تھا جس کی نظیر صدیوں میں نہیں ملتی، میں ان کا اصل امتیاز و جوہر ذہانت ذہن کی صفائی و رسائی اور نئے انداز میں تحریر وتفہیم کی امتیازی قوت وقدرت سمجھتا تھا، اور اب بھی سمجھتا ہوں، لیکن کچھ عرصہ بعد مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ جماعت کے اس علمی اور تنقیدی حصہ کو جو مغربی تہذیب اور موجودہ مادی فلسفوں اور نظامہائے حیات سے متعلق تھا، دین کی اس تفہیم وتشریح سے الگ نہیں کیا جاسکتا جو خود مولانا اور جماعت کے قائدین کی نظر میں بنیاد اور سرچشمہ رکھتی ہیں، میرا شعور جس قدر پختہ اور میرا مطالعہ اور تجربہ جتنا وسیع ہوتا گیا میری ذہنی کشمکش میں اضافہ ہوتا گیا.....اور مجھے محسوس ہوا کہ دعوتِ نبوت اور اس کے حامل کا مزاج اور اس کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں اور وہ ایک ایسی تحریک ودعوت سے کتنی مختلف ہوتی ہیں جس کی بنیاد خالص مطالعہ، ذہانت اور کسی فلسفہ ونظام کے ردعمل پر ہوتی ہے.....میں نے جماعت سے اپنی بے اطمینانی اور اس کے اسباب کا اظہار کرنے میں ہمیشہ احتیاط سے کام لیا ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک میں دیانت کے ساتھ اس نتیجہ پر نہیں پہنچ گیا کہ اب مجھے مولانا کے دین کی اس تفہیم وتشریح کے

متعلق کچھ لکھنا چاہئے جس کی بنیاد ان کی کتاب 'قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں' ہے اور جو اقلیدس کے اصول موضوعہ کی طرح ان کی فکر و دعوت میں جاری و ساری ہے..... بڑے فکر و تامل اور دعا و استخارہ کے بعد ایک دینی فریضہ سمجھتے ہوئے رمضان ۱۳۹۸ھ اگست ۱۹۷۸ء میں اس موضوع پر مستقلاً قلم اٹھایا اور ایک شاہد عینی مستفید کی حیثیت سے اس کو ضروری سمجھا کہ مولانا کی خدمات اور ان کی تصنیفی انفرادیت کا پورا پورا اعتراف کرتے ہوئے اپنے خدشوں اور اندیشوں کو ظاہر کیا جائے..... میں نے کتاب کے مسودہ کو بار بار اس خیال سے پڑھا کہ اس میں کوئی طنزیہ جملہ یا تیز لفظ ایسا نہ ہو جو اس مقصد کے لیے مضر ہو اور جہاں کوئی جملہ یا لفظ زورِ قلم میں اتفاقاً نکل گیا تھا اس کو حذف کر دیا۔"

(ص ۳۰۳، ۳۱۳، ۳۱۴)

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے تذکرہ میں یہ نازک احساس ملاحظہ ہو:

"ان کے یہاں ساری ادبی شوخیوں اور تنقیدوں کے ساتھ مذہب و اہل مذہب کا احترام ہمیشہ رہا..... ہم دونوں کی لائنیں کچھ ایسی الگ تھیں کہ عرصۂ دراز تک کہیں آمنا سامنا (Cross) نہیں ہوا۔" (ص-۱۷۱)

مولانا عبدالماجد دریابادی سے متعلق یہ الفاظ دیکھئے۔

"مولانا کی تمام ذوقی باتوں، ان کی تمام علمی تحقیقات، ان کے سارے خیالات سے کلی اتفاق ہو، یہ نہ پڑھنے لکھنے والے کے لیے ضروری ہے نہ مولانا کی عظمت و شہرت کے پیش نظر ان کے

لیے مفید۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنے زمانہ کی نادرۂ روزگار اور صاحب کمال شخصیتوں میں سے تھے۔'' (ص ۱۵۴)

ان تحریروں کے دروں میں شخصیت کی تہہ تک پہنچنے یا خورد بینی سے مطالعہ کرنے اور گوہر مقصود حاصل کرنے کی کامیاب کوشش نظر آتی ہے۔ ہر تذکرہ عمیق فکر و نظر اور ذوق وشوق کا ترجمان ہے۔ مولانا نے ان جواہر پاروں کو جس طرح صیقل کیا ہے وہ آپ کے صدق وخلوص، قلبی وابستگی، اخلاق وتواضع، علمی دیانتداری اور اعتدال وتوازن کی دلیل ہے۔ ''پرانے چراغ'' کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہاں چراغ تلے اندھیرا نہیں روشنی ہی روشنی ہے، جو کچھ تو مذکور شخصیات سے مزین ہے اور کچھ مرقع نگار کے اسلوب کی تابانی کا مظہر صاف جھلکتا ہے کہ ان چراغوں کی ضیا پاشی میں مرقع نگار کا قلبی گداز، روحانی حلاوت اور ایمانی حرارت بھی شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ادبی نقوش نظر سے زیادہ قلب کو متأثر کرتے ہیں۔ 'پرانے چراغ' (ج اوّل) سے متعلق پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے ایک خط میں جو احساس وتأثر پیش کیا ہے وہ اس کتاب کی قدر و قیمت کا واضح اظہار ہے۔

> ''پرانے چراغ' کے آپ کے اوّل درجہ کی تصنیف ہونے میں کوئی شک نہیں۔ آپ نے جن عظیم المرتبت مرحومین کو عقیدت کا ہدیہ پیش کیا کون ہے جو ان کی فضیلتوں کا معترف نہ ہوگا اور ان کی جدائی پر محرومی کا احساس نہ کرے گا۔'' (ص-۱۸۵)

خاکہ نگاری یا تذکرہ نویسی کا ایک اہم وصف یہ بھی ہے کہ اسے پڑھ کر موضوع مذکور کی مکمل سوانح وسیرت کو جاننے اور سمجھنے کی آرزو پیدا ہو جائے۔ 'پرانے چراغ' کے تذکرے اس اعتبار سے بھی منفرد ہیں کہ یہ اپنے اندر معلومات بے بہا کے باوجود اپنے موضوع کی حیات وسوانح کے خصوصی مطالعہ کی طرف بھی قاری کی توجہ مبذول کرا لیتے

ہیں اور انھیں ادب میں ایک گرانقدر اضافہ کی حیثیت سے تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

ایک ہی موضوع پر کتاب کے کئی حصوں میں ضروری نہیں کہ ہر حصہ یکساں نوعیت کا ہو اور ہر جگہ فکر و اسلوب کی ایک ہی فضا ہو کیونکہ فصلِ زماں، مصنف کی دیگر علمی مشغولیتیں، فکر و احساس کی مختلف کیفیتیں اور تصنیفی ترجیحات بھی حائل ہو سکتی ہے۔ اس اعتبار سے جب ہم پرانے چراغ کی تیسری جلد کا مطالعہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ پہلی اور دوسری جلد کے مقابلہ میں تیسری جلد میں تقریباً ۱۴ برس کا زمانی فصل ہے۔ بہ اعتبار زماں بعض شخصیات پہلی یا دوسری جلد میں مذکور ہو سکتی تھیں۔ تیسری جلد کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس میں مذکور ۲۵ شخصیات سے متعلق وہ تفاصیل و طوالت نہیں جو اوّل و دوم کا حصہ ہے۔ اس اعتبار سے پرانے چراغ کی تیسری جلد کو اختصار نویسی کا مختصر مجموعہ کہنا شاید نامناسب نہ ہو۔ یہاں مولانا نے ان شخصیات کی نمایاں ترین خصوصیات کو چند اہم واقعات کے آئینے میں بہت اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے۔

یوں تو مولانا علی میاں کا اسلوب بحیثیت مجموعی دلکشی و رعنائی، جاذبیت، جامعیت اور اعتدال و توازن سے عبارت ہے لیکن 'پرانے چراغ' میں اسلوب کی دلکشی اپنی الگ ہی بہار دکھاتی ہے۔ ایک ایک تذکرہ اور اس کا ایک ایک جملہ یہ باور کراتا ہے کہ آپ کا اسلوب تکلف و تصنع کا خوگر نہیں۔ سادہ و برجستہ اور مہذب و شائستہ ہے۔ یہ اسلوب عالمانہ و حکیمانہ شان رکھتا ہے لیکن علم و حکمت کے اس دفتر بے پایاں میں خشکی یا انجماد نہیں، ادبی حسن کاری ہے۔ عربی زبان و ادب میں مولانا کے امتیاز اور فنی دسترس اور ترجیحی صلاحیت کے باوجود اردو تحریریں بڑی حد تک دقیق عربی آمیز الفاظ و تراکیب سے وزنی نہیں۔ ان میں ثقالت نہیں، حسن و دلکشی ہے۔ 'پرانے چراغ' میں جا بجا اردو، عربی اور فارسی کے جو اشعار یا مصرعے اپنے خیال کی ترسیل کے لیے مولانا نے پیش کیے ہیں نیز اردو کے نامور ادیبوں اور ان کی معروف نگارشات سے متعلق جو حوالے اور جملے قلمبند

کیے ہیں ان سے آپ کے وسیع تر علم ومطالعہ اور اعلیٰ ادبی ذوق کا برملا اظہار ہوتا ہے۔ فکر و خیال کی رعنائی، اسلوب کی دلکشی اور ادبی حسن کاری کے سبب 'پرانے چراغ' کے یہ خاکے وتذکرے اپنے مطالعہ کا نہ صرف اشتیاق بلکہ ذوق پیدا کر دیتے ہیں۔ مولانا کے اسلوبیاتی مطالعہ میں 'پرانے چراغ' کی یہ تصنیف کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ صاحب ''صدق'' مولانا عبدالماجد دریابادی کے اسلوب سے متعلق مولانا علی میاں کے یہ احساسات خود آپ کے فکر واسلوب پر صادق آتے ہیں۔ بس اسی پر اس مطالعہ کو تمام کیا جاتا ہے۔

> ''ایک فطری ادیب اور صاحب قلم کی پہچان یہ ہے کہ موضوع کیسا ہی سادہ، سنجیدہ اور خشک و پر تقدس ہو وہ اپنے قلم کی جولانی، خیال کی رعنائی اور طرز ادا کی دلآویزی کو روک نہیں سکتا اور اس کے لیے اپنے ادبی ذوق اور اسلوبِ تحریر سے عاری وخالی ہو جانا ناممکن ہوتا ہے..... مولانا عبدالماجد دریابادی کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی کوئی تحریر زبان وادب کی چاشنی سے خالی نہیں اور کہیں ان کا اسلوبِ تحریر جو ان کی شخصیت بن گیا ہے ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔''

(ص-۱۴۷-ج دوم)

مولانا ابوسفیان اصلاحی

القرأۃ الرشیدہ کا ایک تجزیہ

علم وفن کی دنیا میں ادب الاطفال تصنیف کرنا اور ترتیب دینا ایک نہایت مشکل اور نازک ترین مرحلہ ہے۔ اس کی راہیں بڑی ادق اور پر پیچ ہیں۔ بڑے سے بڑے اہل علم وفضل اس موضوع پر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادب الاطفال پر خامہ فرسائی کے لئے جتنی ضرورت علم کی ہوتی ہے اتنی ہی مہارت نفسیات کی، اس موضوع پر لکھنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ بچوں کی نفسیات، ان کی ترجیحات، ان کے مختلف مراحل، معیار درجات اور ان کے شب وروز سے بخوبی واقف ہو۔ جب تک بچوں سے متعلقہ امور پر گہری گرفت نہ ہو اس وقت تک معیاری ادب الاطفال کی فراہمی ناممکن ہے۔ ایسا مصنف جو بچوں کا ڈاکٹر اور ماہر نفسیات ہو تو وہ اس موضوع پر گرانقدر لٹریچر تیار کر سکتا ہے۔ دور جدید میں مغرب نے بچوں کا نہایت حسین اور دلکش ادب تیار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج عالم اسلام اور دیگر ممالک میں بچوں کا جو لٹریچر تیار کیا جا رہا ہے اس پر مغرب کے خاصے اثرات ہیں۔ عربوں نے بچوں کے لئے جو ریڈرز تیار کی ہیں وہ اپنی طرز تحریر اور تزئین وترتیب میں مغرب کے لٹریچر سے کافی حد مستفاد اور مماثل ومتشابہ ہیں۔

بچوں کے لٹریچر کی تیاری کے سلسلے میں مصر نے بھی خاصہ رول ادا کیا ہے۔اسی سلسلے کی ایک اولین کڑی ''القراۃ الرشیدۃ'' ہے۔عبدالفتاح صبری بک اور علی عمر بک کی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ یہ کتاب ساٹھ سال پیشتر ترتیب دی گئی تھی۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو جدید دور کے تقاضوں کے پیش نظر اس میں بہت کچھ حذف واضافہ کی ضرورت ہے۔سائنسی اور صنعتی عہد نے جہاں فکر ونظر اور تحقیق وتنقید کے بہت سے سانچوں کو بدل ڈالا ہے وہیں اس کی وجہ سے زبان وبیان میں ناقابل بیان تبدیلی رونما ہوئی ہے۔اس وجہ سے اس عہد جدید میں جو لٹریچر بھی تیار کیا جائے یہ بات ضرور پیش نظر رہے کہ اس عہد کے کیا کیا تقاضے ہیں۔

ان تمام چیزوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات بغیر کسی تردد کے کہی جاسکتی ہے کہ آج بھی یہ ریڈر ہندوستانی مصنفین کی ترتیب کردہ تمام ریڈرز سے کہیں بہتر ہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ عرب کسی چیز یا فکر کو اپنی زبان میں جتنے سلیقے یا جتنے اسلوب میں پیش کرسکتا ہے وہ کسی غیر عرب مصنف کے لئے ممکن نہیں ہے۔زبان کا تعلق اکتساب اور اقتباس سے اتنا نہیں ہے جتنا کہ مادیت سے ہے۔ایک غیر عرب عربی علوم وفنون کا بڑا عالم تو ہوسکتا ہے لیکن زبان وبیان کے مسئلہ میں وہ ایک عرب سے آگے نہیں جاسکتا، کیونکہ یہ ایک فطری شئے ہے اور فطرت سے پرے جانا ناممکنات میں سے ہے۔ اس لئے زبان وبیان کے اعتبار سے یہ کتاب طلبہ کے لئے حد درجہ مفید ہے۔

اس کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ بچوں کے ذہن ونفسیات کو دیکھتے ہوئے اسباق کو ترتیب دیا گیا ہے۔یعنی یہ کتاب غیر عرب بچوں کے لئے اتنی مفید نہیں ہوسکتی ہے جتنی کہ عرب بچوں کے لئے، کیونکہ اس کتاب کے مرتب مصری ہیں، ان کے پیش نظر عرب طلبہ وہ بھی خصوصاً مصری طلبہ ہیں۔مثلاً ''مصر والاسکندریۃ''، ''القناطر الخیریۃ''، ''محمد علی پاشا''، ''وصف مصر''، ''دولۃ المماليك فی

مصر"، "النیل"، "الجامع الأزهر"، "ملوك المصريين القدماء" وغیرہ اسباق کا تعلق صرف مصر سے ہے۔اسی طرح بہت سے دوسرے اسباق میں مصر کی دیگر خصوصیات کو اجاگر کرنے کی قابل ذکر کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتاب مسلم طلبہ کے ساتھ ساتھ دوسرے طلبہ کے لئے بھی یکساں طور پر مفید ہے۔لیکن اس میں مسلم طلبہ کے ذہن، ان کے تمدن، ان کی تاریخ اوران کے دین کا خصوصی خیال رکھا گیا ہے، اس کتاب کے پڑھنے سے ایک طرف طلبہ کی زبان وبیان اور الفاظ پر گرفت مضبوط ہوتی ہے، دوسری طرف اپنے ماحول، اپنے ملک اور دنیا کی بہت سی اشیاء کے متعلق معلومات یکجا ہوتی ہے۔ اوراپنی شخصیات کو قابل ستائش خطوط پر گامزن کرنے کے مواقع ہاتھ آتے ہیں۔ یہ کتاب اچھائیوں اور برائیوں کی آئینہ دار ہے۔قدم قدم پر صفات عالیہ کی علمبردار ہے۔ ہرآن اس میں بچوں کی دلچسپیوں، ان کی ترجیحات، ان کی سوچ اوران کے حلقہ علم کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔اسی لئے یہ مشہور ہے کہ جو طالب علم" القراءة الرشيدة، القراءة الراشدة، كليله ودمنة اور المختارات" کو نہایت توجہ سے پڑھ لے تو عربی نثر کے مطالعہ کے اثناء میں بار بار پیش آنے والی دشواریوں سے نجات پا جائے گا۔ یہ چاروں کتابیں زبان اسلوب اور فکر کی تعمیر میں غیر معمولی حد تک معاون ومساعد ہیں۔

ساٹھ سال گزرنے کے بعد بھی یہ کتاب افادیت سے خالی نہیں ہے۔لیکن دور جدید میں لفظیات کے اعتبار سے زبان میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی نے زبان کے دائرہ کار کو کافی پھیلا دیا ہے۔نظم ونثر میں سیلاب کے مانند اضافہ ہوا ہے۔اس عرصہ میں بیشمار ادباء اور شعراء منظر عام پر آئے اور ادب الاطفال میں بہت سے تعمیری اضافے ہوئے ہیں۔ان تمام چیزوں کے تناظر میں یہ کتاب بہت کچھ اپنے اندر اضافہ چاہتی ہے۔

ادب الاطفال میں اس کا اہتمام ہونا چاہئے کہ الفاظ کا بار بار اعادہ ہو، کیونکہ

اس کی وجہ سے بچوں کے ذہن میں الفاظ بیٹھ جاتے ہیں۔ اور اس وقت کی بیٹھی ہوئی چیز زندگی بھر کام آتی ہے۔ القراۃ الرشیدۃ میں قدرے اس کا اہتمام ہے، لیکن اس سلسلے میں کوئی ارادی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ اس کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ دروس کو پیش نظر رکھتے ہوئے کتاب تصاویر سے مزین ہے۔ آج سے ساٹھ سال قبل اس کتاب کی کوشش ایک بہت بڑا اقدم تھی۔ جبکہ آج کے زمانہ میں یہ کام بہت آسان ہو چکا ہے۔ ان تصاویر کے ساتھ ساتھ ان کے نام بھی لکھے ہوئے ہوتے تو اس کی افادیت میں مزید اضافہ ہوتا۔

اس کتاب کی ایک قابل قدر پہلو یہ ہے کہ مصر کا مختلف حیثیتوں سے تعارف پیش کیا گیا ہے۔ شخصیات کے ساتھ ساتھ مصر کی آب وہوا، زراعت، صنعت، باغات اور حیوانات کا ذکر بچوں کی ذہنی سطح کے مطابق کیا گیا ہے۔ مصر کی خصوصیات اور وہاں کی آب وہوا سے متعلق نظم "مصر العزیزہ، الاھرام، النیل" وغیرہ دیکھی جاسکتی ہیں۔ مصری زراعت کے سلسلے میں "القطن، الارزُّ، الفلاح و اللفت، قصب السکر اور القمح" جیسے اسباق اس کتاب میں شامل ہیں۔ اس کتاب میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جس سے بچوں کے ذہن میں خاصی وسعت پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً نمک کے باب میں بتایا گیا ہے کہ وہ کس طرح کان سے نکالا جاتا ہے اور کس طرح پانی سے نمک بنایا جاتا ہے۔ اسی طرح کرسی کی ایجاد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ صابن کی صنعت پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ سونے کے معدنیات کو بیان کیا گیا ہے۔ ہاتھی کے دانت کی صنعت کا بھی ذکر ہے۔ ریشم کے طریقۂ حصول پر بھی ایک سبق ہے۔ اس کتاب میں اس کا بھی اہتمام کیا گیا ہے کہ بچوں کو سائنس کی اہمیت اور افادیت سے آگاہ کیا جائے۔ اسی مناسبت سے سائنس سے متعلق کئی اسباق اس کتاب میں شامل ہیں۔ مثلاً ہوا، جسمانی اعضاء کی شناخت، بجلی، ٹیلیگراف، ریلوے اور گھڑی وغیرہ کی ایجادات میں سائنس نے کیا کارنامے انجام دیئے ہیں ان سے بچوں کو آگاہ کیا گیا ہے۔

اس کتاب پر ایک بہت بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس میں اسلامی اقدار اور اسلامی حضارت وثقافت اور اسلامی شخصیات کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ایک حد تک تو یہ خیال درست ہے،لیکن پورے طور سے اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔کیونکہ اس میں متعدد ایسے اسباق ہیں،جن میں گفتگو کرتے کرتے موقع ومحل کی مناسبت سے آیات کریمہ اور احادیثِ شریفہ کو جوڑ دیا گیا ہے۔اس کے علاوہ کئی اسباق مثلاً ''آداب القرآن الکریم قدرة القدیر ، نمطة لقمان لابنه ، سیدنا نوح ، الفضیلة اور ان تعدوا نعمة الله لا تحصوها'' وغیرہ ایسے ہیں،جو آیات کریمہ پر مشتمل ہیں۔اسی طرح حدیث سے بھی مختلف جگہوں پر استدلال کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں مسلمانوں کی تاریخ پر خصوصی توجہ برتی گئی ہے۔اس کتاب میں ایسے پہلوز یر بحث لائے گئے ہیں جن سے اسلامی ثقافت،اسلامی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے یہ تو نہیں کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب اسلامی ذہن کی تعمیر اور اسلامی فضا کے قیام کے باب میں سنگ میل کے مانند ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ اس سے ایک حد تک اسلامی ماحول کے ارتقاء میں مدد ملتی ہے۔مصر والاسکندیه ، الاستاذ، الساعة الدقاقة عند العرب، خطبة طارق قبل فتوح الاندلس ،التاریخ الجامع ، دمشق ، المدینة المنورة ،بغداد، العرب والطیران، اعراب البادیة، مسجد القلعة الجامع الازهر، الرئیس ابن سینا، اوراجواء العرب عند الاسلام وغیرہ میں دین اسلام کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اور مذکورہ اسباق سے یہ تأثر پیدا ہوتا ہے کہ دین اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اگر اس کے بتائے ہوئے راستوں پر عمل کیا جائے تو دور جدید کی جہالتوں کو بآسانی دور کیا جاسکتا ہے۔دوسری طرف یہ چیز بھی سامنے آتی ہے کہ ملت اسلامیہ کی ایک شاندار تاریخ ہے،اس کے کارناموں کی تاریخ صفحات میں محفوظ ہے۔اور آج بھی دنیا کے چپے چپے ان کی خدمات کی شہادت دے

رہے ہیں۔ مسلمانوں کے ہاتھوں جو شہر آباد ہوئے وہ اپنی متنوع خوبیوں اور گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ فن تعمیر اور طرز تعلیم میں مسلمانوں نے گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔

اس کتاب کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ اس میں بیشمار ایسے اسباق ہیں جن میں کوئی عبرت اور نصیحت کا پہلو موجود ہے۔ بڑے اچھے اور سیدھے سادھے انداز میں عبرت کا پہلو پیش کر دیا گیا ہے۔ جس سے بچوں پر بڑے گہرے اثرات مرتسم ہوتے ہیں۔ تفریحی انداز میں بڑی قیمتی چیزیں طلبہ کے سامنے آجاتی ہیں اور ہمیشہ کے لئے ان کے اذہان قبول کر لیتے ہیں۔ مثلاً "الطفل و النملة" کے اخیر میں ایک جملہ "واجمع فی صغرك ماینفعك فی کبرك" ہے بچہ پورے سبق کو پڑھتے پڑھتے جب اس جملہ پر آتا ہے تو اسے اس بات پر پورا یقین ہو جاتا ہے کہ بچپن کی کمائی عمر بھر کام آتی ہے۔ اسی کو بنیاد بنا کر انسان اپنی زندگی کے مستقبل کے زینوں کو طے کرتا ہے۔ اسی طرح "الاسد والفار" میں جب طالب علم "لا تحتقد من دون فلکل شئی مزیة" پر پہنچتا ہے تو وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی اور حقیر سے حقیر شئے ایک خصوصیت اور ایک اہمیت کی حامل ہے۔ صرف چھوٹے اور ضعیف ہونے کے سبب اسے حقیر سمجھنا نادانی ہے۔ اس میں ایک سبق "الشد بالشد" ہے۔ اس میں نتیجہ کے طور پر آخر میں ایک آیت کریمہ "فجزاء سیئةٍ سیئةٌ مِثْلُها" ہے اس کو پڑھنے کے بعد اس کے سوچنے کا انداز اس طرح ہو جاتا ہے کہ بلاوجہ کسی کے ساتھ بدسلوکی اور کج خلقی سے نہ پیش آیا جائے کیونکہ برائی کا بدلہ برائی ہے۔ جیسا کہ مذکورہ آیت میں مذکور ہے۔ بلکہ لوگوں سے حسن اخلاق سے پیش آنا چاہئے، خیر خواہی کے عوض میں خیر ہی ملتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔ "ھل جزاء الاحسان الا الاحسان"

اسی طرح سبق "الحمامة و النملة" میں یہ وضاحت ہے کہ اگر کوئی ذرہ

برابر نیکی کرتا ہے تو اللہ اس کی جزاء سے اسے سرفراز کرتا ہے، جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ جب کبوتری نے چیونٹی کو پانی سے نکالا تو اس نے اس کا بدلہ اس طرح چکایا کہ جب ایک شکاری پورے طور پر کبوتری پر نشانہ لگانے کے لئے تیار ہوگیا اور کبوتری اس سے بالکل غافل تھی۔ یہ صورت حال دیکھ کر چیونٹی شکاری کے جسم پر چڑھ کر تیزی سے کاٹ لیتی ہے جس کی وجہ سے اس کا نشانہ خطا ہوجاتا ہے۔ واقعہ کی مناسبت سے آخر میں یہ آیت کریمہ ہے۔ ''ومن یعمل مثقال ذرة خیرا یره'' ان اسباق کے اختتام بڑے مؤثر انداز میں ہوا ہے۔ باتیں طلبہ کے ذہن پر مرتسم ہوجاتی ہیں۔ یہ کتاب طلبہ کی شخصیت سازی میں سنگ میل کے مانند ہے۔ بات کو باوزن بنانے کیلئے آیات کریمہ اور احادیث شریفہ کے استعمالات بڑے برمحل ہیں۔ کیونکہ پیش کردہ نصیحتوں کو دینی رنگ دینا چاہتے ہیں۔

کتاب میں اس چیز کا بھی خیال رکھا گیا ہے کہ بعض عالمی مسائل کو ہلکے پھلکے انداز میں اختصار سے پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً ''اهل الصین'' چینی لوگوں کے عادات واطوار اور طرز معاشرت سے بحث کی گئی ہے۔ نیز ان کی مصروفیات کو ہی منظر عام پر لایا گیا ہے۔ اسی طرح ''مصر والاسکندریة'' میں اسکندریہ کی خصوصیات اور اس کی تاریخی حقیقت کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اسی طرح آستانہ کا ایک خوبصورت تعارف بچوں کے ذہن کے مطابق اس میں شامل ہے۔ اسی طرح ''تکشیف امریکا'' الجامع الاموی بدمشق'' المدینة المنورة اور بغداد وغیرہ میں ان چیزوں کو پیش کیا گیا ہے جن سے عالمی مسائل کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہ اسباق طلبہ کو اپنے ملک سے ہٹ کر دوسرے ممالک کے متعلق بھی سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔

اس کتاب میں کئی ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جو بچوں کے اذہان کی تہذیب وتطہیر میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ کتاب کی پہلی نظم ''مصر العزیزة'' ہے چونکہ یہ ریڈر مصری طلبہ کے لئے ہے۔ اس لئے یہی مناسب تھا کہ ان کے سامنے ان

کے وطن کی خوبیوں کا ذکر ہو اور ان کے اندر ایسے جذبات پیدا کئے جائیں جو وطن کی تعمیر و ترقی کے لئے کام آسکیں۔ دوسری نظم "ترنیمة الولد فی الصباح" کے عنوان سے ہے۔ جس میں صبح کی منظر کشی کی گئی ہے اور ان کے دلوں میں اللہ کی عظمت وقدرت بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اللہ قد اجارنی
من کل شرفی الظلام
شکراً لہ قد صاننی
شکراً لہ علی الدوام

اسی طرح "ترنیمة الام للصبی فی المساء" میں ماں کی ممتا اور اللہ کی کبریائی کا ذکر ہے۔

نم یا حبیبی سالما　　نم آمناً نم آمنا
باتت عصا فیر الغرد　　فی حفظ مولانا الصد

اسی طرح نظم "الفار" اور الطائر و النبات، اللعب، النحلة و الزنیار، لاتصنع المعروف فی غیر اهله، الببغا، الطاؤس "وغیرہ میں ایک طرف جہاں بچوں کی دلبستگی کے سامان ہیں، وہیں دوسری طرف ان نظموں میں ان کے لئے نصیحتیں بھی مذکور ہیں۔ ایک نظم "جزاء الوالدین" ہے جس میں بچوں کے ساتھ انتہائی محبت وشفقت کا ذکر ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ بچے کی بیماری کے وقت والدین کن کن حالات سے گزرتے اور ان کی صحت یابی کے لئے کیا کیا جتن کرتے ہیں۔ تیسرے حصہ میں بھی کئی نظمیں ہیں۔ مثلاً "سکة الحدید اور ینزل المطر" کو طلبہ بڑی دلچسپی سے پڑھیں گے نظم "الریاح" میں بچوں کی فہم کو پیش نظر رکھتے ہوئے نہایت آسان طریقہ سے ہوا کی مختلف شکلوں کو پیش کیا گیا ہے۔ ایک نظم "أنه طفل صریر" کے عنوان سے

ہے۔جس میں ایک نابینا بچے کی داستان بڑے مؤثر انداز میں بیان کی گئی ہے۔طلبہ کے سامنے یہ بات آتی ہے کہ آنکھیں بہت بڑی نعمت ہیں ایک نابینا دنیا کی تمام رنگینیوں اورفطرت کے تمام مناظر سے محروم ہے۔اس میں عنیزہ کی ایک نظم"الحماسہ" بھی شامل ہے۔جس سے طلبہ کے اندر شجاعت پیدا ہوتی ہے۔یہ خوبصورت نظم بچوں کو فعال اورسرگرم بناتی ہے۔نظم"التحذیر من ھوی النفس" کے اچھے اثرات بچوں پر مرتب ہوتے ہیں اوران کے اندر خواہشات نفس سے بچنے کے محرکات جنم لیتے ہیں۔

وخالفِ النفس والشیطان وا عصھما
وأن ھما محضاك النصح فاتھم
أستغفر اُللہ من قولٍ بلا عمل
لقدنسبتُ بہ نسلاً لدی عُقم

ایک نظم"الحدب" کے عنوان سے شامل ہے جس میں جنگ کی تباہیوں کا ذکر ہے۔ایسے مؤثر انداز میں ہے کہ طلبہ کے اندر جنگ سے نفرت اور بیزاری پیدا ہوتی ہے۔

اب تک کتاب کی خصوصیات پیش کی گئیں۔اوراب کچھ اس کی خامیوں کی طرف اشارہ کیا جائے گا۔اس کی خامیوں کی طرف اشارہ اس حیثیت سے کیا جائے گا کہ اسے مسلم طلبہ کے نصاب میں رکھنے سے کیا کیا دشواریاں پیش آسکتی ہیں۔پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کی ترتیب میں کافی حد تک انگلش ریڈرز کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔پوری کتاب میں ایک حد تک اسلام کی تصویر چلتی پھرتی نظر آرہی ہے لیکن یہ بھی کوشش رہی ہے کہ اس میں سکولر مزاج کی بھی آمیزش رہے۔ایک دوسری خامی یہ ہے کہ اس کے آغاز میں اسلامی مزاج کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے بلکہ اس کی بسم اللہ بھیڑ اور بلی سے ہوگئی ہے، جو انگلش ریڈرز کا عمومی طرز ہے،اسی طرح اس میں"عید وفاء الفیل" کا ذکر ہے لیکن عیدین کے ذکر سے پہلوتہی برتی گئی ہے۔

پوری کتاب حیوانات کے ذکر اور ان کی تصاویر سے مزین ہے لیکن اس شدومد کے ساتھ کہ انسانی مباحث کو موضوع بحث نہیں بنایا گیا۔ پڑھتے ہوئے یہ تأثر ابھرتا ہے کہ مرتبین کو انسانوں سے زیادہ جانوروں سے لگاؤ ہے۔ چونکہ یہ مغربی تہذیب کا ایک حصہ ہے۔ آج مغرب میں کتا کلچر بہت شباب پر ہے۔ بے پناہ دولت کتوں کی خوراک اور ان کی تحفظ پر خرچ کی جاتی ہے جب کہ دنیا کے گوشے گوشے میں عدم خوارک کے سبب بنی نوع انسان دم توڑ رہے ہیں۔ اخبارات کے قارئین دیکھتے ہوں گے کہ امریکہ کے صدر کو اپنے کتے سے جتنا پیار ہے اتنا انسانوں سے نہیں۔

اس کتاب میں مغربی تہذیب کی نمائندگی کا یہ حال ہے کہ خلیل اپنے دوست علی کی ملاقات ہونے پر السلام علیکم کے بجائے ''صباح الخیر''، اسی طرح اس میں سالگرہ کا ذکر ہے جو مغربی ثقافت کی علامت ہے۔ چنانچہ "مولد سعاد" کے پڑھنے کے بعد بچہ ضرور اس سے اثر قبول کرے گا۔ اسی طرح اس کتاب کی ایک بہت بڑی کمی یہ ہے کہ اس میں تین اسلامی شخصیات کا ذکر ہے لیکن یہ نمائندگی نہیں کے برابر ہے۔ شخصیات میں محمد علی کا ذکر ہے لیکن جمال الدین افغانی، محمد عبدہ اور رشید رضا کا ذکر نہیں ہے۔ اور نہ ہی بیسویں صدی میں عرب کی اسلامی تحریکوں کا ذکر ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اس کتاب میں اور بہت سی چیزیں ہیں جو اسلامی امتزاج سے میل نہیں کھاتیں۔

اسلامی اور غیر اسلامی مباحث سے قطع نظر اس میں کوئی کلام نہیں کہ زبان و بیان کے اعتبار سے یہ کتاب حد درجہ مفید ہے۔ لیکن علوم وفنون اور صنعتی عہد کی ایجادات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس میں بہت کچھ اضافے کی ضرورت ہے، جس طرح اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ٹیلیگراف کی کیا افادیت ہے اسی طرح اب یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ ٹیلی ویژن، ٹیلکس، فیکس، اور کمپیوٹر کی اس عہد جدید میں کیا معنویت ہے۔ اور اس کے بغیر انسان کس افلاس کا شکار ہوسکتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی نئی ایجادات کے متعلق اس

میں معلومات فراہم کی جاسکتی ہیں۔ اپنی بات کو ختم کرنے سے قبل یہ کہنا ضروری ہے کہ پوری کتاب میں ایسی چیزیں موجود ہیں جو طلبہ کے اندر صالحیت سلیت اور اخلاق کریمانہ پیدا کرنے میں سنگ میل کے مانند ہے۔ اسلامی تاریخ، مسلمانوں کے فن تعمیر اور مختلف اداروں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ دنیائے عرب کے مقدس مقامات اور عرب تہذیب کی بھی خاصی نمائندگی ہے۔ اور یہ تو پتہ ہی ہے کہ مصر کی مختلف جہتوں سے تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس سے بھی اسلامی تاریخ ہی کی ہمنوائی ہوتی ہے۔

پروفیسر شریف حسین قاسمی

ادبی اور تنقیدی بصیرت اور گلِ رعنا پر تبصرہ

''حیات مولانا سید عبدالحی حسنیؒ'' کے حوالے سے

جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ایک جامع الصفات شخصیت کے مالک تھے۔ آپ بنیادی طور پر ایک عالم دین تھے اور آپ کی زندگی کا اصل میدان عمل دعوتِ اسلام تھا۔ آپ کی بیشتر تصانیف میں یہی رنگ غالب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جہاں گوناگوں دینی امور پر غور وفکر اور منطقی نتائج اخذ کرنے کا موقع اور سعادت عطا فرمائی، وہاں آپ کو ایک قدرت مند قلم بھی ودیعت کیا تھا جس نے آپ کے علمی وادبی افکار وعقائد کو عربی اور اردو میں نہایت فصیح و بلیغ انداز واسلوب میں صفحۂ قرطاس پر محفوظ کر دیا۔ آپ کے والد محترم جناب مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب حسنی مرحوم نے عربی میں آٹھ جلدوں میں نزہۃ الخواطر جیسا تذکرہ تالیف کیا ہے جس میں آپ نے ساڑھے چار ہزار سے زائد علماء، عرفاء، ادباء، شعراء، وغیرہ کے حالات قلم بند کئے ہیں۔ ہندوستان میں فارسی میں شعراء وادباء کے تذکرے لکھنے کی قدیم روایت ملتی ہے۔ فارسی میں عرفی کا لباب الالباب سب سے پہلا فارسی شعراء کا دستیاب تذکرہ ہے۔ اس کے

بعد ہندوستان میں متعدد اہم تذکرے لکھے گئے اور اس طرح ہندوستان کو فارسی ادب میں تذکرہ نگاری کے میدان میں ایک خاص امتیازی مقام حاصل ہوا۔ مولانا سید عبدالحیٔ مرحوم نے نزہۃ الخواطر اور گل رعنا تالیف کیں اور ہندوستان کی اس تذکرہ نگاری کی قدیم روایت کو نہ صرف زندہ ہی رکھا بلکہ اسے تقویت بخشی۔ اس سے انکار مشکل ہے کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب کا خانوادہ اسی علمی وادبی روایات کا نمائندہ ہے جو قرون وسطی کے ہندوستان میں پروان چڑھیں اور جس کی نشو ونما میں فارسی زبان وادب نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اس ضمن میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ مولانا ندوی صاحب نے نزہۃ الخواطر کے مآخذ کے بارے میں لکھا ہے کہ ''اس کی تصنیف میں مصنف نے جن مآخذ سے فائدہ اٹھایا ہے، ان کی تعداد تین سو کتابوں سے کم نہیں اور وہ عربی فارسی، اردو تینوں زبانوں میں ہیں۔'' فارسی کا طالب علم ہونے کی وجہ سے اس سلسلے میں مجھے یہ کہنے میں خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ نزہۃ الخواطر کے متعدد مآخذ فارسی میں ہیں۔ یہ حقیقت خود ہندوستان میں فارسی کے وسیع رواج اور اس کی علمی وادبی اہمیت کی آئینہ دار ہے۔ اسی طرح اگر دیکھا جائے تو غالباً نزہۃ الخواطر عربی میں وہ سب سے مفصل تذکرہ ہے جس کے ذریعے فارسی مآخذ کا عربی دنیا میں تعارف ہو سکا ہے۔

حضرت مولانا علی میاں نے بھی اپنے والد ماجد کی اس روایت کو برقرار رکھا اور اس موضوع پر کئی کتابیں تالیف فرمائیں۔ حیات عبدالحی اسی روایت کی ایک کڑی ہے جس میں مولانا ندوی صاحب نے اپنے والد کی سوانح حیات، علمی کمالات، دینی خدمات اور ان کے عربی، فارسی اور اردو آثار سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کتاب میں حضرت مولانا نے اپنے برادر بزرگ جناب حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب حسنی کے احوال زندگی بھی ضمیمے کے طور پر شامل کئے ہیں۔ اس کتاب پر تبصرہ یا اظہار نظر اس وقت منظور نہیں، بلکہ اس کتاب میں شامل گل رعنا پر تبصرے کے بارے میں اجمالاً عرض کرنا

مقصود ہے، لیکن اس سے پہلے مولانا علی میاں کی وہ عبارت نقل کرنا چاہوں گا جو آپ نے نزہۃ الخواطر کے بارے میں ''حسن انتخاب اور مؤرخانہ دیدہ وری'' کے عنوان سے تحریر فرمائی ہے۔ یہ عبارت حضرت مولانا کی علمی بصیرت اور محققانہ رویے سے بخوبی واقفیت کی غماز ہے اس عبارت میں حضرت مولانا نے مختلف متعلقہ مآخذ سے مطلوبہ مطالب کا انتخاب، ان کی تحقیق، بعدازاں ان کی تدوین وغیرہ کے بارے میں جو اظہار نظر کیا ہے، وہ ان امور سے متعلق جدید نظریات سے ہم آہنگ ہے اور اس کوچے کے جدید پیچ وخم سے مولانا صاحب کی بخوبی آشنائی کا آئینہ دار بھی۔ اسی طرح یہ وہ بنیادی اصول ہیں جن کو اگر آج کے تذکرہ نگار ملحوظ رکھیں تو خاطر خواہ نتائج نکالے جا سکتے ہیں اور ہماری علمی وادبی کاوشیں اعلیٰ معیار کی امین ہو سکتی ہیں۔ حضرت مولانا فرماتے ہیں:

> ''ایک مؤرخ کی صحیح کامیابی کا پیمانہ اور اس بات کی شہادت کہ اس کو اپنے فن میں کس درجہ کا ملکہ خداداد حاصل ہے اور وہ اس کوچہ کی رسم وراہ سے کہاں تک آگاہ ہے، یہ نہیں ہے کہ اس نے کتنے صفحات سیاہ کئے اور کتنی ضخیم تصنیف اس نے تیار کر دی۔ اس کا راز دراصل اس کے جزئیات ومعلومات کے انتخاب اور اس ردو قبول میں پوشیدہ ہوتا ہے جس سے اس نے اپنی تصنیف میں کام لیا ہے، نیز اس مذاق سلیم میں اس پوری کتاب میں نمایاں ہوا ہے، ایک مؤرخ جب کسی نامور شخصیت کے تذکرہ پر قلم اٹھاتا ہے تو اس کو حالات و واقعات (یا اگر صاحب ترجمہ کوئی عالی مرتبہ شیخ یا باکمال عالم ہے) تو کرامات و کمالات، روایات و بیانات اور مناقب وفضائل کا ایک جنگل نظر آتا ہے اس وقت اس کے صبر و ظرف اور اس کی قوت انتخاب کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ اس میں سے

کس کو قبول کرے اور کس کو نظر انداز کر دے، کس کو قابل اعتماد قرار دے اور کس کو نا قابل اعتماد پھر یہ کہ وہ ان منتشر اجزا سے کس طرح اس کی سیرت کا قالب تیار کرے۔"

ظاہر ہے مولانا علی میاں صاحب کی وہ تمام کتابیں اور تحریریں جو صاحبان کمال کی سوانح، اخلاق وکمالات سے متعلق ہیں، ان میں وہ تمام امتیازات موجود ہونے چاہئیں جن کو ایسے کام کی تکمیل کے لئے خود مولانا مرحوم نے درج بالا پیراگراف میں پیش کیا ہے۔

گلِ رعنا اردو شعراء کا وہ تذکرہ ہے جسے آپ کے والد ماجد نے تالیف کیا ہے۔ مولانا صاحب کا اس پر تبصرہ قابل توجہ ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کتاب کا موضوع "اردو شعراء کے تراجم" ان کے اصل ذوق دعوت اسلام اور تاریخ اسلام سے لگاؤ نہیں کھاتا۔ لیکن اس کے باوجود یہ تبصرہ ہندوستان میں فارسی اور اردو ادب سے حضرت مولانا کی واقفیت اور بہر حال ذہنی لگاؤ کا پتہ دیتا ہے۔ حضرت مولانا نے بڑے سلیقے اور خاص نظم سے گل رعنا کا تعارف کرایا ہے۔ آپ نے اپنے اس تبصرے کو قرون وسطیٰ میں مروج نظام تعلیم پر اظہار خیال سے شروع کیا ہے۔ چونکہ آپ خود درس و تدریس سے وابستہ رہے اور بڑی حد تک اسی نظام تعلیم کے ساختہ و پرداختہ ہیں جو اسی دور میں رائج تھا، اس لئے اس نظام کے محاسن اور اس کی ہمہ گیری پر آپ نے نہایت اختصار کے ساتھ بصیرت افروز اظہار نظر کیا ہے۔ آپ اس ضمن میں فرماتے ہیں:

"ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار اور جدید نظام تعلیم کے رائج ہونے سے پہلے ایک ہی نظام تعلیم رائج تھا جو فارسی وعربی درسیات، زبان کے قواعد، ریاضی، منطق وفلسفہ، ادب (نثر ونظم) بلاغت وفن عروض سے لے کر علوم دینیہ (فقہ، اصول وحدیث وتفسیر

وعلم کلام) پر مشتمل تھا۔ صدیوں تک ہندوستان میں ذہنی صلاحیتوں کے نشو ونما، فطری جوہر و ملکات کے چمکانے اور اعلیٰ ثقافت (کلچر) پیدا کرنے کا یہی واحد ذریعہ تھا جس سے ملک کے انتظامیہ کے لئے اعلیٰ عہدہ دار یہاں تک کہ وزیر سلطنت، محاسب اعلیٰ (اکاؤنٹینٹ جنرل) جس کو عہد قدیم میں مستوفی الممالک کے نام سے یاد کرتے تھے، دبیر منشی (انشاء پرداز وسکریٹری) اور قاضی و مفتی یکساں طور پر پیدا ہوتے تھے..... اس زمانہ میں نصاب تعلیم زندگی ملک کی زبان وادب اور مجالس ومعاشرت سے الگ تھلگ کوئی چیز نہ تھی جیسا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے واضح طریقہ پر نظر آنے لگا۔ یہی باکمال اساتذہ جو مسند درس پر بیٹھ کر منطق وفلسفہ کی خشک و بے مزہ کتابیں پڑھاتے تھے اور علمی مباحث اور دقیق مضامین میں بال کی کھال نکالتے تھے اور حدیث وتفسیر کے درس کے وقت وقار وتمکنت کی تصویر ہوتے، دوسرے وقت اپنے شہر وقریہ کی ادبی مجلسوں میں بے تکلف شریک ہوتے۔''

حضرت مولانا اس کے بعد فرماتے ہیں:

''اس دور کے بعد بھی اسی طبقہ کے ہاتھ میں ملک کی علمی و ادبی قیادت رہی۔ مولوی محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی اور شبلی نعمانی، جن کو دور آخر میں زبان وادب کی عمارت کے چار ستون کہنا بجا ہوگا، اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔''

محترم علی میاں مرحوم اس کے بعد اپنے والد اور مصنف گل رعنا کے دور کے ادبی ماحول کا ذکر فرماتے ہیں۔ اور لکھنؤ میں اس ادبی گہما گہمی کی طرف اشارہ کرتے ہیں

جس میں منشی امیر احمد امیر مینائی، حکیم ضامن علی جلال، شیخ امیر اللہ تسلیم اور مولوی محمد محسن کاکوروی جیسے شعراء نے حصہ لیا تھا اور جن کے کلام کی تعریف و تحسین سے لکھنؤ کے در و دیوار گونج رہے تھے۔

حضرت مولاناؒ اردو شعراء کے تذکروں پر بھی اجمالی طور پر نظر ڈالتے ہیں اور بجا طور پر فرماتے ہیں:

''اردو شعرا کے تذکرے ۱۸۵۷ء تک فارسی ہی میں لکھے گئے۔''

مولانا صاحب نے محمد حسین آزاد کی آب حیات پر اس لئے ناقدانہ نظر ڈالی ہے کہ آزاد کا ذکر گلِ رعنا میں موجود ہے۔ مولانا آب حیات کے ادبی مقام سے خوب واقف تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ آزاد نے بعض اردو شعراء کے احوال و کوائف اور ان کے کلام پر تبصرہ کرنے میں جانبداری سے کام لیا ہے۔ آب حیات میں آزاد کا یہ رویہ آج کے ناقدین کو بھی نہیں بھاتا۔ انھوں نے آب حیات کے اس پہلو پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے جس کی وجہ سے آب حیات مکمل طور پر ایک قابل بھروسہ ماخذ کے طور پر استعمال نہیں کی جاتی۔ گل رعنا کے مصنف جہاں آزاد کی انشاء پردازی کے محاسن سے متاثر تھے، وہاں ان کی نگاہ سے آب حیات کا یہ کمزور پہلو پوشیدہ نہیں رہا۔ مولانا علی میاں صاحب نے آبِ حیات کے ان دونوں پہلوؤں کے مدنظر مصنف گل رعنا کے آب حیات پر اس تبصرے کو نقل کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف گل رعنا آب حیات کے محاسن و معایب دونوں سے واقف تھے۔ مولانا علی میاں صاحب کے بقول ''ان (آزاد) کے سب سے بڑے ناقد مولانا حکیم سید عبدالحی نے گل رعنا میں ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اور ان کے اس یگانہ کمال کا جس طرح اعتراف کیا ہے، اس پر اضافہ مشکل ہے'' اس کے بعد گل رعنا سے آزاد کے بارے میں یہ عبارت نقل کی گئی ہے:

''سب سے بہتر اور عمدہ تصنیف ان کی آب حیات ہے جو

اردو زبان اور ریختہ شعر کی تاریخ میں پہلی کتاب اور اردو انشاء پردازی کا بہترین کارنامہ ہے۔ عبارت کی بے ساختگی اور برجستگی اور اس میں شاعرانہ تخیل، استعاروں کی دلفریبی کے ساتھ ایسی چیز ہے جس پر غزلوں کے سینکڑوں دیوان قربان کردینے کے قابل ہیں۔"

اس کتاب کی مقبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ جو غلط اور نادرست روایتیں مصنف کے جادو نگار قلم نے لکھ دی ہیں وہ آج اردو کی انشاء پردازی کے قالب میں روح کی طرح پیوست ہوگئی ہیں اور ضرب المثل کی طرح زبانوں پر چڑھ گئی ہیں۔ جس طرح اقلیدس کے اصول موضوعہ بے چون و چرا مانے جاتے ہیں، اسی طرح ان کو بے تکلف کام میں لایا جاتا ہے۔" اب آج کے دور میں ایسی بات نہیں ہے جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جاچکا ہے، آب حیات کا تنقیدی جائزہ لیا جاتا رہا ہے اور اس میں واقع عیوب پر اب پوری نظر ہے۔

مولانا علی میاں مرحوم کا آب حیات پر اظہار خیال بہت اہم ہے۔ مولانا صاحب نے گل رعنا پر تبصرے کے ضمن میں آب حیات پر بھی سیر حاصل تبصرہ فرمایا ہے جو قابل توجہ ہے۔ اس تبصرے سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا مرحوم نے آب حیات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا۔ چونکہ اردو ادب خاص طور پر اس کے منظوم ادب سے آپ واقف تھے، اس لئے آپ ایک صاحب نظر اور باذوق ناقد و ادیب کے طور پر آب حیات پر تبصرہ فرما سکے۔ آپ نے آب حیات کے بعض سوانحی اور تاریخی تسامحات پر نہایت لطیف پیرایے میں اظہار خیال فرمایا ہے۔ ضمن میں ادیب و مؤرخ کے رویوں میں مغایرت کا جس خوبی سے حضرت مولانا ذکر فرماتے ہیں وہ ایک طرف حقیقت پر مبنی ہے اور دوسری طرف اس کی زبان و انداز بیان نہایت دلکش اور اردو زبان پر آپ کی قدرت اور حتیٰ کہ فنی مطالب کو بھی فصاحت و بلاغت کے پیرائے میں پیش کرنے کی صلاحیت و استعداد

پر دال ہے۔اس ضمن میں حضرت مولانا لکھتے ہیں:

''مولانا آزاد (محمد حسین آزاد) پیدائشی اور خلقی طور پر ادیب تھے اور ادب وحسن انشاء ان کے تیغ قلم کا اصل جوہر ہے۔ادبی مزاج اور تاریخی مزاج میں ایک طرح کا بعد اور ادبی تقاضوں اور تاریخی تقاضوں میں بعض اوقات تعارض پایا جاتا ہے۔ادب تخیل پسند ہوتا ہے اور تاریخ حقیقت پسند،ادب اپنی پرواز کے لئے آزاد و بے قید فضا چاہتا ہے،تاریخ اپنے سفر کے لئے ایک محدود اور نپا تلا راستہ،ادب تشبیہہ اور استعارہ اور تخیل سے آب ورنگ پیدا کرتا ہے اور تاریخ،حوالوں،واقعات اور قدیم تحریروں کی پابندی سے گرانبار ہوتی ہے۔مولانا آزاد کا اصل مزاج اور رجحان طبیعت ادب وانشاء پردازی ہے وہ خواہ کسی تاریخی موضوع پر قلم اٹھائیں،یہ ذوق ان پر غالب آکر رہتا ہے۔''

گل رعنا کے مصنف نے آب حیات کے محاسن ومعایب پر مختصراً اظہار خیال کیا ہے۔خود مولانا علی میاں صاحب نے گل رعنا کے متعلقہ بیانات کی اس طرح وضاحت فرمائی ہے کہ خود ان کا ادبی اور تاریخی ذوق کھل کر سامنے آگیا ہے اور گل رعنا کے اجمال کی تفصیل بھی فراہم ہوگئی ہے۔

مولانا علی میاں کی تحریروں کا بنیادی وصف یہ ہے کہ وہ اشخاص اور ان کے کارناموں کی اہمیت اور مناسبت کو کسی حال میں نظر سے اوجھل ہونے نہیں دیتے۔گل رعنا میں آب حیات کے مطالب پر بحث وگفتگو،اس کے بعض تاریخی تسامحات کی نشاندہی وغیرہ کے بعد مولانا مرحوم آب حیات پر اپنی گفتگو کو اس عبارت پر ختم فرماتے ہیں جو ان کے سلیم الطبع ہونے اور سنجیدہ اور بے لاگ ادبی وتنقیدی رویے کا ثبوت ہیں:

''ان فروگزاشتوں اور ناہمواریوں کے باوجود آب حیات کی انفرادیت قائم تھی اور رہے گی اور اس کی ادبی قدر و قیمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ ضرورت اسکی تھی کہ اس کے اس تاریخی حصہ کو مکمل کر دیا جائے اور اس کی ان غلطیوں کی نشاندہی کر دی جائے جو مصنف کی ادبی افتادِ طبع یا اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ مصنف کی ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ پر وسیع اور گہری نظر نہ تھی اور وہ اس کے بعض شعبوں (مثلاً تصوف وسلوک، علماء ومشائخ کے حالات، ملفوظات ومخطوطات) کا رمز شناس طالب علم نہیں رہا۔''

بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق مرحوم نے گل رعنا پر اپنے تبصرے میں لکھا تھا کہ:

''ہر شاعر کے کلام سے نمونہ بھی دیا گیا ہے جس سے فاضل مؤلف کی وسعت نظر کا ثبوت ملتا ہے۔ اگرچہ زبان وشعراء کے کلام پر اعلیٰ تنقید کا حق ادا نہیں کیا گیا، تاہم ہر شاعر کے کلام پر بہت ہی منصفانہ رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔''

ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کے اس تبصرے میں اس جملے ''اعلیٰ تنقید کا حق ادا نہیں کیا گیا'' کے پیش نظر مولانا مرحوم نے ہمیں اس رویے سے روشناس کرایا ہے جو انیسویں صدی کے ہندوستان میں وجود میں آنے والی تقریباً ہر کتاب اور خاص طور پر تذکروں کے مطالعے کے وقت ہر قاری کے لئے لازمی ہے کسی بھی مصنف سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اس کی تصنیف ہر قسم کے جھول اور کمی سے مبرا ہوگی اور ہماری تمام توقعات پر پوری اترے گی۔

مولانا مرحوم نے گل رعنا کی بعض محدودتیوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور ان کے

بارے میں اظہار رائے کے ضمن میں ایک ایسا اصول بیان کیا ہے جو کسی بھی کتاب کی قدر شناسی کے لئے بنیادی اہمیت ومناسبت کا حامل ہے۔ مولانا صاحب فرماتے ہیں:

> ''مصنف (گل رعنا) ادب و شاعری کے ان تنقیدی اصولوں سے واقفیت نہیں رکھتے تھے جو بیسویں صدی کے وسط میں مغربی ممالک میں دریافت کئے گئے اور صدیوں کی کاوشوں کے بعد انھوں نے ارتقا کے منازل طے کئے۔ ان میں بھی ایک بڑا حصہ وہ ہے جو مغربی ماحول و معاشرہ کی آب وہوا، مخصوص سیاسی وتمدنی عوامل کا نتیجہ اور مغربی زبانوں اور ان کے ادب وشاعری کے مخصوص مزاج سے تعلق رکھتا ہے اور مشرقی زبانوں اور ان کے ادب وشاعری پر جوں کا توں ان کا انطباق نہیں کیا جاسکتا۔ مصنف گل رعنا نے کہیں بھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ یہ کتاب تنقید کا اعلیٰ نمونہ ہے اور اس میں وہ تنقید کے اعلیٰ معیاروں کی پیروی کریں گے جو اس وقت تک دریافت ہو چکے ہیں۔''

گل رعنا پر مولانا علی میاں صاحب مرحوم کا یہ تبصرہ اردو ادب، شعراء کے تذکرے اور خاص طور پر آب حیات پر انتقادی قدر شناسی کے ضمن میں ایک متوازن رویے کا ترجمان ہے۔ گل رعنا پر یہ تبصرہ ہی نہیں بلکہ مکمل کتاب ''حیات عبدالحیٔ'' متوازن سوانح نگاری کا ایک قابل قدر نمونہ ہے۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد بے ساختہ یہ دعا زبان پر آتی ہے کہ قرون وسطیٰ کے ہندوستان میں بے شمار علمی خانوادوں کی اسی نہج پر سوانح لکھنے کی دوسروں کو بھی توفیق نصیب ہوتا کہ اس دور کے علمی تاریخ کے تاریک گوشے جگمگا اٹھیں۔

شمس الدین ندوی

تاریخ دعوت وعزیمت

(ایک مطالعہ)

تحریر وکتابت ایک ایسا جوہر ہے جو فانی انسان کو بھی پائندہ وتابندہ بنا دیتا ہے، ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء بیسویں صدی کا آخری دن تھا، جب عالم اسلام کی مشہور شخصیت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اس دار فانی سے کوچ کر گئی، اور اپنے پیچھے کم وبیش ۲۰۵ کتابوں کا ایک ایسا ذخیرہ چھوڑ گئی جس کی بدولت مولانا مرحوم رہتی دنیا تک جئیں گے، اور یاد رکھے جائیں گے، کیونکہ وہ علی الاعلان کہہ گئے ہیں۔

جسم تو خاک ہے اور خاک میں مل جائے گا
میں بہر حال کتابوں میں ملوں گا تم کو!

داعی امت ومفکر ملت کے لئے یہ عجب حسن اتفاق ہے کہ ان کے رواں دواں قلم سے پہلی علمی کاوش معرض وجود میں آئی تو وہ ''سیرت سید احمد شہید'' تھی، جب آپ کی عمر ۲۴ سال تھی، جو تاریخ دعوت وعزیمت کی پہلی کڑی تھی، علامہ شبلی نعمانی کی (Islamic Heroes) یعنی ''ناموران اسلام'' کے طرز پر مولانا مرحوم نے ''تاریخ دعوت وعزیمت'' لکھ کر کتب خانۂ عالم اسلامی کو ایک یادگار تحفہ عنایت کیا، یہ کتاب آپ کی

تصنیفات کا وہ حسین گلدستہ ہے، جو صوفیاء و اولیاء، فقہاء و علماء، مشائخ و اہل اللہ، مجاہدین و مصلحین کے عملی کارناموں و علمی کاوشوں کا آئینہ دار ہے، ایک طرف اس میں خواجہ اجمیری و نظام الدین اولیاء جیسے اہل اللہ ہیں تو دوسری طرف ابن تیمیہ جیسے محدث، فقیہ و متکلم، ایک طرف علمی و عملی، اصلاحی و تجدیدی تحریک کا بیان مجددی و ولی اللہی ہے، تو دوسری طرف دعوت و جہاد، اصلاح و تجدید کی وہ ایمان افروز داستان جسے سیرت سید احمد شہید کہتے ہیں۔ ذیل میں ہم تاریخ دعوت و عزیمت کی جلد چہارم پر روشنی ڈالیں گے، جو مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کی عظیم تجدیدی و انقلابی کارناموں کی مفصل روئداد ہے۔

مصنف علیہ الرحمہ نے باب اول میں جن عناوین پر خامہ فرسائی کی ہے، ان میں اس وقت کے سیاسی و مذہبی حالات، علمی و اعتقادی معاملات کے علاوہ مہدویت جو اس وقت کی سب سے زلزلہ انگیز تحریک تھی، اس پر بھی مولانا نے قدرے روشنی ڈالی ہے، اور بتایا ہے کہ اس کے بانی سید محمد جونپوری اگرچہ دسویں صدی کے اوائل ہی میں وفات پا چکے تھے، لیکن ان کی تحریک کے اثرات اس صدی کے اختتام تک باقی رہے، اور اس تحریک کے اعتقادی تشدد سے مسلمانوں کے عقائد میں ایک تزلزل اور مسلم معاشرہ میں ایک بے چینی و اضطراب کا ماحول تھا، اسی کے ساتھ ساتھ دسویں صدی کا فتنہ اکبری صفوی و نقطوی تحریکیں ہیں، جن کے داعیوں اور علمبرداروں نے ہندوستان آکر نئے ہزارہ اور نئے دین و آئین کے لئے کس طرح ایک تخت و مسند تیار کر رکھی تھی، جس پر جلوہ افروز ہونے کے لئے ایک با اختیار و طاقتور شخصیت درکار تھی، جو ان کی نظر میں اکبر کی شخصیت سے موزوں کوئی اور نہ تھی۔

باب دوم میں مصنف فاضل نے اکبر کی دینداری و مذہبی شغف کا جائزہ لیا ہے، اور بتایا کہ اس قسم کی سطحی و عامیانہ باتوں کا دین سے دور کا بھی واسطہ نہیں، نیز ناخواندہ محض سادہ لوح ابر کی فتوحات و کامرانیوں نے اسے اپنے بارہ میں خوش فہمی میں

مبتلا کر دیا تھا کہ جس طرح وہ سیاسی گتھیاں سلجھا رہا ہے، اسی طرح وہ مذہب وعقائد کی پر خار وادیوں میں بھی کامیاب دخل اندازیاں کر سکتا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ اسے بے اعتدالی وانحراف میں مبتلا کرنے میں علماء دربار، چاپلوس ارکان سلطنت کے علاوہ راجپوت رانیوں کا بھی اہم رول رہا ہے، جس کے نتیجہ میں اس کے اندر آتش پرستی، آفتاب پرستی سے لے کر گنگا جل تک کی عظمت سرایت کر گئی، یہی نہیں بلکہ اسلامی شعائر سے دوری، غیر اسلامی رسوم ورواج سے قربت ودلچسپی بڑھی، اسلامی تعلیمات ودینی احکامات کا تمسخر واستہزاء کیا، اسراء ومعراج کو عقل ناقص کی کسوٹی پر پرکھا، اور منکر ہوا، علامہ سید سلیمان ندوی ''مقدمۂ سیرت سید احمد شہید'' میں رقمطراز ہیں:

''اس پیچ میل تحریک کا جو اثر ہوا، اس کی تصویر اگر کوئی دیکھنا چاہے تو دبستان مذاہب کا مطالعہ کرے، کتنے زنار داروں کے ہاتھوں میں تسبیح اور کتنے تسبیح خانوں کے گلوں میں زنار نظر آئیں گے، بادشاہی آستانہ پر کتنے امیروں کے سر سجدہ میں پڑے، اور شہنشاہ کے دربار میں کتنے دستار بند کھڑے دکھائی دیں گے، اور مسجدوں کے منبر سے یہ صدا سنائی دے گی تعالیٰ شأنہ اللہ اکبر، یہ ہو ہی رہا تھا کہ سرہند کی سمت سے ایک پکارنے والے کی آواز آئی کہ راستہ صاف کرو کہ راستہ کا چلنے والا آتا ہے، ایک فاروقی مجدد فاروقی شان سے ظاہر ہوا، یہ شیخ احمد سرہندی تھے''۔

(تاریخ دعوت وعزیمت جلد ۴ ص ۱۳۲)

وہ کیا دور تھا جس میں مجدد صاحب نے آنکھیں کھولیں، مولانا مرحوم نے اس کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے!

''سنت وشریعت کی اہمیت، علماء راسخین کی ایک قلیل تعداد

شروح حدیث تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، بدعات نے اکثر کھلے طریقہ پر اور بعض مرتبہ "بدعت حسنہ" کے نام اور نقاب سے پورے معاشرہ اور مسلمانوں کی عملی زندگی پر پورا تسلط حاصل کر لیا تھا، اور کوئی اس بدعت حسنہ کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا، مزید یہ کہ ہندوستانی مسلم معاشرہ کو وحدت ادیان کی ہندی تہذیب وفلسفہ میں رنگنے کی سازش وکاوش کی جارہی تھی، اور نیا دور، نیا آئین، نیا ہزارہ نئی امامت کا نعرہ بلند کیا جارہا تھا۔"

(تاریخ دعوت وعزیمت مقدمہ ص ۲۳-۲۴)

یہ حالات کہ جب ۱۴ شوال ۹۷۱ھ م ۱۵۶۳ کو شہر سرہند میں آپ کی ولادت ہوئی، حفظ قرآن کریم کے بعد تمام مروجہ علوم اپنے والد بزرگوار اور دیگر کبار علماء سے حاصل کئے، اور علوم عقلیہ ونقلیہ کی فراغت کے بعد درس وتدریس میں لگ گئے، اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے والد اور حضرت خواجہ باقی باللہ سے مقامات سلوک وعرفان طے کئے اور درجۂ کمال تک پہنچے۔

۱۰۱۴ھ میں اکبر کی موت کے بعد نورالدین جہانگیر تخت نشین ہوا، ابھی آپ اپنی اصلاحی مہم کا آغاز بھی نہ کر پائے تھے کہ قلعۂ گوالیار کی اسیری کا وہ عظیم حادثہ پیش آیا جو آیت قرآنی (عسی ان تکرھوا شیئا وھو خیر لکم) کا مصداق تھا، جس میں آپ نے سنت یوسفی علی صاحبھا الف الف سلام پر عمل پیرا ہو کر سیکڑوں بت پرستوں کو پرستار حق بنا دیا، اور جیل خانہ قال اللہ وقال الرسول کی صداؤں سے گونج اٹھا، نتیجۂ جہانگیر کو اپنے اقدام پر ندامت ہوئی، اور ایک سال کے بعد قید سے آپ کی باعزت رہائی ہوئی، پھر جہانگیر نے آپ کو وطن جانے اور لشکر شاہی کی رفاقت میں اختیار دیا، جس میں آپ نے آخر الذکر کو پسند کیا، اور ساڑھے تین سال تک لشکر شاہی کے ساتھ رہ کر

ہزاروں بندگان خدا کو دولت اسلام سے مالا مال، اور لاکھوں کو اصلاح ظاہری و باطنی سے سرفراز کیا۔ جس کے نتیجہ میں جہانگیر میں دینی رجحان پیدا ہوا، منہدم مساجد کو دوبارہ تعمیر کروایا، مفتوحہ علاقوں میں دینی مدارس قائم کروائے، اور اسلامی شعائر کو دوبارہ زندہ کیا۔ صفر ۱۰۳۴ھ میں مجدد صاحب نے دار فانی سے کوچ کیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شیخ احمد سرہندی کا وہ عظیم کارنامہ کیا ہے؟ جس کی وجہ سے آپ کو مجدد کا لازوال خطاب ملا، اس سوال کا جواب مصنفین و تجزیہ نگاروں نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق دیا ہے، مصنف علیہ الرحمہ نے ان کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ پہلا گروہ کہتا ہے کہ آپ مجدد کہلانے کے اس لئے مستحق ہیں کہ آپ نے ہندوستان کو اسلام کے لئے دوبارہ بازیاب کیا، اس کو برہمنیت یا وحدت ادیان کی گود میں جانے کے بجائے دوبارہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور دین حجازی کی تولیت ونگرانی میں دے دیا۔

۲۔ دوسرے گروہ کے نزدیک آپ کا تجدیدی کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے طریقت پر شریعت کی فوقیت و بالادستی ایسے پر اعتماد انداز میں ثابت کی کہ طریقت شریعت کی تابع ہی نہیں بلکہ اس کی خادم بن گئی، اور پھر کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہوئی کہ شریعت وطریقت کے کوچے الگ الگ ہیں، اور طریقت پر شریعت کے پہرے نہیں بٹھائے جاسکتے۔

۳۔ تیسرا گروہ یہ مانتا ہے کہ آپ نے وحدۃ الوجود'' جس کے خلاف کسی پڑھے لکھے آدمی کا لب کشائی کرنا اپنی جہالت کا ثبوت دینا اور نصف النہار میں دن ہونے کا انکار کرنا تھا'' ایسے عقیدہ پر آپ نے کاری ضرب لگائی، اور وحدۃ الشہود کا مجرب نظریہ پیش کر کے امت کو گمراہی کے اس سیلاب سے بچالیا۔

ان تینوں گروہوں کے اقوال پیش کرنے کے بعد فاضل مصنف نے اپنی رائے کا اظہار کچھ اس طرح فرمایا ہے:-

"لیکن حقیقت میں ان کا اصل کارنامہ جس کے جلو میں ان کے سارے تجدیدی کارنامے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں، وہ نبوت محمدی اور اس کی ابدیت وضرورت پر امت میں اعتقاد واعتماد بحال کرنے اور مستحکم کرنے کا وہ تجدیدی وانقلابی کارنامہ ہے، جو ان سے پہلے اس تفصیل، وضاحت وقوت کے ساتھ ہمارے علم میں کسی مجدد نے انجام نہیں دیا"۔ (تاریخ دعوت وعزیمت جلد۴ص ۱۹۵)

اس تجدیدی اقدام سے ان تمام فتنوں کا سدباب ہوا، جو اس وقت عالم اسلام میں منھ پھیلائے ہوئے اسلام کے شجرۂ طیبہ اور اس کے پورے اعتقادی اور روحانی نظام کو نگل لینے کے لئے تیار تھے، ان میں سے کچھ مشہور فتنے اور تخریبی تحریکیں ذیل میں بیان کی جارہی ہیں:-

(ا) ایران کی نقطوی تحریک جس نے نبوت محمدی کا ایک ہزارہ سالہ دور ختم، اور نئے دین وشریعت کی ضرورت کو بتا کر نبوت محمدی اور اس کے بقاء ودوام کے خلاف کھلے عام علم بغاوت بلند کیا۔

(ب) اکبر کا دین جدید وآئین اکبری جو ہندوستان میں نبوت محمدی وشریعت احمدی کی جگہ لینے اور اس کا بدل بننے کا منتظر وکوشاں تھا۔

(ج) اسلامی معاشرہ کی وہ بدعات جو ایک متوازی شریعت بنتی جارہی تھیں، اور جن کی ایک مستقل فقہ تیار کی جارہی تھی، وہ بھی ختم رسالت کے خلاف ایک کھلا چیلنج تھا۔

(د) فلسفۂ وحدۃ الوجود جو شریعت محمدی کا حریف بنتا جارہا تھا، اور اس کی جڑیں دل ودماغ، اور اسلامی معاشرہ مین پیوست ہوتی جارہی تھیں۔

(۵)۔ ''فرقۂ امامیہ'' جو امام کو نبی کا درجہ و مرتبہ دیتا ہے، اور حضرات صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتا ہے۔

بیاسی صفحات کے اس باب میں مولانا مرحوم نے تفصیل سے جائزہ لیا ہے کہ حضرت مجدد سرہندی نے کتنے مدلل طریقہ سے ثابت کیا ہے کہ عقل و کشف غیبی اور مابعد الطبیعی حقائق کے ادراک میں عاجز ہیں، اسی طرح اس باب میں آپ کے وہ مکتوب بھی ہیں جو آپ نے اپنے شاگردوں اور مریدوں کو تحریر فرمائے ہیں، اور جن میں آپ نے مفصل انداز میں طریقت پر شریعت کی برتری، سنت نبوی کی اہمیت، اس کا اہتمام و ترویج بدعت اور بدعت حسنہ کی تردید، نیز صوفیاء کے اعمال بھی اسی وقت قابل تقلید ہیں جب کہ وہ مطابق سنت ہوں وغیرہ بیان کئے ہیں۔

وحدۃ الوجود پر ۳۰ صفحہ کا ایک مستقل باب قائم کیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ حالت مغلوبیت میں متقدمین صوفیاء سے جو اقوال سرزد ہوئے ہیں جیسے'' سبحانی ما اعظم شأنی'' لیس فی جبتی للہ'' أنا الحق '' وغیرہ اقوال نے فلسفۂ وحدۃ الوجود کو کتنی تقویت و رواج بخشا، اور کس طرح پھر اس نے ایک تحریک اور مذہب کی شکل اختیار کر لی، اس سلسلہ میں جن صوفیاء کرام کا نام لیا جاتا ہے ان میں حضرت بایزید بسطامی، حسین بن منصور حلاج اور سب سے زیادہ شہرت یافتہ امام شیخ اکبر شیخ محی الدین بن عربی م ۶۳۸ھ دمشقی ہیں، درخت اپنی جڑ سے نہیں، اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، تو آیئے دیکھیں کہ شجر وحدۃ الوجود کس طرح برگ و بار لا رہا تھا، جس پر حساس و غیور علماء کا خاموش رہنا مانند جرم تھا۔ مصنف فاضل رقمطراز ہیں:

> ''ابن تیمیہ ناقل ہیں اور وہ نقول میں عام طور پر محتاط ہیں کہ تلمسانی مسلک وحدۃ الوجود کے قائل ہی نہیں، بلکہ اس پر عامل بھی تھے، شراب پیتے تھے، محرمات کا ارتکاب کرتے تھے کہ جب موجود

ایک ہے تو حلال وحرام کی تفریق کیسی۔'' (ایضاً ۸۰-۲۷۹)

ابن تیمیہ ''الفرقان بین الحق والباطل'' میں تحریر کرتے ہیں کہ:-

مجھ سے ایک معتبر آدمی نے بیان کیا کہ وہ تلمسانی سے فصوص الحکم کا درس لیتے تھے، اور اس کو اولیاء اللہ و عارفین کا کلام سمجھتے تھے، جب انھوں نے فصوص کو پڑھا تو دیکھا کہ اس کے مضامین تو قرآن سے صریح طور پر ٹکراتے ہیں، انھوں نے یہ بات تلمسانی سے کہی، تو انھوں نے جواب دیا کہ قرآن تو سارا شرک سے بھرا ہوا ہے، اس لئے کہ وہ رب وعید میں تفریق کرتا ہے، توحید تو ہمارے کلام میں ہے''۔

(الفرقان بین الحق والباطل ص ۱۴۵ بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت ص ۲۸۰)

مزید لکھتے ہیں کہ:

ایک شخص نے جو تلمسانی اور اس کے ہم خیال کے ساتھ تھا، مجھے خود سنایا کہ ہمارا گذر ایک مردہ کتے کے پاس سے ہوا جس کو خارش تھی، تلمسانی کے رفیق نے کہا کہ کیا یہ بھی ذات خداوندی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ کیا کوئی چیز اس کی ذات سے خارج ہے ہاں سب کے سب اسی کی ذات کے اندر ہیں'' (ایضاً)

" الرد الأقوم علی فصوص الحکم" میں ابن تیمیہ تحریر فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں نے کہا کہ جب وجود ایک ہے تو بیوی کیوں حلال اور ماں حرام ہے؟ اس محقق نے جواب دیا کہ ہمارے نزدیک سب ایک ہیں، لیکن ان محجوبین نے (جو توحید حقیقی سے ناآشنا ہیں) کہا کہ ماں حرام ہے، ہم نے بھی کہا کہ ماں حرام ہے تم پر''

(الرد الأقوام علی فصوص الحکم ص ۴۲ بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت ص ۲۸۰)

مرزا غالب دہلوی نے انھیں لوگوں کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا ہے ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

یہ تھا عقیدۂ وحدۃ الوجود کا وہ شجرۂ خبیثہ، جو اس طرح کے پھل پھول لا رہا تھا، جس کی بیخ کنی ہر حساس عالم اور غیور مومن کا فرض منصبی تھا، لہٰذا علماء کرام نے سختی سے اس پر نکیر کی، جن میں حافظ ابن حجر، علامہ سخاوی، شیخ الاسلام عزیز الدین بن عبدالسلام، ملا علی قاری اور تفتازانی شامل ہیں، اور جس شخصیت نے سب سے زیادہ مدلل و مسکت رد کیا، وہ شیخ الاسلام تقی الدین حافظ ابن تیمیہ ہیں۔ لیکن پہلے محقق مسلم صوفی و عارف جنھوں نے خصوصیت سے اس مسلک و مشرب پر تنقید و تردید کی وہ شیخ رکن الدین ابوالمکارم علاء الدولہ سمنانی ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے اس وادیٔ پر خار میں قدم کیوں رکھا؟ اس کے جواب میں صاحب تاریخ دعوت وعزیمت تحریر فرماتے ہیں کہ:

> جس ماحول اور عہد میں حضرت مجدد کو اپنا نازک و دشوار تجدیدی و اصلاحی کارنامہ انجام دینا تھا، اس میں تصوف اسلامی معاشرہ میں اس طرح گھل مل گیا تھا کہ وہ اس کا مزاج و مذاق بن گیا تھا، خواص تو خواص عوام بھی کسی عالم، معلم و مصلح کے اس وقت تک قائل، اس کے عقیدت کیش، اس کے خطاب سے متمتع نہیں ہوتے تھے، جب تک کہ وہ تصوف و سلوک کے کوچہ سے آشنا، اور کسی مقبول و مستند سلسلہ سے وابستہ، اور مشائخ کا صحبت یافتہ نہ ہو۔

آگے تحریر فرماتے ہیں کہ:

''غرض یہ کہ اس عہد و ماحول میں تصوف وسلوک، قوت روحانی اورنور باطنی کے بغیر اصلاح و انقلاب کی کوشش کرنا بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ ہتھیاروں اور سپہ گری کی مشق کے بغیر کوئی شخص میدان جنگ میں اتر آئے، اور کسی تربیت یافتہ مسلح فوج کا مقابلہ کرے، یہ عین حکمت وتدبیر الٰہی کا تقاضہ تھا کہ اس میدان اصلاح و انقلاب میں اترنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ احمد سرہندی کو تصوف وسلوک کا نہ صرف رمز آشنا اور محرم راز بنایا، بلکہ اہل کمال و تکمیل کی صحبت و تربیت سے، پھر موہبت ربانی اور اجتبائے خاص سے ان کو اس میں درجۂ امامت و اجتہاد تک پہنچایا، تاکہ وہ اس کار عظیم کو پوری تیاری اور پورے اعتماد کے ساتھ انجام دیں، اور اس کا اثر دنیا کے دور دراز گوشوں، اور بعد کی صدیوں تک قائم رہے، ذلك تقدير العزيز العليم ۔

(تاریخ دعوت وعزیمت ص ۱۴۸ جلد ۴)

شاعر مشرق علامہ اقبال نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے:

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار

ایک مغربی مصنف Peter Hardy وہ اگرچہ ان مسائل میں سند کا درجہ نہیں رکھتا، مگر اپنی کتاب Sources of Indian Tradition میں بجا لکھا ہے کہ:

''شیخ احمد سرہندی کی بڑی کامیابی یہی ہے کہ انھوں نے ہندی اسلام کو متصوفانہ انتہا پسندی سے خود تصوف کے ذریعہ نجات دلائی، شائد اس کی وجہ یہ ہو کہ جس نظریہ کی انھوں نے تردید کی،

اس کے مطلب و مفہوم، قدر و قیمت کا ان کو ذاتی طور پر عمیق ادراک تھا۔"

(۱) Sources Of Indian Tradition.-P. 449 بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت ص ۳۰۰

اگلے باب میں سلطنت کو راہ راست پر لانے میں آپ کی اور دیگر علماء و مشائخ کی خفیہ واعلانیہ مساعی جمیلہ کا تذکرہ ہے، اور تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ اکبر کو اس کے خلاف شرع رویہ پر روکنے والے علماء کی ایک شرذمۂ قلیلہ تھی، جن میں شیخ ابراہیم محدث اکبرآبادی، شیخ حسین اجمیری، شہباز خاں کنبوہ، عبدالقادر اُچی، شیخ احمد غرشتی، اور شیخ عبدالقادر لاہوری خاص طور سے قابل ذکر ہیں کہ ان تمام علماء ومشائخ نے حدیث رسول "من رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ" پر حتی المقدور عمل کیا، اور "کلمة حق عند سلطان جائر" کا حساس، لیکن اہم ترین فریضہ انجام دیتے ہوئے اکبر کے نزدیک مبغوض ومردود، لیکن عنداللہ ماٴجور ومقبول قرار پائے۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سلطنت کی بے راہ روی کی منظّم مخالفت اور اس کو راہ راست پر لانے کی مکمل وحکیمانہ جدوجہد کا سہرا حضرت مجدد الف ثانی کے سر ہے، چونکہ آپ کے پیش نظر ایک مقصد تھا، لہٰذا آپ نے الأهم فالأهم کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے پہلے ارکان سلطنت سے روابط قائم کئے، ان کو اپنا مخاطب وہمنوا بنایا، اس ذیل میں مصنف فاضل رقمطراز ہیں:

"ارکان سلطنت سے آپ نے مراسلت کی، اور صفحۂ قرطاس پر اپنے دل کے ٹکڑے بکھیر دئے، اور سیکڑوں برس گذر جانے کے بعد آج بھی ان میں اثر ودلآویزی پائی جاتی ہے، اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے مکتوب الیہم پر کیا اثر ڈالا ہوگا، حقیقت میں یہی

خطوط مجدد صاحب کی دعوت وتبلیغ کے قاصد، ان کے زخمی دل کے صحیح ترجمان، ان کے قطرات اشک اور ان کے لختہائے جگر ہیں، اور دسویں صدی میں ہندوستان کی عظیم سلطنت مغلیہ میں جو عظیم انقلاب رونما ہوا اس میں ان کا بنیادی حصہ اور سب سے بڑا دخل ہے"۔ (ایضاً ص ۳۱۵)

بطور نمونہ ہم یہاں صرف ایک خط نقل کر رہے ہیں جو آپ نے سید فرید بخاری کو جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد ہی لکھا تھا، شیخ سرہندی لکھتے ہیں:-

"بادشاہ کو عالم سے وہی نسبت ہے جو دل کو بدن سے ہے، اگر دل صحیح وصالح ہے تو بدن بھی صحیح وصالح ہوگا، اور اگر وہ فاسد ہے تو بدن بھی فاسد ہوگا، بادشاہ کا صلاح، عالم کا صلاح ہے، اور بادشاہ کا فساد عالم کا فساد ہے"۔ (ایضاً ص ۳۱۷)

آپ کی ان مساعی جمیلہ کا اثر امرائے کبار اور ارکان سلطنت تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ جہانگیر، شاہجہاں اور بعد کے سلاطین تک ہوا، جہانگیر بلا واسطہ دیکھ چکا تھا کہ مجدد صاحب میں دینی صلابت واستقامت آخری حد تک ہے، مثلاً اس کے حضور سجدۂ تعظیمی نہ کرنا، آداب شاہی کو خاطر میں نہ لانا، "رب السجن أحب إلی مما یدعونني إلیه" پر عمل کرتے ہوئے قلعۂ گوالیار کی اسیری کو ترجیح دینا، مگر دست معافی دراز نہ کرنا، نیز لشکر شاہی کے قیام کے دوران آپ کا زہد وورع، تقویٰ واستغناء، اذکار وعبادات کی پابندی سے وہ حد درجہ متاثر ہوا، خامۂ مفکر اسلام لکھتا ہے:

"اس طرح سلطنت کا رخ مخالفت اسلام سے ہٹ کر احترام اسلام، شعائر اسلام کی بلندی، اور بادشاہ اسلام کی اسلام سے دلچسپی کی طرف ہوا، جس کا سلسلہ جہانگیر کے آخری دور سے

شروع ہو کر صاحبقراں ثانی شاہجہاں کے عہد سلطنت پر سایہ فگن ہوا''۔ (ایضاً ص ۳۳۱)

یہ حضرت مجدد شیخ احمد سرہندی کی قربانیوں اور فیض کا ہی ثمرہ تھا کہ سلطان الہند اورنگ زیب عالمگیر آپ کے فرزند وخلیفہ حضرت خواجہ محمد معصوم سے بیعت وارادت کا تعلق قائم کر لیتا ہے، اور خادم اسلام کے گھرانے میں ایک ایسا خادم اسلام جنم لیتا ہے، جو خلیفۂ خامس عمر بن عبدالعزیز کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ ع

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانہ سے

مولانا مرحوم علامہ اقبال سے جون ۱۹۳۷ء کی لاہور ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے اپنے مضمون ''عارف ہندی کی خدمت میں چند گھنٹے'' میں لکھتے ہیں:-

''ہندوستان میں اسلام کے تجدید واحیاء کی بات نکلی تو علامہ نے مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی، حضرت شاہ ولی اللہ دھلوی اور سلطان الہند محی الدین اورنگ زیب کی بڑی تعریف کی، فرمایا کہ میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ اگر ان کا وجود اور ان کی جدوجہد نہ ہوتی تو ہندو تہذیب وفلسفہ اسلام کو اپنے اندر تحلیل کر لیتے''۔

(ایضاً ص ۳۴۸)

اس کے بعد آپ کی مخالفت ومخالفین پر ایک فصل قائم کی گئی ہے، اور مخالفت کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا (۱) ایک مخالفت وہ جو اختلاف عقیدہ ومسلک، یا کسی عصبیت وذاتی عناد پر مبنی تھی جو کسی طرح ختم نہ ہوئی (۲) دوسری وہ مخالفت جو کسی غلط بیانی یا غلط فہمی کے نتیجہ میں پیدا ہوئی، اور اس غلط فہمی کے دور ہوتے ہی وہ اختلاف بھی جاتا رہا، اس ذیل میں شاہ عبدالحق محدث دہلوی کا نام لیا جاتا ہے کہ غلط بیانی کا پردہ چاک ہوتے ہی آپ نے مجدد صاحب سے اپنائیت، خلوص ومحبت کا برملا اظہار کیا، و کفاك به اماما

یشھد لامام۔ آخری باب یعنی باب ہشتم میں آپ کے خلفاء صالحین منتسبین ومریدین کا کر ہے جن کے ذریعہ آپ کا اصلاحی وتجدیدی مشن مزید آگے بڑھا، پھلا پھولا، اور پایہ تکمیل کو پہنچا۔

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پودا انھیں کی لگائی ہوئی ہے

ہم اپنے اس مقالہ کو مولانا مناظر احسن گیلانی کے اس مختصر مگر جامع ''ماقل ودل'' کے مصداق ان تأثرات پر ختم کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:-

''مجھے اس کتاب کے ذریعہ دعوت وعزیمت کی تاریخ ملی اور مجھے اپنی گمشدہ چیز ہاتھ آگئی ہے، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میں نے کتنی دفعہ اس کے مطالعہ سے استفادہ کیا، بار بار پڑھ رہا ہوں لیکن جی سیر نہیں ہوتا، خدا ہی جانتا ہے کہ میرے کتنے خوابوں کی تعبیر آپ کی اس کتاب کے ذریعہ سے پوری ہوگئی''۔ (ایضاً ص ۳۴۸)

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

پروفیسر وصی احمد صدیقی

شرق اوسط کی ڈائری

حضرت مولاناؒ کا سفرنامہ ''شرق اوسط کی ڈائری'' ان کی ابتدائی کتابوں میں ہے، چونکہ یہ اس دور کی تصنیف ہے جب حضرت مولانا نے وہ شہرت نہیں پائی تھی جو ملنے والے پر مصنف کا رعب قائم کردے اور وہ اپنے جوابات کو سننے والے کی خواہش کا تابع کردے۔ اس لئے سارا بیان اخلاص سے پوچھے ہوئے سوالات اور صداقت پر مبنی جوابات کا ہے، کہیں مصنف نے اپنی شخصیت کا اظہار نہیں کیا ہے۔ بلکہ ایک طرح سے اس سے گریز کیا ہے، مگر ذہن کی ہمہ گیری اور وسعت ہے۔ حضرت مولانا کی ساری معلومات، سارے تجربات، سارے افکار اور سارے نتائج کو ایک وحدت میں پیوست کردیا ہے۔ پورا ماحول یکسانیت کا ہے۔ حضرت مولانا تاریخ کے رازداروں میں تھے، اس لئے تاریخی آثار کا تو بیان ہے مگر محلات اور مناظر دیکھنے کی انہیں کوئی خواہش نہ تھی، اس لئے ان کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ البتہ جن ممالک میں گئے وہاں کا ماحول معاشرتی آداب اور سیاسی اتھل پتھل کا ذکر ناگزیر تھا، وہ ضرور ملتا ہے مگر اس کی اہمیت ثانوی ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ حضرت مولانا جہاں تشریف لے گئے وہاں انقلاب ضرور آیا اور ملک میں بادشاہت ختم ہوکر جمہوریت آئی، چاہے دیو استبداد ہی جمہوری قبا میں پائے کوب ہو۔

حضرت مولانا کی زندگی کا بیشتر حصہ اسفار میں گزرا۔ یہ سفر صرف عالم عربی کے نہیں رہے بلکہ اپنا پیغام لے کر حضرت مولانا یورپ اور امریکا کے بیشتر حصوں میں پہنچے۔ آکسفورڈ سے چل کر سمرقند اور بخارا پہنچنے کا قصہ اور امام بخاری کی یادگار قائم کرنے کی داستان تو جناب مولانا محمد رابع حسنی ندوی نے بڑی دلچسپی سے قلم بند کی ہے، کیسا انبساط اور اہتزاز ان شہروں کی بازیافت پر عالم اسلامی نے محسوس کیا تھا۔ یہ کتاب بھی ایک ایسے ہی سفر کی داستان ہے جسے عربی سے اردو قالب میں لایا گیا۔ مگر اردو میں پڑھ کر مجھے اپنی محرومی کا کوئی خاص احساس نہیں ہوا، کیونکہ زبان ایسی رواں اور فصیح ہے کہ اگر پہلے سے نہ معلوم ہو کہ یہ ترجمہ ہے تو اسے اصلی ہی سمجھا جائے اور سچی بات یہ ہے کہ زبان کی خوبی محض ایک آرائش ہوتی ہے۔ نفسِ مضمون سے پیرایہ اظہار خود بخود مؤثر ہو جاتا ہے۔ اسلوب بیان تو مضمون کا تابع ہے۔

حضرت مولانا اب ہمارے درمیان میں نہیں رہے لیکن اس مضمون کو میں نے صیغہ واحد حاضر ہی میں لکھا ہے۔ جو دیکھا تھا وہ تاریخ کے صفحات پر لکھ گیا ہے اور جو فرمایا تھا وہ ایک طرح کا Universal Truth ہے۔

حضرت مولانا کی تخلیق تو عمومی اور آفاقی دونوں ہوتی ہے۔ اس معاملے میں حضرت مولانا اور ایک مصور میں جو فرق ہے وہ یہ کہ مصور مادی اشیاء کا خاکہ بناتا ہے اور حضرت مولانا غیر مادی اشیاء مثلاً افکار اور جذبات کی خاکہ کشی کرتے ہیں اور حقائق کی دنیا سے احساسات کی دنیا میں جاتے ہیں۔ مولانا کی تحریر کی قدر و قیمت پڑھنے والا اپنے مشاہدۂ نفس کے ذریعہ سے طے کر سکتا ہے۔ اسے لذت اور ہدایت دونوں ملیں گی۔ ہر کتاب پر عام طور پر اور اس پر خاص طور پر حضرت مولانا کے معلم، مؤرخ، فلسفی اور عالم ہونے کی چھاپ ہے۔ تحریر کا یہ ملکہ جو حضرت مولانا کو ودیعت ہوا تھا محض ایک فن یا ہنر نہیں بلکہ بقولِ غالب ''صریر خامہ نوائے سروش ہے''۔

اس سفر نامے یا روزنامچے میں حضرت مولانا نے استعاروں کی زبان نہیں اختیار کی ہے۔ اس کا کوئی محل بھی نہ تھا۔ حضرت مولانا نے کوئی زاویہ نگاہ خاص طور پر مرتب نہیں کیا۔ صرف مشاہدے ہیں مگر مصنف کو اور لوگوں سے زیادہ انسانی فطرت کا علم ہے اور ان کی روح میں ہمہ گیری اور وسعت ہے۔ فطرت، انسان، تاریخ اور حسن پر جو اعتقاد ہے وہ کتاب کے ہر جملہ سے ہویدا ہے۔ وہ زندگی اور انسان کی قدر و قیمت کے معتقد ہیں۔ ان کو جو بصیرت نصیب ہے اس کا سرچشمہ صرف ان کا وجدان نہیں بلکہ وہ علم بھی ہے جو ان کو اپنے مطالعہ اور تجربہ سے حاصل ہوا ہے۔ وہ اس حسن کو سامنے لاتے ہیں جو بذاتِ خود صداقت ہے۔ وہ تخیل کو حقائق کے بیان میں نہیں لاتے گو کوئی شک نہیں کہ ذکاوت کی معراجی صورت وجدان کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ وہ ایک تخلیق نگار، ایک وہبی ملکہ کے حامل اور کمال لایزال کے جویا ہیں۔ ان کا سب کچھ مذہب ہے، ''اسلام تیرا دین ہے تو مصطفوی ہے'' چونکہ مذہب اسلام کی بنیاد ہی فطرت اور شعور پر ہے اس لئے کہیں بھی خشک بیانی نہیں۔ انسان کی امید و بیم محبت اور اعتقاد ہی سے معاملہ رکھا ہے اور اس دنیا کو بھی محبت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ یہ کتاب مجرد افکار کا ایک خشک مجموعہ نہیں ہے بلکہ زندہ انسانوں کے افعال اور جزئیات کی نقشہ کشی کرتی ہے۔ انسانی فطرت اور انسانی مزاج کو دلفریب اور پُر لطف طریقہ سے بیان کرتی ہے۔ کیونکہ مصنف زندگی کی تمام صورتوں اور کیفیتوں سے واقف ہیں۔ بین السطور میں ان کلی اور ماورائی قوانین کا ذکر ہے جو کبھی نہیں بدلتے۔ ہر جگہ یہ بات ہویدا ہے کہ اسلامی نظام اور نظام کائنات متوازی ہیں اور مذہب کی صداقتیں مطلق اور بدیہی ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ اس مسافر کی اپنی بستی مکان اور زمان سے تھوڑا اونچی ہے۔

کیسے کیسے لوگوں سے مولانا کی ملاقات ہوئی کیسے اداروں میں حضرت مولانا تشریف لے گئے۔ سب کا عجیب و غریب بیان ہے جو مرئی کو غیر مرئی کے ساتھ، فرد

کو جماعت کیساتھ، عمومی کو خصوصی کے ساتھ، اختلاف کو مشابہت کے ساتھ اور ندرت اور تازگی کو پرانی اور مانوس چیزوں سے وابستہ کرتا ہے۔ تواتر یا دوسرے لفظوں میں ربط فکری کہیں مجروح نہیں ہوتا۔

اس کتاب کے مفصل بیان سے پہلے اُس کتاب کا ذکر لاؤں گا جو حضرت مولانا کے آگے آگے چلی اور سب سے مولانا کا غائبانہ تعارف کراتی رہی۔ یہ نقیب تھی ان کی آمد کی جن کے لئے نگاہ روبرو بہت مناسب ترکیب ہے۔ میرا مطلب انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال سے ہے ۴۷ء میں حضرت مولانا نے حجاز کا پہلا سفر کیا اور اس کے بعد فوراً یہ کتاب لکھی گئی، ۵۲ برس قبل لکھی ہوئی یہ کتاب جب مصنف کی عمر ۳۲، ۳۳ برس رہی ہوگی۔ تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کا شاہکار ہے اور اس کو پڑھ کر حضرت مولانا کو بجا طور پر تلمیذ الرحمٰن کہا جاسکتا ہے۔ کوئی شک نہیں کلام پاک کی تفسیر، حدیث رسول سے شناسائی، ادب عربی سے واقف کاری حضرت مولانا کو ماہر فن کی طرح حاصل ہو چکی تھی، مگر ان کا ایسا عالمانہ اور محققانہ استعمال حضرت مولانا ہی کا حق تھا، یہ رتبۂ بلند جن کو مل گیا، یہ کتاب صرف عطیہ ربی ہے جو فیضان الٰہی سے حاصل ہوئی۔

حضرت نے پوری تفصیل سے دکھایا کہ سرکارِ دوعالمؐ کی بعثت کے وقت دنیا کا کیا حال تھا۔ دینی اور اخلاقی، سماجی اور سیاسی ماحول کیا تھا۔ انسانیت کس پستی کی طرف پہنچ چکی تھی۔ اسلام نے کس طرح زمامِ قیادت اپنے ہاتھ میں لی اور اس کے اقتدار نے دنیا کی تہذیب پر کیا اثر ڈالا۔ پھر یہ قیادت کیسے کمزور اور غافل لوگوں کے ہاتھ میں پہنچی اور کیسے بتدریج انحطاط اور زوال ہوا اور پھر امامت مادہ پرست یورپ کی طرف منتقل ہوئی۔ یورپ کی قیادت نے دنیا پر کیا اثر ڈالا اور زندگی کو کس طرح متاثر کیا۔ اب دنیا کا رخ کیا ہے اور مسلمانوں کی کیا ذمہ داری ہے۔ مسلمانوں کا زوال صرف ایک ملی حادثہ نہیں بلکہ انسانیت کی بدقسمتی ہے۔ اسلامی انقلاب برائی سے اچھائی کی طرف تھا اور

مسلمانوں کا زوال دنیا کو خیر سے شر کی طرف لے جارہا تھا۔ یہ کتاب مسلمانوں میں خود اعتمادی اور اسلام کی طرف لوٹنے کے لئے تصنیف کی گئی تاکہ بقول حضرت مولانا کے مسلمانوں کو یہ بتایا جائے کہ وہ دنیا کی تعمیر وتشکیل کے اہم کام میں ایک فعال فیکٹر ہیں، کسی اسٹیج کے ایکٹر نہیں۔

یہ کتاب عربی میں لکھی گئی کیونکہ حضرت مولانا کے الفاظ میں اس وقت کے عالمِ عربی کی فضا سب سے زیادہ خاموش اور اس کا سمندر سب سے زیادہ پُرسکون تھا، عربوں نے زمانہ کے ساتھ صلح کرلی تھی، یہ ہندی المولد جن کی مادری زبان اردو ہے انھوں نے نئے عالمگیر انقلاب اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے قرآن کی زبان کو چنا۔ اسلامی انقلاب کی عظمت اور محیر العقول کارنامہ کو ذہن نشین کرنے کے لئے بطور کنٹراسٹ جاہلیت کا پورا مرقع پیش کیا۔ دعوت اسلام کے امتیازات کو تفصیل سے بیان کیا، حضرت مولانا کو ۱۹۵۱ء میں شرق اوسط کے سفر کا موقع ملا تو وہ خود دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے کہ کتاب کا کیسی گرم جوشی سے استقبال ہوا اور اسلامی حلقوں میں کتنا ہاتھوں ہاتھ لی گئی، جدید اور قدیم دونوں حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوئی اور خود حضرت مولانا کے الفاظ میں کتاب کے گمنام اور بعید الوطن مصنف کی جو حوصلہ افزائی ان عرب ملکوں میں ہوئی اس کی توقع اپنے ملک میں نہیں کی جاسکتی۔

اس کتاب کا اردو ترجمہ خود مصنف نے کیا تھا، اس دوران بہت سے اضافے ہوئے۔ اس حقیر مضمون نگار کے پڑھنے میں مکمل کتاب آئی۔

سید قطب نے ایک واضح حقیقت اپنے مقدمہ میں لکھی ہے کہ اسلام کی تعلیم سروری اور جہاں بانی کی تعلیم ہے۔ یہ تعلیم بتاتی ہے کہ اس دین کے ماننے والوں پر پوری انسانیت کی ذمہ داری ہے، حضرت مولانا نے اپنی کتاب میں ٹھوس علمی حقائق سے کام لیا ہے جو بیک وقت وجدان اور شعور اور فکر ونظر دونوں کو اپیل کرتی ہے۔

حضرت مولانا نے لکھا ہے کہ اسلام سے پہلے اس دنیا کا کیا حال تھا۔ مشرق ومغرب شمال وجنوب کا کیا نقشہ تھا۔ چین وعرب اور ہند سے لے کر روم اور فارس تک معاصر دنیا کا عقلی اور فکری مزاج کیا تھا، جو مذاہب دین سماوی تھے مثلاً یہودیت اور نصرانیت یا جو بت پرست مذاہب تھے مثلاً ہندومت اور بدھ مت ان کا کیا حال تھا۔ اس سلسلے میں حضرت مولانا نے قدیم اور جدید غیر مسلم مصنفین کا بھی حوالہ دیا ہے۔ یہ مذاہب صرف ڈھانچے تھے جن میں نہ کوئی روح تھی نہ کوئی زندگی، صرف بے جان اور بے روح مراسم کے حامل تھے۔ پھر حضرت مولانا نے دکھایا کہ اسلام نے تعمیر انسانیت میں کیا کارنامہ دکھایا، کس طرح انسان کو اوہام اور خُرافات اور ذلت اور غلامی سے نجات دی، ایک وقت آیا جب زمام قیادت اسلام کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ حضرت مولانا نے اس کے اسباب بیان کئے ہیں، کتاب پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے کیسی مجرمانہ کوتاہی اور غفلت کا ارتکاب کیا۔ یہ نکتہ ہر جگہ واضح رہا اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود نہ بدلے۔

مضمون شرق اوسط کی ڈائری پر لکھنے بیٹھے تھے اور تمہید اتنی لمبی کردی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام والی کیفیت ہے کہ ''تمہارے ہاتھ میں کیا ہے'' کے جواب میں بہت سی باتیں بیان کردیں۔ لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔ اب اس سفرنامہ یا ڈائری پر آتا ہوں جو اس مضمون کی محرک ہے

یہ کتاب ان حضرات کا سراپا ہمارے سامنے پیش کرتی ہے جن سے حضرت مولانا ملے۔ عام سفرناموں سے یہ بالکل الگ ہے کیونکہ یہ اس وقت کے عالمِ اسلام کی پوری تصویر ہمارے سامنے پیش کرتی ہے اور زندگی سے تعلق رکھتی ہے۔ بیان واقع میں کسی کی تعریف ہو جائے مگر مناقب اور فضائل کے ذکر سے خالی ہے۔ سفرناموں میں سب سے معتبر اور دلچسپ ابن جبیر اندلسی، ابن بطوطہ مغربی اور ہیونگ سانگ کے

رہے ہیں۔ مگر حضرت مولانا کے سفر ناموں کو ان سے کوئی تعلق نہیں، پورا اسٹائل ہی الگ ہے، حضرت مولانا کے اس متاع کو نہاں خانہ ازل سے تھوڑا سا بریز نے نے لیا تھا۔ اس نے خطوط کے پیرایہ میں جہانگیر اور شاہ جہاں کے زمانے کے ہندوستان کو بیان کیا ہے گو تخیل کی آمیزش بے حد ہے اور افسانوی رنگ پیدا کیا ہے۔

قدیم سفر نامے جس زندگی اور جس معاشرے کو بیان کرتے ہیں وہ سادہ اور پُرسکون تھے۔ انقلابات اسی طرح آئے تھے کہ ایک بادشاہ کی موت کے بعد یا ایک بادشاہ کو قتل کر کے دوسرا بادشاہ بیٹھا۔ تھوڑی اتھل پتھل ہوئی اور عوام کی زندگی پھر یکسانیت پر آ گئی۔ موجودہ زندگی کی تیزی اور نگارنگی نہ تھی۔ دشمن ہوتے تھے مگر متضاد شخصیتیں نہ تھیں، نہ کوئی فکری تحریک تھی نہ ایسے انقلاب جیسے انقلاب فرانس یا انگلستان کا صنعتی انقلاب یا روس کا بالشویک انقلاب جنہوں نے عوام اور خواص سب کی زندگی کا دھارا بدل دیا۔ شاہی فرمائش یا کسی امیر کی فرمائش پر لکھی ہوئی تحریر کتنی سچی ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔ واقعہ کے نہ معلوم کتنے عرصے کے بعد لکھی ہوئی تحریر قابل اعتماد کیوں کر ہو سکتی ہے۔ حضرت مولانا نے کس قدر صحیح بات لکھی ہے کہ وقت گزرنے کے بعد محض حافظہ کی مدد سے مسرت الم انقباض اور انشراح کی کیفیات کا اندازہ کرنا آسان بات نہیں۔ اپنی ملاقاتوں کا اور اپنے احساسات کا روز کے روز اندراج کرنا کبھی رائج نہیں رہا۔

جیسا کہ میں نے لکھا ہے کہ حضرت مولانا کا یہ سفر نامہ سیر و سیاحت کے ذکر اور آثار قدیمہ اور قابل دید مقامات کے بیان سے تقریباً خالی ہے۔ اگر ہے تو اس کی حیثیت فروعی ہے۔ اس نے مشینی انداز میں حالات کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس سفر نامے میں کیمرے سے صرف تصویر نہیں کھینچی ہیں بلکہ اس میں ملنے والوں کے دل کی دھڑکن اور ضمیر کی سرگوشی رکارڈ ہے۔ مصنف کی شخصیت کی چھاپ ہر مکالمہ اور ہر واقعہ پر ہے۔ اس تحریر میں حزن والم کی تلخ کامی اور مسرت اور شادمانی کی مٹھاس ہے۔

اس سفر میں اہم اور غیر اہم شخصیتوں سے حضرت مولانا نے ملاقات کی اور ان کے ساتھ مختلف دینی اور علمی موضوعات، اسلامی مسائل، تحریکات اور تعلیمی منصوبوں پر گفتگو کی۔ بقول حضرت مولانا ان کو عالمِ عربی کے افکار ونظریات، اصلاحی تحریکات اور وہاں کے فکری اور ادبی مکاتب خیال اور مسائل کو سمجھنے اور فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔

حضرت مولانا کو جو میں نے تلمیذ الرحمٰن لکھا ہے وہ غلط نہیں لکھا ہے کیونکہ سفر کے وقت جب سعدی کی طرح ''چہل سال عمر عزیزت گزشت'' والی عمر بھی نہ تھی ان کا علمی، ادبی اور زمینی سانچہ بن چکا تھا۔ مصر اور شام کے مختلف اداروں سے شناسائی تھی اور ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین کے مصنف ہو چکے تھے۔

حضرت مولانا نے روز کے روز ہر گفتگو، ملاقات، تأثر اور مشاہدہ کو قلم بند کیا اور اس کا اہتمام کیا کہ جو الفاظ بولنے والے نے استعمال کئے وہی لکھے جائیں، عالم عربی کے اس وقت کے نفسیاتی اور فکری اضطرابات کا پورا نقشہ کھینچا ہے اور وہ باتیں بھی لکھیں جو آگے پیش آئیں۔

ان شخصیات کا بھی ذکر ہے جن کے بقول حضرت مولانا کے اشارے افق پر ظاہر ہو رہے تھے اور آگے چل کر پوری تصویر سامنے آئی۔ اپنے بیان میں حضرت مولانا نے بغیر کسی مروت اور تکلف کے شخصیتوں کو پیش کیا۔ خود حضرت مولانا نے لکھا ہے کہ یہ ایک زندہ انسان کی تصویر کشی اور منظر نگاری ہے جو اپنے سینے میں دل رکھتا ہے جس کے کچھ عقائد اصول اور اقدار ہیں۔ حضرت مولانا نے لکھا کہ ان کے نزدیک اسلام ہر چیز کا اصل پیمانہ اور معیار ہے اور اعمال، اخلاق اور شخصیات سب کو اسی پیمانہ سے ناپنا چاہئے۔ انہوں نے ان ممالک اور ان کے نمائندوں کے محاسن اور کمزور پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

انتہائی اہم بات یہ ہے کہ اتنا وقت گزرنے کے باوجود اس کتاب کی اہمیت اور افادیت ویسی ہی قائم ہے۔ یہ ایک تاریخی دستاویز ہے۔ پڑھنے والے ان ملاقاتوں اور

گفتگو سے وہ نتائج نکال سکتے ہیں جو تاریخ کی ہزاروں کتابیں پڑھنے سے بھی نہیں مل سکتے۔ آیئے اب اس ڈائری کے مندرجات پر بھی تھوڑی سی نگاہ ڈالی جائے۔

جدہ سے حضرت مولانا کو مولانا عبداللہ عباس ندوی اور مولانا محمد رابع حسنی ندوی نے رخصت کیا۔

جہاز پر حضرت مولانا کا پہلا احساس کچھ مسرت اور کچھ دکھ کے ساتھ فجر کی اذان پر ظاہر ہوا انھوں نے دیکھا کہ ''نماز بہتر ہے نیند سے'' کی صدا کم لوگوں پر اثر انداز ہوئی۔ انہوں نے دیکھا کہ مسافروں میں اسلامی تعارف اور ملاقات کا کوئی شوق نہیں، ایک کشتی کے سوار ایک دوسرے سے بیگانہ لگتے تھے۔

حضرت مولانا کو قاہرہ میں اپنے پردیسی ہونے کا احساس ہوا جب ہوٹل والوں نے پاسپورٹ اور ویزا کے مسائل کے سبب سے قیام کا انتظام کرنے میں آنا کانی کی۔ وہ دشواری دور ہوئی پھر حضرت مولانا نے ہندوستانی دارالاقامہ کے ایک جلسہ کو خطاب کیا۔ حضرت مولانا نے طلباء کو نصیحت کی کہ اپنے کو پیغام اسلام کے لئے خاص کرلو۔ اپنی زندگی اور اپنے مستقبل کو اسلام پر ثابت قدمی اور اس دعوت کے ساتھ جوڑ دو۔ یہ پیغام تو ابدی ہے۔

حضرت مولانا نے مختلف تقریروں میں یہ نکتہ واضح کیا کہ نئی نسل کے لئے نئے اسلوب اور طرز کلام کو اختیار کرنا چاہئے۔ عالمِ اسلام کو زوال پذیر ہونے سے بچانے کے لئے ایک ایسی طاقتور عوامی تحریک کو اٹھنا چاہئے جس کی بنیاد ایمان وتقویٰ اور خالص اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جدوجہد پر ہو۔

حضرت مولانا شیخ ازہر سے ملے۔ مولانا نے محسوس کیا کہ شیخ ازہر حسن کردار اور تواضع کے بلند مقام پر ہیں۔ حضرت مولانا شیخ حامد فقی کی ایک مجلس میں بیٹھے، وہ شیخ کے جوہر خطابت سے خوش ہوئے مگر مقلدین مذاہب اربعہ کے پیروؤں کے متعلق ان کے تمسخر آمیز تبصرہ کو ناپسند کیا۔

حضرت مولانا اخوانی طلباء سے ملے اور ان کے جذبہ سے متأثر ہوئے۔ پھر انصار السنہ میں تقریر کی اور ہندوستان میں داعیوں اور مجاہدین کی مثالیں دیں۔ مختلف مجالس میں اور مختلف لوگوں سے ملتے ہوئے حضرت مولانا نے دین وسیاست کی تفریق کے بارے میں گفتگو کی۔ یہ بھی فرمایا کہ نئے تمدن کے بارے میں مسلمانوں کے احساس کمتری کا علاج ایسے علماء کی دریافت ہے جو دینی اور دنیاوی دونوں علوم کے جامع ہوں۔ طلباء کے بیچ میں تقریر کرتے ہوئے حضرت مولانا نے فرمایا کہ اس عالم کی از سرِ نو تعمیر وہی کر سکتے ہیں جو معمار حرم ہیں۔ ڈاکٹر احمد امین سے مولانا کی کئی ملاقاتیں رہیں، کبھی جوگ اور تصوف پر گفتگو ہوئی۔ کبھی حکیم اور عارف کے فرق پر۔ فرمایا کہ علم کا صحیح سرچشمہ وحی الٰہی اور علم نبوت ہے۔

اس وقت ازہر کے طلباء اور اساتذہ کی اسٹرائک پر مولانا نے فرمایا کہ اسلام سے کشمکش، اخلاق سے مذاق، بے حیائی اور فطری حدوں سے تجاوز میں ترقی ہوتی رہے گی جب تک کہ سوسائٹی میں طاقتور دینی روح، حمیت دینی اور خودداری نہ پیدا ہو جائے۔

حضرت مولانا نے عدالت فوجداری کی بھی سیر کی اور اخوان کے وکیل صفائی کی حیثیت سے استاذ سعید رمضان کی تقریر سنی۔

شیخ حسن البنا شہید کے والد سے ملاقات کی۔ حسن البنا مرحوم سے حضرت مولانا کی ملاقات نہیں ہوئی تھی ان کے متعلق کچھ بات کرنی چاہی۔ انھوں نے اپنے عزیز بیٹے اور جگر گوشہ کا قصہ بڑی سنجیدگی اور سکون سے سنایا ان کی قوت ایمانی اور جوانمردی سے حضرت مولانا متحیر ہوئے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دو شعر نقل کئے:

> ''اگر تم پوچھتی ہو کہ تم کیسے ہو تو میں حوادث روزگار پر پختہ اور ثابت قدم ہوں، میرے لئے بڑی دشوار بات یہ ہے کہ تم میرے اوپر کوئی رنج کی بات دیکھو اور میں کمزوری کا مظاہر کروں پھر دشمن

ہنسے یا دوست غمگین ہو۔"

حضرت مولانا نے محسوس کیا کہ اس وقت کے مصر کا عربی رجحان غیر دینی تھا۔ پھر حضرت مولانا مسجدوں اور مقبروں کی سیر کے لئے نکلے۔ شہر فسطاط دیکھنے گئے، مسجد عمرو بن العاص میں ایسی قلبی کشش اور انس محسوس کیا جو مصر کی وسیع سرزمین میں کسی مسجد میں محسوس نہ ہوا تھا۔

مولانا العالم العربی کے ایڈیٹر اسعد حسنی صاحب سے ملے۔ ان سے بڑی اچھی علمی گفتگو رہی، انہوں نے اپنے رسالہ میں شائع کرنے کے لئے حضرت سے ان کی تصویر مانگی۔ حضرت نے معذرت کی اور فرمایا کہ میں آپ کو وہ تصویر دوں گا جو میں اپنے قلم سے کھینچتا ہوں جو میری فکر و زندگی کی تصویر ہے۔

منبر الشرق جناب علی النایاتی کے ساتھ بڑی دلچسپ گفتگو رہی، مولانا نے فرمایا کہ ہندو پاک کے مسلمانوں میں بڑا دینی جذبہ اور عرب ممالک سے بہت زیادہ دین کی عظمت پائی جاتی ہے۔ وہ ممالک جو اصلاً اسلام کے داعی اور خالص عرب ہیں دین و رسول و قرآن کی طرف عادت و رسم کی نظر سے دیکھتے ہیں جس میں نہ کوئی کشش ہوتی ہے نہ تعظیم، حضرت مولانا نے اپنی کتاب ماذا خسر العالم سے روح العالم العربی کے عنوان سے جو لکھا ہے پڑھ کر انہیں سنایا، انہوں نے اسے بہت پسند کیا اور اتفاق ظاہر کیا۔

حضرت مولانا نے اخوان المسلمین کو تین اہم نکات سے بہرہ مند کیا۔ پہلا یہ کہ عوام کے دلوں میں مبادی ایمان کی تخم ریزی کو انتظامی امور پر مقدم رکھنا چاہئے۔ دوسرا یہ کہ ایسی شخصیتوں کو پیدا کریں جو دعوت کے کام کو چلائیں اور افراد کو تیار کریں۔ تیسرا نکتہ قلب و نگاہ کو ایسی غذا پہنچائیں جو داعیوں کے جوش اور نشاط کو باقی رکھیں۔

حضرت مولانا استاذ احمد حسن زیات سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ ان کی کتاب تاریخ الادب العربی کو ندوہ میں مولانا پڑھاتے تھے اور مصنف کے ادبی اسلوب اور عربی

زبان اور انشاء پر ان کی قدرت سے متأثر تھے، حضرت مولانا کی سید قطب سے ملاقات کو میں نے اپنے مضمون ''شہر خموشاں کے مکیں'' میں قران السعدین سے تعبیر کیا تھا۔ جہاں بہت سے موضوعات پر بات رہی وہاں مولانا کے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ وہ ادب اور ادبی اسلوب میں عقاد کے شاگرد ہیں اور الفاظ سے زیادہ فکر کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب کی تاریخ اور وہ اسباب بتائے جو ان کتابوں کی تصنیف کے محرک ہوئے۔ ایسے انہوں نے رفتہ رفتہ اسلامی فکر کی طرف قدم بڑھایا۔

سید قطب کا دیباچہ جو انہوں نے ماذا خسر العالم پر لکھا وہ ان کا تعارف کرانے کے لئے کافی ہے۔

حضرت مولانا نے علی باشا مبارک ہال میں ڈاکٹر اقبال پر ایک مقالہ پڑھا جو بہت پسند کیا گیا۔ حاضرین میں ایک پروفیسر نے اپنی تقریر میں کہا کہ اقبال کو ان کے ہم عصروں میں جو چیز سب سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کا پیغام ہے۔ انہوں نے کہا کہ افسوس ہمارے موجودہ شعراء صاحب پیغام نہیں۔

فؤاد یونیورسٹی کے لا کالج میں حضرت مولانا کی تقریر ہوئی۔ مخاطب انڈونیشیا کے طلبا تھے۔ بہت ہی اچھی تقریر تھی، جس نکتہ پر حضرت مولانا کا زور تھا وہ یہ کہ حکومتوں کے وجود میں آنے اور ان کے باقی رہنے میں کوئی کمال نہیں۔ خوبی وکمال اس میں ہے کہ اس کی تنظیم دینی بنیاد اور اس کے صحیح نمونہ اور اسلام کی اچھی نمائندگی پر ہو۔ مصر میں حضرت مولانا کا بے حد مشغول وقت کٹا۔ کبھی یونیورسٹیوں میں تقریر فرمارہے تھے کبھی ترکوں کے جلسہ میں، کبھی سنٹرس میں۔ کبھی بچوں کی تعلیم کے بارے میں گفتگو فرمارہے تھے۔ چھاپہ خانوں اور ملوں کا بھی معائنہ کیا اور بہت تفصیل سے ان کا ذکر کیا۔

مفتی امین الحسینی سے گفتگو سے حضرت مولانا کو اندازہ ہوا کہ مسلمانوں کے زوال میں حقائق سے ان کی ناواقفیت اور استعماریوں کی سیاست بھی شامل ہے۔ جنھوں نے قلب

اور ضمیر کو خرید لیا ہے۔ حضرت مولانا کی ملاقات مولانا ابوالکلام آزاد سے بالکل اتفاقی رہی۔ گفتگو سے حضرت مولانا نے نتیجہ نکالا کہ زندگی کے طویل سفر نے انہیں علمی موضوعات سے غافل اور بے خبر نہیں کیا ہے۔ مصر میں حضرت مولانا کا آخری پروگرام مصری آثار قدیمہ کے میوزیم کی سیر تھی۔ پھر حضرت مولانا نے سوڈان کے لئے رخت سفر باندھا، سفر کی ابتداء ریل سے ہوئی۔ جب ریل فراعنہ کے پایہ تخت صعید کے علاقہ سے گزر رہی تھی تو اس وقت حضرت مولانا کلام پاک کی جو آیت پڑھ رہے تھے اس کا ترجمہ یہ ہے "اور فرعون نے اپنی قوم میں بآواز بلند یہ بات کہی کہ اے میری قوم کیا مصر کی سلطنت میری نہیں اور نہریں میری پائیں میں بہہ رہی ہیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو" یہ قرآن پاک کا معجزہ تھا کہ اس وقت حضرت مولانا پچیسویں پارہ کی آیتیں پڑھ رہے تھے۔

پھر حضرت مولانا جہاز پر سوار ہوئے جو دریائے نیل میں بہہ رہا تھا۔ اس جہاز پر حضرت مولانا نے رمضان کا چاند دیکھا۔ پھر ریل کا سفر ہوا اور عصر کے وقت ساڑھے چار بجے ٹرین سے اترے، سید میر غنی کے خلفاء اور عزیزوں میں ایک صاحب کے گھر قیام کا انتظام تھا۔

سید میر غنی سے حضرت مولانا کی ملاقات حضرت کے لئے پسندیدہ تھی۔ ان کے لئے بہت تعریف کے کلمے فرمائے۔ ان سے افریقہ میں اسلامی دعوت کی ضرورت پر بہت کارآمد گفتگو رہی۔ خرطوم میں ماہر معاشیات شیخ شوقی اسد سے ملاقات کی۔ مختلف ملاقاتوں کے بعد حضرت مولانا اس نتیجے پر پہنچے کہ سوڈانیوں کا دینی جذبہ قومی اور الحاد اور آزادی سے بہت دور ہے۔ ان کی دینداری میں تصوف کے سلسلوں کے اشخاص اور بزرگوں کے ساتھ احترام و تعظیم میں اتنا مبالغہ ہو جاتا ہے کہ جو شرعی حدود سے نکل کر شرک تک جا پہنچتا ہے، مسجدوں میں سید میر غنی کی تصویر آویزاں رہتی ہے اور جو ان کے متبعین میں نہ ہو وہ خطبہ نہیں دے سکتا۔

یہ اس وقت کے سوڈان کا حال تھا۔ سوڈان سے حضرت مولانا واپسی قاہرہ پہنچے اور پھر ملک شام چل دیئے۔ حضرت مولانا نے لکھا کہ خدا مصر اور اہل مصر کو سلامت رکھے۔ مصر اور مصریوں کو اس مسافر اور سیاح کا سلام جس کو اس اسلامی ملک میں وہ محبت اور نوازش، ضیافت اور اکرام نصیب ہوا جس کی ایک مسلمان امید کرتا ہے۔

اس سفر کے بیان میں نہ ان سب لوگوں کا ذکر آیا ہے جن سے حضرت مولانا ملے تھے اور نہ ان سب جگہوں کا جہاں حضرت مولانا تشریف لے گئے تھے۔ اس کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی مگر مدارس عربیہ کے طالب علموں کو میرا مشورہ ہے کہ وہ یہ دیکھیں کہ جن لوگوں کا ذکر آیا ہے مستقبل میں ان کا کیا مقام رہا۔ اپنے دین، اپنی زبان اور اپنے ملک کے لئے انہوں نے اور کیا کیا۔ یہ ان کے لئے ریسرچ کا بہت اچھا موضوع ہوگا۔

جناب انیس چشتی

اپنے گھر سے بیت اللہ تک!

سفر نامے گھر سے شروع ہوتے ہیں اور گھر پر ختم ہوتے ہیں۔ یہ طویل بھی ہوتے ہیں اور مختصر بھی۔ ان کا مطالعہ بعض مرتبہ قاری کو تھکا بھی دیتا ہے اور اکتاہٹ کے باوجود پڑھنے پر آمادہ بھی کرتا ہے۔ سفر کبھی سفر نامے میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور اکثر سفر کے دائرے سے نکل کر حضر میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان کا لکھنے والا کبھی عجب وخود نمائی کا شکار ہو جاتا ہے اور کبھی اخفاء کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ پڑھنے والے کو سفر کی راکھ کرید کر اس کی جستجو کرنی پڑتی ہے۔

سفر کی قسمیں اور افتاد بھی مختلف ہوتی ہے۔ سیاسی، سماجی، تعلیمی، معاشی، مذہبی اور دعوتی وغیرہ۔ ہر سفر نامہ مسافر کی افتاد طبع، ذہنی ساخت، مخصوص تہذیبی وراثت، معاشی حیثیت اور اس کے وجدان کا عکاس ہوتا ہے۔

اردو میں سفر ناموں کی تاریخ اردو سے بھی کم پرانی ہے۔ اچھا سفر نامہ لکھنے کے لئے مسافر کا ادیب ہونا ضروری نہیں، اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر اچھا ادیب اچھا سفر نامہ بھی لکھ سکے گا۔ بعض سفر نامے ایسے بھی ہیں جو اس کے مصنف کی واحد تصنیف ہیں بعض

غیر ادیب مصنفوں نے جرسِ غنچہ کی صدا پر چلی جانے والی نسیم کے تعاقب میں قافلہ نو بہار کو جالیا ہے اور ادب کے وہ گل بوٹے تراشے ہیں کہ ع

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

اردو میں حج کے سفر ناموں کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے۔ حج کے سفر نامے کیفیت اور تاثر میں اپنی مثال آپ ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس سفر میں تقویٰ اور دارفتگی کا ایسا حسین وجمیل امتزاج ہوتا ہے کہ یہاں کبھی جنیدؒ و بایزید نفس گم کردہ نظر آتے ہیں تو کبھی جوشِ جنوں اس طرح سے بے حال کر دیتا ہے کہ آگے آگے مشعل سی لئے جانے والے شخص کا نام پوچھ لینے کا بھی یارا نہیں رہتا۔ یہ سفر نامے ہدیے میں ناظرین سے آنسو طلب کرتے ہیں اور عوض میں اس سفر کے لئے تیار ہونے کی امنگ بخشتے ہیں۔ ان سفر ناموں میں خلوص وللّٰہیت، بے ساختگی اور آمد دیگر سفر ناموں کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے۔

اسی طرح کا ایک سفر نامہ آج سے تقریباً ۵۰ سال پہلے لکھا گیا تھا اور لکھنے والا بیک وقت مفکر، مؤرخ، محقق، اہلِ زبان، صاحب قلم اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اہل دل تھا۔ اس کے شعلہ نگار اور برودت ساماں قلم نے آج مشرق ومغرب کی علمی محفلوں پر اپنی ایک جداگانہ دھاک بٹھا دی ہے۔ میری مراد کسی اور شخصیت سے نہیں بلکہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے ہے۔

میں عرض کر رہا تھا کہ آج سے تقریباً نصف صدی قبل لکھا یہ حج نامہ ''اپنے گھر سے بیت اللہ تک'' پہلی مرتبہ ۱۳۶۸ھ میں ماہنامہ ''الفرقان'' کے ''حج نمبر'' میں اس شرط کے ساتھ اشاعت کے لئے ایڈیٹر کے اصرار پر دیا گیا تھا کہ ''اس مضمون کے لکھنے والے کا نام ظاہر نہ کیا جائے۔ پھر یہ مضمون ارکان حج سے متعلق ایک کتاب میں ایک ذیلی مضمون کے طور پر شائع ہوا۔ اب یہ مضمون ایک مستقل کتاب کی صورت میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکا ہے اور کتاب کا عنوان ہے ''اپنے گھر سے بیت اللہ تک''۔

اس کتاب کے مصنف کے لئے یہ بات دعوے سے کہی جاسکتی ہے کہ اس نے کرۂ ارض کے شمال وجنوب اور مشرق ومغرب کا اتنا سفر کیا ہے کہ ''خضر ثانی'' کہلائے جانے کا مستحق ہے اور اگر بس چلے تو مولاناؒ یہ کہنے سے بھی دریغ نہ کریں کہ ؎

میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے بہت اونچا حدِ پرواز سے

حضرتؒ نہ صرف حج سے واقف تھے بلکہ حج کی سرزمین سے بھی واقف تھے۔ وہاں کی زبان وتہذیب سے واقفیت انھیں ورثے میں ملی تھی۔ بیت اللہ شریف میں داخلے کا شرف انھیں متعدد بار میسر آچکا تھا۔ گویا روحانی اعتبار سے مصنف ''محرم رازِ درونِ مے خانہ'' ہیں لیکن اپنے سفرنامے میں لکھے ان الفاظ کی سادگی ملاحظہ فرمائیے:

''.....اس سادہ سے چوکور گھر میں خدا جانے کیا حسن وجمال اور کیا دلکشی ومحبوبیت ہے کہ آنکھوں میں کھپا جاتا ہے اور دل میں سمایا جاتا ہے۔ کسی طرح نظر ہی نہیں بھرتی۔ تجلیات الٰہی اور انوار کا ادراک تو اہل نظر ہی کر سکتے ہیں، لیکن جلال وجمال کا ایک پیکر ہم جیسے بے حسوں اور کم نظروں کو بھی نظر آتا ہے۔''

اس سفرنامے کا انداز دھیما اور دل میں گھر کرنے والا ہے۔ اس میں فرازِ کوہ سے اترنے والے سرکش آبشار کا شور نہیں بلکہ میدان ومرغزار میں بہنے والی سلسبیل مسلسل کا بہاؤ ہے، جو احترام مکاں اور عام حاجی کی تربیت کے لئے ضروری ہے۔ سفرنامہ آہستہ آہستہ سفر کی تیاریوں اور گھر سے رخصت ہونے سے شروع ہوتا ہے اور ریل، ساحلِ بمبئی، بحر عرب سے ہوتا ہوا ساحلِ جدہ پر جا پہنچتا ہے۔ اس وقت مصنف کو اپنے قلم پر قابو رکھنا دشوار ہے۔ اس کی تیز دھار دل میں اترتی محسوس ہوتی ہے۔ دیکھئے:

''وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ اب جدہ پہنچنے کی باتیں ہونے

لگیں۔ تیر کی طرح ایک کشتی آئی۔ ارکاٹی عرب جہاز پر چڑھا اور حجاج یورپین کپتان کی ناخدائی سے نکل کر ایک باخدا جہاز ران کی رہنمائی میں آئے..... جہاز لنگر انداز ہوا..... حجاج عرب کی سرزمین پر پہنچ گئے۔ دل سینے سے نکلا جاتا ہے۔ کیا واقعی ہم عرب کی سرزمین پر ہیں؟ کیا ہم اب دیارِ محبوبؐ میں ہیں۔ کیا ہم مکہ مکرمہ سے چند میل کے فاصلہ پر ہیں؟ ع

آنچہ ما بینیم بہ بیداریست یارب یا بخواب؟''

بظاہر اس سفرنامے کا مقصد حرمین شریفین کی منظر کشی نہیں بلکہ حجاج کی جذباتی و روحانی تربیت اور اخلاقی دروبست ہے۔ آپ نے حج کی متعدد کتابیں پڑھی ہوں گی۔ ان میں مناسک وارکان کی فہرست نرخِ بازار یا حاذق حکیم کے نسخے کی طرح نازل ہوتی اور فوجی حکم کی طرح ''پیچھے مڑ..... تیز چل!'' پر ختم ہوتی ہے۔ زیر بحث پورے سفرنامے میں مصنف نے کسی رکنِ حج کا اعلان نہیں کیا ہے اور نہ کوئی بغلی سرخی قائم کی ہے۔ اس کی وجہ سے تاثر میں زبردست وحدت اور اسلوب میں انفرادیت پیدا ہوگئی ہے۔ پورا سفرنامہ ایک شش جہتی (Six Diamensional) فلم کی طرح قاری کو اپنے احاطے میں لے لیتا ہے۔ یہ اسلوب قلمی منظر کشی اور ٹیلی ویژن کیمرے کی عکس نگاری سے زیادہ دلچسپ اور دل کو چھو لینے والا ہے۔ پورے مناسک وارکان، درود وسلام، مناجات اور دعائیں، ہلکی پھلکی تاریخ اور عرب کا جغرافیہ، غرض کہ حاجی کی ضرورت کی ہر وہ چیز اس سفرنامے میں در آئی ہے جو ''یاد کرو ہجے اور معنی'' طرز کی سیکڑوں کتابیں پڑھنے کے بعد بھی حاصل نہ ہوں گی۔ یوں محسوس ہوتا ہے گویا قاری مصنف کی انگلی تھامے ایک معصوم بچے کی طرح مناسک حج ادا کر رہا ہے، غیر محسوس طریقے پر حاجی اپنی ناکارگی، گنہ گاری اور شاملتِ نفس کے استحضار اور اللہ کے بے استحقاق عطا کا مراقبہ کرتا ہے۔

آج کل کے مسافرانِ حرم اور حج نامہ نگار تنقید کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان کی آواز صدا بصحرا سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ حکومت کے ایوانوں میں برق بن کر برستے اور رعد بن کر گرجتے تھے۔ انھیں سلطان جابر کے سامنے کلمہ حق بلند کرنے کا بھی شرف حاصل ہے۔ مولاناؒ نے عالم اسلام کی قیادت اور رہنمائی کا فریضہ ہر آڑے وقت میں انجام دیا ہے۔ انھیں بیک وقت مسلم اور غیر مسلم قوموں کا اعتماد حاصل تھا۔ دنیا کی شاید ہی کوئی یونیورسٹی ہو جہاں آپ کی کتب داخل نصاب نہ ہوں۔ اور پھر یہ کہ یہ ان کا واحد سفر نامہ بھی نہیں ہے۔ دس کے قریب سفر نامے مولانا کے سیال قلم سے نکل چکے ہیں، شرق اوسط کی ڈائری، دریائے کابل سے دریائے یرموک تک، شرق اوسط میں کیا دیکھا؟ مغرب اقصیٰ مراقش میں دو ہفتے، ان میں سے چند ایک نہایت معروف سفر نامے ہیں۔ بعض مقامات پر ان سفر ناموں میں مولانا نے کھل کر تنقید کی ہے اور بے لاگ تبصرہ کیا ہے۔ تنقید کے مواقع زیرِ تبصرہ سفر نامے ''اپنے گھر سے بیت اللہ تک'' میں بے شمار تھے۔ لیکن مصنفؒ نے تنقید سے احتراز کیا ہے اور جہاں تنقید بھی کی ہے وہاں لہجہ ایک مخلص مصلح اور مربی کا ہے۔

مصنفؒ نے جس زمانے میں یہ مقدس سفر کیا تھا اس وقت کی عمارات اور حرم شریف کا نقشہ آج بھی لفظوں میں اس سفر نامے کے ذریعے محفوظ ہو گیا ہے۔ کوئی اور مصنف ہوتا تو مارے تنقید کے حاجیوں اور پورے نظامِ حرم کے بخیے ادھیڑ دیتا۔ مسعیٰ کا ذکر ملاحظہ فرمائیں:

> ''ملتزم سے ہم زمزم پر آئے۔ پہلی مرتبہ آسودہ ہو کر زمزم شریف پیا۔ اس کے اصلی مقام پر پیا۔ پھر باب الصفاء سے نکل کر ہم سعی کے لئے مسعیٰ آئے۔ ہمیشہ سے یہ تصور تھا کہ صفا اور مروہ دو پہاڑ ہیں، ان کے درمیان غیر آباد سا راستہ ہوگا۔ طول طویل۔ اس پر لوگ دوڑتے

ہوں گے۔ یہاں کچھ اور ہی نظر آیا۔ پہاڑ کھد کر اس سے بڑی بڑی عمارتیں بن گئی تھیں۔ پختہ سڑک کے کنارے ایک ذرا سی بلندی تھی۔ چند سیڑھیوں کا ایک زینہ تھا۔ اس پر چڑھ کر سعی کی اور کہا:

أبدأ بما بدأ الله به إن الصفا و المروة من شعائر الله

(جس چیز کو اللہ نے مقدم رکھا ہے اس کو میں بھی مقدم رکھتا ہوں۔ بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں) بیت اللہ کی طرف منہ کر کے ہاتھ اٹھا کر حمد و ثنا، تکبیر و تہلیل کی ..... دعا کی ..... پھر اترے اور مروہ کی طرف چلے ..... ادھر مروہ کی طرف جانے والوں اور مروہ سے صفا کی طرف آنے والوں کے قافلے قطار اندر قطار ملتے رہے، کبھی جاوی پاس سے گزر جاتے۔ کبھی مصری چھیلتے ہوئے نکل جاتے، کبھی مراکشی و جزائری سامنے سے آتے نظر آتے۔ کبھی ترکی و بخاری راستے میں ساتھ ہو جاتے، کبھی تکرونی و سوڈانی قدم بڑھا کے آگے ہو جاتے۔ ہر ایک احرام میں ملبوس، ننگے سر و ننگے پاؤں، عاشقانہ حال، مستانہ چال، دنیا سے بے خبر، اپنی دھن میں مست، دونوں طرف پر رونق دوکانیں، مسعیٰ کا بازار اپنے پورے شباب پر اور بہار پر۔ موٹر کاریں ہارن بجاتی ہوئی اور آدمیوں کو بچاتی ہوئی نکلتی رہتی ہیں۔ دوکانوں پر سودے بک رہے ہیں۔ شربت کے گلاس کے دور چل رہے ہیں۔ صرافوں کی دوکانوں پر روپیہ گننے اور سکوں کے گرنے کی آواز کانوں میں آرہی ہے۔ لیکن عشاق کا مجمع سر جھکائے نظریں بچائے اپنی دھن میں چلا جا رہا ہے۔ عشق کی پوری تصویر، دنیا میں مومن رہنے کی مکمل

تفسیر، خلوت در انجمن کا پورا منظر۔ دنیا کے بازار میں چلتی پھرتی مسجدیں اور گونجتی ہوئی اذانیں، سعی کیا ہے؟ مومن کی پوری زندگی ۔بھرے بازار، پھولوں سے لدے گلزار میں رہنا اور دل نہ لگانا۔ مقصد کو پیش نظر رکھنا، مبداء اور منتہیٰ کو نہ بھولنا، اپنے کام سے کام رکھنا۔ صفا سے چل کر نہ مروہ کو فراموش کرنا نہ مروہ سے چل کر صفا کو بھول جانا۔ کہیں نہ اٹکنا۔ کہیں نہ الجھنا۔ پیہم گردش، مسلسل عمل۔ مسعی میں دونوں طرف دوکانوں کے ہونے اور سعی کے اس محل وقوع نے سعی میں ایک خاص معنویت اور لطف پیدا کر دیا ہے۔"

ساحلِ جدہ پر اترنے کا منظر آپ دیکھ چکے ہیں۔ جدہ کا یہ حصہ بھی دیکھ لیجئے:

"جدہ کوئی مقدس مقام نہیں۔ نہ یہاں بیت اللہ نہ مسجد نبوی، نہ یہ حرم ابراہیمؑ نہ حرم رسولؐ۔ لیکن محبت کا آئین نرالا ہے۔ اس کو کیا کیجئے کہ جدہ کی گلیوں سے بھی انس و محبت معلوم ہوتی ہے، غریب الدیار مسافر کو یہاں پہنچ کر بوئے اُنس آئی۔ برسوں کی محبت نے اپنی پیاس بجھائی۔ محبت..... فلسفہ اور قانون سے آزاد ہے۔ یہاں کے قلی اور مزدور، سیاہ فام سوڈانی اور پیرہن دریدہ بدو بھی دل کو اچھے لگتے ہیں۔ یہاں کے دوکانداروں، خوانچہ فروشوں کی صدائیں، معصوم بچیوں اور بچوں کی گیتیں۔ جن میں وہ حجاج سے سوال کرتے ہیں۔ دل میں اترتی چلی جاتی ہیں۔ محبت عقل کی فرصت ہی نہیں دیتی اور اچھا ہے کہ اس کو کچھ دن فرصت نہ دے ؎

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

جب جدہ سے عقیدت کا یہ حال ہے تو دیار حبیبؐ پر حاضری کی کیا کیفیت ہوگی:

"نظر اٹھا کر دیکھئے۔ یہ دونوں پہاڑوں کی قطاریں ہیں۔ کیا عجب ہے کہ ناقۂ نبویؐ اسی راستے سے گزری ہو۔ یہ فضا کی دلکشی، یہ ہوا کی دلآویزی اسی وجہ سے ہے۔ لیجئے مسجد آ گئی۔ اب بئر علی (ذوالحلیفہ) کی باری

منزل دوست چوں شود نزدیک
آتش شوق تیز تر گردد

درود شریف زبان پر جاری ہے۔ دل وفورِ شوق سے امنڈ رہا ہے۔ عرب ڈرائیور حیران ہے کہ یہ عجمی کیا پڑھتا ہے اور کیوں روتا ہے؟ کبھی عربی میں گنگناتا ہے۔ کبھی دوسری زبانوں میں شعر پڑھتا ہے۔

بھینی بھینی ہوا ہے اور ہلکی ہلکی چاندنی۔ جس قدر طیبہ قریب ہوتا جا رہا ہے ہوا کی خنکی، پانی کی شیرینی اور ٹھنڈک، لیکن دل کی گرمی بڑھتی جا رہی ہے۔ سنئے کہہ رہا ہے۔

باد صبا جو آج بہت مشکبار ہے
شاید ہوا کے رخ پہ کھلی زلفِ یار ہے

داغِ غلامیت کر درتبۂ خسرو بلند
میرِ ولایت شود بندہ کہ سلطان خرید

میں نے عرض کیا تھا نا کہ پورا سفرنامہ ایک شش جہتی فلم بندی کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ اس بیچ میں مصنف نے اپنی قلبی کیفیت کو الفاظ کا جامہ پہنانے کیلئے عربی، فارسی اور اردو کے بیش بہا اشعار کا سہارا لیا ہے۔ آگے چلئے:

''صبح ہوئی۔نماز پڑھی۔موٹر روانہ ہوئی۔کیا جہاں سر کے بل آنا چاہئے تھا وہاں موٹر پر سوار ہو کر جائیں گے؟ بات کرتے کرتے بیئر عروہ آ گیا۔بسم اللہ اتریئے،وہ دیکھئے جبل احد نظر آ رہا ہے۔وہ سواد مدینہ کے درخت نظر آئے۔کیا یہ وہی درخت ہیں جن کے متعلق شہیدی مرحوم نے کہا تھا

تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھیں
قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقید کا

وہ گنبد نظر آیا۔دل کو سنبھالیے اور قدم اٹھائیے۔''

پورا سفرنامہ صرف وفورِ شوق اور جذبات کی آفاقی کیفیت میں ہی گم نہیں بلکہ بعض ارضی حقائق کی نشاندہی ایک ماہر نباض کی حیثیت سے کرتا ہے مدینے کا یہ حصہ دیکھئے:

''ہم نے دین و دنیا کی خیرات یہیں سے پائی۔آدمیت یہیں سے سیکھی۔یہاں کی دستگیری نہ ہوتی تو ہم میں سے کتنے معاذ اللہ بت خانہ،آتش کدہ اور کلیسا میں ہوتے۔لیکن ہم نے اس کا کیا حق ادا کیا۔فاصلے کا عذر صحیح نہیں۔ان کے بزرگوں نے سمندر اور صحرا عبور کر کے اور پہاڑوں کو طے کر کے دین کا پیغام ہم تک پہنچایا ہم نے بھی اپنے فرض کا احساس کبھی کیا؟''

آج کی نہایت اعلیٰ درجے کی خوشحالی سے پہلے حجازِ مقدس کی تعلیمی اور معاشی کیفیت پر مشتمل سفرنامے کا یہ حصہ پڑھنے اور عمل کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔کیونکہ ریالات کی فراوانی کے باوجود بعض بنیادی کمزوریاں آج بھی وہاں کی مدنی زندگی میں پائی جاتی ہیں۔

مدینہ منورہ کی حاضری کے بعد مکہ مکرمہ کی حاضری ہے۔ایک حاجی نہ مدینے

سے رخصت ہونا چاہتا ہے نہ مکہ چھوڑنا چاہتا ہے۔اس عجیب کیفیت سے ہر عاشق حرم کو سابقہ پڑتا ہے۔مصنف نے دل پر پتھر رکھ کر لیکن نہایت چابکدستی سے اس کیفیت کو محو کرنے کی کوشش کی ہے۔ملاحظہ فرمائیں:

"آخری سلام عرض کیا۔مسجد نبویؐ پر حسرت کی نگاہ ڈالی اور باہر نکلے غسل کر کے احرام کی تیاری کر لی تھی۔ذوالحلیفہ میں جانے کا موقع ملے نہ ملے۔موٹر پر بیٹھے۔محبوب شہر پر محبت کی نگاہ ڈالتے چلے۔احد کو ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔اب مدینہ سے باہر ہو گئے۔جو لمحہ گزرتا ہے،مدینہ دور اور مکہ قریب ہوتا جاتا ہے۔الحمد للہ کہ حرمین کے درمیان ہی ہیں ع

صد شکر کہ ہستیم میانِ دو کریم"

چلئے مصنف کے ساتھ مکہ سے قریب موٹر میں سوار ہوتے ہیں:

"جدہ آیا اور گزر گیا۔اب شہنشاہِ ذوالجلال کا شہر اور اس کا گھر قریب ہے۔باادب!ہوشیار!!مدینہ اگر مرکز جمال تھا تو یہ مرکز جلال ہے۔مدینہ کے در و دیوار سے اگر محبوبیت ٹپکتی ہے تو یہاں کے در و دیوار سے عاشقی نمایاں ہے۔یہاں عاشقانہ آنے کی ضرورت ہے۔برہنہ سر،کفن بردوش،پریشان حال،یہی یہاں کے آداب میں سے ہے۔نظر اٹھایئے مکہ سامنے نظر آرہا ہے۔

اے اللہ!مجھے اپنے شہر میں ٹھکانا عطا فرما اور مجھے اس میں رزقِ حلال نصیب فرما۔"

یاد رہے کہ یہ سفرنامہ حضرت مولاناؒ کو بیت اللہ شریف کی کنجیاں عطا ہونے سے پہلے کا لکھا ہوا ہے۔کنجیاں عطا ہونے پر حضرت مولاناؒ کی کیا قلبی کیفیات ہوئی؟اس کا ذکر

اپنے آپ میں ایک روحانی کیف سموئے ہوئے ہے۔لیکن اس سے بھی زیادہ پُر کیف اور پُر مسرت وہ لمحات ہیں جن کا ذکر حضرتؒ اکثر اپنی نجی مجلسوں میں تعدد و تکرار کے ساتھ سنایا کرتے تھے۔اس ذکر میں حضرت فرمایا کرتے تھے کہ وہ ہماری زندگی کا سب سے مبارک اور خوش نصیب دن تھا۔جب کہ ہمارے لئے خصوصی طور پر بیت اللہ شریف کا دروازہ کھولا گیا۔

اس واقعے کی تفصیلات بتاتے ہوئے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ:

''ایک مرتبہ ہمیں خصوصی طور پر بیت اللہ شریف میں حاضری کے لئے شیبی صاحب نے مدعو کیا۔ہم اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ بیت اللہ شریف میں داخل ہوئے۔وہاں مطاف میں ہمارے جاننے والے کئی افراد موجود تھے۔باوجود خواہش کے ہم سبھوں کو اندر نہ لے جاسکے۔شام میں کئی افراد ہماری قیام گاہ پر آئے اور شاکی ہوئے کہ میاں! ہم تمہیں آواز دیتے رہے لیکن آپ نے خیال نہ کیا۔بعد میں ہمیں احساس ہوا کہ ان لوگوں کے لئے بھی کچھ کرنا چاہئے۔چنانچہ دوسرے روز ہم نے ذمہ داروں سے بات کی۔انھوں نے حامی بھر لی۔چنانچہ دوسرے روز ہم بیت اللہ شریف کے دروازے پر کھڑے تھے اور مطاف میں موجود حجاج کرام کے اژدہام میں ہم جس کی طرف اشارہ کرتے اسے محافظ اندر پہنچا دیتا۔''

پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی ندوی

مولانا علی میاں ندویؒ کی

سیرت نگاری میں قرآنی استناد

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کو اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت حسین وجمیل اور اعلیٰ صفت سے نوازا تھا۔ وہ اپنی تقریر وتحریر کو قرآنی آیات سے آراستہ وپیراستہ کرنے کا گر جانتے تھے۔ موقع ومحل کی مناسبت سے اپنی بات اور اپنے بیان اور استدلال کو مستند کرنا بھی ایک فن ہے اور فرمان الٰہی سے اس کے پیچھے پشتہ لگانا اس سے برتر فن ہے۔ موزوں ترین آیات کریمہ وہ اپنے بیان ونگارش میں اس طرح پیوست وچسپاں کرتے تھے جیسے انگوٹھی میں نگینہ ہوتا ہے۔ ان کی بات تو مدلل ومستند بنتی ہی تھی آیات قرآنی کے معانی ومفاہیم کے نئے جہاں اور تازہ جہات اہل بینش کی نگاہوں کے سامنے آتی تھیں۔ اہل دانش کو روح قرآن اور باطن کلام ربانی سے آگاہی ملتی تھی۔ اور مجموعی طور سے فکر وعلم، نظر وفہم اور دانش وبینش کا ایک جہان رنگ وبو سامعین وقارئین کو اپنی گرفت میں لے لیتا تھا۔

سیرت نبوی کے بیان ونگارش میں بھی مولانائے موصوف نے اپنی قرآن فہمی کے قدم قدم پر ہزار ہا چراغ جلائے ہیں۔ اصولی طور پر اہل سیر وفکر قرآن کریم کے سر چشمۂ صافی سے استدلال واستناد کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن عمل ذرا کم کرتے ہیں۔ بہت

سے سیرت نگاروں نے قرآنی آیات کو اپنی کتب سیرت کے مختلف ابواب میں استعمال کیا ہے مگر ایسا خال خال ہے۔ بعض محققین فن نے زیادہ تر واقعاتِ سیرت کے بیان کے بعد ان سے متعلقہ آیات کریمہ ایک ذیلی وضمنی مبحث میں سمودی ہیں۔ درمیان بحث اگر سخن گسترانہ بات آپڑی ہے تو آیت متعلقہ سے تعرض کر کے کلام تمام کر دیا ہے۔ مولانا ندویؒ کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ موقع ومحل سے متعلق وابستہ آیات کریمہ کو بیان کرتے ہی ہیں، اپنے بیانیہ میں جابجا موزوں ومناسب آیات الٰہی سجاتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی دونوں کتب سیرت۔ ''سیرة خاتم النبیین، السیرة النبویة'' اس کی شاہد عدل ہیں۔

حضرت محمد بن عبد اللہ ہاشمی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ سے قبل عالم انسانیت جس فکری، دینی، اخلاقی، سماجی اور سیاسی تاریکی، افراتفری اور انتشار سے گذر رہا تھا۔ اس کو کہیں مفصل اور کہیں مختصراً بیان کر کے مجموعی تجزیہ کا عنوان آیت قرآنی کا ایک جملہ: '' ظهر الفساد فی البر والبحر '' پر رکھا ہے اور بحث کا خاتمہ پوری آیت کریمہ نقل کر کے کیا ہے:

ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس
لیذیقهم بعض الذی عملوا لعلهم یرجعون

(سورہ روم: ۴۱)

آیت کریمہ کو سرنامہ اور خاتمہ پر نقل کر کے اس وقت کی صورتحال کو اس کے اسباب کو اور اس کے مآل کو پوری طرح واضح کر دیا ہے (خاتم النبیین ۱۲، السیرہ النبویة ۴۲) عرب میں صنم پرستی کے ضمن میں سورہ نوح:

وقالوا لا تذرن آلهتکم ولا تذرن ودّا ولا سواعا ولا
یغوث ویعوق ونسرا'' (سورۂ نوح: ۲۳)

کو نقل کیا ہے کہ بقول حافظ ابن کثیر ایسا ''اکابر پرستی'' کی بنا پر ہوا تھا (السیرة۔ ۹۷)

حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی عرب میں بعثت کے عوامل واسباب سے بحث کرتے ہوئے کعبہ مشرفہ کی مکہ مکرمہ میں موجودگی کو ایک عامل ربانی بتایا اور سورۃ آل عمران۔ ۹۶ کو خوب برجستہ بیان کیا ہے۔

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکة مبارکا وھدی للعالمین

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سعیدہ دعائے ابراہیمی کے جواب وقبول میں ہوئی تھی۔ مولانا نے سورہ بقرہ ۱۲۹ سے اس موقعۂ نگارش کو آراستہ کیا جن میں سے آخری آیت کریمہ یہ ہے۔

ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم آیاتك ویعلمھم الکتاب والحکمة ویزکیھم، انك انت العزیز الحکیم۔

(خاتم النبیین ۴۱، ۷۱، السیرۃ النبویۃ ۱۲۹۔ اول الذکر میں تین آیات اور موخر الذکر میں صرف آخری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید کے لفظاً ومعناً نازل ہونے کی حقیقت کو دو آیات قرآنی سے مستند فرماتے ہیں:

وما ینطق عن الھویٰ، ان ھو الا وحی یوحیٰ۔

(سورہ نجم ۴۔۳)

لا یاتیه الباطل من بین یدیه ولا من خلفه تنزیل من حکیم حمید (سورہ فصلت ۴۲۔ السیرۃ ۳۵)

اور اسی طرح عرب میں بعثت محمدی علی صاحبہا الصلوۃ والتسلیم کی حکمت الٰہی کی تفصیل میں ایک اور آیت کریمہ سے استدلال کرتے ہیں:

الله اعلم حیث یجعل رسالته (انعام ۲۴، السیرۃ ۵۵)

نبی آخر الزماں کی بعثت کی ضرورت کو اسی سورہ کی ایک اور آیت کریمہ سے مستند کرتے ہیں:

او من کان میتا فا حییناہ و جعلنا لہ نورا یمشی بہ
فی الناس کمن مثلہ فی الظلمات لیس بخارج منھا
(انعام ۲۲)

اور عربوں پر بعثت محمدی کی صورت میں نعمت الٰہی کے فیضان کی دلیل سورہ آل عمران ۱۰۳ سے فراہم کرتے ہیں:

واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم اعداء فألف بین
قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا و کنتم علی شفا
حفرۃ من النار فانقذکم منھا۔ (السیرۃ ۵۹)

جبکہ مقصد بعثت محمدی کی وضاحت میں سورہ البینہ کی دو آیات کریمہ ۲۔۱ کو نقل کر کے اپنی بات مکمل فرماتے ہیں:

لم یکن الذین کفروا من اھل الکتاب والمشرکین
منفکین حتی تاتیھم البینۃ رسول من اللہ یتلوا
صحفا مطھرۃ ،فیھا کتب قیمۃ (السیرۃ ۶۱)

جزیرۃ العرب کی قدیم نبوتوں، نبیوں اور آسمانی مذہبوں سے قریبی تعلق کی وضاحت کے لئے آیت قرآنی کا سہارا لیتے ہیں:

واذکر اخا عاد اذ أنذر قومہ بالاحقاف وقد خلت
النذر من بین یدیہ ومن خلفہ الا تعبدوا الا اللہ انی
اخاف علیکم عذاب یوم عظیم

(سورۃ الاحقاف ۲۱)

وقد خلت النذر من بين يديه ومن خلفه

(سورۃ الاحقاف ۲۱)(السیرۃ ۷۰۔۶۹)

اسی بحث میں حضرت ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام، ان کی سکونت مکہ مکرمہ، تعمیر کعبہ مشرفہ، دعائے ابراہیمی کا ذکر کرتے ہوئے سورۃ بقرہ کی آیات کریمہ ۲۹۔۱۲۷ سے استدلال کرتے ہیں۔(خاتم ۱۷۔۱۴ السیرۃ ۷۲) واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسمٰعیل .....انك انت العزیز الحکیم"۔مزید ثبوت ومکرر استناد سورہ ابراہیم کی آیات کریمہ ۳۷۔۳۵ سے لاتے ہیں جو معنی ومفہوم میں سورہ بقرہ کی مذکورہ بالا آیات قرآنی کی تائید وتصدیق کرتی ہیں: واذقال ابراھیم رب اجعل ھذاالبلد آمنا.....لعلھم یشکرون'' (السیرۃ ۷۳) جبکہ واقعہ فیل کی تائید وتصدیق کے لئے پوری سورۃ الفیل نقل کرتے ہیں: (خاتم ۲۶۔۲۵)(السیرۃ ۸۱) مکہ مکرمہ کو قرآن مجید اور عربی ادب میں ام القریٰ کا لقب بکۃ سے موسوم کیا ہے۔مولانائے محترم اس کی تاریخ کو بعثت محمدی سے جوڑتے ہوئے آیات قرآنی سے ثبوت فراہم کرتے ہیں:

وکذلك اوحینا الیك قرآنا عربیا لتنذر ام القریٰ ومن حولھا وتنذر یوم الجمع لاریب فیه فریق فی الجنة وفریق فی السعیر　(الشوریٰ:۷)

والتین والزیتون وطور سینین وھذاالبلد الامین

(سورہ التین ۳۔۱)

لا اقسم بھذا البلد وانت حل بھذا البلد

(سورۃ البلد ۲۔۱)(السیرۃ ۸۴)

مکہ مکرمہ کو ام القریٰ یا سورہ زخرف ۳۱" وقالو لو لا نزل ھذاالقران علی رجل من القریتین عظیم" میں قریہ کہنا بلد ہونے کے منافی نہیں (ایضاً: حاشیہ ۳)

مکہ مکرمہ کی تجارتی سرگرمیوں میں خواتین قریش وعرب کے کردار کی سند بھی قرآن مجید کی ایک آیت سے فراہم کرتے ہیں:

للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن (سورۃ النساء ۳۲ (السیرۃ ۹۱)

جبکہ قریش کے ''امی'' ہونے کی سند: ھو الذی بعث فی الأمیین رسولا منھم ..... سے پکڑی ہے (السیرۃ ۹۴) اور عمومی تجارت قریش اور اس کی بنا پر قریشی معاشی خوشحالی کو سورۂ ایلاف کی آیت ۴۔۳ سے ثابت کیا ہے۔ (السیرۃ ۹۵)

قرآن مجید سے مکہ مکرمہ کے تجارتی، اخلاقی، دینی پس منظر بیان کرنے کے بعد بعثت محمدی کا اس سے مزید تعلق سورہ یٰسین ۶ سے یوں قائم کرتے ہیں:

لتذر قوما ما انذر آباؤھم فھم غافلون۔ (السیرۃ ۹۸)

بحیرا راہب کی کہانی کی تغلیط کرتے ہوئے ایران وروم کی ساسانی اور بازنطینی سلطنتوں کی سیاسی آویزش اور روم کی ایران کے ہاتھوں شکست اور مستقبل قریب میں رومی فتح کی پیشگوئی کے باب میں مولانا مرحوم سورۃ الروم کی آیات کریمہ (۷۔۱) نقل فرماتے ہیں:

الم ° غلبت الروم ° فی أدنی الأرض وھم من بعد غلبھم سیغلبون فی بضع سنین .....وھم عن الآخرۃ ھم غافلون ° (السیرۃ: ۱۰۶)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی بے چینی، موجودہ حالات پر پریشانی اور ان کے تدارک کے ضمن میں مؤلف گرامی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ آپ کو کتاب ونبوت کا ذرا بھی علم نہ تھا، اور نہ یہ امید کہ نبوت ورسالت سے سرفرازی ہونے والی ہے۔ اس بنیادی حقیقت کو سورۂ شوریٰ ۵۲ کو مستند فرماتے ہیں:

وکذلك اوحینا الیك روحا من امرنا ما کنت تدری
ما الکتاب ولا الایمان ولکن جعلناه نورا نهدی به
من نشاء من عبادنا وانك لتهدی الی صراط مستقیم

اس آیت کریمہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امیت کا بھی ذکر ہے۔
اس حقیقت ابدی کو بعض دوسری آیاتِ قرآنی سے مزید مستند و مدلل فرماتے ہیں:

وما کنت ترجوا ان یلقی الیك الکتاب الا رحمة من
ربك فلا تکونن ظهیراً للکافرین (القصص:۸۶، السیرۃ:۱۱۴)
وما کنت تتلوا من قبله من کتاب ولا تخطه بیمینك
اذا لارتاب المبطلون (العنکبوت:۴۸)
الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونه
مکتوبا عندهم فی التوراة والانجیل
(اعراف:۱۵۷، خاتم:۴۰، السیرۃ:۱۱۴)

عام اہل سیر کی مانند مولانا موصوف بھی بعثت محمدی کو سورہ اقراء کی ابتدائی پانچ آیات کریمہ کی غار حرا میں جبریل علیہ السلام کے ذریعہ تنزیل کے مترادف مانتے ہیں اور رسالت و نبوت کا نقطۂ آغاز بھی، اور اسی معنی و مفہوم میں وہ ان آیات کریمہ کو نقل کرتے ہیں:

اقرأ باسم ربك الذی خلق خلق الانسان من علق اقرأ وربك
الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم (خاتم ۴۴، السیرۃ ۱۱۶)

تبلیغ و رسالت کے علانیہ دور سے متعلق امر الٰہی کے متعلق عام سیرت نگاروں کی طرح سورہ حجر ۴" فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشرکین" اور سورۃ الشعراء ۱۵-۲۱۴: "وانذر عشیرتك الاقربین واخفض جناحك لمن

اتبعك من المومنين " نقل کر کے ایک مزید آیت کریمہ سورۃ الحجر ۸۹ کا اضافہ بھی کرتے ہیں: وقل انی انا النذیر المبین (رسول اکرم ۳۵ صرف اولین دو خاتم ۵۲، السیر ۃ ۱۲۰) اگر چہ ان آیات کریمہ کو کوہ صفا پر دعوت نبوی کے علانیہ اظہار کی سرخی کے ماتحت کر دیا ہے۔ جبکہ نبوی دعوت کے حکیمانہ انداز کی حقیقت کو سورۃ سبا کی آیت کریمہ ۶۴ کو تھوڑے سے تصرف سے یوں نقل کیا ہے: فانی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید سورۃ مدثر کی اولین آیت کو مولانا نے قریشی تعذیب ومحاربہ کے پس منظر میں نقل کیا ہے۔ (خاتم ۶۴، السیر ۃ ۱۲۷)

قریشی تعذیب کے پس منظر میں مولانا نے سورۃ غافر ۲۸: " تقتلون رجلاان یقول ربی الله وقد جاء کم البنیات " اس واقعہ سے متعلق نقل کی ہے جس کے مطابق عقبہ بن ابی معیط اموی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بحالت نماز گلا گھونٹنے کی مذموم کوشش کی تھی۔ اور حضرت ابوبکر صدیق نے آپ کو بچایا اور آیت کریمہ پڑھی تھی۔ (رسول اکرم ۴۰)

قریش کو دعوت اسلامی دینے اور ان کی طرف سے دشمنی کرنے، بحث ومباحثہ کرنے کے پس منظر میں مکہ مکرمہ کے ایک عظیم ترین سردار عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکالمہ کا مفصل ذکر آتا ہے مولانا مرحوم نے اپنی دونوں کتابوں میں سورۃ فصلت کی اولین آیات کریمہ کی تلاوت نبوی کا حوالہ دیا ہے جبکہ اردو کتاب میں حم سجدہ ۵۔ نقل کی ہیں (رسول اکرم ۴۴۔۴۳)

حم ۔ تنزیل من الرحمن الرحیم ۔ کتاب فصلت آیاته
قرآنا عربیا لقوم یعقلون ۔ بشیرا ونذیرا فاعرض اکثر
هم فهم لا یسمعون ۔ وقالو اقلوبنا فی أکنة مما
تدعوننا الیه الخ"

طائف کے سفر نبوی، اس کے دوران تبلیغ وارشاد نبوی، قوم ثقیف کی دنیاوی وجاہت، ان کی پرغرور زندگی اور فساد فی الارض وغیرہ کے سلسلے میں معتدد آیات کریمہ نقل فرماتے ہیں جیسے قرآن کریم کی تنزیل کے باب میں دونوں ''قریوں'' کے ''رجل عظیم'' پر تنزیل قرآن کے باب میں ثقفی استہزاء: وقالوا لولا نزل هذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم (سورہ زخرف ۳۱) اور ان کی پر اسراف اور باعث فساد زندگی کے بارے میں سورہ سبا ۳۵۔۳۴ نقل کرتے ہیں: وما ارسلنا فی قریة من نذیر الا قال مترفوها انا بما ارسلتم به کافرون، وقالوا نحن اکثر اموالا و اولادا وما نحن بمعذبین (السیرۃ ۴۳۔۱۴۲) سورہ زخرف کی مذکورہ بالا آیت کریمہ کو دوبارہ مزید تصدیق وتائید کے لئے بھی نقل فرماتے ہیں۔ (السیرۃ ۱۴۶)

اسراء ومعراج حیات نبوی اور دین اسلام کے دو اہم ترین ابواب ہیں۔ ان کے بیان میں پوشیدہ معانی اسرار ورموز کے بیان میں سورہ اسراء وسورہ النجم کا عمومی حوالہ دینے کے علاوہ سورہ نجم کی آیت کریمہ ۱۸۔۱۷ کو باقاعدہ نقل فرماتے ہیں کہ کوئی فریب نظر کا معاملہ نہیں تھا بلکہ ایک حقیقت امر تھی جس کی شہادت خود اللہ تعالیٰ دیتا ہے: مازاغ البصر وما طغی لقد رای من آیات ربه الکبری (خاتم ۱۱۰، السیرۃ ۴۹۔۱۴۸) مدینہ منورہ کے انصار کرام کے قبول اسلام، اس کے اخلاص اور اس کے عوامل سے بحث کرتے ہوئے سورۂ حشر: ۹ بیان کرتے ہیں:

والذین تبووا الدار والایمان من قبلهم یحبون من
هاجر الیهم ولا یجدون فی صدورهم حاجة مما
اوتوا، ویوثرون علی انفسم ولو کان بهم خصاصة

اور اسی کے ساتھ سورۃ یٰسین ۶ کو مزید تائید کے لئے دہراتے ہیں۔ (السیرۃ ۵۵۔۱۵۴) اور یہود مدینہ سے اوس وخزرج کے نبی آخر الزمان کی تشریف آوری کی بابت روایات

سننے کے سلسلہ میں سورہ بقرہ ۸۹ نقل کرتے ہیں:

ولما جاء هم كتاب من عندالله مصدق لما معهم ،
وكانوا من قبل يستفتحون على الذين كفروا فلما
جاء هم ماعرفوا كفروا به فلعنة الله على الكافرين

(السیرۃ ۱۵۶-۱۵۵)

ہجرت مدینہ حیات نبوی کا ایک تکمیلی باب، اسلام دین کا تشریعی مرحلہ اور اسلامی تہذیب وتمدن کا تشکیلی دور ہے۔ حضرت مولانا نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کی ہجرت مدینہ اور اس کے پس منظر تشکیلی کے تعلق سے کئی آیات قرآنی نقل کی ہیں۔ ان میں سے اولین آیت سورہ انعام ۳۳ ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم ذات سے اہل مکہ کے تعلق عقیدت ومحبت اور اسلام سے ان کی مخالفت کے تضاد کو واضح کرتی ہے: قد نعلم انه ليحزنك الذى يقولون فانهم لا يكذبونك ولكن الظالمين بآيات الله يجحدون عمومی اذن ہجرت سے متعلق سورہ عنکبوت ۵۶ بیان کی ہے: "يا عبادى الذين آمنوا ان أرضى واسعة فاياى فاعبدون غارثور کے دہانے پر مکڑی کے جالے، کبوتروں کے گھونسلے وغیرہ کے معجزات کے ضمن میں سورہ فتح کی ۴ آیت کریمہ سے استناد کیا ہے۔ ولله جنود السمٰوٰت والارض اور غارثور میں عام انسانی پریشانی کے ضمن میں سورہ توبہ: ۴۰ نقل کی ہے: فانزل الله سكينته عليه وايده بجنود لم تروها جب کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا غم واندوہ دور کرنے کے ضمن میں اسی آیت کریمہ کا بقیہ حصہ نقل کیا ہے: ثاني اثنين اذهما فى الغار اذيقول لصاحبه لاتحزن ان الله معنا (خاتم ۱۴-۱۱۳ السیرۃ ۷۵-۱۶۷)

اور ہجرت مدینہ کو نبوی فتح مبین کا دیباچہ قرار دیتے ہوئے سورہ توبہ ۳۳ سے

استشہاد کیا ہے: ھو الذی ارسل رسوله بالھدیٰ و دین الحق لیظھره علی الدین کله ولو کره المشرکون (السیر ۱۶۸)

مدینہ منورہ کے معاشرتی حالات کی تصویر کشی کرتے ہوئے مولانا مرحوم نے یہود قبائل کی باہمی عداوت و دشمنی کو قرآن مجید کی سورہ بقرہ ۸۵-۸۴ سے مستند و مدلل کیا ہے: واذ اخذنا میثاقکم لا تسفکون دمائکم ولا تخرجون انفسکم من دیارکم ثم اقررتم وانتم تشھدون ثم انتم ھولاء تقتلون انفسکم.....وھو محرم علیکم اخراجھم (السیر ۱۷۳) منافقین و یہود مدینہ کی ایک اخلاقی اور ذہنی کجی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسی سورہ کی آیت کریمہ ۱۰۴ نقل کی ہے: یاایھا الذین آمنو لا تقولوا راعنا وقولوا انظرنا واسمعوا وللکافرین عذاب الیم (السیر ۱۷۵)

مدینہ منورہ کو متعدد بستیوں کا مجموعہ دو قرآنی آیات کریمہ کی بناء پر قرار دیا ہے۔ ماافاء الله رسوله من اھل القریٰ (سورہ حشر ۷) لایقاتلونکم جمیعا الافی قری محصنة اومن وراء جدر (سورہ حشر ۱۴) (السیر ۱۸۳) مدنی عرب قبائل اوس وخزرج کے مذہبی عقائد و اعمال کی بحث میں ان کی بعض کج فہمیوں اور غلط رویوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے صفاء و مروہ کے طواف کی مزعومہ عدم مشروعیت کا خیال بھی تھا جس کا قرآن مجید کی سورہ بقرہ ۱۵۸ کے ذریعہ استشہاد کیا ہے: ان الصفا والمروه من شعائر الله فمن حج البیت اواعتمر فلا جناح علیه ان یطوف بھما (السیر ۱۸۴) جب کہ ان دونوں قبیلوں کی باہمی عداوت کے بفضل الٰہی مودت و محبت میں بدل جانے کی حقیقت کے لئے سورہ انفال ۶۳-۶۲ نقل کی ہیں: ھو الذی ایدك بنصره وبالمومنین والف بین قلوبھم لو انفقت ما فی الارض جمیعا ما الفت بین قلوبھم ولکن الله الف بینھم انه عزیز حکیم (السیر ۱۹۱)

مدینہ منورہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اہم ترین اقدام اس سمت میں اوس وخزرج کے انصار کرام اور مکہ مکرمہ وغیرہ کے مہاجرین عظام کے درمیان مواخاۃ کا تھا۔اس کی عدم موجودگی یا فقدان کے نقصان کے لئے سورہ انفال ۷۳ کا ایک حصہ خوب استعمال فرمایا ہے:الا تفعلوہ تکن فتنة فی الارض وفساد کبیر (السیرہ ۲۰۰) جبکہ سورہ انفال ۷۲:ان الذین آمنوا وھاجروا وجاھدوا بأموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ والذین آووا و نصروا اولئك بعضھم اولیاء بعض نقل کی ہے اور مہاجرین کو انصار کرام کی اعانت کی منسوخی کے حوالے سے انفال ۷۵:واولوا الارحام بعضھم اولیٰ ببعض "بیان کی ہے مگر وہ عربی کتب میں موجود نہیں ہے (رسول اکرم ۱۱۹) اسی طرح انصار کرام کے ایثار ومحبت کے لئے سورہ حشر:۹"ویوثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصة"نقل کی ہے (۱۲۲)

اس جماعیت کو اکھاڑ پھینکنے کی مشرکانہ سازش اور کافرانہ غلبہ کا ذکر سورہ انفال ۲۶ کے ذریعہ سے کیا ہے:واذکروا اذانتم قلیل مستضعفون فی الارض تخافون ان یتخطفکم الناس.....(السیرۃ ۲۰۲)

جب کہ گھر کا بھیدی منافقین کے ظہور وحرکات پر سورۂ حج ۱۱:ومن الناس من یعبد اللہ علی حرف،فإن اصابته خیر اطمأن به وان اصابته فتنة انقلب علی وجھه، خسر الدنیا والاخرہ،ذلك ھو الخسران المبین -اور سورہ نساء ۱۴۳ سے واضح فرمایا ہے کہ وہ اپنے فکر وعمل میں تذبذب کا شکار تھے۔مذبذبین بین ذلك لا الی ھؤلاء ولا الی ھولاء (السیرہ ۳۔۲۰۲)

یہود مدینہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بجا طور سے امید تھی کہ وہ آپ کی اور آپ کے پیغام کی تائید کریں گے کہ دونوں ایک سرچشمہ ایمان ورسالت سے مستفیض تھے:کل آمن باللہ وملائکته وکتبه ورسله لا نفرق بین احد

منهم (سورہ بقرہ ۱۸۵) لیکن ان کے حسد وطغیان نے بعثت نبوی اور رسالت محمدی کو نہ ماننے پر اس طرح ابھارا کہ قرآن مجید نے اس کی مذمت کی: الم تر الی الذین اوتوا نصیبا من الکتاب یؤمنون بالجبت والطاغوت ویقولون للذین کفروا ھؤلاء اھدی من الذین آمنوا سبیلا (سورہ النساء ۵۱) (السیر ۴۰۲ اور ۸۰۲)

کعبہ مشرفہ کو قبلہ بنانے کی حقیقت بیان کرنے کے لئے مولانا مرحوم نے سورہ بقرہ ۱۴۳ نقل کی ہے: وکذلك جعلناکم امة وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا وما جعلنا القبلة التی کنت علیھا الا لنعلم من یتبع الرسول ممن ینقلب علی عقبیه وان کانت لکبیرة الا علی الذین ھدی الله (خاتم ۹۲۱-۹۲۰، السیر ۸۰۲)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور امت مسلمہ کو جہاد کے اذن الٰہی سے مشرف کئے جانے کی حقیقت عام اہل سیر کی مانند سورہ حج ۳۹ نقل کر کے ظاہر کی ہے: اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان الله علی نصرھم لقدیر (خاتم ۱۳۱، السیر ۲۰۹) اس اذن الٰہی کے بعد سلسلہ غزوات وسرایا شروع ہوا اور پہلا مال غنیمت سریہ نخلہ میں ملا جس کے باب میں سورہ بقرہ ۲۱۷ کا نزول ہوا اور اس نے مخالفین کے بہت سے اعتراضات اور مسلمانوں کے شکوک دور کردئے: یسألونك عن الشھر الحرام قتال فیه قل قتال فیه کبیر، وصد عن سبیل الله وکفر به والمسجد الحرام واخراج اھله منه اکبر عند الله، والفتنة اکبر من القتل..... (السیر ۲۱۱)

اس بحث کے آخر میں فرضیت صیام رمضان کے حوالے سے مولانا مرحوم نے سورہ بقرہ ۱۸۳: یاایھا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون اور سورہ بقرہ ۱۸۵: شھر رمضان الذی انزل فیه القرآن ھدی للناس وبینات من الھدی والفرقان، فمن شھد منکم الشھر

فلیصمه (خاتم ۳۳۔۱۳۲ السیر ۱۳۰۔۲۱۲)

غزوہ بدر سے متعلق قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں متعدد آیات کریمہ ملتی ہیں۔ مولانا ندویؒ نے ان میں سے متعدد، مختلف احوال وظروف اور حقائق کے ضمن میں نقل کی ہین جیسے اسے یوم الفرقان قرار دینے کے لئے سورہ انفال ۴۱: ان کنتم آمنتم باللہ وما انزلنا علی عبدنا یوم الفرقان یوم التقی الجمعان (السیر ۲۱۵) میدان بدر میں پانی کی کمی دور کرنے کے لئے بارش کی نعمت الٰہی ارزانی ہونے پر سورہ انفال ۱۱: وینزل علیکم من السماء ماء لیطھرکم به ویذھب عنکم رجز الشیطان ولیربط علی قلوبکم ویثبت به الاقدام (خاتم ۴۲۔۱۴۱، السیر ۲۱۹، رسول اکرم ۱۲۸) صرف جناب الٰہی سے نصرت وامداد عطا ہونے کی حقیقت کے لئے سورہ انفال ۱۰: وما النصر الا من عند اللہ (السیرہ ۲۲۱) قریشی اور مسلم مبارزوں کے یقین کے سورہ حج ۱۹ بطور عنوان: ھذان خصمان اختصموا فی ربھم (خاتم ۱۴۴، السیر ۲۲۲) ایک متن میں سورہ آل عمران ۱۲: ''لقد کان لکم آیة فی فئتین التقتافئة تقاتل فی سبیل اللہ واخری کافرة'' غزوہ بدر کے فرائض کے لئے (رسول اکرم ۱۳۱) مسلم فوج کی امداد ملائکہ، ثبات قدمی اور کافر لشکر کی مرعوبیت وزخم کاری کے لئے سورہ انفال ۱۲ کی آیت کریمہ نقل کی ہے:

''اذیوحی ربك الی الملائکة انی معکم فثبتوا الذین آمنوا سالقیفی قلوب الذین کفروا الرعب فاضربوا فوق الاعناق واضربوا منھم کل بنان''

اور بدر کی فتح مبین میں نصرت الٰہی کے کردار کے لئے سورۂ آل عمران: ۱۲۳ بیان کی ہے۔ ولقد نصرکم اللہ ببدر وانتم اذلة فاتقوا اللہ لعلکم تشکرون

(خاتم ۱۴۹، السیر ۲۴۰۔۲۲۳)

اسی طرح غزوہ احد کے باب میں مولانا علی میاںؒ نے کئی آیات کریمہ سے مختلف مراحل غزوہ میں استشہاد کیا ہے۔ تیراندازوں کے دستہ کی غلطی کی بنا پر مسلمانوں کو سخت جانی نقصان اور فوجی گردش کا سامنا ہوا۔ مؤلف گرامی نے اس حادثۂ فاجعہ کے لئے سورۂ آل عمران ۱۵۲ نقل کی ہے:

ولقد صدقکم الله وعده إذتحسونهم بإذنه حتى
إذافشلتم وتنازعتم فى الامروعصيتم من بعد ماأراكم
ماتحبون،منكم من يريد الدنياومنكم من يريد
الآخرة،ثم صرفكم عنهم ليبتليكم،ولقد عفاعنكم
والله ذوفضل على المومنينْ (خاتم ۱۶۳ السیر ۳۵۔۱۳۴)

جنگ احد کی پہلی گردش کے بعد مسلمانوں نے پلٹ کر حملہ کیا' اپنے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کی اور تعاقب کر کے دشمن کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ سورہ آل عمران ۷۵۔۱۷۲ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ الٰہی پایا جاتا ہے:

الذين استجابو الله والرسول من بعد ماأصابهم
القرح للذين احسنوا منهم واتقوا اجرعظيم ° الذين
قال لهم الناس ان الناس قد جمعوالكم فاخشوهم
فزادهم ايمانا.....فلاتخافوهم وخافونى ان كنتم
مومنين"

مولانا موصوف نے وہ تینوں آیات کریمہ نقل کر کے اپنی بات مستند بنادی ہے (السیر ۱۴۱) اسی شکست وفتح میں مسلمانوں کی تربیت وتعلیم کا راز الٰہی مستور تھا جسے مولف گرامی نے سورۂ آل عمران ۱۵۳ کے حوالے سے واضح کیا ہے: فأثابكم غما بغم لكيلا تحزنوا على مافاتكم ولا ماأصابكم والله خبير بما

تعملون "(السیرۃ ۲۴۱) نہ صرف حیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں بلکہ آپ کی وفات کے بعد بھی مسلم تربیت کا یہی راز سربستہ تھا جسے سورۂ کریمہ کی اگلی آیت کریمہ ۱۴۴ میں بیان کیا گیا ہے: وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم.....الخ (السیرۃ: ۲۴۲)

مولانا علی میاںؒ نے اس کے بعد غزوہ بنی النضیر کے باب میں سورۂ حشر ۲ سے استناد کیا ہے: هو الذی اخرج الذین کفروا من اهل الکتاب من دیارهم لأ دل الحشر ماظننتم ان یخرجوا وظنوا انهم ما نعتهم حصونهم من الله فاتاهم الله من حیث لم یحتسبوا وقذف فی قلوبهم الرعب یخربون بیوتهم بایدیهم وایدی المومنین فاعتبروا یااولی الأبصار اور پھر اسی کے ضمن میں اللہ کی کارسازی سے متعلق آیت کریمہ کا ایک فقرہ نقل کیا ہے وکفی الله المومنین القتال (احزاب ۲۵) جو کہ ایک اصول وقاعدہ الٰہی ہے (السیرۃ ۲۴۵)

غزوہ خندق یا احزاب کے مبحث میں حضرت مولانا نے کئی آیات کریمہ مختلف مواقع کے تعلق سے بیان کی ہیں۔ احزاب کے ''ٹڈی دل'' حملے کی سختی، اور مسلم ابتلا کی شدت بیان کرنے کے لئے سورۃ احزاب ۱۱۔۱۰ کا سہارا لیا ہے جس سے بڑھ کر صحیح تصویر کشی نہیں ہوسکتی: ''اذجاء وکم من فوقکم ومن اسفل منکم واذزاغت الابصار وبلغت القلوب الحناجر وتظنون بالله الظنونا هنالك ابتلی المومنون وزلزلوا زلزالا شدیدا (السیرۃ ۲۴۷) (رسول اکرم ۱۸۱)' (خاتم ۱۸۴ میں صرف آیت کریمہ ۱۱ ہے)۔ آیت کریمہ ۱۰ کا اولین حصہ ''اذجاء وکم من فوقکم ومن اسفل منکم'' کو بطور سرخی بھی استعمال کیا ہے (خاتم ۱۹۰' السیرۃ ۲۵۲)۔ اسی طرح سورہ فتح ۷ کے ایک فقرہ یا جملہ کو ولله جنود السموت والارض' کو پھر بطور سرخی استعمال کیا ہے جب کہ منافقین کی حیلہ سازی کہ ہمارے گھر خالی ہیں کے تعلق سے سورہ

احزاب ۱۳:"ان بیوتنا عورۃ وماھی بعورۃ ان یریدون الافرارا "نقل کی ہے (خاتم ۱۹۶۔ السیرۃ ۲۵۴۔ رسول اکرم ۱۸۲ موخر الذکر میں سورہ احزاب ۲۲)" المومنون الاحزاب قالوا ھذا ماوعدنا اللہ ورسولہ ومازادھم الاایمانا وتسلیما" بھی نقل کیا ہے۔ لشکر احزاب کے حملہ آور ہونے پر جنود الٰہی سے امداد کرنے اور کافروں کے خائب وخاسر واپس جانے کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت وفضل سے تعبیر کیا ہے۔ مولانا نے سورہ احزاب کی دو آیات کریمہ ۹ اور ۲۵ اس موقعہ پر نقل کی ہیں: یاایھا الذین آمنوا اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جائتکم جنود فارسلنا علیھم ریحاً وجنوداً لم تروھا وکان اللہ بما تعملون بصیرا وردالله الذین کفروا بغیظھم لم ینالوا خیرا وکفی اللہ المومنین القتال وکان اللہ قویا عزیزا (خاتم ۲۰۱۔۱۰۰) (السیرۃ ۲۵۶) (رسول اکرم ۸۹۔۱۸۸ نیز ۱۹۰)

سورہ احزاب ۱۰ کے اولین حصہ:"اذجاء وکم من فوقکم ومن اسفل منکم" سے مولانا مرحوم نے غزوہ بنی قریظہ کے عقبی حملہ کے خطرہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو کہ ایک نئی توجیہ اور اچھوتا استدلال ہے (خاتم ۲۰۴، السیرۃ ۲۶۰) حضرت ابولبابہؓ نے پرانے تعلقات کی خاطر بنوقریظہ کو ان کے انجام سے باخبر کردیا تھا، راز نبوی فاش کرنے پر ان کو ندامت ہوئی تو اپنے آپ کو ستون مسجد سے باندھ لیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی تو سورہ توبہ ۱۰۲ سے مولانا نے اس پر استشہاد کیا: وآخرون اعترفوا بذنوبھم خلطوا عملا صالحا وآخر سیئا عسی اللہ ان یتوب علیھم ان اللہ غفور رحیم (السیرۃ ۲۶۲)

غزوہ بنی المصطلق کے دوران بلکہ اس کی واپسی کے سفر میں واقعۂ افک پیش آیا۔ مولانا موصوف نے اس ضمن میں سورہ نور ۱۵ کا حوالہ اپنے ایک حاشیہ میں آیت کریمہ نقل کرنے کے بعد کیا ہے: اذتلقونہ بالسنتکم، وتقولون بافواھکم

ما لیس لکم به علم و تحسبونه هینا و هو عندالله عظیم جب کہ واقعہ افک سے اولین آیات کریمہ آگے متن میں نقل کی ہیں:

ان الذین جاء وا بالافك عصبة منكم لا تحسبوه شرالكم بل هو خير لكم،لكل امرى منهم ما اكتسب من الاثم والذى تولى كبره منهم عذاب عظيم لولا اذسمعتموه ظن المومنون والمومنات بانفسهم خيراوقالوا هذاافك مبين

(سورہ نور ۱۲-۱۱)(السیرۃ ۱۷۲)

صلح حدیبیہ کے ''غزوہ'' کے دوران بیعت الرضوان ہوئی جس کے لئے مولانا نے سورہ فتح:۱۸ سے استشہاد کیا ہے:لقدرضى الله عن المؤمنين اذيبايعونك تحت الشجرة فعلم ما فى قلوبهم فانزل السكينة عليهم واثابهم فتحاقريبا " (خاتم ۲۱۵'السیرۃ ۲۷۶ رسول اکرم ۵-۲۰۴) صلح حدیبیہ کو فتح مبین ثابت کرنے کے لئے اسی سورہ کی اولین تین آیات کریمہ سے گواہی لی ہے انا فتحنا لك فتحا مبينا ليغفرلك الله ما تقدم من ذنبك وما تاخر ويتم نعمته عليك ويهديك صراطامستقيما ٭ وينصرك الله نصراعزيزا ٭ (خاتم ۲۲۲'السیرۃ ۸۰-۲۷۹ رسول اکرم ۲۱۰) جب کہ سورہ بقرہ ۲۱۶ کے ایک حصہ کو بطور سرخی استعمال کیا ہے پھر پوری آیت کریمہ اس صلح میں مضمر خیر دکھانے کیلئے پیش کردی ہے:وعسى ان تكرهواشيئا وهو خيرلكم وعسى ان تحبواشيئاوهوشرلكم والله يعلم وانتم لا تعلمون (خاتم ۲۵-۲۲۳'السیرۃ ۸۱-۲۸۰)

سورہ فتح ۲۴:هو الذى كف ايديهم عنكم وايديكم عنهم ببطن

مکة بعد ان اظفرکم علیهم" کو ایک قریشی دستہ کی سرکوبی سے متعلق نقل کیا ہے (رسول اکرم ۵-۲۰۳) مسلم عورتوں کی مکہ واپسی سے متعلق شق صلح حدیبیہ کی منسوخی کے ضمن میں مولانا گرامی نے سورہ ممتحنہ ۱۰: یاایها الذین آمنوا اذجاء کم المومنات مهاجرات فامتحنوهن، الله اعلم بایمانهن فان علمتوهن مومنات فلاترجعوهن الی الکفار..... بعصم الکوافر پیش کی ہے (رسول اکرم ۱۲-۲۱۱)

شاہان عالم وسلاطین عرب میں ایرانی کسریٰ اور رومی قیصر کے نام فرامین نبوی میں مذکور آیت کریمہ بھی مولانا نے نقل کی ہے اور اس کی حکمت بیان کی ہے: "یااهل الکتب تعالوا الی کلمة سواء بیننا و بینکم الا نعبد الاالله ولانشرك به شیئا ولایتخذ بعضنا اربابامن دون الله فان تولوا فقولوا اشهدوا بانامسلمون" (السیرۃ ۲۹۰، رسول اکرم ۲۱۵)

غزوہ خیبر اور اس میں حاصل ہونے والے غنائم کو مولانا موصوف صلح حدیبیہ کا انعام قرار دیتے ہیں اور سورۂ فتح: ۱۹-۱۸ سے جو بیعت رضوان سے متعلق ہیں استشہاد کرتے ہیں کہ اس کے آخر میں مغانم کثیرہ کا تذکرہ پایا جاتا ہے: "لقد رضی الله عن المومنین اذیبایعونك تحت الشجرة فعلم مافی قلوبهم فانزل السکینة علیهم واثابهم فتحا قریبا ومغانم کثیرة یاخذونه وکان الله عزیزاحکیما" (خاتم ۲۳۳، السیرۃ ۳۱۱، رسول اکرم ۲۳۳)

عمرۃ القضاء سے متعلق سورہ فتح ۲۷ کا بیان ملتا ہے: لقد صدق الله رسوله الرؤیابالحق لتدخلن المسجد الحرام ان شاء الله آمنین محلقین رؤسکم ومقصرین لا تخافون فعلم مالم تعلموا فجعل من دون ذلك فتحا قریبا" (خاتم ۴۷-۲۴۶، السیرۃ ۳۲۱)

اس کے بعد مولانا موصوف نے فتح مکہ کے باب میں بعض آیات کریمہ نقل

کی ہیں اوران سے استشہاد کیا ہے: پہلی آیات کریمہ نخوت جاہلیت کے خاتمہ اور اسلامی مساوات کے نفاذ کے تعلق سے نقل کی ہے:

یاایھاالناس انا خلقناکم من ذکروانثی وجعلناکم شعوباوقبائل لتعارفواان اکرمکم عنداللہ اتقاکم،ان اللہ علیم خبیر (سورہ حجرات ۱۳،السیر ۃ ۳۴۰)

قریش کی عام معافی کے لئے سورہ یوسف ۹۲ کا ایک فقرہ لاتثریب علیکم الیوم (خاتم ۲۴-۲۶۳،السیر ۃ ۳۴۱) جب کہ رسول اکرم ۲۴۸ میں سورہ یوسف ۹۱ اور ۹۲ دونوں موجود ہیں)

فتح مکہ کے اثر کے لئے سورہ نصر کی اولین دو آیات (خاتم ۲۸۱،السیر ۃ ۳۴۵) اصنام کعبہ کی بربادی کے تعلق سے سورہ اسراء ۸۱ اور سورہ سبا ۴۹ (خاتم ۲۷۲) نقل کی ہیں۔

غزوہ حنین کے باب میں مولانائے موصوف نے ایک درخت کو "ذات انواط" بنانے کی درخواست پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تردید شرک میں اعراف ۱۳۸ کی تلاوت: اجعل لنا الھا کمالھم آلھۃ.....انکم قوم تجھلون کا حوالہ دیا ہے (السیر ۃ ۳۴۹) اور سورہ توبہ ۲۶-۲۵ معرکہ حنین کے مراحل وشدائد کے بارے میں نقل کی ہیں:

لقد نصرکم اللہ فی مواطن کثیرۃ ویوم حنین اذأعجبتکم کثرتکم فلم تغن عنکم شیئاوضاقت علیکم الارض بمارحبت ثم ولیتم مدبرین ثم انزل اللہ سکینتہ علی رسولہ وعلی المومنین وانزل جنودالم تروھا وعذب الذین کفروا وذالک جزاء الکافرین ° (خاتم ۲۸۷،السیر ۳۵۱،رسول اکرم ۲۶۴)

حیات نبوی کے آخری غزوہ، تبوک کے تعلق سے حضرت مولانا نے متعدد آیات کریمہ سے استشہاد کیا ہے۔ غزوہ تبوک میں مضمر حکمت الٰہی کے لئے سورہ توبہ:۱۲۳ بیان کی ہے: یاایھا الذین آمنوا قاتلوا الذین یلونکم من الکفار ولیجدوا فیکم غلظة واعلموا ان الله مع المتقین ۝ (السیرہ ۳۶۳) اور اسی ضمن میں اسی سورۃ کی آیت کریمہ: ۱۲۰ بھی ہے: ولا یطاؤن موطئا یغیظ الکفار ولا ینالون من عدو نیلا الا کتب لھم به عمل صالح (السیرۃ ۳۶۴) منافقین کے قابل مذمت رویہ کے لئے پھر سورہ توبہ ہی کی آیت کریمہ ۸۱ نقل کی ہے: فرح المخلفون بمقعدھم خلاف رسول الله وکرھوا ان یجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل الله وقالوا لاتنفروا فی الحر قل نار جھنم اشد حرا لو کانوا یفقھون ۝ (خاتم ۳۰۱، السیرہ ۳۶۵) جب کہ غریب مگر مشتاق وآرزومند مجاہدین کی غزوہ میں شرکت سے بسبب زادِراہ کی کمی اور ان کے حزن وملال کے لئے سورہ توبہ ۹۲ بیان کی ہے: ولا علی الذین اذا ما اتوك لتحملھم قلت لا اجد ما احملکم علیه تولوا واعینھم تفیض من الدمع حزنا ألا یجدوا ما ینفقون ۝ (السیرہ ۳۶۶)

اس غزوہ سے متعلق آخری آیت کریمہ سورہ توبہ ۱۸-۱۱۷ ہیں جو تین مخلص مگر پہلوتہی کرنے والے صحابہ کی توبہ کی قبولیت کے باب میں ہیں: "لقد تاب الله علی النبی والمھاجرین والانصار الذین اتبعوا فی ساعة العسرة من بعد ما کاد یزیغ قلوب فریق منھم ثم تاب علیھم انه بھم رؤف رحیم ۝ وعلی الثلاثة الذین خلفوا حتی ضاقت علیھم الارض بما رحبت وضاقت علیھم انفسھم وظنوا أن لا ملجا من الله الا الیه ثم تاب علیھم لیتوبوا ان الله ھو االتواب الرحیم ۝ (خاتم ۳۰۶، السیرۃ ۳۷۲)

غزوہ تبوک کے آخر میں مسجد ضرار سے متعلق سورہ توبہ کی آیات کریمہ: والذین

اتخذو امسجداضرارا..... یحب المطھرینْ نقل کی ہے۔(رسول اکرم ۲۹۰)

مولانا مرحوم نے ''غزوات پر ایک نظر'' کے عنوان سے ایک تحلیلی بحث کی ہے اس میں اسلامی فلسفہ جہاد کے تعلق سے دو آیات کریمہ: والفتنة اشد من القتل (سورہ بقرہ ۱۹۱) اور لکم فی القصاص حیوٰۃ یا اولی الالبابْ (سورہ بقرہ ۱۷۹) نقل کر کے ان سے استدلال کیا ہے۔(السیر ۳۷۳)

وفود عرب کے باب میں وفد ثقیف سے کلام نبوی کے باب میں ربوا کے حرام ہونے کا مسئلہ آیا اور شراب نوشی کی بات نکلی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلمنے ان دونوں کو حرام قرار دیا اور متعلقہ آیات کریمہ پڑھیں، ربوا کے متعلق سورہ بقرہ ۲۷۸ ہے:"یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ و ذروا مابقی من الربوا ان کنتم مؤمنین جب کہ شراب نوشی کے تعلق سے سورہ مائدہ ۹۰ ہے: یاایھا الذین آمنوا انما الخمر والمیسر والازلام رجس من عمل الشیطین فاجتنبوہ لعلکم تفلحونْ (السیر ۸۳-۸۲ اکرم ۹۶-۲۹۵) جب کہ زنا کی حرمت کے لئے سورہ بنی اسرئیل ۴: لا تقربوا الزنیٰ انہ کان فاحشة و ساء سبیلا ْ نقل کی ہے (رسول اکرم ۲۹۵) اور وفد بنو اسد کے ضمن میں سورہ حجرات ۱۷: یمنون علیك ان اسلموا (رسول اکرم ۳۱۱) وفود نجران کے بیان میں عیسائی ارکان کے لئے سورہ آل عمران ۶۴ کو بطور استشہاد پیش کیا ہے جو بالعموم آیت مباہلہ'' کہلاتی ہیں ان مثل عیسی عنداللہ کمثل آدم.....ثم نبتھل فنجعل لعنة اللہ علی الکاذبین ْ (رسول اکرم ۳۲۱) جب کہ یہودی دعوے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے کی تردید میں آل عمران ۷: قل یااھل الکتاب لم تحاجون فی ابراھیم..... اور عیسائی دعوے کی تردید میں آل عمران ۷۹: ما کان لبشر ان یوتیہ اللہ الکتاب والحکم والنبوة ثم یقول للناس کونوا عبادالی من دون اللہ ولکن کونوا ربانیین.....

(رسول اکرم ۲۷-۳۲۵) حجۃ الوداع کے تعلق سے اولین آیت کریمہ سورہ مائدہ ۳ ہے: جس میں تکمیل دین کی الٰہی خوشخبری دی گئی ہے: "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا..... (خاتم ۳۱۹، السیر ۳۸۹، رسول اکرم ۲۳۹) رسول اکرم میں عنوان حجۃ الوداع کے عین نیچے سورے نصر نقل کی ہے اور اس کے مضمر معانی بیان کئے ہیں (۳۳۰) اور صفا و مروہ اور مقام ابراہیم سے متعلق سورہ بقرہ ۱۲۵، ۱۵۸: واتخذوا من مقام ابراھیم مصلی اور ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ نقل کی ہیں اور قیام عرفات کے تعلق سے سورہ بقرہ ۱۹۹: ثم افیضوا من حیث افاض الناس بیان کی ھے۔ (رسول اکرم ۲۳۳ اور ۲۳۵)

سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والتسلیم کا آخری باب وفات نبوی ہے، دین کے اوج کمال پر پہنچنے کے تعلق سے مولانا نے سورہ مائدہ ۳ کو دہرایا ہے اور پھر سورہ حجر ۹ نقل کر کے قرآن کو اساس دین میں ثابت کیا ہے: "انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون" (السیر ۳۹۳، خاتم میں صرف سورہ مائدہ ۳) اور امت مسلمہ کو ان دونوں کا حامل محافظ قرار دیتے ہوئے سورہ آل عمران ۱۱۱ سے استشہاد کیا ہے: "کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر تؤمنون باللہ (السیر ۳۹۳) جب کہ سورہ نصر کے حوالے سے تمام ادیان پر اسلام کے غلبہ کی حقیقت بیان کی ہے، (خاتم ۳۲۵، السیر ۳۹۴) سورہ آل عمران ۲۴۴ کے حوالے سے حادثہ وفات کے وقوع ہونے کی بات کہی ہے: وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل، افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم ومن ینقلب علی عقبیہ فلن یضر اللہ شیئا وسیجزی اللہ الشاکرین" (السیر ۳۹۴) جب کہ رسول اکرم میں وفات کا باب سورہ زمر ۳۰: انک میت وانھم میتون" سے بحث کا آغاز کیا ہے۔ (۳۵۰)

مولانا مرحوم نے سورۂ مائدہ ۳ کے حوالے سے ایک بات یہ بھی کہی ہے کہ

اس کے نزول کے بعد صحابہ کرم کو آپ کی وفات کا اندازہ ہو گیا تھا، (السیرہ ۳۹۵) اپنے مرض الوفاۃ میں رسول کرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو دعا دیتے ہوئے ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس میں ان کو کبر وغرور سے بچنے کی ہدایت فرماتے ہوئے سورہ قصص ۸۳ اور سورہ زمر ۶۰ کی تلاوت بھی فرمائی تھی، وہ بالترتیب یہ ہیں: "تلك الدار الآخرة نجعلها للذين لا يريدون علوا في الارض ولا فسادا والعاقبة للمتقين اور اليس في جهنم مثوى للمتكبرين" (خاتم ۲۹-۳۲۸) صحابہ کرام کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی شدید محبت وعقیدت تھی اس لئے آپ کی وفات ان پر انتہائی شاق گذری، مولانا رحمہ اللہ نے اس باب میں سورہ توبہ ۱۲۸ سے استشہاد کیا ہے: لقد جاء كم رسول من انفسكم عزيز عليه ما عنتم حريص عليك بالمومنين رؤف رحيم" (خاتم ۳۴۰، السیرہ ۴۰۴) عام اہل سیر کی مانند مولانا نے بھی وفات نبوی پر صحابہ کرام کے حزن وملال اور اندوہ دور کرنے کے لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے خطبہ کا متن دیا ہے جس میں سورہ آل عمران ۱۴۴ ایک بار پھر نقل کی گئی ہے۔ (السیرہ ۔۴۰۵)

ازواج مطہرات کے محرمات اور مسلمانوں کی مائیں ہونے کی حقیقت ظاہر کرتے ہوئے سورہ احزاب ۵۳ نقل کی ہے: وما كان لكم ان تؤذوا رسول الله والا ان تنكحوا ازواجه من بعده ابدا ان ذلكم كان عند الله عظيما (السیرہ ۔۴۱) تعدد ازوج کی بحث میں ازواج مطہرات کے زہد وورع کو ثابت کیا ہے اور سورہ احزاب ۲۹-۲۸ بیان کی ہیں: يا ايها النبي قل لأزواجك ان كنتن ترون الحياة الدنيا وزينتها فتعالين امتعكن واسرحكن سراحا جميلا وان كنتن تردن الله ورسوله والدار الآخرة فان الله اعد للمحسنات منكن اجرا عظيما" (السیرہ ۔۴۱۲)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ اخلاق کے بیان میں سورہ قلم ۴ سے

استشہاد کیا ہے: وانك لعلى خلق عظيم (السیرۃ ۴۳۸) جبکہ انسانیت پر بعثت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے فضل واحسان کے باب میں آپ کے رحمۃ للعالمین ہونے کی حقیقت قرآن مجید کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے دو آیت کریمہ نقل کی ہیں: وما ارسلناك الا رحمة للعالمين (انبیاء ۱۰۷) اور انا نحن نزلنا الذكر وانا له لحافظون (حجر۔۹) (السیرہ۔۴۵۳-۴۶۶) انسانی جمعیت کو محبت ومودت سے ہمکنار کرنے کی حقیقت ونعمت کے اظہار کے لئے آل عمران: ۱۰۳ کو پھر دہرایا ہے۔ (السیرہ ۴۶۲) اور سورۂ آل عمران: ۱۰۳ کا حوالہ بھی دیا ہے: وكنتم على شفا حفرة من النار فانقذكم منها (السیرہ ۴۶۴-۴۶۳) جب کہ معبودان باطل کی بے بسی کے تعلق سے سورہ حج ۷۳ نقل کی ہے: وان يسلبهم الذباب شيئا لا يستنقذوه منه ضعف الطالب والمطلوب (السیرۃ۔۴۶۸)

ایک رب کی مخلوق ہونے کی حیثیت سے تمام انسانوں کی مساوات کے نظریہ کی تائید کے لئے سورہ نساء: ۱، اور سورہ حجرات ۱۳ نقل کی ہیں: يا ايها الناس اتقوا ربكم الذى خلقكم من نفس واحدة وخلق منها زوجها وبث منهما رجالا كثيرا ونساء واتقوا الله الذى تسائلون به والأرحام ان الله كان عليكم رقيبا يا ايها الناس انا خلقناكم من ذكر وانثى وجعلناكم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اكرمكم عند الله اتقكم ان الله عليم خبير" (السیرہ۔۴۷۰) اس کے علاوہ اللہ کے رب العالمین اور خالق کل ہونے کی حقیقت کا اظہار سورہ اسراء ۷۰ کے ذریعہ ظاہر کی ہے: ولقد كرمنا بنى آدم وحملناهم فى البر والبحر ورزقناهم من الطيبات وفضلناهم على كثير ممن خلقنا تفضيلا (السیرہ۔۴۷۳)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجموعی خدمات کی بحث میں مولانا گرامی نے

اسلام کے ایک اصول کو اجاگر کرنے پر زور دیا ہے کہ ہر انسان اپنے قول وعمل کے لئے ذمہ دار ہے اور دوسرا اس کے لئے جوابدہ نہیں اور اسکے لئے سورہ نجم ۴۰-۳۸، سے استدلال کیا ہے۔"الا تزروازرۃوزراخرای وان لیس للانسا ن الاماسعی وان سعیه سوف یری ثم یجزاہ الجزاء الاوفی" (السیر ہ۔۴۷۵)۔اسی ضمن میں انسان کے توبہ کرنے کو ایک عظیم صفت بتا کر سورہ زمر ۵۳ نقل کی ہے":قل یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسهم لا تقنطوا من رحمة الله ان الله یغفرالذنوب جمیعاانه هو الغفورالرحیم اور سورہ توبہ ۱۱۲ کو توبہ کرنیوالوں کا طرۂ امتیاز بتایا ہے۔:"التائبون العبدون الحامدون السائحون الراکعون الساجدون الأمرون بالمعروف والناهون عن المنکر والحافظون لحدود الله وبشرالمومنین (السیر ہ۔۴۷۵-۴۷۷)اسی کے ساتھ سورہ توبہ ۱۸-۱۱۷ کا دوبارہ تعلق جوڑا ہے جو تائبین غزوہ تبوک سے متعلق تھیں،اور توبہ عبد کا تعلق رحمت الٰہی سے تین آیات کریمہ کے ذریعہ قائم کیا ہے۔"ورحمتی وسعت کل شئی (اعراف ۱۵۶)"انه لایأس من روح الله الاالقوم الکافرون" (یوسف ۷۸)"ومن یقنط من رحمة ربه الاالضالون (حجر ۸۶)(السیر ہ۔۴۷۸)دین محمدی میں دین ودنیا کے جمع وامتزاج کے تعلق سے سورہ بقرہ ۲۰۱"ربنااتنافی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة وقنا عذاب النار" نقل کی ہے اور واضح کیا ہے کہ دین وحیات مومن پر غلبہ آخرت کا ہے بحوالہ سورہ انعام ۱۶۳:ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی لله رب العالمین" (السیر ہ۔۴۸۲)اور اسی انقلاب سے انسان جدید اور عالم جدید کا ظہور ہوا جس کا طرۂ امتیاز ہے وماارسلنك الا رحمة للعالمین (انبیاء ۱۰۷،السیر ہ۔۴۸۶)

مولانا ابوالحسن ندویؒ نے سیرت نگاروں کے طریقہ کے مطابق اپنی دونوں کتابوں سیرۃ خاتم النبین اور السیرۃ النبویہ۔میں مختلف مقاماتِ بحث اور مراحل سیرت

میں قرآن مجید اور اس کی متعلقہ سورتوں اور ان کی آیات کریمہ کا بھی حوالہ دیا ہے، ایسے مقامات زیادہ نہیں ہیں لیکن بہر حال ہیں، جیسے حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی مکہ میں سکونت، تعمیر کعبہ اور دعوت اسلامی کے ضمن میں مولف گرامی نے سورہ بقرہ و سورہ ابراہیم سے استفادہ کا اعتراف کیا ہے، (الیسرہ ۷۱) حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کے تعلق سے سورہ صافات ۱۰۷ کا حوالہ دیا ہے، (السیرہ ۔۷۲) سورہ اقرأ کی اولین پانچ آیات کے نزول کے بعد فترہ کا زمانہ آیا جس کے بعد قرآن مجید مسلسل نازل ہوتا رہا، (السیرہ ۔۱۱۸) سردار مکہ عتبہ بن ربیعہ عبد شمسی سے اسلام کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کا بحوالہ سورہ فصلت ذکر کیا ہے، (خاتم ۷۲؛ پ ۱۰۳) اسی طرح دوبار نجاشی میں حضرت جعفر بن ابی طالب ہاشمی کی تقریر کے بعد سورہ مریم کے تلاوت کرنے کا ذکر ہے، (خاتم ۷۹ السیرہ ۔۱۳۳؛ رسول اکرم ۵۹) یا حضرت عمر بن خطاب کے قبول اسلام کے ضمن میں سورہ طٰہٰ، قرآن کی تلاوت اور صحیفہ قرآن کا حوالہ دیا گیا ہے، (خاتم ۸۵: السیرہ ۔۳۷۔ ۱۳۶؛ رسول اکرم ۶۲) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے باب میں یہ مذکور ہوا کہ جب رات کی تاریکی میں آپ اپنے گھر سے نکلے تو سورہ یٰسین کی آیات کریمہ تلاوت فرماتے ہوئے برآمد ہوئے اور مشرکین مکہ آپ کو نہ دیکھ سکے۔ (رسول اکرم ۹۸؛ خاتم (السیرہ ۔)

تجزیاتی مطالعہ وتنقیدی جائزہ

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی سیرت نگاری کا فن ان کی انہیں دونوں عربی کتابوں میں نکھرا ہوا نظر آتا ہے، ان کی اردو کتاب سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں وہ بات نہیں ہے، وجہ یہ ہے کہ وہ ان کی ابتدائی تالیف ہے جس کا مقصد اولین تذکیر و تبلیغ تھا اور جو شاید موجودہ صورت میں مولف گرامی کے اشاعتی منصوبے میں شامل نہ تھی بہر کیف اس میں بھی کہیں قرآنی آیات کریمہ کا حوالہ ذکر اور ان سے استفادہ نظر آتا ہے۔

یہ طرفہ ماجرا ہے کہ مولانا مرحوم کا قرآنی شغف اور آیات کریمہ سے استفادہ اور

قرآنی استدلال بہت ظاہر و باہر مقامات سیرت پر ان کے قلم و ذہن کا ساتھ چھوڑ جاتا ہے یا تیر نشانہ خطا کر جاتا ہے اس کی بہت سی مثالیں ان کی کتب سیرت میں مل جاتی ہے۔

ابولہب کی مخالفت و عناد اسلام کے تعلق سے بیشتر اہل سیر و تفسیر سورہ لہب کے نزول کا حوالہ دیتے ہیں مولانا نے نہیں دیا ہے، مدینہ کی اولین مسجد قباء کی تعمیر کے حوالے سے مولانا نے عام اہل سیر کی مانند عربی کتابوں میں سورہ توبہ ۱۰۸: المسجد اسس علی التقوی من اول یوم احق ان تقوم فیه فیه رجال یحبون ان یتطهروا والله یحب المطهرین" کا ذکر خیر نہیں فرمایا جب کہ اولین اردو کتاب میں وہ موجود ہے۔ (رسول کرم ۱۰۸) غزوہ بنی النضیر کے حوالے سے سورہ صف کا حوالہ دیا ہے نہ آیات کریمہ کا کیا ہے، غزوہ ذات الرقاع میں صلاۃ الخوف کے حوالے سے متعلق آیات کریمہ کا ذکر و حوالہ مفقود ہے، تفحص و تلاش سے دوسرے مقامات بھی بتائے جا سکتے ہیں۔

یہاں یہ بہر حال اعتراف کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہر مقام کتاب اور ہر مرحلہ سیرت پر قرآن مجید کی آیات کریمہ سے استشہاد و استناد کرنا ناگزیر ہو، لیکن مولانا مرحوم جیسے صاحب فکر و نظر سے ایسی "بھول چوک" کی توجیہ و تاویل بس یہی کی جا سکتی ہے کہ توفیق الٰہی ہوتی ہے تو انسانی ذہن بڑی دور کی کوڑی لاتا ہے ورنہ سامنے کی چیز نگہ میں نہیں آتی۔

سیرت نبوی میں قرآن مجید سے استشہاد و استدلال کرنے کی بہت سی وجوہ اور متعدد صورتیں ہیں، مولانا مرحوم نے ان میں سے بیشتر معلوم و معروف وجوہ کو اپنی کتب سیرت میں برتا ہے، بہت سے مقامات و مراحل میں مؤلف گرامی قدر نے آیات کریمہ کو منفرد و ممتاز انداز سے ذکر کیا ہے جو بالعموم دوسرے سیرت نگاروں کے ہاں نظر نہیں آتا، ایسے ہی نادر و بے مثال مقامات میں مولانا کی عبقریت، قرآنی فکر کی تازگی اور موقعہ و محل کی مناسبت سے آیات کریمہ کی پیوستگی کا حسن اجاگر ہوتا ہے۔

حضرت مولانا نے متعدد مقامات پر عام اہل سیر کی مانند آیات قرآنی کو بطور

تاریخی مآخذ وسیرتی مصادر استعمال کیا ہے، جیسے علانیہ تبلیغ ودعوت کے لئے سورۂ حجر اور سورہ شعراء کی متعلقہ آیات وغیرہ یا اس سے قبل تعمیر کعبہ کے ضمن میں دعائے براہیمی سے متعلق آیات قرآنی یا اولین تنزیل قرآنی سے وابستہ سورہ اقرا کی آیات کریمہ، ایسے مقامات میں اہل سیر قدیم وجدید سے خوشہ چینی' استفادہ اور نقل اصل ہے، کتب سیرت وحدیث میں ان مقامات پر متعلقہ آیات کا بیان ملتا ہے اور تمام سیرت نگار شعوری یا غیر شعوری طور سے ان کا حوالہ دینے کا ان کا ذکر کرنے کی سعادت پاتے ہیں۔

قرآن مجید سے استشہاد واستناد کے عظیم وجلیل باب میں مولانا مرحوم کا اصل کارنامہ ان مقامات ومباحث میں نظر آتا ہے جہاں پیشر وسیرت نگاروں نے آیات قرآنی سے اکتساب فیض نہیں کیا ہے، اور مولانا مرحوم نے کیا ہے اور خوب کیا ہے، اس کا ایک خوبصورت ترین مظاہرہ بعثت نبوی سے قبل کی دنیائے انسانیت کے احوال کے باب میں ملتا ہے، جہالت وجاہلیت کے غلبہ اور خیر پر شر کی حکمرانی کے نتیجہ میں جو فساد ارضی پھیلا تھا اور جس میں سارے انسان مبتلا تھے مولانا نے اس کو سورۂ روم:۴۱ سے خوب مستند ومدلل فرمایا ہے کہ بر وبحر میں جو فساد غالب ہو گیا ہے وہ انسانی کرتوت ہے تاکہ وہ اس کا مزہ چکھیں، مکہ مکرمہ کو ام القریٰ قریہ اور بلد بتانے والی آیات کا تصادم ان کی اسی فکر قرآنی سے دور ہوا ہے، عرب جاہلی میں مردوں اور عورتوں کے اشتراک تجارت سے متعلق سورہ نساء کی آیت اکتساب کا انطباق بھی مولف علام کی فکر ونظر کا ثبوت فراہم کرتا ہے، ''امیوں'' کے لئے ''رسول امی'' کی بعثت اور ان سے متعلق آیات قرآنی کا انطباق فکر وبحث کے نئے زاویے پیش کرتا ہے۔

یہی حوالہ ہے کہ حضرت مولانا کی عربی کتاب کبیر۔السیرۃ النبویۃ۔ کے وہ ابواب ومباحث جو سیرت طیبہ کے واقعات احوال وکوائف سے بحث نہیں کرتے اور متعلقات سیرت کے خانے میں آتے ہیں مولانا کی قرآنی فکر کے اچھوتے نادر اور دل موہ

لینے والے گوشے اجاگر کرتے ہیں، ان میں العصر الجاهلی 'قبل البعثة' مكة زمن البعثة وعندظهور الاسلام' تصوير المدينة عندالهجرة، اور آخری دوابواب الاخلاق والشمائل' فضل البعثة المحمدية على الانسانية ومنحهاالعالمية الخالدة شامل وممتاز ہیں۔

ابواب ومباحث اوران کی ذیلی سرخیوں کے تعلق سے مولانا مرحوم کی فکر قرآنی کی طرف مقالہ میں اشارہ آتا رہا ہے، مولف گرامی قدر نے بعض عنادین' سرنامے اور سرخیاں یا توجوں کی توں قرآنی تعبیرات سے لی ہیں یا کسی قدر تصرف کے ساتھ ان کو قائم فرمایا ہے، ان ضمنی وذیلی عناوین نے پورے باب یا فصل وبحث کی روح کشید کر کے قاری کے سامنے پیش کردی ہے، بعثت محمدی سے قبل عالم انسانیت کی خرابی' زبوں حالی اور بربادی کا نقشہ "ظهر الفساد فی البحر والبحر" کے ایک عنوان میں پیش کردیا ہے، غزوہ بدر میں مسلم وکافر فریقین کی محاذ آرائی کے لئے "هذان خصمان اختصموا فی ربهم" سے بڑھ کر اور کوئی سرخی نہیں ہوسکتی، غار ثور میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی محافظت الٰہی کے لئے ولله جنود السموات والارض بالخصوص معجزات وکرامات واقعہ کے بس منظر میں بہترین عنوان ہے، مدینہ منورہ پر احزاب کی فوج کشی اوراس کے نتیجہ میں اہل مدینہ کی دگرگوں حالت کی عظیم الشان تصویر کشی "اذجاء وكم من فوقكم ومن اسفل منكم" کے قرآنی سرنامے کی گئی ہے اور ان کی ناکام ونامراد واپسی کے عوامل واسباب سماوی کا عنوان ایک بار پھر "ولله جنودالسموات والارض" کے قرآنی جملہ سے قائم کر کے یداللہی کی کارفرمائی کو اجاگر کیا گیا ہے، صلح حدیبیہ کی مضمرافادیت کو نہ سمجھ سکنے کے باعث عام صحابہ کرام کو جو حزن وملال ہوا تھا، اس بحث کا عنوان عسیٰ ان تكرهوا شيائوهو خير لكم" سے عمدہ اور کیا ہوسکتا ہے، غزوہ حنین کے تمہیدی بحث کے سرنامے کے

لئے "محاولة اخری لاطفاء نور الله بالافواہ پر ہے جس پر قرآنی الفاظ ومعانی کا پرتو ظاہر وباہر ہے۔

آیات قرآنی کے انتخاب، استعمال اور اطلاق کے ضمن میں مولانا مرحوم کی فکر وبینش کا ایک اور اچھوتا پہلو ملتا ہے، بالعموم اہل سیر ان آیات کریمہ کو اپنے بیانیہ میں سموتے ہیں جن کو براہ راست تعلق زیر بحث واقعات وکوائف سے ہوتا ہے، معانی ومفاہیم کی ترسیل کے لئے کبھی کبھی اصولی نوعیت کی آیات کریمہ بھی نقل کردی جاتی ہیں، بیشتر احوال میں مولفین سیرت آیات کریمہ کے شان نزول، پس منظر اور ربط کا خیال رکھتے ہیں، وہ دوسرے واقعات واحوال سے متعلق آیات کو چسپاں نہیں کرتے، زیادہ سے زیادہ ان کا حوالہ دے دیتے ہیں۔

مؤلف علام نے روایتی تعلق وربط شان نزول اور پس منظر کی محدودیت کی تنگنائے کلام سے آیات کریمہ کو نکال کر ان کو اصولی حقائق ونظریات، آفاقی بیانات، ابدی عنوانات اور سرمدی آیات بنادیا ہے وہ مثلاً یہود ومدینہ سے مسلم آویزش سے وابستہ آیات کریمہ (سورہ حشر ۷ اور سورہ حشر ۱۴) میں اھل القری "اور" قری محصنة" سے یہود کی متعدد بستیوں پر استدلال کرتے ہیں، اوس وخزرج کی دشمنی کو مودت ومحبت میں بدلنے کی نعمت الٰہی سے متعلق آیت کریمہ (سورہ انفال ۶۳-۶۲) نقل کرتے ہیں جب کہ وہ عام عربوں کی باہمی محبت ومودت سے متعلق ہے اور اس کا پس منظر غزوہ بدر کے بعد کا ہے جب کہ مولانا موصوف نے اس کا پس منظر ہجرت نبوی کے بعد دونوں قبیلوں کے درمیان محبت ومواخاۃ کو بنادیا ہے، اسی طرح سورہ انفال ۷۳ کے ایک جملے کو مواخاۃ انصار ومہاجرین پر چسپاں کرکے افادیت امن وامان اور صالح زندگی ثابت کی ہے اور مواخاۃ نہ ہونے کی صورت میں زمین میں فتنہ اور فساد کبیر ہونے کا اعلان کیا ہے جو اسلام سے پہلے مدینہ کی حالت تھی کبھی کبھی مولف گرامی قدر نے متاخر غزوات وواقعات سے متعلق

آیات کریمہ کو ماقبل غزوات وواقعات پر چسپاں کر کے اس قرآنی حقیقت کی آفاقیت اجاگر کی ہے کہ شان نزول، تاریخی پس منظر، مخصوص واقعہ سے تعلق کے باوجود اب قرآنی آیات اصولی، ابدی، سرمدی اور ہمہ گیر اطلاقیت رکھتی ہیں، یعنی ان کے ایک مخصوص معانی ومفاہیم ہیں جو ان کے تاریخی واقعات سے وابستگی کی دین ہیں، لیکن اب ایسی تمام آیات کریمہ بھی اصولی، آفاقی اور سرمدی بن گئی ہیں کہ کسی بھی وابستہ ومتعلقہ واقعہ، کیفیت وحال پر منطبق کی جاسکتی ہیں۔

علی ٹھنڈک ہو آنکھوں کی

محترمہ خیر النساء بہتر (والدہ علی میاںؒ)

علی ٹھنڈک ہو آنکھوں کی علی راحت ہو سینوں کی
ترا شیوہ کرم ہے اور میری عادت گدائی کی
نہ ٹوٹے آس اے مولا ترے در کے فقیروں کی
ترے دربار سے مایوس پھر جائیں بھلا کیونکہ
کہ تو کرتا رہا ہے خواہشیں پوری حریصوں کی
ادھر بھی ابر رحمت آئے اور جم جم کے یوں برسے
کہ ہو سرسبز کھیتی ہم غریبوں بدنصیبوں کی
خزاں میں بھی شجر سرسبز ہو کر پھول پھل لائیں
ہو شہرت باغباں کی باغ کی غنچوں کی پھولوں کی
مری اولاد کو تو یا الٰہی اتنی ہمت دے
کہ ہو کر قوت بازو خبر لیں ہم ضعیفوں کی
انہیں کے علم اور اقبال کی شہرت جہاں میں ہو
ہے شہرت جیسی عالم میں نبیؐ کے ہم نشینوں کی
ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ علیؓ میں جتنے جوہر تھے
وہی جوہر ہوں ان میں اور وہی فطرت کریموں کی
ترے دربار سے بہتر کی بھی امید بر آئے
علی ٹھنڈک ہو آنکھوں کی علی راحت ہو سینوں کی

تیری ہستی کو چراغ رہ گزر پاتا ہوں میں

حضرت شفیق جون پوری کا نذرانۂ اخلاص وعقیدت

حضرت شفیق جونپوریؒ اردو زبان کے ان شاعروں میں ہیں جنھوں نے اردو شاعری کی آبرو بڑھائی ہے، انھوں نے ۱۹۶۰ء سے پہلے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تحریروں اور تقریروں سے متاثر ہو کر اپنے تاثرات کو شعری لباس میں اس طرح پیش فرمایا تھا۔

انجمن کی انجمن کو پر خطر پاتا ہوں میں
اپنی ہی جانب حریفانہ نظر پاتا ہوں میں

ہو رہا ہے کب سے عیارانِ مغرب کا ستم
نوجوانانِ حرم کو بے خبر پاتا ہوں میں

اے مجاہد قوم تیری روشنی کیا ہو گئی
کیوں تری قندیل کو شمع سحر پاتا ہوں میں

قائدین قوم کی چشم بصیرت کیا ہوئی
دامن اسلام کو اشکوں سے تر پاتا ہوں میں

شیخ محمود الحسنؒ سا قائد امت کہاں
دل میں ابتک جس کے غم کا نیشتر پاتا ہوں میں

اب امام الوقت عبدالباری ذیشان کہاں
جن کی تصویر آج بھی زیب نظر پاتا ہوں میں

شیخ سنوسی نہ انور ہے نہ جوہر ہائے ہائے
چاند تارے ہیں نہ شمع رہ گذر پاتا ہوں میں

اے غریبوں کے مجاہد سیدی عبدالکریمؒ
اٹھ کہ تیری قوم آشفتہ سر پاتا ہوں میں

الجزائر کے شہیدوں کی ہیں نعشیں اک طرف
دیر سے قوم عرب کو نوحہ گر پاتا ہوں میں

ایک ہی خطرہ میں ہیں ایران بھی افغان بھی
قوم میں بحث ابوبکرؓ و عمرؓ پاتا ہوں میں

آرہا ہے اپنی جانب ایک ایسا زلزلہ !
جس سے خوف جنبش دیوار و در پاتا ہوں میں

اے علی ندوی غنیمت ہے تری تبلیغ آج
تجھ میں بے شک عالمی ذوق نظر پاتا ہوں میں

خاکساری تیری دیتی ہے پیام بوترابؓ
تیری دانائی میں انداز عمرؓ پاتا ہوں میں

گر نہیں سیف و علم نوک قلم سے کام لے
اے علی ندوی تجھے کچھ باخبر پاتا ہوں میں

جاگ اٹھے خوابیدگان خواب غفلت جاگ اٹھے
نعرۂ توحید میں تیرے اثر پاتا ہوں میں

سچ تو یہ ہے آج کی تاریکی الحاد میں

تیری ہستی کو چراغ رہ گذر پاتا ہوں میں
رخ نہ کر بحث بریلی ہو کہ بحث دیو بند
اس سے بالا تر تجھے اے نامور پاتا ہوں میں
آج لادینی کی دنیا میں نہ ہے تیرا وجود
شب کی تاریکی میں پیغام سحر پاتا ہوں میں
تیری تقریروں سے جاگ اٹھتا ہے مرا ذوق عشق
تجھ سے گویا کوئے سلمیٰ کی خبر پاتا ہوں میں
منزل جاناں کی جانب ہے تری پرواز شوق
تجھ میں کچھ آثار مرغ نامہ بر پاتا ہوں میں
مرد حق بیں کے تجسس میں شفیق زار کو
اک بگولے کی طرح آوارہ تر پاتا ہوں میں

ماخوذ: از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اکابر و مشاہیر امت کی نظر میں تالیف: مولانا ممشاد علی قاسمی

کشور ہندوستاں سے بوالحسن رخصت ہوا

ہر طرف تھا علم نو کا ایک شور انقلاب
کشتی اقدارِ آدم کھا رہی تھی پیچ وتاب
اور سارا عالمِ انسانیت تھا محوِ خواب
دہر میں اُگنے کو تھا تازہ صدی کا آفتاب
گلشنِ ہستی سے وہ جان چمن رخصت ہوا
کشور ہندوستاں سے بوالحسن رخصت ہوا

یعنی وہ رخصت ہوا تھا جو امیروں کا امیر
جس کے دم سے فکر و دانش کا تھا اک دریا رواں
جس کے علم و فضل کا قائل تھا ہر پیر وجواں
مختصر میں جس کو کہیے نازشِ ہندوستاں
آشنائے راہِ منزل صاحبِ کردار تھا
ملتِ اسلامیہ کا قافلہ سالار تھا

رومیؔ و اقبالؔ کے افکار کا تھا جانشیں
اس کی تحریروں میں تھی روح غزالی جاگزیں

تیمیہ اور ابن قیم کی امانت کا امیں
جس کی شخصیت کے قائل تھے سبھی علمائے دیں
واعظ وناصح، فقیہ نکتہ داں جاتا رہا
یعنی فخر کشور ہندوستاں جاتا رہا
ایک تنہا فرد لیکن علم وفن کی درس گاہ
ذات اس کی تشنگانِ علم کی آماجگاہ
نطق گویائی بنالیتی تھی شہر دل میں راہ
اس کی ہستی میں تھے یکجا مدرسہ اور خانقاہ
دردِ ملت سے پریشاں صورت بسمل بھی تھا
رونق محفل شریک شورش محفل بھی تھا
اس کی شہرت ہر طرف تھی وہ عرب ہو یا عجم
جس کے آگے ہیچ تھا شاہوں کا بھی جاہ وحشم
سینۂ گیتی میں کر کے نصب عظمت کا علم
خامشی سے وہ روانہ ہوگیا ملکِ عدم
مدتوں کرتا ہے گردش آسماں پر آفتاب
تب کہیں ہوتا ہے پیدا ایک مرد کامیاب

غم دل فگار

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی وفات حسرت آیات پر اشکہائے غم

وصف الرحمٰن واصف لطانی

آہ اے انیس سو ننانوے کیا کر دیا
جاتے جاتے چھین لی ہم سے متاع بے بہا

وہ متاع بے بہا جس کا بدل ممکن نہیں
یعنی اک رخشندہ سورج عالم اسلام کا

اس کی تابندہ شعاعیں ختم ہو کر رہ گئیں
حیف ہے وہ ماہ تاب علم وحکمت چھپ گیا

اب زیارت کیسے ہوگی اس عظیم انسان کی
وہ مفکر وہ مبلغ ، رہبرِ کامل گیا

حق پرستی کے لئے نکلا تھا جو میدان میں
آہ صد افسوس وہ دنیا سے رخصت ہو گیا

چاہتا تھا جو بڑھے انسانیت کا احترام
ہم کو اخلاق و مروت کا پیام اس نے دیا

ہندو مسلم سکھ عیسائی ہیں سبھی آپس میں ایک
یہ "پیام انسانیت" کا لے کر وہ ہر سو پھرا

خدمت دین متیں کرتا رہا وہ تا حیات
چل بسا ہے آج وہ عاشق رسول پاک کا

جس کا لوہا مانتے تھے دہر کے اہل کمال
علم کے میدان میں دیکھا نہ ایسا سورما

بوالحسن تھا واقعی ایسا ہی انسان عظیم
دور موجودہ میں اس کا کوئی بھی ثانی نہ تھا

آج اس کے غم میں ہم سب ہی جگر افگار ہیں
آنکھوں سے رواں ہے اور غم دل میں چھپا

آہ ندوہ کی فضا پر غم کے بادل چھا گئے
یہ وہ غم ہے جو کہ صدیوں تک نہیں مٹ پائیگا

عالم اسلام میں ہے اک صف ماتم بچھی
ہر کوئی ہے دل گرفتہ اور غم میں مبتلا

ندوۃ العلماء کی یارب آبرو ہے ترے ہاتھ
فضل سے اپنے مزید اس کو عطا کر ارتقا

جنت الفردوس میں دے تو اسے اعلیٰ مقام
بہترین اس کا ہمیں نعم البدل کر دے عطا

اور سب پسماندگان کو صبر کی توفیق دے
رہنما اس کے ہمارے واسطے ہوں نقشِ پا

آج میرے مرشدی، مولانا واصف چل بسے
اے خدا ان کے تصدق مجھ پہ کر اپنی عطا

منقبت

(مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ)

ابوالحسن علی ندوی ہیں مردِ والا صفات
ابوالحسن علی ندوی ہیں راز دار حیات

ابوالحسن علی ندوی ہیں مستِ جامِ الست — سرور میں بھی ہے پاسِ شعور و عزم و ثبات
ابوالحسن علی ندوی ہیں ساقیٔ فیاض — نہیں ہے بزم میں کوئی بھی تشنہ کامِ حیات
ہوا ہے خرمنِ طاغوت جل کے خاکستر — ابوالحسن علی ندوی ہیں مردِ شعلہ صفات
عجیب نور ہے خم خانۂ تصوف میں — کہ رشکِ صبح گہر ریز ہے یہاں ہر رات
عیاں ہے راز حسیں نفسِ مطمئنہ کا — ضمیر و قلب پہ ہر دم ہے نور کی برسات
یقیں کی ضرب بڑی با اثر ہے کاری ہے — ہیں ریزہ ریزہ توہّم کے سارے لات و منات
حیات ذکرِ جلی ہے حیات ذکرِ خفی — یہی دو ذکر ہیں وردِ زبانِ والا صفات
فغانِ نیم شبی مردِ حق کی دولت ہے — جسے عزیز ہے سوز و گداز کی سوغات
گدائے عشق کا اسباب پر نہیں تکیہ — ہے فقرِ بے سر و ساماں ہی قاضی الحاجات

گدائے کوئے جنوں ہے حریفِ قیصر و جم　　اگرچہ نانِ جویں پر ہے بس گذر اوقات

شرارِ زیست سے تابندہ اور پائندہ　　نگاہِ اہلِ جنوں میں ہے ایک موت و حیات

یہ زندگی ہے حقیقت میں منزلِ اعراف　　یہاں سے دوزخ و جنت کے دیکھئے حالات

ہے رمزِ معرفت و آگہی عیاں ہم پر　　بفیضِ صحبتِ اہلِ صفا کھلی ہر بات

ابوالحسن علی ندوی مورّخِ اعظم　　ادیب و عالم و فاضل، فقیہہ والا صفات

بیان نادر و اعلیٰ نفیس ہے تحریر　　بیان کرتے ہیں خوبی سے اپنے محسوسات

گہر فروش ہے شام و سحر قلم ان کا　　مری نظر میں موقر ہیں ان کی تصنیفات

نوائے بربطِ فطرت ہے زندگی بردوش
ہر ایک شعر ہے غمّازِ محشرِ جذبات

کلید کعبہ کی شرف یابی پر

کلید کعبۂ مسجود جن کے ہاتھ آئی
انھیں کی مدح و ستائش میں لب پہ بات آئی
نصیب آپ کو معراجِ صد سعادت ہے
کلیدِ کعبہ نہیں یہ کلیدِ جنت ہے
فروغ طالعِ بیدار کا نہ پوچھ اعجاز
اس امتیاز پہ خود امتیاز کو بھی ہے ناز
جناب آپکی عزت ہے خود مری عزت
کلیدِ کعبۂ مسجود ہے مری قسمت
یہ کہنے دو مجھے میں نے مراد پائی ہے
کلیدِ کعبہ تو خود میرے ہاتھ آئی ہے
ہمیں بھی حق نے عجب امتیاز بخشا ہے
کہ اپنا صاحبِ کنجی سے خاص رشتہ ہے
عجیب ہوتی ہیں راز و نیاز کی باتیں
کہ اہل دل ہی سمجھتے ہیں راز کی باتیں
عجیب چیز ہے سوز و گداز کی لذت
دلِ حزیں کو تڑپنے کی ہے بڑی عادت
جناب آپکے فطرت کا حال مت پوچھو
شہیدِ تیغِ محبت کا حال مت پوچھو
حضور ہدیۂ تبریک لے کے آیا ہوں
خلوص و شوق کی تحریک لے کے آیا ہوں

محمد یٰسین ذکی

آخری سفر

آج کیا معاملہ ہے بابا؟ جگہ جگہ لوگ جمع ہیں۔ پتہ نہیں کیا باتیں کر رہے ہیں۔

ارے منا ! تمہیں کئی بار سمجھایا۔ میری بات سمجھو بیٹا۔ لوگ یہاں جمع ہیں وہاں جمع ہیں۔ تمہیں کیا مطلب؟ تمہارا کام تو یہ ہے کہ گھر سے سیدھے اسکول جانا اور پڑھ کر واپس آجانا۔ راستہ میں کیوں لوگ جمع ہیں؟ کیا باتیں کر رہے ہیں ہوں گے۔ یہ سوچو گے تو پڑھائی میں تمہاری لگن کم ہو جائے گی۔

نہیں بابا! آج راستہ میں کچھ ایسا لگا جیسے لوگ کچھ بدل سے گئے ہوں۔

چار دن کا بچہ! کتنی باتیں کرتا ہے۔ ''لوگ بدل گئے ہیں'' عجیب لڑکا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو نوٹ کرتا ہے۔ بڑے بوڑھوں جیسی باتیں کرنے لگا ہے۔...

اے بابا! کیا سوچنے لگے..... مجھے بہت زور کی بھوک لگی ہے۔ کچھ کھانے کے لئے.....

چلو کھانا لگ گیا ہے۔ حمیدہ بوا کمرہ میں آکر بولیں۔

چلو بابا۔ جلدی کرو۔ بھوک بہت زور کی لگی ہے۔

ہاں ہاں! چلو بیٹا۔ مجھے بھی کھانا کھا کر بازار جانا ہے۔

بابا! ایک بات تو میں بھول ہی گیا تھا۔ وہ اپنا.... وہ ہے ناں.... کیا نام ہے اس کا .... ہاں مجاہد! لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ ''بابا کو جا کر سب بات بتانی ہے۔''

بیٹا پھر تم نے وہی راستہ کی بات چھیڑ دی۔ کھانا کھاؤ۔ کھانے میں زیادہ بولنا اچھی بات نہیں ہے۔

دونوں چپ چاپ کھانا کھاتے رہے۔ حمیدہ بوا نے آج بڑا ہی مزیدار کھانا بنایا تھا۔

میں تھوڑی دیر آرام کے بعد باز ارجاؤں گا۔ بیٹا تمہیں کچھ منگانا تو نہیں ہے۔

نہیں بابا مجھے کچھ نہیں منگانا۔ بابا آپ کا وہ چشمہ ٹوٹ گیا تھا وہ ٹھیک کراتے لانا۔ اس چشمہ والے سے کہنا۔ اچھی طرح ٹھیک کرے۔ بار بار ٹوٹ جاتا ہے۔ پتہ نہیں کیسے ٹھیک کرتا ہے۔ آپ کو پریشانی ہوتی ہے۔ مجھ سے آپ کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی بابا۔

ارے بیٹا! اتنا کیوں پریشان ہوتے ہو۔؟ میرے پاس دو چشمے ہیں۔

بابا! اس دنیا میں آپ کے سوا میرا ہے ہی کون؟ آپ کسی چیز کے لئے پریشان ہوں..... مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔

کتنا خیال رکھتا ہے میرا منا۔ شاباش میرے بچے۔ بڑوں کا ایسے ہی ادب کرنا چاہئے۔ ان کی خدمت کا خیال رکھنا چاہئے۔ ان سے خوب دعائیں لینی چاہئے۔ یہی پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سکھایا ہے۔ بیٹا! اب تھوڑی دیر سو جاؤ۔ اٹھ کر اپنا ہوم ورک کرنا۔ بابا، ناصر کو نصیحت کرتے جاتے اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے جاتے۔

کچھ ہی دیر میں ناصر کو نیند آ گئی..... بابا بھی لیٹ گئے۔ مگر آج بابا کو نیند نہیں آ رہی تھی۔

میجر چاچا! (سارا شہر بابا کو میجر چاچا کہہ کر پکارتا تھا) آپ کی دوا۔ کھانے کے بعد والی۔ شاید آپ بھول گئے۔ حمیدہ بوا کمرہ میں داخل ہوتی ہوئی بولی۔

لا بیٹی لا۔ تو بھی میرا کتنا خیال رکھتی ہے۔ ناصر کے اور تمہارے سہارے ہی خدا نے مجھے زندگی دے رکھی ہے۔ ورنہ..... اس بوڑھے نے جتنے غم اٹھائے ہیں کبھی کا اس دنیا سے چلا جاتا..... جہاں سے آج تک کوئی واپس نہیں آیا..... سب چلے گئے.....

مگر.....یہ بوڑھا.....

میجر چاچا.....میجر چاچا.....کئی آوازیں آئیں۔

یہ تو شریف میاں کی آواز ہے بیٹا.....دیکھو تو معاملہ کیا ہے؟

ابھی دیکھتا ہوں۔ناصر جلدی سے اٹھ کر باہر کی طرف گیا۔

بابا! شریف چاچا کے ساتھ بہت سے لوگ ہیں۔ پتہ نہیں کیا بات ہے؟ ناصر نے آکر بتایا۔

اچھا میں دیکھتا ہوں۔میجر چاچا اپنی چھڑی لے کے تیزی سے اٹھے۔آج اپنے بابا کے اندر ناصر نے پہلی بار اتنی پھرتی دیکھی تھی۔ویسے تو بابا فوج میں رہ چکے تھے۔

کیا بات ہے شریف؟ یہ بھیڑ کیوں جمع ہے؟ میجر چاچا نے شریف سے پوچھا۔

اب بات حد سے بڑھتی جارہی ہے۔ہم سے اب برداشت نہیں ہوتا بھیڑ میں سے کسی کی آواز آئی۔

آپ لوگ ذرا خاموش رہیں۔میجر چاچا سے میں بات کرتا ہوں۔مہربانی کر کے چپ ہو جائیے۔شریف میاں نے بھیڑ کو چپ کرنے کی کوشش کی۔پھر کہا ''میجر چاچا آج بازار میں دس بارہ ہندو ایک مسلمان کی دکان کے سامنے کھڑے تھے۔مسلمان نے ان سے صرف اتنا کہا ''ذرا ایک طرف ہو جائے گاہکوں کو پریشانی ہو رہی ہے''۔اتنی سی بات پر ان میں سے ایک غصہ ہو گیا اور بولا ''ہمیں کیا ایک طرف کرتے ہو۔یہ ہماری زمین ہے۔اس پر ہمارا حق ہے۔دیکھنا ایک دن یہ دکان تمہیں چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا۔'' کچھ لوگوں نے آکر بیچ بچاؤ کرایا۔ورنہ آج بہت گڑبڑ ہو جاتی۔

کیا اب ہمیں ہندو بن کر رہنا پڑے گا؟ کیا ہم کچھ نہیں کر سکتے؟ بھیڑ میں کوئی بڑے جذبات میں بول رہا تھا۔

ہمیں اس معاملہ کی پولیس کو اطلاع کرنی چاہیے۔ایک اور آواز آئی۔

ایک نوجوان جو بڑ سلجھا ہوا معلوم ہو رہا تھا آگے آ کر بولا۔ ''میجر چاچا! السلام علیکم یہ سارا جھگڑا جب سے کھڑا ہوا ہے جب سے لوگوں نے یہ خبر پڑھی ہے کہ اسکولوں میں اب تمام بچوں کو ''وندے ماترم'' گانا ہوگا۔ چاہے وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔''

میں جانتا ہوں۔ کل ہی وزیر تعلیم کا یہ بیان آیا ہے۔ ہمیں اس بارے میں کچھ کرنا ہے شریف میاں۔ لیکن پہلے یہ بھیڑ تو کم ہو۔ دیکھو شریف رات بھی کافی ہو چکی ہے۔ یہاں لوگوں کا جمع رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ شہر میں کشیدگی بھی تو ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں یہ لوگ اپنے اپنے گھر چلے جائیں۔ یہ کہہ کر میجر چاچا نے اپنا ہاتھ اٹھایا لوگوں کو کچھ نصیحتیں کیں۔ امن وسکون کی تلقین کی اور معاملہ کو جلد سلجھانے کا یقین دلایا..... لوگ رفتہ رفتہ کم ہوتے گئے، لیکن میجر چاچا نے شریف اور اس نوجوان کو روک لیا۔

''شہر کی حالت بہت نازک ہے میجر چاچا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کب کیا ہو جائے۔ اب کی بار بہت خون خرابہ ہوگا۔ لوگ بدلہ کی آگ میں جل رہے ہیں۔ افواہوں کا بازار گرم ہے۔ شہر کے نیتاؤں نے ماحول کو مزید بگاڑ رکھا ہے۔ میجر چاچا اگر آج یہ نوجوان محمد مسلم بازار میں وقت پر نہ پہنچتا تو فساد کبھی کا بھڑک چکا ہوتا۔ شریف میاں نے بڑے افسوس کے ساتھ کہا۔''

''شریف میاں! شہر کی حالت کسی وقت بھی بگڑ سکتی ہے۔ اس لئے ہمیں انتظامیہ کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ کرنا چاہیے''۔ میجر چاچا بڑے متفکرانہ انداز میں بولے۔

''کیوں نہ کل ہم مجسٹریٹ سے ملیں۔'' محمد مسلم نے اپنی تجویز پیش کی۔

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ شریف میاں! کل ہم آٹھ دس لوگوں کا گروپ بنا کر ضلع مجسٹریٹ کے پاس چلیں گے۔ اب تم لوگ بھی اپنے گھر جاؤ.... اور ہاں.... دیکھو! شہر پر کڑی نظر رکھو۔'' میجر چاچا نے سمجھایا۔

صبح میجر چاچا نماز سے فارغ ہو کر ذرا دیر سے واپس لوٹے۔ ناصر اسکول جانے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ ناشتہ کر کے ناصر اسکول چلا گیا۔ میجر چاچا نے بھی ناشتہ کیا اور تلاوت کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد شریف میاں اور شہر کے چند معزز لوگ آ گئے۔ آج ان کو ضلع مجسٹریٹ سے ملنا تھا۔ میجر چاچا بھی تیار ہو گئے۔ لیکن تب ہی ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھلا۔ ناصر سامنے کھڑا تھا۔

''تم اسکول نہیں گئے بیٹا۔ کیا راستہ ہی سے واپس آ گئے؟ بستہ کہاں ہے تمہارا؟ تم ہانپ کیوں رہے ہو؟'' میجر چاچا نے ناصر کو دیکھ کر کئی سوالات کر ڈالے۔

''مجھے نہیں جانا اسکول۔ میں بھاگ کر آ گیا ہوں!! مورتی کے آگے کون ہاتھ جوڑے گا بابا..... آپ کے کہنے پر عمل کیا ہے..... اور..... اور'' ناصر جذبات میں بولے چلے جا رہا تھا۔

''اپنے اوپر قابو رکھو بیٹا..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم گھر پر ہی ٹھہرو۔ میں اسکول سے تمہارا بستہ منگا لوں گا...'' میجر چاچا نے ناصر کو دلاسہ دیا اور دوسرے لوگوں کے ساتھ مجسٹریٹ کے دفتر چلے گئے۔

''آیئے! ادھر بیٹھئے، کہیئے آپ لوگ کیسے آئے ہیں؟'' ضلع مجسٹریٹ میجر چاچا اور دوسرے لوگوں سے بولا۔

''آپ تو شہر کی حالت سے باخبر ہیں۔ جب سے وزیر تعلیم نے اسکولوں میں وندے ماترم لازمی کیا ہے۔ مسلمان بہت ناراض ہیں اور کچھ شر پسند ہندو مسلمانوں کے جذبات سے کھیل رہے ہیں۔ جگہ جگہ وندے ماترم گاتے پھر رہے ہیں۔''

''دیکھئے جناب میں کیا کر سکتا ہوں۔ سرکار نے اسکولوں میں وندے ماترم لازمی کر دیا ہے۔ اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ اور پھر سرکار اکثریت کو دیکھ کر ہی تو کسی معاملہ کا فیصلہ کرتی ہے۔''

''ڈی.ایم صاحب! آپ وندے ماترم کی وکالت کررہے ہیں۔ایک بات یاد رکھئے مسلمان اللہ کو ایک مانتا ہے۔اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔زمین، آسمان، چاند، ستارے اور سب کچھ اللہ ہی نے پیدا کیا۔اللہ کو چھوڑ کر مسلمان کسی دوسرے کے سامنے سر جھکائے۔ایسا ناممکن ہے.....بالکل ناممکن.....شہر کی حالت سے ہم نے آپ کو آگاہ کردیا۔کنٹرول کرنا آپ کی ذمہ داری ہے .....ایک بات اور سن لیجئے مسلمان کی وفاداری پر ہمیشہ شک کیا جاتا ہے۔حالانکہ ہر مسلمان ملک کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کو ہر وقت تیار رہتا ہے۔یہ دیکھو.....یہ کٹا ہوا ہاتھ

آج کئی اسکولوں میں بچے آپس میں جھگڑ پڑے۔مسلمان بچوں کو تنگ کیا جارہا ہے۔حالات کو کیا ہوگیا میجر چاچا۔دوسرے شہروں کی بھی خبریں اچھی نہیں ہیں۔مسلمان جگہ جگہ پریشان ہیں۔مگر سرکار کے کانوں پر ذرا بھی جوں نہیں رینگتی۔شریف میاں بہت غمگین تھے۔

بابا خبریں شروع ہونے والی ہیں۔ناصر نے اطلاع دی۔

ہاں بیٹا! ابھی آیا۔آؤ شریف میاں خبریں سنیں۔میجر چاچا اٹھتے ہوئے بولے۔

آج مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی نے اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ: ''مسلمان اپنے بچوں کو سرکاری اسکولوں میں نہ بھیجیں۔جہاں سرسوتی وندنا اور وندے ماترم کی تلقین کی جاتی ہے۔ہم سرکار سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اپنے اس فیصلہ کو واپس لے۔''

خبریں ابھی جاری تھیں مگر میجر چاچا درمیان میں ہی بول پڑے۔

''اب سرکار کو ضرور گھٹنے ٹیکنے پڑیں گے۔حضرت مولانا کے بیان پر ہر مسلمان اپنی جان نچھاور کرسکتے ہیں۔دیکھنا اب سرکاری اسکول خالی نظر آئیں گے۔دنیا حضرت کی شخصیت کا لوہا مانتی ہے۔حضرت نے بہت اچھا بیان دیا ہے۔شریف میاں آج

صرف حضرت ہی ہیں جن کی طرف پوری ملت اسلامیہ رجوع کرتی ہے۔''

''میجر چاچا! حضرت کے بارے میں مجھے معلومات کم ہیں۔ آپ ذرا تفصیل سے بتایئے۔'' شریف میاں نے خواہش ظاہر کی۔

''ارے شریف! حضرت کے بارے میں کیا پوچھتے ہو۔ بس یہ تو عرب وعجم کا چاند ہیں۔ آج ان کے علم کی روشنی سے دنیا فیض حاصل کر رہی ہے۔ آپ ایسی روحانی شخصیت ہیں کہ دنیا کے کونے کونے سے لوگ استفادہ کیلئے آتے ہیں۔ آپ کا خاندان علم وعمل کا گہوارہ رہا ہے۔ کس کس کا نام گناؤں سید قطب الدین، شاہ علم اللہ، سید احمد، دادا سید فخر الدین اور والد عبدالحی اللہ ان پر اپنی رحمت نازل کرے۔ سب بڑے بزرگ لوگ تھے۔ اور شریف میاں! حضرت بھی ان کے نقش قدم پر ہیں۔ دنیاداری، شہرت، ریاکاری خودغرضی سے کوسوں دور.... بس ان کو ایک ہی دھن سوار رہتی ہے۔ اخوت اور بھائی چارہ عام ہو۔ ملک سے نفرت دور ہو جائے۔ ملت اپنے اسلاف کی آئینہ دار ہو۔ لوگ خرافات چھوڑ کر ایک اللہ کے سچے پکے بندے بنیں۔ جہالت کی تاریکی دور ہو، علم کی شمعیں ہر جگہ روشن ہوں۔ قوم اپنے اندر سوز پیدا کرے، دین کو مکمل نظام کی حیثیت سے اپنائے، اپنی بھولی ہوئی تاریخ کو پھر یاد کرے اور ساتھ ہی ساتھ روحانیت کا دامن بھی نہ چھوڑے جانتے ہو شریف میاں..... اس کے لئے حضرت تقریر کرتے ہیں۔ اس بڑھاپے کے عالم بھی دور دراز کے سفر!! یا اللہ کیسی ہمت دی ہے میرے حضرت کو۔ واہ رے واہ مولیٰ۔ تو جسے چاہتا ہے اپنے کام کے لئے چن لیتا ہے۔ کتنا لکھا ہے حضرت نے۔ موٹی موٹی کتابیں۔ ہم نے زندگی بھر اتنا پڑھا بھی نہیں جتنی حضرت نے کتابیں لکھ دیں۔ یہ دیکھو میری الماری میں کتنی کتابیں ہیں۔ ادھر آؤ۔ دیکھو۔ یہ جو ادھر والی کتابیں ہیں نا، سب حضرت نے لکھی ہیں۔ شریف پڑھو بیٹا۔ حضرت کا لکھا تم بھی پڑھو۔ لو یہ کتاب لے جانا ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' واہ! کیا شاہکار ہے یہ کتاب۔ اور یہ

دیکھو شریف میاں۔ قصص النبیین۔ بچوں کے لئے عربی زبان میں بالکل سادہ زبان، ہلکی پھلکی جس سے بچے عربی بھی سیکھ جائیں اور نبیوں کے قصہ سن کر ان کی زندگی بھی سنور جائے۔ اور شریف میاں! کتنا بڑا مدرسہ جیسے عربی یونیورسٹی ''ندوۃ العلماء'' حضرت کی محنت، کوشش اور خلوص نے کہاں تک پہنچا دیا اللہ اسے نظر بد سے بچائے۔ شریف میاں! جب بھی ملت پر کوئی مصیبت آئی ہے حضرت نے اس کا ڈٹ کر کا مقابلہ کیا ہے۔ دعا کرو شریف۔ حضرت کی عمر دراز ہو۔ ہم سب کی عمریں انھیں لگ جائیں..... اچھا دیکھو اب کافی رات ہوگئی ہے تم جا کر آرام کرو۔ صبح جلدی اٹھ کر پروگرام بنائیں گے۔''

''میجر چاچا۔ میجر چاچا۔'' صبح نماز کے فوراً بعد شریف چیختا چلاتا آرہا تھا۔ میجر چاچا تو گھبرا ہی گئے۔ آخر شریف اتنا کیوں چلا رہا ہے۔

''السلام علیکم میجر چاچا یہ لو۔ آج کا یہ اخبار دیکھو۔ آپ نے ٹھیک کہا تھا۔ حضرت کے بیان پر سرکار بوکھلا گئی۔ اب اسکولوں میں وندے ماترم نہیں ہوگا۔ اور..... اور.....''

''بیٹا اپنا سانس تو ٹھیک کرلو۔ لگتا ہے بڑی دور سے بھاگے چلے آرہے ہو۔'' میجر چاچا نے شریف کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''...اور میجر چاچا..... سرکار نے اس وزیر تعلیم کو بھی برخاست کر دیا۔ جس نے یہ سب کچھ کیا تھا۔ حضرت کے بیان کی بہت لوگوں نے حمایت کی ہے۔ ایک بیان نے سرکار کو ہلا کر رکھ دیا۔'' شریف میاں اور کچھ کہنا چاہتے تھے مگر میجر چاچا نے ہاتھ کے اشارہ سے روک دیا۔ اور ہاتھ اٹھا کر حضرت کی لمبی عمر کی دعائیں کرنے لگے۔

''میں نے ایک فیصلہ کیا ہے شریف'' میجر چاچا نے کہا۔

'' کیا میجر چاچا؟ مجھے بھی بتائیے۔'' شریف میاں بے چینی سے بولے۔

''میں اپنے ناصر کو ندوہ پڑھنے بھیجوں گا۔'' میجر چاچا نے بتایا۔

''یہ تو بہت اچھا ہے۔ حضرت کا ندوہ، حضرت کی صحبت، بہت اچھا چاچا بہت

اچھا۔ فرشتہ صفت انسان کی صحبت ناصر کو ملے گی۔ انسان بن کر نکلے گا۔'' شریف میاں اس فیصلے سے بہت خوش تھے۔

''آؤ بیٹا آؤ'' میجر چاچا نے ناصر کو آتے دیکھ کر کہا۔

''بیٹا میں نے تم کو لکھنؤ بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ندوہ میں پڑھو'' میجر چاچا نے ناصر سے کہا۔

''بابا! میں آپ کو چھوڑ کر کیسے جاسکتا ہوں۔ اتنی دور! نہیں بابا۔ میرے بابا اکیلے رہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' ناصر بے چین ہوگیا۔

''ناصر بیٹا! یہ میری خواہش ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم حضرت کے زیر سایہ تعلیم حاصل کرو اور انھی جیسے انسان بنو۔'' میجر چاچا نے ناصر کو سمجھایا۔

بابا.... آپ کی خواہش ہے.... اور آپ چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے..... ناصر ہر وقت بابا کی خواہش پر جان نچھاور کرنے کے لئے تیار رہتا تھا۔

اگلے دن میجر چاچا ناصر کو لے کر لکھنؤ روانہ ہوگئے۔ میجر چاچا کے دل میں ایک خواہش اور تھی۔ حضرت سے ملاقات کی خواہش..... ٹرین جتنی لکھنؤ سے قریب ہو رہی تھی۔ میجر چاچا اتنے ہی بے چین ہو رہے تھے۔ ان کی حالت اس پرندہ جیسی ہو رہی تھی جو بند پنجرہ میں آزادی کی کوشش میں پھڑ پھڑاتا ہے... آج یہ دوسرا موقع تھا جب میجر چاچا ندوہ آئے تھے۔ میجر چاچا پہلی بار حضرت سے نہ مل سکے تھے اور ملاقات نہ ہونے کا درد سینہ میں لئے واپس گئے تھے۔ ندوہ کے احاطہ میں داخل ہوتے ہی دل دھڑکنے لگا۔ قدم آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔ یہ وہ میجر تھا جس نے کتنی ہی مخالف فوجوں کو شکست دی تھی۔ بارہا ملک کے دشمنوں کو میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کیا تھا۔ لیکن حضرت کی روحانی شخصیت نے میجر چاچا پر جادو سا کر دیا تھا۔ میجر چاچا کو یہ احساس نہیں رہا کہ ناصر ان کی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہو رہا ہے۔

''بابا آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' ناصر بولا۔

ہاں ہاں.... ہاں بیٹا..... کیوں نہیں..... میں بالکل ٹھیک ہوں'' میجر چاچا نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

''حضرت مولانا شاید کل تشریف لائیں گے۔'' میجر چاچا کے پوچھنے پر مہمان خانہ کے ناظم نے بتایا۔

آج ندوہ میں ان کا دوسرا دن تھا۔ ناصر کا داخلہ ہو چکا تھا۔ شام ہونے کو تھی مگر حضرت تشریف نہیں لائے تھے..... تیسرے دن کا سورج نمودار ہوا۔ میجر چاچا کی امیدیں بھی بڑھ گئیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آج بھی حضرت تشریف نہ لائیں۔ اور ملاقات نہ ہو سکے.... یہ سوچ کر میجر چاچا پریشان ہو گئے۔ ان کو ایسا لگا جیسے ان کا دل بیٹھ جائے گا۔ تیسرا دن بھی اسی کشمکش میں ختم ہو گیا۔ چوتھے دن معلوم ہوا کہ حضرت کا پروگرام کسی وجہ سے بدل گیا ہے۔ اب دس دن کے بعد تشریف لائیں گے۔ یہ خبر ملتے ہی میجر چاچا پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ میجر چاچا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ انھوں نے خود کو سنبھالا۔ من ہی من میں خود کو دلاسہ دیا اور ناصر سے بولے۔

''میں آج واپس جا رہا ہوں بیٹا۔ اس امید کے ساتھ کہ تم ایک اچھے انسان بنو گے۔'' اور بھیگی آنکھوں کے ساتھ میجر چاچا اپنے وطن لوٹ آئے۔

ناصر خوب دل لگا کر پڑھتا۔ وہ اس بات کی کوشش کرتا کہ حضرت سے زیادہ سے زیادہ ملاقات کرے۔ ان سے کچھ سیکھنے کی کوشش کرے۔ یہی اس کے بابا کی نصیحت بھی تھی۔

کئی مہینوں کے بعد آج ناصر اپنے وطن لوٹ رہا تھا۔ میجر چاچا اس کو لینے اسٹیشن آئے تھے۔ میجر چاچا نے اس کو خوب پیار کیا ایسا لگ رہا تھا مہینوں کی دوری کا حساب چند لمحوں میں پورا کر لیں گے۔

''بیٹا! حضرت کیسے ہیں؟ ان سے تم کتنی بار ملے۔ ان کی صحبت میں کچھ وقت گذرا کہ نہیں....'' میجر چاچا ناصر سے یہی سوالات کرتے رہتے۔ حضرت کی شخصیت کے بارے میں معلوم کرتے رہتے۔ ناصر بھی ان کو حضرت کے بارے میں بتاتا رہتا۔ حضرت سے ملاقات کے واقعات سناتا رہتا اور میجر چاچا سن سن کر خوش ہوتے رہتے۔

''حضرت کی طبیعت اب بہت خراب رہنے لگی ہے''۔ ناصر اگر کبھی یہ بات کہتا تو میجر چاچا بے چین ہو جاتے اور خدا سے ان کی صحت کی دعا کرتے۔

''میجر چاچا! آج کا اخبار دیکھا ہے؟ حضرت کی طبیعت بہت خراب ہے۔'' ایک دن شریف میاں نے اطلاع دی۔

''خدا حضرت کی عمر دراز کرے۔ ان کا سایہ دیر تک قائم رکھے۔ شریف میاں جب ناصر کی چھٹیاں ختم ہوں گی تم ندوہ چلنا۔ اب کی بار اللہ نے چاہا تو حضرت سے ضرور ملاقات ہوگی۔'' میجر چاچا بولے۔

''آج تو بابا سردی نے کمال کر دیا۔ لو بابا آپ کی یہ دوا۔ ابھی چائے لے کر آتا ہوں۔'' ناصر دوائی لے کر چلا گیا۔

''میجر چاچا! میجر چاچا غضب ہو گیا'' ایک دن شریف میاں کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے بولے۔ ناصر بھی آچکا تھا۔

''غضب ہو گیا چاچا..... آج حضرت.....'' شریف میاں آگے نہ بول سکے۔

''کیا ہوا حضرت کو .....'' میجر چاچا بستر سے اٹھ بیٹھے۔

''آج حضرت اللہ کو پیارے ہو گئے۔ .....(شریف میاں زار و قطار رو رہے تھے۔ ناصر بھی رونے لگا) آج..... پوری قوم یتیم ہو گئی.....'' شریف میاں آگے کچھ نہ بول سکے اور ان کی ہچکی بندھ گئی۔

بابا..... آپ کو کیا ہوا بابا..... ناصر نے گرتے ہوئے بابا کو سنبھالا .....اتنی

سردی میں آپ کے چہرے پر پسینہ..... بابا اے بابا..... آپ بولتے کیوں نہیں بابا.....
شریف چاچا دیکھو بابا کو یہ اچانک کیا ہو گیا..... آنکھیں کھولئے بابا.....
پانی..... بڑی مشکل سے میجر چاچا کی آواز نکلی۔ شریف میاں نے ایک چمچہ پانی منہ میں ڈالا۔

حضرت..... حضرت..... حضرت اس دنیا سے.....

ہاں بولو بابا.....

حضرت..... اپنے مالک سے..... جا ملے..... انا للہ... وانا الیہ.....
راجعون..... بیٹا ناصر..... تم اپنا..... خیال.....
اور میجر چاچا اپنے حضرت کی موت کے غم میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

ماہ وسال کے آئینہ میں

۵/دسمبر ۱۹۱۳ء ـــــــــــــــ ۳۱/دسمبر ۱۹۹۹ء

- ۵/دسمبر ۱۹۱۳ء: ولادت
- ۱۹۲۲ء: والد صاحب کی وفات
- اردو فارسی اور عربی تعلیم کا آغاز
- ۱۹۴۲ء: ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لئے ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے ساتھ کانپور سفر۔
- ۱۹۲۶ء: ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں اور حکیم اجمل خاں سے ملاقات۔
- ۱۹۲۷ء: لکھنؤ یونیورسٹی میں فاضل ادب میں داخلہ۔
- ۱۹۲۸ء: شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی سے پہلی ملاقات۔
- ۱۹۲۹ء: فاضل ادب کے امتحان میں فرسٹ ڈویژن فرسٹ آئے۔
- لاہور کا سفر کیا اور علامہ اقبالؔ اور حفیظ جالندھریؔ سے تعارف حاصل ہوا۔
- دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مولانا حیدر حسن خاںؔ صاحب سے حدیث شریف کی تعلیم

کا آغاز کیا۔

- انگریزی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔
- ۱۹۳۰ء: والدہ صاحبہ کی آنکھ کے آپریشن کے سلسلہ میں چند روز میڈیکل کالج میں قیام رہا۔
- ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی کی آمد ہوئی۔
- مولانا داؤد غزنوی کے رسالہ میں شائع شدہ ''ہندوستان کا مجاہد اعظم یا مجدد اعظم'' کا عربی ترجمہ کر کے تصنیفی زندگی میں قدم رکھا۔
- ڈاکٹر تقی الدین ہلالی کے ساتھ اعظم گڑھ، مئو اور مبارک پور کا سفر کیا۔
- ۱۹۳۱ء: لاہور کا سفر
- مولانا احمد علی لاہوری کے درسِ قرآن اور حجۃ اللہ البالغہ کے درس میں شرکت۔
- مولانا احمد علی لاہوری کے شیخ خلیفہ غلام محمد دین پوری سے بیعت ہوئے۔
- ۱۹۳۲ء: دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے اور مولانا حسین احمد مدنی کی خدمت میں حاضری دی اور درسِ حدیث میں شریک ہوئے۔
- ''الضیاء'' نامی رسالہ کا اجراء ہوا، اور یہیں سے آپ کی مضمون نگاری کا سلسلہ شروع ہوا۔
- ۱۹۳۳ء: مفتی امین الحسینی سے پہلی ملاقات۔
- ۱۹۳۴ء: دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تفسیر و ادب کے استاذ کی حیثیت سے ۴۰ روپے ماہوار پر تقرر ہوا۔
- شادی ہوئی۔
- تھانہ بھون میں حاضری اور مولانا اشرف علی تھانوی سے پہلی ملاقات۔
- ۱۹۳۵ء: بمبئی میں ڈاکٹر امبیڈکر کو اسلام کی دعوت دیکر اپنے دعوتی مشن کا آغاز کیا۔
- ۱۹۳۶ء: علی گڑھ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کی۔

- ٹونک کا سفر کیا اور نشانہ بازی کی تربیت حاصل کی۔
- ۱۹۳۷ء: علامہ اقبال سے آخری اہم اور یادگار ملاقات ہوئی۔
- ۱۹۳۸ء: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے B.A. کلاس کے لئے دینیات کی کتاب تیار کی۔
- ۱۹۳۹ء: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے پہلی ملاقات۔
- سیرت سید احمد شہید طبع ہو کر منظر عام پر آئی
- ہندوستان کے دینی مراکز کا دورہ کیا۔
- مولانا عبدالقادر رائے پوری سے پہلی بار تعارف حاصل ہوا۔
- مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی خدمت میں پہلی حاضری
- ۱۹۴۰ء: ''الندہ'' رسالہ سہ بارہ جاری ہوا، اور مولانا عبدالسلام قدوائی کے ساتھ اس کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔
- مختارات کی تالیف کا کام مکمل ہوا۔
- مولانا محمد الیاس کاندھلوی سے دوسری بار ملاقات اور تبلیغی کام کا آغاز۔
- ۱۹۴۱ء: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی آپ کی دعوت پر ندوہ تشریف لائے۔

جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کی۔

- ۱۹۴۲ء جماعت اسلامی کی مجلس عاملہ میں شرکت کے لئے لاہور کا سفر کیا۔
- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ساتھ علی گڑھ کا سفر۔
- جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں ''مذہب وتمدن'' کے عنوان سے ڈاکٹر ذاکر حسین، عابد حسین اور پروفیسر مجیب کی موجودگی میں مقالہ پڑھا۔
- مولانا محمد الیاس کاندھلوی کے ایما پر ندوۃ العلماء سے تنخواہ لینا بند کر دی۔

۱۹۴۳ء: جماعت اسلامی سے کنارہ کشی اختیار کی۔

- لکھنؤ میں ادارہ تعلیماتِ اسلام کی بنیاد ڈالی اور اُس کے زیرِ اہتمام درسِ قرآن کے

حلقوں کا سلسلہ شروع کیا۔

- علامہ سید سلیمان ندوی کے اصرار پر دوبارہ تنخواہ لینا شروع کیا۔
- ۱۹۴۴ء: پشاور میں منعقد سیرت کانفرنس میں شرکت کی۔
- ۱۹۴۵ء: دارالعلوم ندوۃ العلماء کی ملازمت سے تعلق ختم کرلیا۔
- ۱۹۴۶ء: لاہور کا سفر کیا اور مولانا احمد علی لاہوری سے خلافت ملی۔
- مولانا عبدالقادر رائے پوری سے اصلاحی تعلق قائم ہوا۔
- بھاگلپور میں فوجی ٹرک پر فساد زدہ علاقے کا دورہ کیا اور سروے کر کے شہدا کی رپورٹ تیار کی۔
- ۱۹۴۷ء: والدہ صاحبہ، ہمشیرہ صاحبہ اور بھانجے سید محمد ثانی حسنی کے ساتھ پہلا حج کیا۔
- شاہ سعود کو اسلامی بنیادوں پر مملکت سعودیہ کی تعمیر و تنظیم کے بارے میں خط لکھا جو بعد میں بین الجبلیۃ والھدلیۃ کے نام سے شائع ہوا۔
- جواہر لال نہرو کی دعوت پر دہلی میں منعقد ہونے والی ایشیائی کانفرنس میں شرکت کی دیگر شرکاء میں سرجنی نائیڈو، محمد علی جناح۔
- ۱۹۴۸ء: ''تعمیر'' نامی رسالہ کا اجرا ہوا اور اس کی ادارت سنبھالی۔
- رکن مجلس انتظامیہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی حیثیت سے انتخاب عمل میں آیا۔
- مولانا عبدالقادر رائے پوری نے آپ کو خلافت عطا فرمائی۔
- ۱۹۴۹ء: علامہ سید سلیمان ندوی کی تحریک پر نائب معتمد تعلیم بنائے گئے۔
- ہندو اور مسلمانوں کے مخلوط اجتماعات سے خطاب کا سلسلہ شروع کیا۔
- ۱۹۵۰ء: دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد بنائے گئے۔
- دعوتی مقصد سے حج کا دوسرا سفر کیا، رفقاء مولانا عبداللہ عباس ندوی، مولانا طاہر حسینی اور محمد رابع حسنی۔

- خانہ کعبہ کے کلید بردار شیبی کی دعوت پر کعبہ کے اندر داخل ہونے کا پہلی بار شرف حاصل ہوا۔
- سید قطب شہید سے مکہ مکرمہ میں پہلی ملاقات ہوئی۔
- اپنے شیخ مولانا عبدالقادر رائے پوری کو لے کر دوبارہ خانہ کعبہ میں داخل ہونے کی سعادت حاصل کی۔
- ۱۹۵۱ء: مصر کا سفر کیا۔
- قاہرہ یونیورسٹی میں محاضرہ دیا۔
- شیخ حسن البنا کے والد شیخ عبدالرحمٰن سے ملاقات کی۔
- سید قطب شہید کے مکان پر آپ کی موجودگی میں آپ کی مشہور کتاب "ماذا خسر العالم" پر علمی مذاکرہ ہوا۔
- اخوانی رہنما شیخ محمد الغزالی کے ساتھ مصر کے قصبات اور دیہات کا دورہ کیا۔
- سوڈان شام اور اردن گئے۔
- بیت المقدس میں رمضان کا آخری عشرہ گذرا اور عید کی نماز ادا کی۔
- شریف حسین کی قیام گاہ پر ان کی عیادت کی۔
- اردن کے حکمراں شاہ عبداللہ بن شریف حسین سے ملاقات کی اور بیت المقدس کی بازیابی کے سلسلہ میں گفتگو کی۔
- شام گئے
- دمشق یونیورسٹی میں ''مسئلہ فلسطین کے بارے میں علم و تاریخ کی شہادت'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔
- ۱۹۵۲ء: ہندوستان میں فرقہ وارانہ صورتحال کو بگڑتے دیکھ کر ہندو اور مسلمانوں کے مشترکہ اجتماعات کے انعقاد کا سلسلہ شروع کیا۔

- ۱۹۵۳ء: لکھنؤ میں تبلیغی مرکز قائم کیا۔
- ۱۹۵۴ء: دارالعلوم دیوبند میں طلبہ سے پہلی بار خطاب کیا۔
- لاہور تشریف لے گئے اور مولانا عبدالقادر رائے پوری کی صحبت میں رمضان گذارا۔ فتح پور جاکر شاہ وصی اللہ صاحب کی خدمت میں پہلی بار حاضری دی۔
- ۱۹۵۵ء: آپ کی پہلی شاہکار تصنیف ''تاریخ دعوت وعزیمت'' مطبوعہ شکل میں سامنے آئی۔
- ۱۹۵۶ء: دمشق یونیورسٹی کی دعوت پر وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے شام تشریف لے گئے اور آٹھ لکچرس دیئے۔
- شامی ریڈیو اسٹیشن سے دو تقریریں نشر ہوئیں۔
- دمشق میں اسلامی کانفرنس میں شرکت کی، صدارت سابق وزیراعظم انڈونیشیا نے کی اور نائب صدر آپ منتخب ہوئے۔
- شام کے صدر شکری القوتلی اور پارلیمنٹ کے اسپیکر ناظم القدسی سے ملاقات کی۔
- دمشق کی علمی اکیڈمی کے ممبر منتخب ہوئے۔
- شامی پارلیمنٹ کے اجلاس میں شرکت کی۔
- سابق وزیراعظم انڈونیشیا محمد ناصر سے ملاقات ہوئی۔
- لبنان کا سفر کیا، اور دعوتی واصلاحی اور دینی تحریکوں کے قائدین سے ملاقات کی۔
- ترکی کا سفر کیا، کمال اتاترک کی اسلامی مخالف پالیسیوں کا مشاہدہ کیا، اور ہندوستان واپس آکر اس کی حقیقت سے لوگوں کو آگاہ کیا۔
- عراق کا سفر کیا اور دعوتی واصلاحی تحریکی رہنماؤں سے ملاقات کی اور عوامی جلسوں سے خطاب کیا۔
- ۱۹۵۷ء: موتیابند کی شکایت اور لکھنے سے معذوری۔

- ۱۹۵۸ء: دمشق سے نکلنے والے عربی رسالہ ''المسلمون'' کا اداریہ لکھنے کی فرمائش کی گئی، چنانچہ کئی ماہ تک مسلسل اس کے اداریئے آپ ہی کے قلم سے نکلے۔
- لکھنؤ میں مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے نام سے ایک ادارہ کی داغ بیل ڈالی۔
- ۱۹۶۰ء: دینی تعلیم کونسل کے قیام میں بنیادی حصہ لیا اور اس کے صدر منتخب ہوئے۔
- نقرس (Gout) کی تکلیف رہنے لگی۔
- ندوہ کے تعارف کے لئے برما کا سفر کیا۔
- ۱۹۶۱ء: بڑے بھائی اور مربی ڈاکٹر سید عبدالعلی کی وفات ہوئی۔
- دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ناظم منتخب ہوئے۔
- ۱۹۶۲ء علی گڑھ میں موتیابند کا آپریشن ہوا۔
- سعودی عرب کا سفر۔
- مدینہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور اس کے مشاورتی بورڈ کے بنیادی رُکن نامزد ہوئے۔
- شاہ سعود اور لیبیا کے فرمانروا ادریس سنوسی سے ملاقات کی۔
- رابطہ عالم اسلامی کی تاسیس میں حصہ لیا اور اُس کے رُکن نامزد ہوئے۔
- مدینہ یونیورٹی میں منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین کے عنوان سے کئی لکچرس دیئے۔
- دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن نامزد ہوئے۔
- ۱۹۶۳ء حج کے مبارک موقع پر حرم شریف میں مصلیٰ شافعی کے اوپر مئذنہ سے حجاج کرام کو خطاب کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔
- یورپ کا سفر ہوا۔
- اڈنبرا یونیورسٹی، لندن یونیورٹی کے یونین ہال، اور لندن یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں تقریریں ہوئیں۔

- B.B.C. سے دو عربی تقریریں نشر کی گئیں۔
- سوڈانی رہنما حسن ترابی (جو اس وقت طالب علم تھے) سے ملاقات۔
- اسپین کا سفر
- ۱۹۶۴ء: یورپ کا دوسرا سفر ہوا۔
- جرمنی میں برلن یونیورسٹی آف انجینئرنگ میں جرمن قوم سے خطاب کیا جرمن زبان میں آپ کی تقریر کا ترجمہ کیا گیا۔
- جمشید پور اور راوڑ کیلا کے فسادات کے بعد جے پرکاش نرائن سے دہلی میں اور ونوبا بھاوے سے ناگپور جا کر ملاقات کی اور ان سے اس موقعہ پر سامنے آنے کی اپیل کی۔
- بمبئی میں بائیں آنکھ کا آپریشن ہوا جو ناکام رہا۔
- مسلم مجلس مشاورت کے قیام میں نمایاں کردار ادا کیا۔
- شاہ فیصل سے تیسری ملاقات ہوئی اور اسلامی ملکوں کے حالات پر گفتگو ہوئی۔
- ۱۹۶۵ء: مسلم مجلس مشاورت کی مہم کے دوران آپریشن زدہ آنکھ پر ہمرج کا اور پھر اُسی آنکھ میں سنبل کا سخت حملہ ہوا۔
- ۱۹۶۶ء: مصر کے صدر جمال عبدالناصر کے خلاف آواز اٹھانے پر حکومت ہند نے آپ کا پاسپورٹ اپنی تحویل میں لے لیا۔
- امام حسن البنا شہید کی خودنوشت "مذکرات الدعوة والداعية" پر ڈاکٹر سعید رمضان (حسن البنا شہید کے داماد) کی خواہش پر مقدمہ لکھا۔
- ۱۹۶۷ء: حجاز کا سفر کیا اور طائف میں کار کا حادثہ ایسا سخت پیش آیا جس میں آپ کا بچنا کسی معجزہ سے کم نہ تھا۔
- ۱۹۶۸ء: سعودی وزیر تعلیم کی دعوت پر ریاض یونیورسٹی میں تعلیم کے موضوع پر لکچر دیا۔
- والدہ صاحبہ کا انتقال ہوا۔

- کویت میں عرب ممالک کے وزرائے تعلیم کی میٹنگ کے لئے ایک مقالہ تحریر فرمایا۔
- ۱۹۶۹ء: تبلیغی مرکز سے منتقل ہوئے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں قیام رہنے لگا۔
- یورپ کا تیسرا سفر
- برمنگھم یونیورسٹی اور لیڈس یونیورسٹی میں خطاب کیا۔
- صحت کی خرابی کے باعث دارالعلوم ندوۃ العلماء کی نظامت سے استعفیٰ دینا چاہا جو منظور نہ ہوا۔
- ۱۹۷۰ء: تکیہ (آبائی گاؤں) میں سیلاب آنے کی وجہ سے شہر میں عارضی قیام فرمایا۔
- ۱۹۷۱ء: سیتاپور میں دائیں آنکھ کا آپریشن ہوا۔
- ۱۹۷۲ء: ترمیمی ایکٹ کے خلاف دہلی میں منعقد ہونے والے آل انڈیا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کنونشن کا افتتاح کیا۔
- ۱۹۷۳ء: رابطہ عالم اسلامی کے وفد کی قیادت کرتے ہوئے افغانستان، ایران، لبنان شام اور عراق کا دورہ کیا۔
- طہران میں آیۃ اللہ العظمیٰ مرزا محمد خلیل کمرئی کی طرف سے دیئے گئے استقبالی جلسہ میں ایرانی دانشوروں سے خطاب کیا۔
- لبنان کے وزیراعظم تقی الدین الصلح سابق وزیراعظم صائب سلام، وزراء اور ممبران پارلیمنٹ سے ملاقاتیں ہوئیں اور ان کے سامنے اپنے خیالات کے اظہار کا موقع ملا۔
- اُردن کے بادشاہ حسین سے ملاقات ہوئی۔
- اردن میں سعودی عرب کے فوجی مستقر کا معائنہ کیا اور فوجیوں سے خطاب کیا۔
- ۱۹۷۴ء: تحریک پیام انسانیت کا آغاز کیا۔
- شارجہ کے حاکم سلطان محمد القاسمی کی دعوت پر عرب امارات کا دورہ کیا۔
- ۱۹۷۵ء: دارالعلوم کے پچاسی سالہ جشن تعلیمی کا انعقاد کیا۔

● ۱۹۷۶ء: ہمیشرہ محترمہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کا انتقال ہوا۔

● ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد دہلی میں وزیر اعظم ہند اندرا گاندھی سے ملاقات کی اور نس بندی کے سلسلہ میں پوری جرأت و بیباکی کے ساتھ اسلامی موقف کی وکالت کی۔

● راشٹرپتی بھون دہلی میں موریٹانیا کے صدر مختار ولد داداصاحب سے ملاقات ہوئی۔

● ION رابطۃ الجامعات الاسلامیہ کے جلسہ میں شرکت کے لئے مراکش کا سفر کیا۔

● مراکش کے بادشاہ شاہ حسن سے ملاقات کی۔

● شاہ خالد سے ملاقات۔

● ۱۹۷۷ء: مسٹر اندرا گاندھی آپ سے ملنے کے لئے آپ کے گاؤں تکیہ آئیں۔

● سابق وزیر اعظم مسٹر چندر شیکھر اور حالیہ وزیر اعظم مسٹر اٹل بہاری واجپئی آپ سے ملنے کے لئے ندوہ آئے۔

● امریکہ کی مشہور تنظیم M.S.A. کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے امریکہ کا سفر کیا۔

● امریکہ کی پانچ مشہور یونیوسٹیوں، کولمبیا یونیورسٹی (نیویارک) ہارورڈ یونیورسٹی) کیمبرج) ڈٹرائٹ یونیورسٹی (آن آربر) کیلی فورنیا یونیورسٹی (لاس انجلس) اور ایوڑا یونیورسٹی (سالٹ لیک سٹی) میں لکچر دیئے۔

● فلاڈالیلفیا (امریکہ) میں دائیں آنکھ کا آپریشن ہوا اور آنکھ کی معذوری جاتی رہی۔ عظیم باکسر محمد علی کلے نے آپ سے ملاقات کی۔

● ۱۹۷۸ء: پاکستان تشریف لے گئے، ایشیائی کانفرنس میں شرکت کی، کانفرنس کی صدارت جنرل ضیاء الحق صدر پاکستان اور نائب صدر حضرت مولانا منتخب ہوئے۔

● ایوان صدر میں جنرل ضیاء الحق صدر پاکستان سے ملاقات۔

● اسلامی نظریاتی کونسل نے آپ کے اعزاز میں استقبالیہ دیا۔

● ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے صدر حکیم محمد سعید کی دعوت پر پاکستانی دانشوروں کو خطاب کیا۔

● سپریم کورٹ پاکستان کے چیف جسٹس انوار الحق نے آپ سے ملاقات کی۔

● کراچی یونیوسٹی علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی (اسلام آباد) زرعی یونیورسٹی (فیصل آباد) پنجاب یونیورسٹی (لاہور) میں تقاریر ہوئیں۔

● جسٹس مشتاق چیف جسٹس پنجاب ہائی کورٹ (جنھوں نے ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کا فیصلہ دیا تھا) کی دعوت پر بار ایسوسی ایشن میں وکلا و جج صاحبان سے خطاب کیا۔

● مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے ان کی قیام گاہ پر ملاقات کی۔

● مشہور امریکن نومسلمہ مریم جمیلہ سے ملاقات ہوئی۔

● ۱۹۷۹ء: عرب ممالک کے وزرائے اوقاف کی میٹنگ میں رابطہ عالم اسلامی کی نمائندگی کی۔

● سیرت کانفرنس میں شرکت کے لئے قطر گئے۔

● قطر کے ولی عہد و وزیر دفاع سے ملاقات ہوئی۔

● ۱۹۸۰ء: شارجہ کے حکمراں سلطان بن محمد القاسمی آپ سے ملنے کے لئے لکھنؤ تشریف لائے۔

● عراق کے صدر صدام حسین کے خصوصی ایلچی کی ندوہ آمد، آپ کو صدر صدام حسین کی طرف سے عراق کا دورہ کرنے اور آپ کی زیر صدارت منعقد ہونے والی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی دعوت۔

● اُردن کی علمی اکیڈمی کے رُکن منتخب ہوئے۔

● فیصل ایوارڈ ملا، ایوارڈ کی رقم آپ نے افغان پناہ گزینوں، جماعت تحفیظ القرآن اور مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے لئے مختص فرمادی۔

● دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ جشن کے موقعہ پر وہ تاریخی تقریر فرمائی جس کی گونج آج بھی اسی طرح سنائی دے رہی ہے۔

- ۱۹۸۱ء: کشمیر یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری تفویض کی۔
- ۱۹۸۲ء: مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر منتخب ہوئے۔
- ۱۹۸۳ء : اُردن کے ولی عہد امیر حسن سے ملاقات ہوئی۔
- دبئی کا سفر۔
- عرب امارات یونیورسٹی کے گرلس کالج اور العین یونیورسٹی میں محاضرہ دیا۔

کویت کا سفر۔

- کویت یونیورسٹی کے سائنس کالج اور جمیعۃ الاصلاح الاجتماعی میں تقریر کی۔
- لندن کا سفر اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں اسلامک سنٹر کا افتتاح اور اس کی صدارت۔
- ۱۹۸۴ء سعودی عرب کا سفر اور عالمی رابطۂ ادب اسلامی کا قیام عمل میں آیا اور اس کے صدر منتخب ہوئے۔
- ایرانی رہنما آیت اللہ خمینی سے ملاقات ہوئی۔
- بنگلہ دیش کا سفر۔
- اسلامک فاؤنڈیشن اور ڈھاکہ کی مرکزی مسجد بیت المکرّم میں خطاب کیا اور بنگالی ادیبوں اور صحافیوں کے سامنے تقریر کی۔
- اردن اور یمن کا سفر کیا۔
- صنعاء یونیورسٹی (یمن) اور یرموک یونیورسٹی (اردن) میں تقریر کی۔
- یمن کے صدر علی عبداللہ صالح سے ملاقات ہوئی۔
- یمن کے وزیر اعظم عبدالعزیز عبدالغنی سے ملاقات۔
- یمن کے ایئر فورس اور ٹینک ڈیویژن سے خطاب کیا۔
- پاکستان کا سفر۔
- پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے کراچی آکر آپ سے ملاقات کی اور آپ

نے ان کو مسجد اقصیٰ کا مرمری ڈھانچہ پیش کیا۔

● جس میں اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ مسجد اقصیٰ کی بازیافت ایک صاحب ایمان صدر کی ذمہ داریوں میں سے ہے۔

● علامہ سید سلیمان ندویؒ کی کتاب ''سیرت النبیؐ'' کی ساتویں جلد پر آپ کے مقدمہ پر حکومت پاکستان نے ایک لاکھ روپئے کا انعام دیا۔ انعام کی رقم آپ نے نصف دارالمصنفین اعظم گڑھ اور نصف علامہ سید سلیمان ندویؒ کی اہلیہ محترمہ کو دے دی۔

● ۱۹۸۵ء: آکسفورڈ یونیورسٹی میں اسلامک سنٹر کو قانونی شکل حاصل ہوئی۔

برسیلز اور بلجیم اور لکسم برگ کا سفر کیا۔

● لکسم برگ میں واقع ادارہ تحقیقات اسلام کی مجلس عاملہ کے جلسہ میں شرکت اور اس کی صدارت کی۔

● ۱۹۸۶ء: ترکی اور پاکستان کا سفر ہوا۔

● صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق سے ملاقات ہوئی۔

● سعودی عرب کا سفر اور جدہ میں آپ کے اعزاز میں کئے گئے جلسہ میں شرکت۔

● الجزائر کا سفر اور ملتقی الفکر الاسلامی میں شرکت۔

● دہلی، ناگپور، اور پونا میں ڈائیلاگ کا انعقاد اور ہندو دانشوروں کے سامنے آپ کی تقاریر ہوئیں۔

● آپ کی حکیمانہ اور مخلصانہ قیادت میں مسلم خواتین مطلقہ بل میں پارلیمنٹ میں پاس ہوا۔

● ۱۹۸۷ء : ملیشیا کا سفر کیا۔

● قومی یونیورسٹی، ٹکنالوجی یونیورٹی، ملیشن یونیورسٹی، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی میں خطاب کیا۔

● لندن کا سفر اور سینٹ کراس کالج میں عبدالعزیز المطوع لکچرز سیریز کا افتتاح کیا۔

- سعودی عرب کا سفر اور رابطہ عالم اسلامی کی سلور جبلی میں شرکت۔
- ۱۹۸۸ء: عرب امارات کا سفر۔
- شارجہ کے حاکم شیخ سلطان محمد القاسمی سے ملاقات، ابوظبی، دبئی اور شارجہ میں محاضرات ہوئے۔
- ۱۹۸۹ء: انگلستان اور ترکی کا سفر۔
- سابق وزیر اعظم ترکی نجم الدین اربکان سے ملاقات۔
- ۱۹۹۰ء سعودی کا سفر۔
- ولی عہد سلطنت امیر عبداللہ ابن عبدالعزیز، ریاض کے گورنر امیر سلمان ابن عبدالعزیز سعودی عرب کے وزیر دفاع امیر سلطان سے ملاقاتیں ہوئیں۔
- بابری مسجد ورام جنم بھومی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے سابق گورنر بہار یونس سلیم صاحب اور سابق گورنر آندھرا پردیش شری کرشن کانت اور (سابق نائب صدر ہندوستان) کے ساتھ کانچی پورم کے دوشنکر اچاریہ شری رام اچاریہ، دوسرے شری وجیندر اچاریہ سے مدراس جا کر ان کے مٹھ میں گفتگو کی۔
- وزیر اعظم ہند شری وشنوناتھ پرتاب سنگھ سے ملاقات۔
- ۱۹۹۱ء: عراق نے کویت پر قبضہ کیا تو آپ نے عوامی جذبات کی پرواہ کئے بغیر اس قبضہ کو غیر اخلاقی، غیر شرعی اور غیر عقلی قرار دیتے ہوئے کھل کر اس کی مذمت فرمائی۔
- سعودی عرب کا سفر اور رابطہ عالم اسلامی کے خصوصی اجلاس میں شرکت۔
- افغانستان کے سابق وزیر اعظم عبدرب الرسول سیاف سے ملاقات ہوئی۔
- شام کے وزیر اعظم ڈاکٹر معروف والدوالینی سے ملاقات ہوئی۔
- ترکی کے سابق وزیر اعظم نجم الدین اربکان سے ملاقات ہوئی۔
- بابری مسجد کے مسئلہ پر ہندو مذہبی پیشواؤں سے گفتگو اور وزیر اعظم سے ملاقات،

پیام انسانیت کا جلسہ اور ممتاز ہندو دانشوروں کی شرکت۔

● سعودی عرب کے فرمانروا شاہ فہد بن عبدالعزیز کو خط لکھ کر سعودی معاشرہ کو اسلامی معاشرہ بنانے پر زور دیا۔

● اُردو اکیڈمی یوپی کی طرف سے مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ کا اعلان کیا گیا، ایواڈ کی رقم آپ نے مولانا پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے مختص فرمادی۔

● ۱۹۹۲ء: حکومت ہند کا ایک اعزاز پدم بھوشن قبول کرنے سے معذرت کی۔

انگلستان کا سفر۔

● اسلامک فاؤنڈیشن مارک فیلڈ (لیسسٹر شائر) اسلامک سینٹر ریجنٹ پارک لندن میں خطاب کیا۔

● سنٹر فار اسلامک اسٹڈیز کے جلسۂ انتظامی میں شرکت۔

● اسلامک سنٹر اور ازبکستان کی حکومت کے مابین امام بخاری کی یادگار قائم کرنے کے سلسلے میں ایک معاہدہ کیا۔

● ۱۹۹۳ء: آکسفورڈ میں اسلام کے تاریخی وثقافتی اٹلس کے منصوبہ کو آخری شکل دی۔

● شکاگو (امریکہ) میں دنیا کے تمام مذاہب کی عالمی کانفرنس میں شرکت کی۔

● ازبکستان، تاشقند اور بخارا کا سفر کیا۔

● امام بخاری کے نام سے موسوم ایک علمی مرکز کا افتتاح کیا۔

● ۱۹۹۴ء: سرسید ہاؤس (علی گڑھ) میں یونیورسٹی کے اساتذہ سے خطاب کیا۔

● لندن کا سفر کیا۔

● آکسفورڈ میں واقع بروکس یونیورسٹی میں تقریر کی۔

● دارالعلوم ندوۃ العلماء پر سی، بی، آئی نے چھاپہ ڈالا۔

● زخمی طلبہ کے لئے حکومت کی طرف سے ایک لاکھ روپئے کا اعلان اور آپ کا انکار۔

- ۱۹۹۵ء: آپ کی سرپرستی میں تحفظ مدارس کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔
- قطر کا سفر
- دوحہ یونیورسٹی میں تقریر، عرب خواتین کے پروگرام میں شرکت اور اُن سے خطاب۔
- ۱۹۹۶ء سابق وزیر اعظم دیوے گوڑا کی آپ سے ملاقات کے لئے ندوہ آمد اور بی، جے پی کا اس پر اعتراض۔
- ترکی میں آپ کے اعزاز میں ایک سیمینار کا انعقاد اور اُس میں آپ کی شرکت۔
- کلید کعبہ پیش کی گئی اور درِ کعبہ کھولنے کی سعادت حاصل ہوئی۔
- ۱۹۹۷ء: رابطۂ ادب اسلامی کی کانفرنس میں شرکت کے لئے لاہور کا سفر۔
- صدر پاکستان فاروق احمد لغاری کی کانفرنس میں شرکت اور آپ سے ملاقات۔
- قادیانیت کے موضوع پر ندوہ میں ایک عالمی سیمینار۔
- نئی تعلیمی پالیسی کے خلاف آپ کی دعوت پر ندوۃ العلماء میں دینی تعلیمی کونسل کا جلسہ۔
- ۱۹۹۸ء دوبئی حکومت کی طرف سے عالم اسلام کی ممتاز شخصیت کا ایوارڈ ملا، ایوارڈ کی رقم (ایک کروڑ بیس لاکھ) دینی مدارس اور تعلیمی مراکز میں تقسیم کردی گئی۔
- وزیر اعظم اٹل بہاری باجپئی نے اپنے لاہور کے بس سفر میں آپ سے ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی، آپ نے صحت کی خرابی کی وجہ سے اس سفر سے معذرت کی۔
- سرکاری اسکولوں میں وندے ماترم اور سرسوتی وندنا لازمی قرار دئے جانے پر آپ کا سخت ردعمل۔
- رائے بریلی میں آپ کے مہمان خانہ پر رات میں پولیس کا چھاپہ اور خانہ تلاشی، جس پر پورے ملک میں زبردست احتجاج کیا گیا، اور عرب دُنیا نے سخت ردعمل ظاہر کیا۔
- آپ کے سخت رویے کو دیکھتے ہوئے نہ صرف یہ کہ سرسوتی وندنا کے احکامات منسوخ کردیئے گئے بلکہ وزیر تعلیم کو بھی برطرف کردیا گیا۔

- بنگلور میں میڈیا سینٹر کا افتتاح کیا۔
- اُردن کا سفر۔
- امیر حسن سے ملاقات۔
- شاہی محل میں آپ کے اعزاز میں دعوت اور وزراء اور حکومت کے اعلیٰ ذمہ داروں سے آپ کا خطاب۔
- ۱۹۹۹ء: علالت۔
- سعودی سفیر کی عیادت کے لئے ندوہ آمد۔
- وزیر اعظم اٹل بہاری باجپئی، سابق وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ عیادت کے لئے ندوہ آئے۔
- ندوۃ العلماء میں ملکی سطح پر منعقد ہونے والے تبلیغی اجتماع میں خطاب۔
- سلطان برونائی الحاج حسن البلقیہ کے نام سے برونائی حکومت نے ایوارڈ دیا۔
- ۳۰ر دسمبر ہندوستانی جہاز کے اغوا کاروں سے مسافروں کی رہائی کی اپیل کی۔
- ۳۱ر دسمبر مطابق ۲۲ر رمضان جمعہ کی نماز سے پہلے داعی اجل کو لبیک کہا۔

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن ندویؒ کی

اردو تصانیف

مرتب: محمد طارق زبیر ندوی

اسمائے کتب	صفحات	ناشرین	اشاعت اول
آئندہ نسلوں کے لیے اسلام کی ضمانت	۳۲	دینی تعلیمی کونسل، لکھنؤ	۱۹۸۵
آج آپ سید احمد شہید کی دعوت کے امین بن رہے ہیں	۲۲	صدیقی ٹرسٹ، کراچی	-
آنکھوں کی سوئیاں	۱۲	مکتبۂ اسلام، لکھنؤ	-
اپنے گھر سے بیت اللہ تک	۱۲۷	اردو مراٹھی پرکاشن، پونے	۱۹۹۰
ارکان اربعہ	۳۸۴	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۸۱
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے	۲۴	حلقہ پیام انسانیت، لکھنؤ	۱۹۷۵
اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں	۳۶	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۷۷
اسلام کے قلعے	۷۰	شعبہ تعمیر وترقی، ندوہ، لکھنؤ	۱۹۹۰
اسلام کے معاشرتی و خاندانی نظام اور ملی تشخص کی حفاظت میں خواتین کا کردار	۱۲	انجمن خواتین اسلام، لکھنؤ	-
اسلام ایک مکمل دین مستقل تہذیب	۳۹	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	-
اسلام اور مغرب	۳۰	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۸۳
اسلامیات اور مغربی مستشرقین ومسلمان مصنفین	۸۸	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۸۲
اسلام بیداری کے لہر پر ایک نظر	۴۸	دعوت اکیڈمی، اسلام آباد	۱۹۸۹
اسلامی مزاج وماحول کی تشکیل میں حدیث کا بنیادی کردار	۴۵	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۸۲
اسلامی ملکوں میں نظام تعلیم کی اہمیت اور وہاں کی قیادت وفکری رجحانات میں اس کے دوررس اثرات	۲۴	شعبہ تعمیر وترقی، ندوہ، لکھنؤ	۱۴۱۰ھ
اسمائے حسنیٰ	۲۴	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۹۰

اصلاحیات	۱۷۲	اردو مراٹھی پرکاشن، پونے	۱۹۸۹
الاعلام بمن فی تاریخ الہند من الاعلام کا تعارف	۱۶	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۴۱۴ھ
اقوام عالم کے درمیان امت اسلامیہ کا حقیقی وزن	۲۹	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۴۱۵ھ
امت اسلامیہ کا مستقبل خلیجی جنگ کے بعد	۲۴	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۹۱
امت کے وفود آقا کے حضور میں	۳۲	مکتبہ ملی، کراچی	-
امت مسلمہ کا فرض منصبی اور اس کے انقلابی اثرات	۲۴	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۹۲
امت مسلمہ کی دوہری ذمہ داریاں	۲۲	دار عرفات، رائے بریلی	۱۹۸۱
انسان کی تلاش	۱۵	مکتبہ اسلام، لکھنؤ	-
انسانیت کی رہنمائی میں اسلام کا عظیم کردار	۲۴	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۸۷
انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر	۴۰۰	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	-
انسانیت کی صحیح گرہ کشائی	۱۰	صدیقی ٹرسٹ، کراچی	-
انسانیت کے محسن اعظم	۳۲	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۸۹
انسانی علوم کے میدان میں اسلام کا انقلابی وتعمیری کردار	۷۸	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۸۸
ایک اہم دینی دعوت	۷۲	مجلس نشریات اسلام، کراچی	-
ایک بہتر ہندوستانی سماج کی تشکیل میں اسلام کیا حصہ لے سکتا ہے؟	۴۴	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۸۱
بارہ دن ریاست میسور میں	۶۲	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۳۹۲ھ
بچوں کے لیے سیرت النبیؐ	۲۰۸	مکتبہ مدینہ، لاہور	۱۹۹۴
بصائر	۵۶	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۹۶
پاجا سراغ زندگی	۲۰۰	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۷۳
پرانے چراغ (حصہ اول تا سوم) بالترتیب	۴۹۴، ۴۳۱، ۳۳۰	مکتبہ فردوس، لکھنؤ	۱۹۹۴
پندرہویں صدی ہجری۔ ایک تاریخی جائزہ	۶۲	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۸۰
پیام انسانیت	۸۸	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	-
تاریخ دعوت وعزیمت جلد اول تا جلد پنجم صفحات بالترتیب		مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۳۹۹ھ
تبلیغ دین کے لیے ایک اہم اصول	۱۶	الفرقان بک ڈپو، لکھنؤ	-
تبلیغ ودعوت کا معجزانہ اسلوب	۱۵۲	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	-
تحریک آزادی اور اصلاح عوام میں ادب اسلامی کا حصہ	۲۴	رابطہ ادب اسلامی، ندوہ، لکھنؤ	۱۹۸۹
تحریک پیام انسانیت	۲۱	حلقہ پیام انسانیت، ندوہ، لکھنؤ	-

تحفظ شریعت کے لئے مسلمانوں کا اتحاد	۲۰ یوپی۔ ایکشن کمیٹی مسلم پرسنل لا بورڈ، لکھنؤ	۱۹۸۵
تحفۂ انسانیت	۲۳۲ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۷۷
تحفۂ بھٹکل	۱۰۴ مکتبہ ندویہ، لکھنؤ	۱۹۸۹
تحفۂ پاکستان	۸۷ مجلس نشریات اسلام، کراچی	۱۹۸۴
تحفۂ دکن	۸۴ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۸۳
تحفۂ دین ودانش	۱۱۰ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۸۷
تحفۂ کشمیر	۱۰۴ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	دوم ۱۹۹۲
تحفۂ مشرق	۶۸ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۸۴
تحقیق وانصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ	۶۸ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۳۹۹ھ
تذکرہ مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ	۱۴۲ مکتبہ دارالعلوم ندوہ، لکھنؤ	-
تذکرہ مولانا محمد الیاس اوران کی دینی دعوت	۳۲۸ مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد، کراچی	۱۹۷۹
ترکی کی مجاہد ملت اسلامی	۳۰ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۸۹
تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک	۱۷۴ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	دوم ۱۴۱۰ھ
تعلیم ودعاء	۴۰ دارالاشاعت، انجمن تعلیم اسلامی، حیدرآباد، سندھ	-
تہذیب وتمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات	۱۴۴ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۸۶
جب ایمان کی بہار آئی	۲۷۱ مکتبۂ فردوس، لکھنؤ (سوم)	۱۴۰۲ھ
جب پڑھے لکھے آدمی پر ہسٹریا کا دورہ پڑتا ہے	۲۴ حلقہ پیام انسانیت، لکھنؤ	۱۹۷۸ء
جزیرۃ العرب اور عالم انسانیت: ایک مکالمہ ایک پیام	۲۰ شعبہ تعمیر وترقی، ندوہ، لکھنؤ	۱۹۵۰
جو لوگ ظالم ہیں ان کی طرف مت جھکو	۲۲ صدیقی ٹرسٹ، کراچی	-
جہاد زندگی اور انبیاء علیہم السلام کا راستہ	۲۴ ادارہ تصنیفات واشاعت اسلام، جونپور	۱۹۶۵
حالات کا نیا رخ	۱۶ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۸۲
حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب		۱۹۷۹
امیدوں اور اندیشوں کے درمیان	۱۱۱ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	
حج کے چند مشاہدات واحساسات	۵۶ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۴۰۲ھ
حدیث پاکستان	۱۸۵ مجلس نشریات اسلام، کراچی	۱۹۷۹
حرمین شریفین کے بیرونی مقیمین کی ذمہ داریاں وحقوق	۳۱ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۸۶
حکومت کی تبدیلی سے سبق اور آئندہ کیلئے صحیح طریقہ کار	۱۶ حلقہ پیام انسانیت، لکھنؤ	-
حیات مولانا حکیم سید عبدالحیٔ حسنی	۴۳۰ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۷۰

خدمت دین وعلم کے دائمی اور ابدی امکانات	۱۶	مکتبہ دارالاسلامیہ، بستی	۱۴۱۴ھ
خطبۂ افتتاحیہ	۱۹	آل انڈیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کنونشن، دہلی	۱۹۹۳
خطبۂ افتتاحیہ	۸	آل انڈیا مسلم پولیٹکل کنونشن، دہلی	۱۹۷۰
خطبۂ صدارت	۲۰	ریاستی دینی تعلیمی کانفرنس، مرادآباد	۱۹۶۹
خطبۂ صدارت	۲۳	ریاستی دینی تعلیمی کانفرنس، لکھنؤ	۱۹۷۵
خطبۂ صدارت	۲۳	پیام انسانیت، لکھنؤ	۱۹۸۰
خطبۂ صدارت	۱۳	علاقائی دینی تعلیمی کانفرنس، بستی	۱۹۸۳
خطبۂ صدارت	۳۱	کیمپ آفس آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، لکھنؤ	۱۹۸۶
خطبۂ صدارت	۳۸	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۸۹
خطبۂ صدارت	۲۴	کیمپ آفس آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، لکھنؤ	۱۹۹۱
خطبۂ صدارت	۱۶	دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش، لکھنؤ	۱۹۹۲
خطبۂ صدارت	۲۳	دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش، لکھنؤ	۱۹۹۴
خطبۂ صدارت	۸	انسٹی ٹیوٹ آف انڈسٹری ٹکنالوجی	-
خطرۂ ارتداد اور اس کا حل	۳۲	انجمن طلبہ، بھٹکل	۱۴۱۴ھ
خلفائے اربعہ	۴۷	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۹۱
خواتین اور دین کی خدمت	۸۸	مکتبہ اسلام، لکھنؤ	-
خواص: ملت میں ان کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں	۲۴	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۷۲
دریائے کابل سے دریائے یرموک تک	۳۰۴	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۷۳
دستور حیات	۲۴۰	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ (سوم)	۱۹۹۵
دنیا میں آنے والے انسان: چمن کے کانٹے یا پھول	۳۱	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۷۸
دو انسانی چہرے: قرآنی مرقع میں	۲۹	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۳۹۲ھ
دو روزے	۲۰	دار عرفات، رائے بریلی	۱۴۱۵
دو ہفتے ترکی میں	۱۱۵	مجلس نشریات اسلام، کراچی	-
دین حق اور علمائے ربانی شرک وبدعت کے خلاف کیوں؟	۵۶	مکتبہ عثمانیہ، رائے بریلی	۱۴۰۳ھ
دین حق اور دعوت اسلام	۲۴	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۹۲
دینی عربی مدارس کا تعلیمی، تربیتی اور وطنی کردار	۲۰	شعبہ نشر واشاعت، ندوۃ العلماء، لکھنؤ	۱۹۹۲
ذکر خیر (مرحومہ والدہ محترمہ کی سوانح حیات)	۱۴۰	مکتبہ اسلام، لکھنؤ (سوم)	۱۳۹۴ھ
ذہنی واعتقادی ارتداد: ایک اہم مسئلہ	۲۶	صدیقی ٹرسٹ، کراچی	-

رمضان اور اس کے تقاضے	۵۶	الٰہی بخش اکیڈمی، مظفر نگر، کاندھلہ	۱۳۹۴ھ
روشنی کا مینار	۱۶	شعبہ نشر و اشاعت، مدرسہ قاسم العلوم سیالکوٹ	۱۹۷۶
زبان و ادب کی اہمیت اور اس کی ضرورت	۱۸	صدیقی ٹرسٹ، کراچی	۱۴۱۳ھ
زندہ رہنا ہے تو میر کارواں بن کر رہو	۲۴	مکتبہ حراء، لکھنؤ	۱۴۱۳ھ
سوانح حیات حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ	۳۵۲	مکتبہ اسلام، لکھنؤ (چہارم)	۱۹۹۴
سوانح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی	۳۲۰	مکتبہ اسلام، لکھنؤ	۱۴۰۳ھ
سوانح محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ	۱۹۲	ادارہ اشاعت دینیات، نئی دہلی	۱۹۸۶
سیرت سید احمد شہید (جلد اول)	۵۸۸	مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۳۹
سیرت سید احمد شہید (جلد دوم)	۵۸۸	مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ (چہارم)	۱۹۹۰
سیرت محمدیؐ دعاؤں کے آئینے میں	۴۸	ادارہ اسلامیات، جامع مسجد، دہلی	۱۳۹۲ھ
سیرت نبوی اور عصر حاضر میں اس کی معنویت و افادیت	۲۴	مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۹۲
سیرت نبوی کے مطالعہ کی دعوت	۲۸	انجمن اسلام، بمبئی	۱۹۸۰
سیرت و کردار کی تبدیلی کی ضرورت	۱۸	صدیقی ٹرسٹ، کراچی	۱۹۸۶
شرعی عائلی قوانین پر عمل کے بارے میں مسلمانوں کا			۱۹۸۵
غیر جانب دارانہ احتساب اور دعوت فکر و عمل	۲۳	دفتر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، بمبئی	
شرق اوسط کی ڈائری (۱۹۵۱ء کا سفرنامہ)	۵۱۴	مکتبہ فردوس، لکھنؤ (دوم)	۱۹۸۴
شرق اوسط میں کیا دیکھا	۹۴	مکتبہ تعلیمات اسلام، لکھنؤ	۱۹۵۳
صحبتے با اہل دل	۳۷۶	کتب خانہ الفرقان، لکھنؤ	۱۹۹۲
صورت و حقیقت	۲۰	مکتبہ اسلام، لکھنؤ	۱۹۴۹
طالبان علوم نبوت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں	۴۸	مکتبہ دارالعلوم، لکھنؤ	-
طاقت کا اصل مرکز نصرت ایمانی	۲۴	صدیقی ٹرسٹ، کراچی	۱۴۰۴ھ
عالم عربی کا المیہ	۲۰۰	مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ	-
عالم عربی کا تازہ المیہ	۸	مسلم انٹلکچول فورم، لکھنؤ	۱۹۹۰
عالم عربی کے لئے سب سے بڑا خطرہ	۳۲	مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ	۱۴۱۱ھ
عرب قوم پرستی اسلامی نقطہ نظر سے خطرناک کیوں؟	۴۸	مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۶۴
عصر جدید کا چیلنج	۳۷	مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ	۱۴۳۱ھ
عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح	۱۲۸	مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۷۸
علمائے ربانی، ان کا منصب اور ان کے کام کی نوعیت	۳۴	صدیقی ٹرسٹ، کراچی	-

علم کا مقام اور اہل علم کی ذمہ داریاں	۱۶	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۴۰۲ھ
فسادات اور ہندوستانی مسلمان	۱۶	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۴۱۲ھ
قادیانیت: اسلام اور نبوت محمدی کے خلاف ایک بغاوت	۴۸	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۵۳
قادیانیت: تحلیل وتجزیہ	۱۹۲	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۸۸
قرآن کا مطالبہ	۳۱	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۸۸
قصہ دو باغ والے کا	۱۸	صدیقی ٹرسٹ، کراچی	-
کاروان ایمان وعزیمت	۱۷۵	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۸۴
کاروان زندگی جلد اول (خودنوشت سوانح حیات)	۵۱۸	مکتبہ اسلام، لکھنؤ (دوم)	۱۴۱۵ھ
کاروان زندگی جلد دوم (خودنوشت سوانح حیات)	۴۲۰	مکتبہ اسلام، لکھنؤ	۱۹۸۴
کاروان زندگی جلد سوم (خودنوشت سوانح حیات)	۴۲۱	مکتبہ اسلام، لکھنؤ	۱۹۸۸
کاروان زندگی جلد چہارم (خودنوشت سوانح حیات)	۴۳۰	مکتبہ اسلام، لکھنؤ	۱۹۹۱
کاروان زندگی جلد پنجم (خودنوشت سوانح حیات)	۳۵۸	مکتبہ اسلام، لکھنؤ	۱۹۹۴
کاروان زندگی جلد ششم (خودنوشت سوانح حیات)	-	مکتبہ اسلام، لکھنؤ	-
کاروان زندگی جلد ہفتم (خودنوشت سوانح حیات)	-	مکتبہ اسلام، لکھنؤ	۱۹۹۸
کاروان مدینہ	۱۹۲	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۷۸
کل مسلمان اور مکمل اسلام	۳۱	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۴۵۱ھ
انسانی وتہذیبی جاہلیت کا المیہ	۳۲	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۷۲
محبت فاتح عالم	۸	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۳۹۴ھ
محسن عالم	۴۶	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۷۵
مدارس ومکاتب کا قیام سب سے ضروری چیز	۱۶	مدرسہ ضیاء العلوم، رائے بریلی	-
مدرسہ کیا ہے؟	۲۸	شعبہ نشر واشاعت جامع الہدایت، جے پور	۱۳۹۶ھ
مذہب وتمدن (۱۹۴۲ء جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی)	۱۱۲	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۴۰۰ھ
مذہب یا تہذیب	۱۶	مکتبہ اسلام، لکھنؤ	۱۹۷۸
المرتضیٰ	۴۶۴	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ (دوم)	۱۹۸۹
مرد خدا کا یقین	۳۱	مکتبہ اسلام، لکھنؤ	۱۹۶۷
مسلمانان ہند سے صاف صاف باتیں	۵۶	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ (دوم)	۱۴۱۱ھ
مسلمانان ہند کے لئے صحیح راہ عمل	۹۲	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۸۷
مسلمان غیر اسلامی ماحول میں	۱۰	صدیقی ٹرسٹ، کراچی	-

مسلمانوں کے مسائل، جذبات کو سمجھنے کی کوشش کیجئے	۴۶	کل ہند مجلس استحکام و یکجہتی، لکھنؤ	۱۴۰۶ھ
مسلم پرسنل لا بورڈ: خدمات و سرگرمیاں	۳۰	آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، ندوہ، لکھنؤ	-
مسلم پرسنل لا کی صحیح نوعیت و اہمیت	۲۴	مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ (دوم)	۱۴۰۶ھ
مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش	۳۴۲	مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ (چہارم)	۱۹۹۶
مطالعہ قرآن کے اصول و مبادی	۱۹۶	مکتبہ اسلام، لکھنؤ	۱۹۸۱
معرکۂ ایمان و مادیت	۱۳۲	مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ (چہارم)	۱۴۰۴ھ
مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں	۱۸۷	مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۷۳
مغربی میڈیا کا چیلنج اور اہل علم کی ذمہ داریاں	۱۶	مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ	-
مقام انسانیت	۸۰	مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ	۱۳۴۹ھ
مکاتیب حضرت مولانا محمد الیاسؒ	۱۴۴	کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد، دہلی	-
مکاتیب یورپ	۶۴	مکتبہ اسلام، لکھنؤ	-
ملت کا تحفظ، تحریک نفاذ شریعت اور غلبہ اسلام	۲۳	صدیقی ٹرسٹ، کراچی	۹۸۷
ملک کا حقیقی مسئلہ اور اس کے لئے اصلی خطرہ	۳۵	پیام انسانیت فورم، لکھنؤ	۱۹۸۰
ملک کا خطرناک رخ اور دانشور طبقہ کی ذمہ داری	۳۰	حلقہ پیام انسانیت، لکھنؤ	۱۹۸۳
ملک کا معاشرہ انتہائی خطرناک موڑ پر ہے	۳۲	مجلس تحقیقات نشریات اسلام، لکھنؤ	۱۴۰۷ھ
ملک و معاشرہ کا سب سے خطرناک مرض ظلم و سفاکی	۳۲	تحریک پیام انسانیت، لکھنؤ	۱۴۱۳ھ
ملک کی آزادی کا صحیح مطلب اور فائدہ	۱۶	تحریک پیام انسانیت، لکھنؤ	۱۴۱۳ھ
ملک کی نازک صورتحال اور محب وطن کی ذمہ داریاں	۲۲	تحریک پیام انسانیت، لکھنؤ	۱۹۸۸ء
ملک کے نوجوان اور ان کی ذمہ داریاں	۲۴	آل مسلم یوتھ کونسل، لکھنؤ	-
مناقب اور مدح صحابہ کے جلسوں کا پیغام	۳۱	طلبہ بھٹکل، ندوۃ العلماء، لکھنؤ	۱۴۱۱ھ
منصب نبوت اور اسکے عالی مقام حاملین	۲۸۶	مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۷۵ء
موجودہ حالات میں ہندوستانی مسلمانوں کیلئے راہ عمل	۱۶	مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ	۱۴۱۱ھ
موجودہ عالم اسلام کیلئے فیصلہ کن محاذ اور مرکزی میدان عمل	۲۴	مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ	۱۴۱۷ھ
مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت	۳۲۸	ادارہ اشاعت دینیات، نئی دہلی	۱۹۷۹ء
مولانا سید طلحہ صاحب، ایم۔اے	۳۴	صدیقی ٹرسٹ، کراچی	-
نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں	۱۳۹	مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ (سوم)	۱۹۹۰ء
نبوت کا اصلی کارنامہ	۲۴	مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ	۱۹۹۲ء
نبی خاتمؐ اور دین کامل	۴۵	مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ	۱۴۰۷ھ

نبی رحمتؐ	۲۴۹	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ (سوم)	۱۴۰۹ھ
نشان راہ (۱۹۴۸ء کا مقالہ)	۳۱	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ (چہارم)	۱۴۰۰ھ
نشان منزل (تحفہ بھٹکل)	۱۰	مجلس نشریات اسلام، کراچی	-
نقوش اقبال	۳۲۵	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنو (ہشتم)	۱۴۱۴ھ
نیا طوفان اور اس کا مقابلہ	۴۰	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ (دوم)	۱۴۱۲ھ
نیپال میں طلبہ علوم دینیہ اور عامۃ المسلمین سے خطاب	۲۴	دارالعلوم نورالاسلام، جلباپور، نیپال	۱۴۱۳ھ
ہدایت وتبلیغ کی اہمیت (برما کی تقریر)	۵۰	صدیقی ٹرسٹ، کراچی	-
ہندوستانی سماج کی جلد خبر لیجئے	۲۴	مکتبہ اسلام، لکھنؤ	۱۹۴۹ء
ہندوستانی مسلمان: ایک تاریخی جائزہ	۲۴۰	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ (سوم)	۱۹۹۲ء
ہندوستانی مسلمان: ایک نظر میں	۱۲۸	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ (چہارم)	۱۹۸۵ء
یہ اخلاقی گراوٹ کیوں؟	۲۰	مکتبہ اسلام، لکھنؤ	-
یورپ، امریکہ اور اسرائیل	-	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ	-

نوٹ: مذکورہ فہرست کے مطابق مولانا مرحوم کی کل کتابیں ۲۰۵ ہیں۔ واضح ہو کہ مولانا مرحوم کی تصنیفی زبان عربی یا اردو ہی ہے ان کی اکثر اہم کتابیں اصلاً عربی میں ہیں جن کا اردو میں ترجمہ ہوا ہے۔ لیکن بعض اہم کتابیں مثلاً ''تاریخ دعوت وعزیمت'' اور ''کاروان زندگی'' وغیرہ اصلاً اردو میں تصنیف کی گئی تھیں جن کے عربی ترجمے شائع ہوئے۔ عالم عرب میں ہونے والی بعض تقاریر اور مقالات صرف عربی میں ہیں۔ جبکہ بعض سفرنامے، تذکرے اور برصغیر ہندوپاک اور بنگلہ دیش کی سطح پر منعقد ہونے والی بعض کانفرنسوں کے صدارتی خطبات صرف اردو میں ہیں۔ مولانا طارق ندوی کی مرتب کردہ فہرست اور معلومات کے مطابق مولانا کی کل عربی تصنیفات ۱۶۷ اور اردو تصنیفات کی مجموعی تعداد ۱۸۰ ہے۔ لہٰذا مذکورہ فہرست میں اردو کتب کی تعداد ۲۰۵ تک ہونے کا ایک سبب یہ ہے کہ اس میں بعض وہ کتابچے بھی شامل ہیں جو کسی بڑی اور اصل کتاب کا حصہ ہیں اور افادہ عام کے لئے شائع کئے گئے ہیں۔ (ادارہ)

مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی

خطبہ استقبالیہ

بھٹکل کی دینی، علمی اور سماجی سرگرمیوں کا تعارف

(منعقدہ کل ہند سیمینار عالمی رابطہ ادب اسلامی ۸/اکتوبر ۲۰۰۰ء بمقام جامعہ اسلامیہ بھٹکل)

الحمدلله رب العالمين ، مالك يوم الدين و الصلاة و السلام على سيد المرسلين خاتم النبيين و امام المتقين و على آله و صحبه اجمعين۔

امابعد! قابل احترام صدر محفل، مہمانان عظام، مندوبین سیمینار اور معزز سامعین!

یوں تو بھٹکل کے نیلگوں وبیکراں آسمان نے صدہا جلسے اس حجازی صفت سرزمین پر اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ لیکن آج کا یہ دینی، تاریخی، روحانی اور ادبی سیمینار اپنی پوری تاریخ میں ممتاز ونمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ جلسے اس سے بڑے بھی ہوئے، جس میں اس سے کئی گنا لوگوں نے شرکت کی اور مقصدیت کے اعتبار سے اس سے اہم بھی جس میں ملت کے سلگتے مسائل پر غور وخوض کیا گیا لیکن آسمان علم وعمل کے اتنے تاروں کا بیک وقت اجتماع کمیت وکیفیت دونوں اعتبار سے اس خطہ میں پہلی دفعہ ہورہا ہے۔ اس وقت یہاں مدارس عربیہ کے ذمہ داران بھی ہیں اور یونیورسٹیوں میں اپنے شعبہ کے سربراہان بھی، آپ کو یہ سن کر مسرت آمیز حیرت بھی ہوگی کہ ان معزز مہمانوں نے اتنا طویل سفر خود اپنے ذاتی مصارف پر کیا ہے۔ ان سب کو سب سے پہلے تو دین کی نسبت نے اپنے وقت

ومال کی قربانی پر آمادہ کیا، اس کے بعد عالمی رابطہ ادب اسلامی کے بانی وروح رواں اور سالار قافلہ سے خصوصی تعلق نے جن کو ملت نے امت کے لئے ان کی غیر معمولی تڑپ وکڑھن کے پیش نظر مفکر اسلام کا عظیم خطاب دیا تھا۔ حسن اتفاق سے اس سہ روزہ سیمینار کا ایک حصہ خود آپ کی ادبی خدمات کے لئے بھی خاص ہے، اس بستی کے کوہ قامت پہاڑوں، بحیرہ عرب کی اوپر اٹھتی لہروں اور یہاں کی حسین وادیوں نے وہ دن بھی دیکھے جب اس شہر کو اپنا وطن ثانی کہنے والا اور پیار سے اس کو بیت الکل یعنی سب کا گھر کہہ کر یاد کرنے والا، اللہ کا یہ بندہ یہاں آتا تو عید کا سماں ہوتا، گھر گھر خوشی کی لہر دوڑتی اور فرحت ومسرت کا ایک عجیب ماحول ہوتا اگر وہ آج بقید حیات ہوتا اور اپنے خون جگر سے سینچے گئے گلشن رابطہ کے کارواں کو خود اپنے محبوب ادارہ جامعہ اور ہر دلعزیز شہر بھٹکل میں رواں دواں دیکھتا تو اس کی زبان پھر ایک بار خدا کی حمد وثنا سے تر ہوتی اور اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں ہوتا، اسی طرح اس کے جانثار رفیق اور مخلص صدیق، فخر نوائط مرحوم محی الدین منیری صاحب کی زندگی بھی وفا کرتی تو مرشد کی طرح اس مسترشد کی آنکھوں سے بھی بے اختیار مسرت کے آنسو جاری ہوتے، منیری صاحب کی اخیر تک دیرینہ خواہش رہی کہ رابطہ کا ایک کل ہند سیمینار حضرت مولانا کی سرپرستی میں یہاں ہو جس سے ملک گیر سطح پر جامعہ کا علمی ودینی وقار بلند ہو لیکن افسوس کہ خادم ومخدوم دونوں ان تاریخی ویادگار لمحات سے پہلے ہی راہی جنت ہوئے۔ وکان امر اللہ قدرا مقدورا۔

ویراں ہے میکدہ خم وساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

اللہ اپنے دونوں بندوں کے درجات بلند فرمائے۔ اور ان کے گلشنوں کی تا قیامت نگہبانی فرمائے آمین۔

معزز سامعین! میں رابطہ ادب اسلامی کی مقامی شاخ، جامعہ اسلامیہ بھٹکل

وآس پاس کے تمام دینی اداروں اور مسلمانوں کی جانب سے اس سیمینار کے مندوبین کا تہہ دل سے استقبال کرتا ہوں اور دل کی گہرائیوں سے ان کو خوش آمدید کہتا ہوں، عالمی رابطہ ادب اسلامی کی بھٹکل شاخ آج سے ڈھائی سال پہلے مفکر اسلام ہی کی زیر صدارت ایک جلسہ میں قائم ہوئی تھی۔ اس کی مختلف سرگرمیوں کے علاوہ گذشتہ سال اہل نوائط کی ادبی ودینی خدمات کے موضوع پر تنظیم ہال اور جامعہ میں رابطہ کے صدر مرحوم کی سرپرستی میں ایک تاریخی سیمینار بھی ہوا تھا، یہ اس کے موجودہ میر کارواں مخدومی حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب ندوی دامت برکاتہم کی بے پناہ شفقتیں ہیں کہ چند ماہ قبل اس شاخ کا دائرہ ملک کی پوری جنوب مغربی ساحلی پٹی یعنی گوا سے کیرلا تک وسیع کردیا گیا۔ اور بھٹکل والوں پر اس کے ذمہ داروں کے اعتماد کا مزید ثبوت بھی اس سے ملا کہ بھٹکل ہی کو اس کا مرکز اور صدر دفتر رکھنے کا حکم بھی دیا گیا۔ اس پر ہم اسی مالک حقیقی کے حضور سجدہ ریز ہیں جس نے ہمارے اکابر کے دلوں میں یہ حسن ظن پیدا کیا۔

معزز مندوبین! بھٹکل کی دینی علمی، سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کے متعلق اگر کچھ سننا چاہتے ہیں تو آپ مجھے اجازت دیں کہ میں اس کا صرف ایک جملہ میں تعارف کراؤں بھٹکل کیا ہے؟ بھٹکل اللہ رب العزت کی رحمتوں کا ایک چھوٹا سا مظہر ہے اور اس کی بے پناہ عنایتوں کی ایک ادنی سی جھلک جس کا خلاصہ اقبال مرحوم کے اس مصرعہ میں ہے۔ ع

رنگ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

برصغیر کے مشہور عالم دین اور معتمد تعلیمات دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب ندوی نے ایک جگہ اپنے سفرنامہ میں جب یہ لکھا کہ:

> ''علامہ اقبال اگر دیکھتے تو اردو ادب کا ایک عظیم خسارہ ہوتا اور ان کی نظم ''آرزو'' شاید وجود میں نہیں آتی جس میں ان کی خواہش تھی کہ ان کو دنیا کے جھمیلوں سے یکسو ہو کر کسی پرسکون وادی

میں زندگی کے پر کیف لمحات گذارنے کا موقع ملے۔ بھٹکل دیکھنے
کے بعد ان کو یہ کہنے کا موقع ہی نہیں ملتا''۔

ہمارے ملک کے مشہور صاحب قلم مولانا رضوان القاسمی صاحب نے جب یہ پڑھا تو ان کو شاید یقین نہیں آیا اور اس کا عینی مشاہدہ کرنے کے لئے یہاں بنفس نفیس تشریف لائے اور واپس جا کر حیدرآباد کو یہ خبر دی کہ:

''یہاں کا ظاہری حسن و جمال کا اصل وصف نہیں بلکہ یہاں کا دینی ماحول اور اسلامی معاشرہ اس کا اصل امتیاز ہے۔ ابن بطوطہ کو کوئی مورخ مانے یا نہ مانے لیکن اس کی عالمی سیاح کی حیثیت تو اس کے مخالفین کو بھی تسلیم ہے، اس نے جتنی دنیا دیکھی اس صدی میں اس کی نظیر نہیں ملتی، کیا شام، کیا مصر، کیا چین اور کیا سندھ لیکن کیا بات تھی کہ جب وہ بھٹکل پہنچا تو اپنے سفرنامے میں اس کو یہ لکھنا پڑا کہ میں نے اس علاقے میں بعض اسلامی خصوصیات ایسی دیکھی جس کی نظیر مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ چھوٹی سی بستی، چند ہزار کی آبادی، ہر بچی حافظ قرآن، ۲۳ دینی مدارس، ہر خاتون برقعہ پوش، مسجدیں آباد، مسلمان دین دار، تہذیب عربی، ثقافت دینی اور تمدن اسلامی''

مشہور مؤرخ مولانا ابوظفر ندوی نہ بھٹکل کے تھے اور نہ انھوں نے بھٹکل دیکھا تھا اور نہ یہاں کے لوگوں سے ان کے روابط تھے لیکن وہ تاریخ کی ورق گردانی کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ برصغیر میں پوری چودہ صدیوں کی تاریخ میں اگر سندھ کے بعد کہیں خالص عربی اسلامی حکومت قائم تھی تو اسی علاقہ میں تھی یعنی آٹھویں صدی ہجری میں سلطان جمال الدین محمد بن حسن کی سلطنت۔

مفکر اسلام علیہ الرحمہ نے جب یہ لکھا کہ بھٹکل میرے لئے رائے بریلی کی

طرح ہے اور جامعہ ندوہ کی طرح تو اس کو بعض لوگوں نے مولانا کی وسعت ظرفی پر محمول کیا لیکن آپ کی وفات کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ آپ کی زندگی کے لاکھوں میل دعوتی سفر کا اختتام بھٹکل ہی پر ہوا۔ اس کے بعد وفات تک آپ نے کوئی سفر نہیں کیا اور چودہویں دفعہ آید پر آپ کے اعزاز میں منعقدہ ایک جلسہ میں آپ نے بحالت صحت نہ صرف بھٹکل کے مسلمانوں سے بلکہ عالم اسلام کے مسلمانوں سے اپنے آخری خطاب میں اس بات کو پھر ایک بار دہرایا کہ بھٹکل اپنی گوناگوں دینی خصوصیات اور اسلامی امتیازات کی وجہ سے پورے عالم اسلام کے لئے ایک نمونہ کی بستی بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

معزز حاضرین جلسہ! بھٹکل نیویارک کی طرح نہ وسیع شہر ہے اور نہ دمشق کی طرح قدیم، نہ شملہ کی طرح سرد، نہ لکھنؤ کی طرح تاریخی، نہ دہلی کی طرح سیاست کا محور، اور نہ ممبئی کی طرح تجارت کا مرکز، سچی بات یہ ہے کہ زیادہ صحیح الفاظ میں یہ شہر کہلانے کے قابل نہیں بلکہ ایک بڑا قصبہ ہے البتہ اس کو قدرت نے فطری حسن و جمال سے غیر معمولی طور پر نوازا ہے۔ تین طرف پہاڑوں سے گھرے بحیرہ عرب کے کنارے وادیوں کے دامن میں ناریل کے خوبصورت باغات کے سایوں میں واقع اس بستی کی تاریخی اور جغرافیائی اہمیت بھی کچھ کم نہیں ہے۔ سلطنت خداداد اور عہد ٹیپو میں یہاں اس کی فوجی تربیت گاہ تھی اور یہی شہر اس کے بحری بیڑے کا مرکز بھی تھا، اسی اہمیت کے پیش نظر حکومت ہند اس وقت اسی ساحل پر ''کاروار'' شہر میں ایشیا کا سب سے بڑا بحری فوجی اڈہ تعمیر کر رہی ہے۔ بھٹکل ملک کے دیگر مسلمانوں کے لئے قابل رشک اس لئے بھی ہے کہ مرور زمانہ وانقلابات عصر کے ساتھ اگرچہ یہاں کے مسلمانوں میں اپنے اسلامی تشخصات کو تھامے رکھنے اور اس التزام میں فرق آیا ہے لیکن ان سب کے باوجود حمیت دینی، غیرت اسلامی، امن پسندی، مہمان نوازی، خاکساری وملی ہمدردی کے وہ اسلامی نمونے اب بھی ان میں موجود ہیں جس سے یہ پورا علاقہ جغرافیائی طور پر نہ سہی تہذیبی وثقافتی اور

دینی خصوصیات کے اعتبار سے ایک جزیرہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ نسلاً عرب اور مسلکاً شافعی، مزاجاً توسع پسند اور عملاً تاجر ہیں۔ صحیح تاریخی روایات کے مطابق سندھ پر محمد ابن قاسم کے حملہ اور گجرات میں مبلغین اسلام کی آمد سے بھی بہت پہلے یہاں اسلام کا پیغام عہد نبوی ہی میں یہاں آنے والے عرب تاجروں کے ذریعہ پہنچ گیا تھا۔ مشہور صاحب تصوف عالم مخدوم علی مہائمی جو بمبئی شہر میں مدفون ہیں اسی قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں، ان ہی عرب بادیہ نشینوں، توحید کے پرستاروں اور شمع حق کے پروانوں کی زبانی اس پورے علاقہ میں توحید کا نغمہ اس کی فضاؤں میں پہلی بار گونجا یہاں اس وقت آباد مسلمان جن کو عرف عام میں اہل نوائط کہا جاتا ہے ان ہی عرب مبلغین کی اولاد ہیں اس وقت سے لے کر آج تک یہاں کے مسلمان اپنے جماعتی نظام کے ساتھ اسلامی اخوت واتحاد کا برابر ثبوت دے رہے ہیں بقول ثانی مرحوم :

جو ساز یہاں پر چھڑتا ہے　　کہتے ہیں حرم کا ساز ہے وہ
سینوں میں ہے جو بھی راز یہاں　　دراصل حجازی راز ہے وہ
جو گونجتی ہے آواز یہاں　　جادو سے بھری آواز ہے وہ
جو دل نہ کھنچے اس کی جانب　　بے سوز ہے وہ بے ساز ہے وہ

الحمدللہ یہاں صدیوں سے قضاء کا جماعتی نظام جاری ہے، حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب نے پہلی دفعہ بھٹکل اپنی آمد کے موقع پر برسبیل تذکرہ کہا کہ بہار کا نظام قضاء پورے ملک کے لئے نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے تو یہاں کے محکمہ شرعیہ کی قدامت کو سن کر ان کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ بہار اگر ملک کے لئے نمونہ ہے تو بھٹکل بہار کے لئے۔ دونوں محکمہ شرعیہ کی طرف الحمدللہ آج بھی نہ صرف تمام عائلی مسائل میں بلکہ اکثر مالی معاملات میں بھی مسلمانوں کا رجوع ہے۔

مسلمانوں کی سیاسی اور سماجی معاملات میں رہنمائی کے کل ہند مجلس مشاورت

کا کامیاب تجربہ ملک کی تاریخ کا ایک سنہرہ باب ہے۔ جس کو دوبارہ تحریک دینے کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے لیکن یہاں اسی نہج پر قائم مجلس اصلاح و تنظیم کے ماتحت بھٹکل وآس پاس میں سو سال سے مسلمانوں کی اجتماعیت کو سیاسی وسماجی معاملات میں برقرار رکھنے کی کامیاب کوششوں کا یہ حال ہے کہ پارلیمانی اور اسمبلی الیکشنوں کے موقع پر تنظیم کا حتمی فیصلہ لوگ اپنے مزاج وذوق اور سیاسی وابستگیوں کو بالائے طاق رکھ کر ماننے کے آج بھی الحمدللہ پابند ہیں۔

اسلامی تشخص کو باقی رکھتے ہوئے نونہالانِ ملت کو عصری تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے تحریک علی گڈھ کے طرز پر قائم انجمن حامی مسلمین کے ماتحت پرائمری سے لے کر کالج تک میں مسلمانوں کی خود کفیلی کا یہ عالم ہے کہ انجینیرنگ کالج تک مقامی مسلمان، حکومت کی کسی مالی امداد کے بغیر چلا رہے ہیں اور ملک کے دیگر مسلم انجینیرنگ کالجوں کے برخلاف جمعہ کو تعطیل ہوتی ہے اور اس وقت انجمن کے ماتحت پانچ ہزار سے زائد طلباء تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

دینی تعلیم کے خاطر ندوۃ العلماء کے نقش قدم پر چلتے ہوئے جامعہ اسلامیہ کی نظیر پورے ملک میں اس حیثیت سے نہیں ملتی کہ ایک ہزار سے زائد طالبان علوم نبوت میں مکتب سے عالمیت تک ۹۰ ٪ فیصد مقامی طلبہ ہیں، قیام وطعام میں وظیفوں کا وہ تصور نہیں جو عام طور پر مدارس میں جاری ہے، الحمدللہ خوشحال گھرانوں کی بھی بھرپور نمائندگی ہے۔ ڈھائی سو کے قریب علماء صرف اس قوم سے عالمیت اور فضیلت کی تکمیل کر چکے ہیں۔ پورے برصغیر میں یہ مسلک شافعی کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ اس کا کتب خانہ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اور بعض حیثیتوں سے بقول مفکر اسلامؒ ملک کے مرکزی کتب خانوں سے بھی ممتاز اور فائق ہے حضرت مولانا عبدالحمید صاحب ندویؒ کے تربیت یافتہ شاگردوں ڈاکٹر علی صاحب ملپا، مرحوم منیری صاحب اور سعد جعفری وڈی برادران کے

قائم کردہ اس ادارہ کی ملک گیر شہرت میں ندوۃ العلماء کی تعلیمی سرپرستی سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا اور بجا طور پر فارغین جامعہ زبان حال سے اپنے مادر علمی ندوۃ العلماء سے یوں مخاطب ہیں۔

اس بزم کی برکت سے بخشا
فطرت نے پر پرواز ہمیں
چلتے ہیں ہوا کے دوش پہ ہم
کہتا ہے ہر اک شہباز ہمیں
خود بڑھ کر بناتی ہے فطرت
ہمراز ہمیں دمساز ہمیں
اللہ نے اپنے فضل وکرم سے
بخشا یہ اعجاز ہمیں

کچھ یہی حال مقامی نمائندگی میں بچیوں کی دینی تعلیم کے لئے قائم جامعۃ الصالحات کا بھی ہے جہاں ساڑھے پانچ سو سے بھی زائد ہائی اسکول وکالجز سے فارغ عالمیت کے کورس میں زیر تعلیم طالبات میں سو فیصد مقامی نمائندگی ہے۔

اسلامی غیر سودی بینکنگ کے نام سے یوں تو ملک میں متعدد ادارے موجود ہیں لیکن بہت کم سود کی آمیزش اور شائبہ سے خالی ہیں، یہاں ویلفیر سوسائٹی کے تحت چلنے والے اسلامی بینک میں رائج نظام قابل دید ہے۔ اب تک اٹھارہ سالہ کے مختصر وقفہ میں چالیس ہزار سے زائد لوگوں کو دو سو ملین روپئے غیر سودی قرض دئے جاچکے ہیں۔

اس کے علاوہ دیگر دینی وعصری تعلیمی ادارے تحفیظ القرآن، مدرسہ قوۃ الاسلام عمر اسٹریٹ، شمس اسکول اور نونہال سینٹر اسکول وغیرہ بھی اپنی امتیازی خصوصیات کی وجہ سے اس پورے ساحلی علاقے کے اپنے ہم عصر اداروں میں امتیازی شان رکھتے ہیں۔

خلیجی ممالک میں قائم بھٹکل جماعتوں کا وفاق بھٹکل مسلم خلیج کونسل اپنے مقاصد اور کامیاب سرگرمیوں کے اعتبار سے ملک کے موجودہ حالات میں مسلمانان ہند کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ ہیں، نوجوانوں کے متعدد اسپورٹس سینٹرس اور اداروں میں بھی دینی چھاپ ہے اور نوجوان علماء ہی زیادہ تر اس کی عملاً قیادت کر رہے ہیں۔ ان سب سینٹروں پر مشتمل یوتھ فیڈریشن کا وفاق بھی سننے سے نہیں بلکہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ غرض یہ کہ شہر و آس پاس میں الحمدللہ اب بھی سیاسی اور سماجی اور ثقافتی معاملات میں دین وعلم کا غلبہ ہے، ان سب کے ساتھ بھٹکل کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اپنے وقت کے صلحاء وعلماء اور اولیاء کی اس کو غیر معمولی دعائیں اور شفقتیں حاصل رہی ہیں۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ تو اپنی بے پناہ عنایتوں کی وجہ سے خود فرد قوم معلوم ہوتے تھے۔ ہماری قوم کے حصہ میں اکابر امت میں ان ہی کا سب سے زیادہ حصہ رہا ہے۔ اس وقت مصلح امت مخدومی حضرت مولانا شاہ ابرارالحق صاحب دامت برکاتہم کی جامعہ کی سرپرستی کی نسبت سے خصوصی دعائیں ہمارے لئے سب سے بڑا سرمایہ ہے۔

معزز مندوبین! آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس شہر کو نظر بد سے محفوظ رکھے اور دین پر استقامت کے ساتھ توحید خالص پر قائم رکھے۔

اخیر میں پھر ایک بار میں اس سیمینار کے تمام مندوبین وحاضرین کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو ملک کے مختلف شہروں دہلی، علی گڈھ، بھوپال، لکھنؤ، پونہ، ممبئی، اورنگ آباد، حیدرآباد، کیرلا اور بنگلور وغیرہ سے تشریف لائے اور امید کرتا ہوں کہ حسب سابق آپ شہر کے مسلمانوں کو اپنی دعاؤں میں فراموش نہیں کریں گے۔

وماعلینا الا البلاغ

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم وتب علينا انك انت التواب الرحيم

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی

دفتر رابطہ ادب اسلامی کا قیام

الحمدللہ بھٹکل میں رابطہ ادب اسلامی کی شاخ قائم ہے جس کے تحت متعدد سمپوزیم و پروگرام ۱۹۹۷ء ہی سے بشمول ایک کل ہند سیمینار بھی منعقد ہو چکے ہیں، ۲۱ر جون ۲۰۰۱ء کو رابطہ کے روح رواں وعالمی نائب صدر حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی دامت برکاتہم کی بھٹکل آمد کے موقع پر رابطہ کے ایک کل وقتی دفتر کا بھی قیام مولانا ابوالحسن ندوی اسلامک اکیڈمی کے مرکزی دفتر واقع صدیق نشیمن نزد شمس الدین سرکل بھٹکل عمل میں آچکا ہے، جہاں دفتر کی ذمہ داری دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فاضل مولوی عبدالحمید اطہر ندوی سنبھال رہے ہیں، اس دفتر کے قیام کے بعد حسب ہدایت مرکزی دفتر لکھنؤ اس کا دائرہ ریاست گوا تا کیرلا بشمول کرناٹک کے ساحلی اضلاع وسیع کر دیا گیا ہے اس سلسلہ میں الحمد اللہ تینوں ریاستوں سے رابطہ کے ایک وفد کے دورہ کیرلا کے بعد منتخب ادباء، شعراء اور علماء کا انتخاب عمل میں آچکا ہے، جس میں حسب ضرورت مزید ارکان کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔

چار سالہ رپورٹ برائے رابطہ ادب اسلامی مغربی ساحلی شاخ بھٹکل

پیش کردہ در سیمینار منیری صاحب حیات وخدمات

(منعقدہ ۲۱ر جون ۲۰۰۱ء بمقام جامعہ اسلامیہ بھٹکل)

الحمد لله رب العالمين و الصلاة و السلام على سيد المرسلين وعلى آله وصحبه أجمعين أما بعد!

اسلام میں ادب کی جو اہمیت ہے وہ اظہر من الشمس ہے، پورا قرآن مجید نہ صرف اسلامی بلکہ انسانی ادب کا مرجع ومصدر ہے، موجودہ زمانہ میں ادب اپنے دشمنوں کو زیر کرنے کا سب سے مؤثر اور کامیاب ہتھیار ہے، ذرائع ابلاغ کے تمام وسائل بھی ادب کے وسیع مفہوم ومعنی میں آجاتے ہیں، موجودہ عالمی تناظر میں اسلامی دعوتی تقاضوں کے پیش نظر ادب نے وہ اہمیت اختیار کی ہے جس کی نظیر ہماری پچھلی تاریخ میں مشکل ہی سے ملتی ہے، لیکن افسوس کہ تعمیری مقاصد کے لئے اس کا استعمال بہت ہی کم ہو رہا ہے، اخلاقی زوال اور انسانی قدروں کی پامالی میں ادب کے غلط ومنفی استعمال نے اہم رول ادا کیا ہے، مزید یہ کہ عالم اسلام میں بالخصوص اس پر ایسے اداروں کی اجارہ داری ہے جن کا خود اسلام پر اعتماد متزلزل ہے، ان کی تحریروں میں تشکیکی رجحانات پائے جاتے ہیں، نئی مسلم نسل میں فکری ارتداد کا سیلاب بھی اسی کے ذریعہ آرہا ہے، اسی پر طرہ یہ کہ تخریبی ومنفی مقاصد کے لئے اپنی ادبی صلاحیتوں کو صرف کرنے والے اپنے نظریاتی اختلافات کے باوجود مسلم امت میں فکری ارتداد پھیلانے کے لئے متحد بھی ہیں، اس پورے پس منظر میں عالمی سطح پر صحیح العقیدہ مسلم ادباء کا کوئی ایسا پلیٹ فارم نہیں تھا جس کے ذریعہ وسیع پیمانہ پر وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اسلام کی خدمت انجام دے سکیں، اگرچہ بعض جگہوں پر ملکی سطح پر یہ کام ہو رہا تھا، لیکن اس کا دائرہ بھی بڑا محدود تھا، بین الاقوامی سطح پر اسلامی دعوتی مقاصد کے لئے اس طرح کے کسی ادارہ کے قیام کا خیال سب سے پہلے الحمد للہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ہی کو آیا اور آپ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اس سلسلہ میں ۱۹۸۱ء میں ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد کیا، جس میں عالم اسلام کے چوٹی کے مفکرین وادباء اور مختلف یونیورسٹیوں کے اہم

ترین سربراہان شریک ہوئے، اس کے بعد ۱۹۸۴ء میں اس فکر کو عملی جامہ پہناتے ہوئے عالمی رابطہ ادب اسلامی کے نام سے مستقل تحریک اور ادارہ کی شکل دی گئی، اور آپ کو اس کے ممبران نے تاحیات بانی صدر منتخب کیا، اس رابطہ کے قیام کے بعد عالمی سطح پر مسلم ادباء میں جو خود اعتمادی پیدا ہوئی اور اس کا جو اثر ہوا اس کا اندازہ ان ہی لوگوں کو ہوسکتا ہے جو اس فن کے ماہرین کہے جاسکتے ہیں، علم وادب کا یہ قافلہ اپنے میر کارواں کی قیادت میں اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہا، اور اللہ تعالیٰ نے اس کو قبولیت سے نوازا، پوری دنیا بالخصوص عالم عرب میں اس کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی، الحمدللہ مراقش، مصر، اردن، ترکی، حجاز، ملیشیا، انڈونیشیا اور برصغیر کے دیگر ممالک میں بھی اس کی شاخیں قائم ہوئی، اسی دوران ۱۸/اگست ۱۹۹۷ء کو ناظم رابطہ مخدومی حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی مدظلہ العالی کی طرف سے راقم الحروف کے نام اس کے صدر دفتر کی طرف سے ایک سرکلر موصول ہوا کہ وہ بحیثیت رکن رابطہ مغربی ساحلی اضلاع نارتھ وساؤتھ کنارہ میں رابطہ کی ایک شاخ قائم کریں، اس کے دو ماہ کے وقفہ بعد ۳/اکتوبر ۱۹۹۷ء کو پٹنہ میں رابطہ کے سالانہ سیمینار میں معاون ناظم جامعہ اسلامیہ بھٹکل مولانا صادق صاحب ندوی کی قیادت میں ہمارے جامعہ کے ایک وفد نے شرکت کی جس میں راقم السطور بھی شامل تھا، اسی سفر سے واپسی کے بعد مولانا صادق صاحب کے مکان پر منعقدہ ایک نشست میں بھٹکل میں اس کی شاخ کے قیام کا فیصلہ کیا گیا، پھر ۲۰/مئی ۱۹۹۸ء کو رابطہ کے بانی مفکر اسلامؒ کی بھٹکل آمد کے موقع پر آپ ہی کی صدارت میں جامعہ اسلامیہ جامعہ آباد میں اس کا پہلا باضابطہ افتتاحی اجلاس بھی منعقد ہوا، جس میں شہر وآس پاس کے ادباء علماء اور عمائدین کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی، اس کے بعد اگلے سال ۱۹۹۹ء میں اہل نوائط کی ادبی علمی، سماجی اور تعلیمی خدمات کے موضوع پر ایک دوروزہ سیمینار حضرت مولاناؒ کی صدارت میں جامعہ میں منعقد ہوا جس کی ایک نشست مجلس اصلاح وتنظیم کے تعاون سے اس کے کانفرنس

ہال میں بھی منعقد ہوئی، اس سیمینار میں حضرت مولاناؒ کے علاوہ لکھنؤ سے حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی، مولانا واضح رشید صاحب ندوی، ناگپور سے مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب اور دہلی سے ڈاکٹر اجتباء صاحب ندوی وغیرہم بھی شریک تھے، سیمینار اس میں شریک مقامی اربابِ علم وفن کے مطابق پورے علاقہ میں اپنی نوعیت کا منفرد وکامیاب سیمینار تھا جس میں انجمن- تنظیم- جامعہ- جامعۃ الصالحات دونوں مقامی جماعتوں، شمس نرسری، اسلامی بنک اور نقش نوائط کے علاوہ مولانا خواجہ بہاؤ الدین اکرمی ندوی اور الحاج محی الدین منیری وغیرہم کی علمی ودینی خدمات کا جائزہ لیا گیا، پھر گذشتہ سال ۸/اکتوبر ۲۰۰۰ء میں جامعہ کے وسیع میدان میں جامعہ کے تعاون سے رابطہ کا برصغیر ومشرقی ممالک کا سترہواں سہ روزہ کل ہند سالانہ سیمینار بعنوان بچوں کا ادب اور بچوں کے ادب میں مفکر اسلامؒ کا حصہ کے موضوع پر منعقد ہوا جو رکن رابطہ مولانا نذر الحفیظ صاحب ندوی کی تعمیر حیات میں شائع شدہ رپورٹ کے مطابق رابطہ کی پوری تاریخ کا الحمدللہ اس معنی میں سب سے کامیاب سیمینار تھا کہ اس میں اب تک سب سے زیادہ ملک کے مختلف ۱۰۵/ادباء، علماء اور چوٹی کے اس فن کے ماہرین نے خود اپنے ذاتی اخراجات پر ہزاروں میل کا سفر طے کر کے شرکت کی، چونکہ سیمینار رابطہ کے بانی کی وفات کے بعد پہلی مرتبہ ایک سال چار ماہ کی تاخیر سے نیپال اور اعظم گڑھ میں منتوی ہونے کے بعد بھٹکل میں ہو رہا تھا اس لئے رابطہ کے ذمہ داروں کو اس کی کامیابی سے متعلق خدشات واندیشے تھے، لیکن محض فضل خداوندی سے پُرسکون ماحل میں روحانی ونورانی فضاء اور سکینت کی چادر تلے یہ سیمینار محتشم عبدالغنی صاحب صدر مجلس استقبالیہ مولانا عبدالعلیم صاحب قاسمی کنوینر اور مولانا عبدالرب صاحب ندوی نائب کنوینر کی قیادت، ناظم جامعہ ماسٹر شفیع صاحب کی نظامت اور مولانا عبدالباری صاحب کے اہتمام میں ذمہ داران جامعہ کے غیر معمولی عملی وذاتی تعاون، اس کے اساتذہ اور طلباء کی محنت اور مدرسہ تنویر

الاسلام مرڈیشور کی جزوی میزبانی اور بیرون میں مقیم رابطہ کے بعض مخلصین کے خصوصی تعاون سے صرف اور صرف خدا کی مدد اور نصرت سے ایسا کامیاب ہوا کہ عالمی شہرت یافتہ ادیب اور کل ہند انجمن ترقی اردو دہلی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم صاحب نے واپس دہلی جا کر میرٹھ اور اجراڑہ میں منعقد ایک جلسہ عام میں جس میں بقول شرکاء پچاس ہزار کے قریب عوام موجود تھے یہ اعلان کیا کہ بھٹکل میں رابطہ کے اس سیمینار میں شرکت سے پہلی دفعہ میں اسلامی ادب کا قائل ہوگیا، ورنہ میں اس سے قبل ادب کے اسلامی اور غیر اسلامی ہونے کا قائل نہیں تھا، فللہ الحمد اولاً و آخراً، اس سیمینار میں دہلی، لکھنؤ، علی گڑھ، بھوپال، اعظم گڑھ، اورنگ آباد، حیدرآباد، پونہ، مظفرنگر، جودھپور اور بنگلور وغیرہ کے علاوہ گجرات، اڑیسہ وغیرہ سے بھی لوگ شریک ہوئے، اس ملکی سطح کے سیمینار کی ایک نشست کی صدارت خود ہمارے رابطہ کے معزز رکن مولانا اقبال صاحب ملاّ ندوی کے حصہ میں بھی آئی جو بھٹکل والوں کے لئے ایک اہم اعزاز کی بات تھی۔

رابطہ کی مغربی ساحلی شاخ کی چار سالہ مختصر مدت میں آج کا یہ سیمینار اس کا چوتھا سیمینار ہے جو محسن بھٹکل، فخر نوائط الحاج محی الدین منیری صاحب سابق ناظم جامعہ اسلامیہ و جامعۃ الصالحات بھٹکل کی طرف منسوب اور ان کی حیات و خدمات کے لئے مختص ہے، مرحوم کی زندگی میں ادب و علم کا کتنا حصہ تھا، اور ان کی ملی خدمات میں اس کا شمار کیسے کیا جائے، اس پر شاید بعض حاضرین کو شبہ ہو لیکن اس سیمینار کے ذریعہ ان کے علم میں اس بات کا اضافہ ہو جانا چاہئے کہ منیری صاحب کی گوناگوں سماجی و تعلیمی خدمات نے ان کے اس گوشہ کو پردہ خفا میں رکھا تھا، وہ نوائطی زبان کے کامیاب شاعر تھے، ان کی متعدد نظمیں خود ان کی طرف سے شائع شدہ کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں، وہ ایک درجن سے زائد چھوٹی بڑی کتابوں کے مصنف تھے، جو آج بھی جامعہ کے کتب خانہ میں موجود ہیں، وہ برصغیر کے مشہور علمی مجلّہ ماہنامہ ''البلاغ'' بمبئی کے بانی اور مدیر مسئول تھے، جس

میں ان کے متعدد مضامین واداریوں سے ان کی علمی وادبی صلاحیتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اس کے علاوہ میں آپ کو پہلی دفعہ یہ حیرت انگیز اطلاع دے رہا ہوں کہ انھوں نے اپنی زندگی میں نوائطی زبان میں قرآن مجید کی تفسیر کا کام شروع کیا تھا، اور انتقال سے پہلے ایک پارہ کی تفسیر مکمل بھی فرمائی تھی جس کا مسودہ ابھی ہمیں دو تین ہفتے قبل دستیاب بھی ہوا ہے، اس کے علاوہ مقامی طور پر علم وادب اور شعر وسخن سے دلچسپی رکھنے والوں کی تربیت ونشو ونما میں بھی ان کا بڑا حصہ تھا، اس طرح وہ اس بات کے پوری طرح مستحق تھے کہ نئی نسل کو ان کے علمی ودینی کارناموں سے آگاہ کیا جائے، رابطہ کی ہماری شاخ کا ارادہ ہے کہ آئندہ اسی طرح کی قومی شخصیات کے کارناموں سے ملت کے نونہالان کو واقف کرانے کے لئے اس طرح کے سیمینار اور سمپوزیم منعقد کئے جائیں، ہمارے ایجنڈے میں اس وقت محسن بھٹکل مولانا عبدالحمید صاحب ندوی مرحوم کے علاوہ مخدوم فقیہ اسماعیل، مولانا شریف محی الدین اکرمی، مولانا خواجہ بہاؤ الدین ندوی وغیرہ کی بھی شخصیات ہیں۔

مجھے آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے بھی نہایت مسرت ہو رہی ہے کہ محض اور محض اللہ رب العزت کے فضل وکرم سے گزشتہ سال رابطہ مرکزی کے دفتر کی طرف سے ہمیں یہ سرکلر موصول ہوا کہ رابطہ بھٹکل شاخ کی حسن کارکردگی کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا دائرہ ریاست کیرلا تا گوا تک وسیع کر دیا گیا ہے، اور اس کو جنوبی مغربی ساحلی شاخ کا نام دیا گیا ہے، اہل بھٹکل کی امانت اور نیکی نیتی پر ان کے اعتماد کی بھی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے کہ اس میں مخدومی حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی مدظلہ العالی نے یہ شرط بھی رکھی ہے کہ تینوں ساحلی ریاستوں کا صدر دفتر لازمی طور پر بھٹکل ہی رہے گا، ان کے اس حسن ظن پر ہم ان کے بجائے اسی ذات بے ہمتا کے مالک ارض وسماء کے حضور سجدہ شکر بجالاتے ہیں جس نے ہم بھٹکل والوں کے متعلق ان کے دلوں میں محبت ڈالی، اللہ تعالیٰ

ان کے اس حسن ظن کی لاج رکھنے کی توفیق عطا فرمائے، ۱۵ رممبر ان پر مشتمل ان تینوں ریاستوں کے ممبران کی فہرست ان کی خدمت میں منظوری کے لئے پیش کی جارہی ہے۔

اسی کے ساتھ آج میں آپ کو یہ خوشخبری سناتا ہوں کہ ہمارے رابطہ کے مخلص اور دیرینہ ہمدرد محترم دامودی سعید صاحب نے بھٹکل میں اس کے روحانی سرپرست ومربی مفکر اسلام کی یاد میں انشاء اللہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ کی زیر سرپرستی قائم ہونے والے تحقیقی ادارہ مولانا ابوالحسن ندوی اسلامک اکیڈمی کے لئے چند سالوں کے لئے شاہراہ پہ واقع اپنا مکان صدیق نشیمن عاریتاً ہمیں دیا ہے اس میں رابطہ کا دفتر بھی قائم کرنے کی انہوں نے ہمیں اجازت دی ہے جس کا افتتاح آج ہی بعد نماز عصر حضرت مولانا دامت برکاتہم کے دست مبارک سے ہوگا، اس کے لئے ہم ان کے تہ دل سے ممنون ہیں۔

رابطہ کے مقامی ذمہ داران کی طرف سے میں پھر ایک بار رابطہ کے صدر دفتر کے ذمہ داران بالخصوص اس کے صدر محترم حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی اوران کے رفقاء ارباب جامعہ اور آپ سب کا استقبال کرتے ہوئے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ لوگ اپنی مصروفیات کے باوجود یہاں تشریف لائے۔

میں ذمہ داران جامعہ کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے رابطہ کی سرگرمیوں میں ہمیشہ ہمارا تعاون فرمایا اور پچھلے تینوں سیمیناروں کی طرح یہ سیمینار بھی ان ہی کے تعاون سے جامعہ میں منعقد ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

محی الدین منیری صاحب، حیات وخدمات

رابطہ ادب اسلامی بھٹکل کی طرف سے ایک تاریخی سیمینار

رپورٹ: ——————— ذاکرالحق سورپ جامعی عمری

۲۱/۶/۲۰۰۱ء بھٹکل میں عالمی رابطہ ادب اسلامی مغربی ساحلی شاخ بھٹکل کے زیر اہتمام ایک سیمینار بعنوان ''مرحوم محی الدین منیری حیات وخدمات'' حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی دامت برکاتہم صدر رابطہ ادب اسلامی مشرقی ممالک کی صدارت میں جامعہ اسلامیہ کے خوبصورت آڈیٹوریم میں منعقد ہوا، تلاوت قرآن اور نعت خوانی کے بعد جواد احمد سکری نے معلمات جامعۃ الصالحات کی جانب سے تیار کردہ منظوم تاثرات اپنی شیریں آواز میں سنائے، اس کے بعد بھٹکل کے مشہور شاعر جناب کوثر جعفری نے ''منیر قوم کی حسن عمل کی داستان'' نظم پیش کی، پھر مولانا محمد الیاس ندوی کنوینر رابطہ نے رابطہ اسلامی مغربی ساحلی شاخ (بھٹکل) کی چار سالہ رپورٹ پیش کی جس میں رابطہ ادب اسلامی کے قیام کے پس منظر، اس کی ضرورت اور تعمیری وبامقصد ادب کے ذریعہ دعوت وتبلیغ کی اہمیت پر مؤثر انداز میں روشنی ڈالی گئی تھی، مولانا نے یہ انکشاف کر کے سامعین کو حیرت میں ڈال دیا کہ مرحوم منیری صاحب نے مقامی زبان نوائطی میں تفسیر قرآن کا سلسلہ شروع کیا تھا اور ایک پارہ مکمل کر پائے تھے کہ مدت زیست مکمل

ہوگئی، حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی دامت برکاتہم نے اپنے جامع خطبہ صدارت میں مرحوم کو پر جوش خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں نے ان کو جب قریب سے دیکھا تو ان کا گرویدہ ہوگیا، ان کا درد، دلسوزی اور قوم وملت کے خاطر قربانی و جانفشانی نئی نسل کے لئے مشعل راہ ہے، بھٹکل کے علماء اور دانشوروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ ان حضرات کو بنانے اور سنوارنے میں مرحوم منیری صاحب کا بڑا حصہ ہے، انھوں نے نئی نسل پر زور دیا کہ وہ بزرگوں کی خدمات کو نگاہ تشکر سے دیکھیں۔

سیمینار میں بھٹکل کی مختلف تنظیموں اور اداروں اور نمایاں شخصیتوں کی جانب سے مرحوم کی حیات وخدمات پر بڑے فکر انگیز اور جامع مقالے پیش کئے گئے۔

قاضی عبدالعلیم صاحب نے مجلس ملیہ نوائط کالونی کی جانب سے مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم نے مسجد ملیہ کی تعمیر، نوائط کالونی میں ہائی اسکول کی شاخ کے قیام اور اس علاقہ میں غیر مسلموں کی طرف سے سینما گھر کی تعمیر کا منصوبہ ناکام بنانے میں قائدانہ رول ادا کیا جس کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

بعد ازاں مجلس اصلاح وتنظیم بھٹکل کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر حنیف شباب صاحب نے تفصیل سے اپنے گرانقدر مقالہ میں منیری صاحب کی خدمات اور روشن کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے مندرجہ ذیل پانچ اہم دینی وملی مسائل میں مرحوم کی ناقابل فراموش کوششوں کو خراج تحسین پیش کیا:

۱۔ اردو زبان کی حفاظت کا مسئلہ

۲۔ پارلیمان میں مسلمانوں کی نمائندگی کا قضیہ

۳۔ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ

۴۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اقلیتی کردار کی بحالی کا مسئلہ

۵۔ مسلم پرسنل لاء کی ملک گیر تحریک

انجمن حامی مسلمین کی طرف سے جناب یم جے خواجہ صاحب نے جامع مقالہ پڑھا جس میں انجمن کے لئے ان کی گرانقدر خدمات کا تفصیل سے ذکر تھا جبکہ جناب محتشم عبدالغنی صاحب نے منیری صاحب کے حالات زندگی اپنے مشاہدات کی روشنی میں قلم بند کر کے سنائے اور ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ خود ان کی تربیت و تعلیم میں مرحوم کی کوششوں کا خاصا دخل رہا۔

جناب مولانا قاضی فاروق صاحب ندوی نے ماضی کی تاریخ کے اوراق الٹتے ہوئے منیری صاحب کی دینی خدمات اور علمی کمالات کا کھلے دل سے اعتراف کیا اور انہیں اردو اور نوائطی زبان کا بہترین ادیب قرار دیا۔ جناب سعید دامودی صاحب نے اپنے مقالہ میں منیری صاحب کے قیام بمبئی کے حالات، ان کی سخت کوششوں، ماہنامہ ''البلاغ'' کی ادارت اور مشہور مؤرخ قاضی اطہر صاحب مبارکپوریؒ سے گہری دوستی اور وابستگی جیسے اہم واقعات کا تذکرہ کیا، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ مولانا نذر الحفیظ صاحب ندوی نے منیری صاحب کی زندگی کے تابناک گوشوں کا احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم بمبئی میں انجمن خدام النبی سے وابستہ تھے ایک دفعہ انھیں کثیر مشاہرہ کے ساتھ دوسری جگہ اسسٹنٹ مینجر کے عہدہ کی پیش کش کی گئی، مگر اس مرد فقیر نے انجمن خدام النبی کی قناعت پسند اور راہبانہ زندگی کو ترجیح دی نیز فرمایا کہ موسم حج کے وقت منی کی ہوش ربا گرمی تشنہ لب حاجیوں کو سیراب کرنا ان کی زندگی کا روشن ترین عمل تھا، مولانا واضح رشید صاحب ندوی کا عربی مقالہ مولانا اقبال صاحب ندوی نائیطے نے سنایا، مولانا واضح رشید صاحب نے سیمینار کے منتظمین کو مبارک باد دیتے ہوئے منیری صاحب کی ادارت میں نکلنے والے ماہنامہ البلاغ کو ادب اسلامی کا بہترین نمونہ قرار دیا، اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے منیری صاحب کے گہرے ربط و تعلق پر روشنی

ڈالی، مولانا عبدالمتین منیری صاحب کے مقالہ میں مرحوم کی زندگی کا پورا خاکہ پیش کیا گیا جس میں سب سے اہم اور قابل ذکر بات یہ تھی کہ منیری صاحب کے والد کو پیدل حج کرنے کا شرف حاصل تھا، نیز یہ کہ بمبئی میں انہیں مولانا شوکت علی کی صحبت وشفقت میسر آئی تھی، اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی عارفانہ وحکیمانہ صحبت سے بھی انہوں نے استفادہ کیا تھا، ماسٹر محمد شفیع صاحب ناظم جامعہ اسلامیہ بھٹکل نے اپنی تقریر میں جامعہ کی ابتدائی وبنیادی تاریخ کی روشنی میں منیری صاحب کی خدمات پر روشنی ڈالی، مولانا عبدالباری صاحب ندوی مہتمم جامعہ اسلامیہ بھٹکل نے سیمینار کی تجاویز پیش کیں جس میں ایک تجویز یہ بھی تھی کہ سیمینار میں پیش کئے گئے تمام مقالات شائع کئے جائیں تاکہ خاص وعام منیری صاحب کے کارناموں سے واقف ہوسکیں۔

مولانا خواجہ صاحب اکرمی ندوی اور مولانا شعیب صاحب ائیکری ندوی نے باری باری نظامت کے فرائض انجام دئے، اخیر میں مولانا عبدالعلیم صاحب قاسمی رکن رابطہ نے منیری صاحب کا بحیثیت بانی جامعۃ الصالحات تعارف کراتے ہوئے سرزمین بھٹکل میں اس ادارہ کی حسن کارکردگی اور اس کی وسیع اثرات اور معاشرہ میں ظاہر ہونے والے بہترین نتائج کا ذکر کیا اور تمام سامعین کا شکریہ ادا کیا، سیمینار میں پڑھے گئے مقالات سے منیری صاحب کی یادگار شخصیت کے خدوخال اور تابناک پہلو روز روشن کی طرح عیاں ہوگئے، ان کی مقبولیت اور ان کی خدمات کا منہ بولتا ثبوت واعتراف حاضرین مجلس کی وہ کثیر تعداد تھی جو بھٹکل واطراف واکناف کے علاقوں سے بارش کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جامعہ اسلامیہ کے خوبصورت اور وسیع اڈوٹوریم میں جمع تھی اور بڑے شوق واشتیاق، شائستگی اور وقار ومتانت سے مقالات سن رہی تھی، جس پر حضرت مولانا رابع صاحب ندوی نے اپنے خطبہ صدارت میں مسرت کا اظہار فرمایا۔

بھٹکل کی تاریخ کا یہ یادگار وتاریخی سیمینار ڈھائی بجے بحسن خوبی اختتام پذیر ہوا۔

ایک شام ملک کے مشاہیر شعراء کے ساتھ دفتر رابطہ میں

۱۵/اگست ۲۰۰۱ء بروز اتوار بعد نماز عصر مولانا ابوالحسن ندوی اسلامک اکیڈمی بھٹکل کے دفتر میں ملک کے چوٹی کے ارباب شعروسخن اور فکرونظر کے ساتھ ایک خصوصی نشست منعقد کی گئی جو رابطہ سوسائٹی بھٹکل کی طرف سے منعقدہ کل ہند مشاعرہ میں شرکت کے لئے بھٹکل تشریف لائے تھے، عصرانہ پر اکیڈمی کے دفتر میں ان کو مدعو کیا گیا تھا، اس میں لکھنؤ سے عالمی شہرت یافتہ ناظم مشاعرہ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی، ڈاکٹر اسلم پرویز اڈیٹر سہ ماہی ''اردو ادب'' کل ہند انجمن ترقی اردو دہلی، جناب ماجد دیوبندی اڈیٹر ماہنامہ ''ادبی میزان'' و پروفیسر جامعہ ملیہ دہلی اور استاذ شاعر نصرت گوالیاری جنرل سکریٹری ''تہذیب اردو'' دہلی کے علاوہ لکھنؤ، دہلی، کانپور، بنارس، حیدرآباد وغیرہ سے دیگر شعراء کرام اور اصحاب فکرونظر بھی حاضر تھے۔

قرآن مجید کی تلاوت سے اس نشست کا آغاز ہوا، تلاوت کے بعد جنرل سکریٹری نے اکیڈمی کے تعارف کے ساتھ اس مجلس کے انعقاد کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہماری اکیڈمی کے مختلف شعبوں میں سے ایک شعبہ عالمی رابطہ ادب اسلامی کی جنوب مغربی ساحلی شاخ بھٹکل کا ہے جو علم وادب سے متعلق ہے، اس شعبہ میں شعراء وادباء کی آراء ومشوروں سے استفادہ بھی کیا جاتا ہے، جنرل سکریٹری عالمی رابطہ ادب اسلامی کی اہمیت اور اس کی مختصراً تاریخ بیان کی، اور آخر میں مغربی ساحلی شاخ (بھٹکل) کی کاروائیوں پر روشنی ڈالی، اور ان اصحاب علم وفن کے شعروسخن پر ان کو مبارکباد پیش کی اور درخواست کی کہ آپ حضرات اپنے شعروسخن کا فن خالص اسلام، اخلاق اور انسانیت کی ترویج میں استعمال کریں، جس میں اپنی دین پسندی اور اسلام سے نسبت کا برملا اعلان ہو، اور اپنی اس سنجیدہ اسلامی کوشش کو جاری رکھتے ہوئے اس کو دوسروں تک پھیلانے کی بھی کوشش کریں، اس کا اجر آپ کو دنیا وآخرت میں ملے گا، جنرل سکریٹری نے شعراء سے التماس کیا کہ اگر رابطہ

ادب اسلامی کی طرف سے آپ کو اس کے پروگراموں اور سالانہ مذاکرہ علمی وسیمیناروں میں شرکت کی دعوت دی جائے تو آپ حضرات اس میں ضرور شرکت فرما کر اس کے دینی اور روحانی ماحول میں دو تین دن ضرور گزاریں۔

تعارفی گفتگو کے بعد حاضرین میں سے بعض نے اپنے تاثرات بیان کئے، ملک زادہ منظور احمد نے اکیڈمی کے منصوبوں کو سراہا، اور اسلامی ادب کے اس کام کی اہمیت کو واضح کیا، ڈاکٹر اسلم پرویز صاحب نے اس ادبی و دینی دعوت کو غیر مسلموں تک پہونچانے کی ضرورت کی طرف توجہ مبذول کرائی، اس کے بعد جناب ماجد دیوبندی صاحب نے حضرت مولاناؒ سے اپنی فکری ہمہ ہنگی کا بھی تذکرہ کیا، اور اپنی شعر گوئی کو اسلامی رخ دینے میں مولاناؒ کی کتابوں سے استفادہ کا خصوصی طور پر ذکر کیا۔

اس نشست میں اصحاب شعر وسخن کے علاوہ شہر کے علماء کرام بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔

پر تکلف عصرانہ پر مغرب کی اذان کے وقت اس نشست کا بخیر وخوبی اختتام ہوا۔

ارکان رابطہ کا دورہ کیرالا

بسلسلہ توسیع حلقہ رابطہ ادب اسلامی از ریاست گوا تا کیرالا بشمول کرناٹک ساحلی اضلاع

۸/۸/۱۹۹۹ء کو رابطہ کے صدر دفتر کی طرف سے اس کے دفتر بھٹکل کو موصولہ سرکلر کے مطابق اس بات کی اطلاع دی گئی تھی کہ رابطہ کی بھٹکل شاخ کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے ریاست گوا تا کیرالا بشمول کرناٹک کے ساحلی اضلاع کر دیا گیا ہے جس میں یہ بھی ہدایت تھی کہ ان تینوں ریاستوں کا صدر دفتر لازمی طور پر بھٹکل ہی رہے، اس سلسلہ میں رابطہ کی طرف مختلف میٹنگوں میں باہم تبادلہ خیال کے بعد یہ طے پایا تھا کہ رابطہ کے ارکان کے لئے مطلوبہ علمی وادبی شرائط اور کیرلا کے مخصوص باہمی فکری ونظریاتی اختلافات

کے پیش نظر بھٹکل سے اس کے ارکان پر مشتمل ایک وفد کے دورہ کے بعد ہی اس سلسلہ میں اراکین کا انتخاب کیا جائے، بھٹکل میں رابطہ کے دفتر کے قیام کے بعد مولانا شعیب صاحب ندوی نے وہاں جاکر حالات کا جائزہ لیا، جس کے بعد ان کی رپورٹ کی روشنی میں ۲۹ رجون ۲۰۰۱ء کو مولانا عبدالباری صاحب ندوی مہتمم جامعہ اسلامیہ بھٹکل کی قیادت اور مولانا فاروق صاحب ندوی سابق مہتمم جامعہ کی رفاقت میں نو ارکان پر مشتمل ایک وفد نے کیرلا کے مختلف اضلاع کا دوروزہ تفصیلی دورہ کیا، اور اس سلسلہ میں وہاں کی مختلف علمی وادبی تنظیموں اور شخصیات سے ملاقات کے بعد وہاں سے بعض اراکین کو اس حلقہ میں شامل کرنے کی صدر دفتر لکھنؤ سے سفارش کی، اس میں سرفہرست حسین مدہور صاحب تھے جو کالی کٹ میں فاروق کالج روضۃ العلوم کے پرنسپل اور ام القری سے فارغ ہیں، مفکر اسلام سے عقیدت بھی ہے، انھوں نے کیرلا میں رابطہ کی سرگرمیوں کے لئے ہر طرح کے تعاون کی پیش کش کی، اور اگلے کل ہند سیمینار کے لئے اپنی خدمات پیش کیں، دوم عبدالحمید مدنی شرمندی صاحب تھے جو ضلع ملپورم میں مقیم ہیں ہفت روزہ مجلّہ ''الشباب'' کے ایڈیٹر اور مختلف کتابوں کے مصنف ہیں، ملیالم زبان میں ان کا ترجمہ شدہ قرآن شریف مکہ مکرمہ سے شائع ہوا ہے، سوم یم یم محی الدین ندوی صاحب تھے جو کالی کٹ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، انھوں نے حضرت مولانا کی بعض کتابوں مثلاً ارکان اربعہ وغیرہ کا ملیالم میں ترجمہ بھی کیا ہے، چہارم ڈاکٹر بہاؤ الدین صاحب ندوی جو دارالہدی اسلامک اکیڈمی چماڈ کے پرنسپل ہیں، اس کے علاوہ بھی متعدد ارباب علم وادب سے ملاقات ہوئی، اور ان کے سامنے رابطہ کے بنیادی مقاصد کی روشنی میں ان کے تعاون اور دلچسپی کا عندیہ معلوم کیا گیا، ان تمام مذکورہ بالا شخصیات کا متعدد تحریکی تنظیموں سلفیت، جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت اور سنیت سے تعلق ہے، ہمارے اس وفد کے ارکان کا مجموعی تأثر یہ تھا کہ کیرلا کی مختلف دعوتی شخصیات کو مختلف نظریاتی وفکری اختلافات

کے باوجود رابطہ ہی کے پلیٹ فارم سے جوڑا جاسکتا ہے، اگر یہ لوگ رابطہ کے پلیٹ فارم پر باہم جمع ہوکر علم وادب اور فکر وفن کی خدمت میں لگ جائیں تو ان کی مسلکی سختی میں نرمی کا قوی امکان ہے، اس طرح دعوتی میدان میں کام کرنے والوں کے درمیان بنیادی مقاصد میں اشتراک کے ساتھ اجتماعی دینی خدمت کے لئے رابطہ کا یہ پلیٹ فارم کیرلا کی فضاؤں میں ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوسکتا ہے، وفد کی واپسی کی صبح ڈاکٹر احتشام صاحب ندوی سابق پروفیسر کالی کٹ یونیورسٹی سے بھی ملاقات ہوئی جو علی گڑھ سے اپنے ذاتی کام کے لئے یہاں تشریف لائے تھے، رابطہ کے ارکان کے انتخاب کے سلسلہ میں ان سے بھی باہم تبادلہ خیال ہوا، اور انہوں نے اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔

مذکورہ بالا رپورٹ کی روشنی میں ہمارا خیال ہے کہ دو چار ماہ کے اندر صوبائی سطح پر پہلے کیرلا میں وہاں کے ادباء وعلماء اور دانشوروں کو جمع کر کے کسی علاقائی ادبی موضوع پر ایک روزہ سمپوزیم رکھا جائے تاکہ ریاستی سطح پر رابطہ کی سرگرمیوں کا وسیع پیمانہ پر تعارف ہوسکے اور بھٹکل صدر مرکز کے زیر اہتمام وہاں ایک ذیلی شاخ قائم کر کے رابطہ کی ایک دو سالہ مستقل سرگرمیوں کے بعد ایک کل ہند سیمینار بھی انشاء اللہ وہاں رکھا جائے۔

اس وفد میں مذکورہ بالا علماء کے علاوہ مندرجہ ذیل افراد بھی شریک تھے۔ حافظ کبیر الدین صاحب، مولانا ناصر صاحب اکرمی، مولانا شعیب صاحب ندوی، مولانا انصار ندوی، مدنی مولانا نعمت اللہ صاحب ندوی، مولانا ابرار صاحب ندوی، محمد الیاس ندوی۔

ادب اسلامی کی انجمن رابطہ ادب اسلامی کی قاہرہ میں سالانہ نشست

عالمی رابطہ ادب اسلامی کی مجلس عاملہ کمیٹی کا ۱۲واں سالانہ جلسہ مصر کے شہر الجیزہ میں ۲۳ر تا ۲۵ر اگست ۲۰۰۱ء کو بیرامیزہ ہوٹل میں منعقد ہوا، جس میں سعودی عرب، مصر، مراکش، اردن، ہندستان، پاکستان، بنگلہ دیش کے نمائندوں نے شرکت کی۔ جلسہ میں اس بات پر زور دیا گیا کہ انجمن کا میدان کار صرف ادب کے دائرہ میں رہتے ہوئے اسلامی ادب کا فروغ ہے، کسی سیاسی یا اختلافی معاملہ سے اس کا تعلق نہیں ہے۔

ہندستان کی طرف سے مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی بحیثیت نائب صدر عالمی رابطہ اسلامی اور مولانا واضح رشید ندوی اور مولانا سعید الرحمٰن اعظمی نے شرکت کی۔

اجلاس کی روزانہ چار نشستیں ہوئیں، جن میں ادب اسلامی کی ترویج کے سلسلے میں غور وخوض ہوا، یہ ساری نشستیں ڈاکٹر عبدالقدوس ابوصالح صدر رابطہ ادب اسلامی کی صدارت میں منعقد ہوئیں۔

افتتاحی نشست میں جو ۲۳ر اگست کی صبح کو منعقد ہوئی، گذشتہ سال کی کارگزاری رپورٹ پیش کی گئی، اور صدر کی طرف سے جو اقدامات کئے گئے ان کی توثیق

کی گئی، اس کے بعد برصغیر ہندوستان اور اس سے متعلق علاقہ میں انجمن کی کارگذاری کی رپورٹ اس کے ذمہ دار مولانا محمد رابع حسنی ندوی نے پیش کی جس کے بعد عالم عربی کے علاقہ کی طرف سے اس کے ذمہ دار ڈاکٹر عبدالباسط بدر نے سالانہ رپورٹ پیش کی، برصغیر ہندوستان اور متعلقہ حلقوں میں کام کی رپورٹ میں اس کے صدر مولانا محمد رابع صاحب ندوی نے اپنے علاقہ میں ادب اسلامی کی سرگرمیوں کا ذکر کیا، خاص طور سے ہندستان کے مختلف علاقوں میں رابطہ کے ادبی مراکز کے قیام اور ادبی موضوعات پر سیمیناروں کے انعقاد کا ذکر کیا، اور ادب اسلامی سے بڑھتی ہوئی دلچسپی کا بھی جائزہ لیا، انھوں نے اس سلسلہ میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی صاحبؒ سے متعلق سیمیناروں اور جلسوں اور ان پر لکھے جانے والے مقالات اور ابحاث کا بھی ذکر کیا جن میں ادب اسلامی کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے اس لئے کہ وہ حضرت مفکر اسلام کی زندگی اور ان کی خدمات کا اہم موضوع تھا۔

مولانا محمد رابع صاحب ندوی نے ہندوستان سے متعلقہ علاقوں میں ادب اسلامی کے مراکز کے قیام اور ان ملکوں میں اس موضوع پر کئے گئے کاموں کا جائزہ بھی پیش کیا۔

افتتاحی نشست میں عالم عربی اور، ہندوستان کے دفاتر کی تفصیلی رپورٹوں کے بعد رابطہ ادب اسلامی کے مختلف خطوں کے دفاتر کی رپورٹیں پیش کی گئیں۔

اجلاس کے آخر میں حسب ذیل تجاویز پیش کی گئیں جو اتفاق رائے سے منظور ہوئیں۔

۱۔ مصر میں رابطہ ادب اسلامی کی شاخ کے باقاعدہ افتتاح کے موقع پر ایک عالمی مذاکرہ کا انعقاد کیا جائے، جو مصر کے مشہور ادیب مصطفیٰ صادق الرافعی کی خدمات سے متعلق ہو، جس میں مصر کے ادباء کے علاوہ عالم اسلامی کے مختلف ملکوں کے ادیبوں کو

شرکت کی دعوت دی جائے۔

۲۔ ادب اسلامی کے مراکز کو چاہئے کہ وہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ اور اسکالرس سے رابطہ قائم کریں اور ادب اسلامی کا پیغام ان تک پہونچائیں، اور وہاں کے نصاب میں ادب اسلامی کو ایک موضوع کی حیثیت سے داخل کرنے کی کوشش کریں، اور ادب اسلامی کے تعارف کے لئے سیمینار منعقد کریں، اور ادب سے دلچسپی رکھنے والی شخصیات کو ملاقات کے ذریعہ ادب اسلامی کی اہمیت سے متعارف کرائیں۔

۳۔ جن تعلیمی اداروں میں ادب اسلامی ایک موضوع کے اعتبار سے پڑھایا جاتا ہے، وہاں کے اساتذہ کے ساتھ علمی تعاون کیا جائے اور ان سے رابطہ قائم کیا جائے۔

۴۔ رابطہ ادب اسلامی کے مختلف مراکز آپس میں رابطہ قائم کریں اور اپنے علاقے سے شائع ہونے والے لٹریچر سے دوسرے مراکز کو واقف کرائیں۔

۵۔ رابطہ ادب اسلامی کی طرف سے مختلف زبانوں میں شائع ہونے والے مجلات اور رسائل میں اسلامی موضوعات اور دینی موضوعات کو شائع کرتے وقت اس کا لحاظ رکھا جائے کہ ان کا اسلوب بیان ادبی روح سے خالی نہ ہو، اور اپنے موضوعات کو پیش کرتے وقت فنی خصوصیات کا اہتمام کیا جائے۔

۶۔ رابطہ ادب اسلامی کی اس نشست نے ان علاقوں میں ادب اسلامی کے مراکز کے قیام کی ضرورت پر زور دیا جہاں یہ مراکز اب تک قائم نہیں ہیں، اس میں سوڈان، عمان، اور لبنان میں قیام کے امکانات پر غور کیا گیا۔

۷۔ ادیب خواتین کی ایک فرعی تنظیم کی تجویز پر غور کیا گیا جو سعودی عرب کی ادیبہ سہیلہ زین العابدین حماد کی طرف سے پیش کی گئی، اس تجویز کے مضمرات پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جو اپنی رپورٹ مرکزی دفتر کو پیش کرے گی۔

۸۔ جلسہ نے عمان میں ایک سیمینار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔

۹۔ڈاکٹر احمد محمد علی سے درخواست کی گئی کہ وہ ادب اسلامی کے مفہوم اور اس کے بنیادی مسائل سے متعلق ایک کتاب تصنیف کریں، جو ادب اسلامی کے موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے گائڈ بک کا کام کرے۔

۱۰۔ادب اسلامی کی اس نشست نے قاہرہ میں ادب اسلامی کے موضوع پر اگست میں ایک کانفرنس منعقد کرنے کا بھی فیصلہ کیا۔

۱۱۔افریقہ میں ادب اسلامی کے پیغام اور کام کو عام کرنے کے لئے چاڈ میں ملک فیصل یونیورسٹی کے تعاون سے ایک سیمینار منعقد کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔

ورکنگ کمیٹی کے جلسہ کے بعد ادب اسلامی کے ذمہ داروں کے ایک وفد نے شیخ ازہر ڈاکٹر طنطاوی اور ازہر یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر احمد عمر ہاشم اور مصر کی دوسری اہم شخصیات سے ملاقات کی اور ان کو رابطہ ادب اسلامی کے کام سے متعارف کرایا، مولانا رابع صاحب ندوی نے اس موقع پر شیخ ازہر سے ملاقات میں ندوۃ العلماء اور ازہر کے درمیان علمی اور تعلیمی تعاون میں اضافہ پر زور دیا، شیخ ازہر نے ندوۃ العلماء اور خاص طور پر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی سے اپنے تعلق کا ذکر کیا اور ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا۔